ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
جنوری 2009
معراج رسول
نیا سال مبارک ہو

معصوم قاتل — 59 — پرویز بلگرامی
تجربات؛ حوادث کی شکل میں ملنے والے تحائف؛ دنیا کو لوٹانے والے شخص کی کتھا

غیرت — 18 — ناصر ملک
ایک بے غیرت کی داستان۔ اس کے نزدیک بے محبت ہونا زیادہ بڑا عیب تھا

چینی نکتہ چینی — 11 — مدیر اعلیٰ
قارئین کی نکتہ آفرینیاں اور حق ادائیاں نامہ و پیام، تجزیے، شکایتیں اور شکایتیں

دیوی — 66 — طاہر جاوید مغل
زندگی کے تلاطم میں ڈوبتے ابھرتے کرداروں کا زندگی پیما ماجرا۔ چیتے قلم کار کا کمال

بھیڑ میں بھیڑیا — 101 — مریم کے خان
راز کھلتے تو بدنیت بھیڑیوں کے درمیان دو نازک اندام شعلہ بدنوں کا ماجرائے بدبختی

شناخت — 110 — راؤ رشید خان
جاسوسی ڈائجسٹ کا نیا ہنگامہ خیز سلسلہ اپنی شناخت کے متلاشی ایک شخص کی روداد

محسن — 153 — آصف ملک
کینسر کے خاتمے کے لیے تحقیق میں مصروف ایک محقق کہ شب و روز وہ محبت میں مبتلا ہو گیا تھا

اعتماد — 161 — مدیحہ شاہ
اعتماد کے بل پر ناممکن کو ممکن بنایا جاسکتا ہے اور ممکنات کو روکا بھی جاسکتا ہے!

سادگی — 167 — شکیل ادریس
خطیر رقم بیت الرجوع خانے سے نکلنے والے شرابی کی زندگی اس کی زندگی اور پلٹ چکی تھی

حادثہ — 173 — رضوانہ منظر
تفریحاً شکار کرنے والے کے خود شکار ہونے کا قصہ فطرت کے ایک اہم راز سے وہ ناواقف تھا

دو نقطے — 181 — ریحانہ ظفر
محبت آدمی کو بہادر بناتی ہے اور بزدل بھی! وہ شخص بھی مظلوم بن گیا تھا اور ظالم بھی

عجیب بستی — 189 — بابر نعیم
ایک عجیب بستی اور اس عجیب تر باسیوں کا احوال صحرا اور سونے کے پُراسرار راز ان کے سینوں کی گہرائی میں دفن تھے

سودا — 203 — بلقیس جہاں
ایک بھائی کا فسانہ غیرت ایک نرالی غیرت سے بڑھ کر کچھ نہ تھا خاص نمبر کی خاص کہانی

مدیرہ اعلیٰ
عذرا رسول

بازگشت — 264 — حسام بٹ
محبت میں مبتلا چند افراد کا فسانہ جو ریاکاری تصنع کی دنیا کے باسی تھے حقیقی احساسات بھی رکھتے تھے

پورا سچ — 232 — کاشف زبیر
حالیہ ممبئی ڈرامے کے پس پردہ کارفرما حقائق کی جھلک لیے ایک انکشاف انگیز تحریر

گردش — 211 — ش صغیر ادیب
اپنی زندگی اپنے اصول اور ترجیحات کے مطابق گزارنے کے خواہش مند شخص کی کتھا معروف مصنف کی نادر تحریر

جلد 38 • شمارہ 01 • جنوری 2009 • زرسالانہ 500 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 40 روپے • سعودی عرب 12 ریال یا مساوی
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون (021) 5895313 فیکس (021) 5802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com
پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

چند باتیں

مدیر اعلیٰ

پیارے قارئین!
السلام علیکم۔

2009ء کا پہلا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ حسب وعدہ اسے خاص نمبر کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں، ہر شمارے پر ہم خصوصی محنت کرتے ہیں لیکن خاص نمبر کے لیے خاص محنت، خاص التزام ہو جاتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ محنت رنگ لائے گی۔ اس شمارے میں ش صغیر ادیب مرحوم کا تازہ ترین شاہکار بطور خاص شامل کیا گیا ہے جبکہ دیوی کی یہ قسط اختتامی ہے۔ طاہر جاوید مغل عنقریب ایک متبادل سلسلے کے ساتھ دوبارہ جلوہ گر ہوں گے۔ اس دلچسپ اور ہنگامہ خیز سلسلے پر انہوں نے کام بھی شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ آپ جلد ہی اسے ملاحظہ کرسکیں گے۔ اس خوشخبری کے ساتھ ہم چلتے ہیں آپ کی اور اپنی محفل میں۔

محمد کلیم شیخ، چیچاوطنی سے ''شومئی قسمت کہ اس دفعہ'' جاسوسی'' 2 نومبر کو ہی مل گیا۔ پکڑتے ہی سرورق کی نیم الجھی، نیم سلجھی زلفوں والی حسینہ کو نظر انداز کرتے اور پس منظر کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے فہرست تک پہنچے اور اس کا عمدہ انداز سراہے بغیر نہ رہ سکے۔ فوراً بعد محفل خطوط میں اپنی کاوش کی تلاش میں نظریں دوڑائیں اور اپنی خیال آرائی پاکر کافی اچھالگا۔ پھر سالگرہ نمبر کی خوشخبری اور ثاقب تبسم کی خوشی پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اب ایک ہی نشست میں جاسوسی ختم کرنے کے بعد چند مزید حروف ناقص پیش ہیں۔ امید ہے کہ شرفِ قبولیت بخشا جائے گا۔ اس دفعہ جاسوسی کی سبھی کہانیاں بہترین تھیں۔ ہوم سویٹ ہوم مشترکہ خاندانی نظام کے شیرازے کے بکھرنے اور اس سے جنم لینے والی خرابیوں کی داستان تھیں...... بے جا پابندیاں ایسے ہی رنگ لاتی ہیں۔ سپر مین سپر کہانی تھی۔ دیوی میں قتل و غارت سے مزین قسط کا اختتام ڈپٹی ریاض کی گرفتاری کے پُرتجسس موڑ پہ آکے ختم ہو گیا۔ اگلی قسط کا اشتیاق رہے گا۔ جدید غلامی میں مصنف نے غلامی میں بھی جدت پیش کی۔ شناخت میں وجی کی وکی اور وکی کی وجی میں تبدیلی ہی پڑھتے رہے۔ موت کے تعاقب میں خوار ہوتے شخص کا احوال پڑھ کر تعجب ہوا۔ سزائے معافی میں مارک نے معافی دے کر جولیا اور فلیچر کو ابدی سزا سے دوچار کر دیا۔ چٹان عمدہ کہانی تھی۔ وہ رات پڑھ کر احساس ہوا کہ حرص و ہوس انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ بے راہ رو سے مغربی معاشرے کی حالت زار پر افسوس اور اس پر ہزار دل سے نفرین کرتے ہوئے رنگوں کی طرف بڑھ گئے۔ رنگوں میں اپنے اور پرائے ملکی حالات کی غمازی کرتی ہوئی عمدہ کہانی تھی۔ معصوم ذہنوں کا مذموم مقاصد کے لیے استعمال قابل مذمت اور باعثِ افسوس ہے۔ جنونِ عشق نے یہ باور کرایا کہ قاعدے اصول و ضوابط کی پیروی ہی اپنی خواہش کے حصول کے لیے بہتر ہے۔ اعلیٰ تسلسل سے لکھی گئی کہانی نے آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔

حفیظ اللہ، ڈی جی سے ''انکل جی اس دفعہ میں کسی ٹائٹل پر تبصرہ نہیں کرنا چاہوں گا اور نہ میرے قلم کی نوک کے نیچے آنے والے الفاظ کسی کہانی کے تبصرے پر مشتمل ہوں گے اور نہ ہی مجھ سے اس دفعہ تڑکا لگانا، خوشبو لگانا، مکھن لگانا اور نہ آگ لگانے کی توقع کریں۔ تو پھر کیا؟ وہ یہ کہ انکل آپ کو نہیں بلکہ میں اپنے تمام دوستوں کو لیے چلتا ہوں صرف 40 روپے اور 00 پیسا میں + ٹیکس جاسوسی کے سالانہ وزٹ پر جہاں وہ دیکھ سکیں گے ادارہ جاسوسی کی کرم نوازیاں جو انہوں نے سال بھر میں ہم پر نچھاور کیں اور اس کے جواب میں پیارے قارئین کا جوش و خروش۔ 2008ء کے 12 مہینوں کے جاسوسی ڈائجسٹوں میں ٹوٹل 156 کہانیاں پڑھنے کو ملیں اور جن میں 22 سرورق شامل تھے۔ 12 رسالوں کے ٹوٹل صفحات 3728 پر مشتمل تھے جن میں 260 صفحات اشتہارات کی نذر ہو گئے۔ اسماء الحسنیٰ کے 72 صفحات اور بزمِ یاراں کے 79 صفحات تھے۔ اب رخ کرتے ہیں تبصروں کی طرف، ٹوٹل تبصرہ بھیجنے والے 616 افراد تھے جو تبصرے شائع ہو سکے 365 اور جو اشاعت نہ ہو سکے وہ 251۔ ان میں صنف کرخت کے، 306 تبصرے اشاعت ہوئے اور 210 لیٹ کمرز میں تھے۔ صنفِ نازک کے جو قابل اشاعت ہوئے وہ 59 تھے اور لیٹ کمرز میں 41 تبصرے شامل تھے۔ انعامی تبصرہ بالترتیب ایم اے جمال (خانیوال) محمد کبیر عباسی (اسلام آباد)، ایم مرتضیٰ انداز (ماموں کانجن)، غزالہ وقار (ملتان)، ثاقب تبسم نگینہ (گوجرانوالہ)، ملک ریاض آصف (جیلانی فورد)، ڈاکٹر محمد ابراہیم اے جے کسانہ، نوشی چوہدری، ثاقب تبسم نگینہ، حافظ اللہ یاسین اس سال کے ونر ہیں، ثاقب تبسم نگینہ جنہوں نے تین دفعہ صدارت کی کرسی حاصل کی۔ تبصرہ بھیجنے والوں کا بڑے شہروں کا ریکارڈ یہ رہا جو کم و بیش شاملِ بزم ہوئے۔ ڈیرہ غازی خان 23، خانیوال، 12 فیصل آباد، 11 راولپنڈی، 16 کراچی، 14 سرگودھا، 17 گوجرانوالہ، 22 لاہور، 14 آزاد کشمیر، 6 ملتان، منڈی بہاالدین، 12 وہاڑی، 4 بہاولپور، 7 پشاور، 6 کوئٹہ، 5 حیدرآباد، 7 حافظ آباد، 8 اور کوہاٹ کے 3 تبصرے شامل تھے۔ لیٹ کمرز میں شہروں کا ریکارڈ ڈیرہ غازی خان، 7 ملتان، 6 لاہور، 18 کراچی، 28 رحیم یار خان، 8 پشاور، 6 خانیوال، 4 اسلام آباد، 9 فیصل آباد، 5 تبصرے تھے۔ افسوس ہے کہ ہمسائے شہر ڈیرہ اسماعیل خان کا ایک لیٹر بھی شاملِ جاسوسی نہ تھا۔ ڈیرہ اسماعیل والوں اللہ پوچھے گا۔ تو قارئین یہ رہا ہمارا سالانہ وزٹ امید ہے بہت انجوائے کیا ہوگا اس سلسلے کے لیے مجھے ایک سال تک کی اجازت دیجیے۔ اللہ نگہبان۔''

شاداب خان، لانڈھی کراچی سے ''دو دسمبر کی شب شمارہ نہ پاکر دکاندار سے استفسار فرمایا تو محترم نے چونک کر کہا کہ کارٹن میں پڑا ہے، ابھی ابھی آیا ہے۔ ہم نے شمارہ خریدا بھی اور بک شاپ کے اندر باہر ریک شوکیس میں سجا بھی دیا کہ کوئی اور قاری شمارہ نہ پاکر واپس نہ چلا جائے۔ ش صغیر ادیب صاحب کے انتقال کا پڑھ کر دلی افسوس ہوا۔ پتا نہیں کیا بات ہے کہ آج کل اچھی خبریں خال خال ہی ملتی ہیں۔ ہم سب قارئین کی طرف سے ان کے اہل خانہ

سے دلی تعزیت کرتے ہیں، رب کریم مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔ سرورق جاسوسی کے شایانِ شان تھا۔ اشتہارات کو سرسری سا دیکھتے ہوئے سیدھے چینی نکتہ چینی کی محفل میں پہنچے۔ ہم نے عہد کیا تھا کہ محفل کے کسی نکتہ داں کے نکتے پر نکتہ چینی نہیں کریں گے مگر نگینہ صاحب کے خط نے ہمیں عہد توڑنے پر مجبور کر دیا اتنا اچھا پُر مزاح خط لکھنے پر ان کو مبارکباد قبول ہو۔ عادت کے مطابق ترتیب وار پڑھنے کا آغاز کیا۔ ہوم سویٹ ہوم اچھی کہانی تھی مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ احمد اقبال صاحب ایف بی آئی کو آخری عمر میں توبہ کروا کر شادی اور نمک حرام عبدل کو گرفتار کروا دیتے۔ سپر مین کا پیپی اینڈ ہمیں پسند آ گیا۔ پتا نہیں کیا بات ہے ہمیں کاشف زبیر صاحب کی تحریر کچھ زیادہ ہی پسند آتی ہے۔ دیوی اس وقت تمام ڈائجسٹوں کی سرتاج کہانی ہے لیکن مغل صاحب نے اس وقت پھر ظلم کر دیا اجمل کا غم ختم نہیں ہوا تھا کہ دراج جیسا وفادار بھی شہید ہو گیا۔ جدید غلامی حقیقت کے قریب کہانی ہے۔ شناخت اب اپنے جوبن پر نظر آنے لگی ہے۔ ہمیں کہانی کا عنوان خنجر کی طرح لکھنے کا انداز پسند آیا۔ آرٹسٹ کو ہمارا اخراج تحسین پہنچا دیجیے گا۔ سزائے معافی عنوان بھی اور کہانی بھی دونوں زبردست تھے۔ چٹان بس گزارہ ہی تھا۔ وہ رات کچھ غیر حقیقی سی لگی۔ لہو کا سراغ کا اختتام چونکا دینے والا تھا۔ بے راہ رو صرف امریکا ہی نہیں ہمارے معاشرے کی بھی کہانی ہے۔ سرورق کا رنگ، اپنے اور پرائے حقیقتوں سے بھرپور تھا اور ہمارے خیال میں شمارے کی نمبرون کہانی تھی۔ سرورق کا دوسرا رنگ جنونِ عشق میں ڈراما، سسپنس، تھرل سب کچھ تھا مگر اختتام جلد ہو گیا۔''

ڈاکٹر شیریں شاہ میر خان، اٹک سے ''ویسے تو ہم جانتے ہیں کہ ہمارا گلستان ہمیشہ ہی مہکتا رہتا ہے اپنی رعنائیوں کے ساتھ ہر ایک قاری کے دل پر چھایا جاتا ہے کہ ہر کوئی قلم اٹھانے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن انٹری دینے کا چانس کسی کسی کی قسمت میں آتا ہے۔ جیسے مابدولت کو ہی لے لیجیے کبھی ان تو کبھی آؤٹ ہو جاتے ہیں۔ جاسوسی کا انتظار 6 تاریخ کو ختم ہوا لیکن جونہی بٹلر نے جاسوسی کا رسالہ میری جانب بڑھایا، شاہ رخ نے جھپٹ لیا تو جناب پھر کیا مجھ سے رہا نہ گیا اور میں اس کے پیچھے لپکی اور میں نے چھینا جھپٹی شروع کی۔ جس پر ہمارا غضب ناک راجو غراتا، دم ہلاتا ہمارے آگے پیچھے ہونے لگا۔ سب تبصرے اچھے تھے۔ بلیک لسٹ سے نظر کو جھٹک کر ایک خبر پر پڑی تو مابدولت انسانیت کے ناتے گہرے صدمے سے دوچار ہو گئی۔ انکل، ہم سب آپ کے دکھ میں شریک ہیں۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ مرحوم ظفر حسن غوری صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے (آمین ثم آمین) کہانیوں میں سب سے پہلے دیوی میں جا کودی۔ اجمل کی موت کا پڑھ کر بے حد دکھ ہوا، رستم اور شانی ایک گہرے اور خطرناک بھنور میں پھنس چکے ہیں۔ خدا خیر کرے۔ شناخت میں وجی کے بارے میں کم جبکہ وکی، شہناز اور خان علی کی سرگرمیوں کو خوب پیش کیا جا رہا ہے۔''

لعل شاہ رخ، فتح جھنگ اٹک سے ''کافی دھینگا مشتی اور ہزار صلواتیں سننے کے بعد جوادھ موئے کلمو ہے رسالے کو ٹیبل پر پڑے منہ چڑاتے دیکھا تو مجھے اس کی حالتِ زار پر بڑا ترس آیا۔ ٹائٹل گرل کے لقمہ اجل ہونے سے اس پیارے سویٹ سے لپٹ کر کنگ نے ایک ٹھنڈی آہ اس ٹھنڈے موسم میں بھری۔ دیوانے کی اس دیوانگی کو برقرار رکھتے ہوئے میں نے محفلِ جاناں کا رخ کیا جہاں خون آشام چمگادڑیں، چڑیلیں ہم معصوم شہزادوں کا خون پینے کے درپے تھیں۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے اپنی من پسند اسٹوری دیوی کے درشن کیے۔ اجمل جیسے بہادر جوان کی موت کا صدمہ سہنا کوئی آسان کام نہیں۔ سرورق کا پہلا کلر چمکیلے اندھیرے نے بڑا امپریس کیا۔ سیما کی بہادری واقعی ایک مثال قائم کر گئی اور شہادت کے مرتبے پر فائز کر کے اس کو خدا نے انعام سے نوازا۔ دوسرا کلر اجنبی رشتے میں گرینڈ پا کی ہمت واقعی قابلِ داد ہے۔ کتنے اپنوں کو کھو کر بھی ایک مضبوط چٹان کی طرح کھڑے رہے۔ مریم کے خان کی ایک لوہار کی، بڑھی شاندار رہی۔ رضوانہ منظر کی خون آشام پڑھ کر جھرجھری لی۔ بابر نعیم کی خواہش ناتمام کمال کی رہی، آصف ملک کی تقاضائے انصاف داد۔ فریب نظر بھی پڑھی جو بس سو سو رہی۔ کاشف زبیر کے قلم نے تو اب کی بار جادو کر دیا۔ جنون پڑھ کر کافی حقیقتیں ہم پر آشکار ہوئیں۔''

ٹریلی ایس کے اسماعیل کی دستک، خیبر ایجنسی شاہ کس سے ''مارکیٹ میں بک اسٹال کے سامنے سے گزر رہا تھا کہ اچانک ڈائجسٹ پر نظر پڑی۔ واہ جی واہ، یکم تاریخ کو رسالہ بھیج کر انکل نے عید سے نو دن پہلے عیدی دے دی۔ شکریہ انکل جی۔ حسبِ معمول حسینہ نے اپنی طرف متوجہ کیا اور ہم بھی متوجہ ہو گئے۔ حسینہ غصے میں تھی، دانتوں پر دانت جمائے ہوئے غصے کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کے بعد نازل ہو گئے کلاس میں سارے دوستوں اور کلاس فیلو سے ملنے، کرسی استاد پر ثاقب تبسم بیٹھے ہوئے تھے۔ کہانیوں کی لسٹ میں دیوی کو چن کر وہاں چھلانگ لگا دی اور پڑھنے لگے۔ رستم کے بچنے کی دعا مانگنے لگے اور آخر کار جہانگیر کی کوششوں سے سب بچ گئے۔ اس کے بعد باری آ گئی شناخت کی۔ جہاں وجی نے وکی بن کر خود کو خطرات کے سمندر میں گرا دیا۔ پہلے صفحوں پر کہانی میں ایک غیرذیتے دار اور اپنے بچوں سے بے پروا باپ کو دکھایا گیا جو کسی رشتے دار کے نہ ہونے کی وجہ سے ایک ملازم کے ہاتھوں برباد ہو جاتے ہیں۔''

عابد بخش، گوجرانوالہ سے ''جاسوسی کا شمارہ دو تاریخ کو ملا، یہ اتفاق ہے کہ سب سے پہلے مریم کے خان کے اپنے اور پرائے پر نظر پڑی، وہی پڑھنے بیٹھ گیا۔ پڑھنے کے بعد پتا چلا کہ ہمارا مکار دشمن ہمیں کس طرح آپس میں لڑا رہا ہے۔ پاک بھارت حالیہ کشیدگی نے دو ایٹمی ممالک کو جنگ کے دہانے پر پہنچا دیا ہے۔ اللہ رب العزت ہمارے ملک کو ہر قسم کی آفات سے محفوظ رکھے آمین۔ اب آتے ہیں محفلِ یاراں کی طرف، وکٹری اسٹینڈ پر ثاقب تبسم نگینہ براجمان تھا یا تھی؟ باقی دوستوں کے خطوط بہت اچھے تھے۔ سب سے پہلے اپنی جان دیوی کے پاس پہنچے۔ کہانی اپنے اینڈ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ انکل اس دفعہ انکل محی الدین نواب سے اندھیر نگری کی طرز پر کوئی کہانی لکھوائیں، پلیز۔ شناخت اچھی جا رہی ہے۔ ہوم سویٹ ہوم ہمارے معاشرے کی ننگی تصویر کا بھیانک انجام تھا۔ کہانی زبردست تھی کاش ہمارے بیوروکریٹ اس کہانی سے سبق سیکھ لیں۔ جنونِ عشق گزارے لائق تھی۔ ش صغیر ادیب کی وفات پر انتہائی دکھ ہوا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین۔ انکل جی آپ کو اور تمام قارئین کو جاسوسی اور سسپنس کی سالگرہ مبارک ہو، خاص نمبر کا خاص انتظار رہے گا۔''

ملک آصف علی اعوان، فیصل آباد سے ''پیارے انکل اور محفل میں موجود تمام دوستوں اور سہیلیوں کو دلی السلام علیکم، اینڈ ہیپی نیو ایئر۔ اس دفعہ ہمارے دل کی دھڑکن، ہمارے جگر کا ٹکڑا، جاسوسی ڈائجسٹ یکم دسمبر کی ایک سرمئی شام کو اپنے دوست زاہد مجید کے طفیل وصول ہوا۔ سب سے پہلے ہماری آنکھوں نے ٹائٹل کا درشن کیا، شکر لگا کے۔ ٹائٹل گرل کچھ زیادہ ہی گلیمرس لگی جو اپنے وسیع و عریض گریبان کو اپنے سفید دوپٹے سے ڈھانپنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ ٹائٹل میں موجود صاحب جن کے ہاتھ میں سن 1978ء کی بندوق تھی، شاید مورچہ بند ہو کر اپنے دوستوں سوری دشمنوں پر فائرنگ کر رہا تھا۔ اپنی

دے، ٹائٹل جاسوسی کے معیار پر پورا اتر رہا تھا۔ اشتہارات کو نظرانداز کرتے ہوئے ہم محفل میں انٹر ہوئے۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو جاسوسی، خدا تعالیٰ آپ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے اور جاسوسی کے تمام اسٹاف کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین ثم آمین۔ پہلا انعامی خط پڑھا۔ ثاقب تبسم نگینہ صاحب! آپ کے خط میں کوئی خاص بات تو نہیں تھی، اینی وے کانگریچولیشنز۔ شکر ہے خدا کا کہ رستم اور ناصر وغیرہ پولیس کا محاصرہ توڑ کر قبائلی علاقوں میں چلے گئے اور وہاں سے شاید فن ستان جانے کا ارادہ رکھتے ہیں، دوسرے رنگ میں مجتبیٰ صدیقی نے افضال خان کو قاتل کے روپ میں پیش کیا اور پھر خدا جانے کیوں ان کو قانون سے بچا بھی لیا، باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔''

ارشد محمود دستی، تحصیل کہوٹہ سے ''ماہ دسمبر کا جاسوسی دو تاریخ شام کو پانچ بجے ملا۔ ٹائٹل پر نظر پڑتے ہی بے اختیار دل کی گہرائیوں سے آہ نکلی بلوری آنکھوں والی حسینہ رسیلے ہونٹ لیے ادائے ناز سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ اوپر ایک بندہ خوفناک انداز سے مسکرا رہا تھا اور نیچے والا بندہ بندوق لے کر فاتا میں داخل ہو رہا تھا۔ ٹائٹل کے معائنے کے بعد بڑھے اپنی محفل ہاؤ ہو کی جانب۔ ثاقب تبسم وکٹری اسٹینڈ پر کھڑے سب لوگوں کو مشورے دے رہے تھے۔ تبصرہ اچھا تھا، مبارکاں۔ تمام دوستوں کے تبصرے اچھے تھے، خاص کر چوہدری بہار نوید احمد، محمد کلیم شیخ ابن مقبول، نوی اے، مسز حسن، اس کے بعد دیوی پڑھی۔ اب ڈپٹی ریاض اور رستم آمنے سامنے آ گئے ہیں تو کہانی کا اینڈ ہو گا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہو گا۔ ابتدائی صفحات پر احمد اقبال کی ہوم سویٹ ہوم بہت زبردست اور خوبصورت تحریر تھی۔ بے شک ہر دولت مند کی کہانی نہیں تھی مگر تھی ہمارے ہی معاشرے کی۔ اس کے بعد سپر مین، جدید غلامی، شناخت کی یہ قسط بہت اچھی تھی۔ اپنے اور پرائے، جنونِ عشق بہت اچھی تھی۔ رنگوں میں سے دوسرا رنگ بہت ہی پیارے انداز سے قلم بند ہوئی۔ اگلے ماہ یعنی نئے سال کی آمد پر جاسوسی کی سالگرہ ہے تو میری طرف سے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو جاسوسی میری طرف سے محمد آصف کی برتھ ڈے پر ہیپی برتھ ڈے ٹو یو آصف۔ آخر میں میری طرف سے جاسوسی کے تمام اسٹاف اور سب دوستوں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے سلام محبت اور HAPPY NEW YEAR 2009۔''

طاہرہ تبسم از خانیوال ''میرا یہ خط جب قارئین پڑھ رہے ہوں گے نیا سال شروع ہو چکا ہو گا، اس لیے سب کو ہیپی نیو ایئر، دسمبر کا شمارہ دیر سے ہم تک پہنچا۔ ٹائٹل پر فضول سی لڑکی تھی۔ اشتہارات کو کراس کرتے ہوئے شوگر پاٹ میں پہنچے چونکہ چلتے چلتے تھک گئے تھے، بیٹھنے کے لیے کرسی پکڑنے لگے مگر یہ کیا یہاں تو پہلے ہی بھائی نگینہ تبسم بیٹھے ہوئے ہیں۔ واہ کیا بات ہے مبارک ہو بھئی۔ سبھی لوگوں کے تبصرے اچھے تھے، پچھلا چھوڑ آگے دوڑ کرتے ہوئے دیوی تک پہنچے، شکریہ طاہر مغل جی آپ نے اپنے قلم کے ہیرپھیر سے ہمارے عزیز بھائی کو بچا لیا۔ کیا تھا اجمل کو زندہ رکھتے اور گریس سے اس کی شادی کروا دیتے۔ اب ناصر اور زری کی شادی ہمیں دکھائے بغیر کہانی کا اینڈ مت کر دیجیے گا۔ رستم اور شانی کو دبئی بھیج دیں کیونکہ نزدیک ہے، شناخت اچھی اور سنسنی خیز جا رہی ہے۔ ہوم سویٹ ہوم پڑھ کر فاروق کی موت کا دکھ ہوا، سپر مین اور جدید غلامی بس ٹھیک ہی تھیں۔ موت کا تعاقب زبردست اسٹوری تھی، سزائے معافی بھی اچھی اسٹوری تھی، چٹان بھی بس یونہی سی لگی۔ وہ رات مزیدار اسٹوری تھی۔ لہو کا سراغ دلچسپ اور عمدہ اسٹوری تھی۔ بے راہ رو کو رضوانہ جی نے بڑے عمدہ انداز میں تحریر کیا تھا۔ پہلا رنگ پسند آیا، البتہ دوسرا رنگ پھیکا رنگ اڑا ہوا تھا۔''

ہیپی ہیپی زیب، تحصیل و ضلع رحیم یار خان سے ''ہیلو ایوری باڈی! کیسے ہیں، امید ہے کہ سب خیریت سے ہوں گے۔ اس بار میری جان مجھے بڑی تاخیر سے ملی، ایک تو میں نے انٹری ماری تھی اور اپنا نام دیکھنا تھا، دوسرا آپ کو پتا ہے کہ رسالہ لیتے ہی ٹائٹل پر نظر پڑی جو کہ کچھ خاص نہیں تھا، ڈائریکٹ شناخت پر پہنچا، آخر راؤ صاحب نے میری بات مان لی اور وکی کو وجی بابا بنا لیا۔ بڑی اچھی جا رہی ہے، اس کے بعد رنگ پڑھے اس بار دونوں رنگ ہی کچھ خاص نہیں تھے اور نہ ہوم سویٹ ہوم اچھی تھی۔ اس بار شارٹ اسٹوریز ساری اچھی تھیں۔ چٹان سب سے بہتر تھی۔ لگتا ہے آپ اس بار سال کو اچھی طرح الوداع نہیں کہہ سکے۔''

بشریٰ افضل، بہاولپور سے ''سال 2008ء کا آخری شمارہ دنیا کے موجودہ حالات کی عکاسی کرتے سرورق کے ساتھ موصول ہوا، جیسے ساری دنیا کا رخ پاکستان کے شمالی علاقوں کی جانب ہو، ویسا ہی سرورق تھا۔ ہوم سویٹ ہوم علامتی کہانی تھی۔ ایف بی آئی کی کمزور و متکبرانہ زندگی کی اچھی عکاسی کی گئی اور اس طرح کے لوگوں کا کیا انجام ہو سکتا ہے اور ان کی دولت کون کھاتا ہے بہت خوبصورت انداز میں دکھایا گیا۔ دیوی میں رستم اور شانی حسبِ معمول مشکلات کا شکار ہیں، لگتا ہے ختم ہونے والی ہے لیکن پھر کہانی اور رخ اختیار کر لیتی۔ رستم صاحب بھی علاقہ غیر کی جانب جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ شناخت میں وکی اور وجی جہاں جاتے ہیں، طوفان برپا کر دیتے ہیں۔ وکی کی مکاریاں اور وجی کی شرافت دیکھیں کیا انداز اختیار کرتی ہے کہ جگہ تو بدل گئی ہے۔ اب کیا کرتے ہیں دونوں بھائی۔ سرورق اپنے پرائے میں خودکش حملوں کی تیاری کے بارے میں بتایا، کہانی میں تو بچہ بچ گیا لیکن آج کل تو یہ بچے ہی ہیرو بنے ہوئے ہیں۔ اللہ پاکستان کے حالات درست فرمائے۔ جنونِ عشق بھی قبائلی علاقوں کی کہانی تھی۔''

قاری عبدالماجد اشرفی، رحیم یار خان سے ''چینی نکتہ چینی میں پہلی بار حاضر ہو رہے ہیں اگرچہ ہم چینی اور نکتہ چینی دونوں کو صحت کے لیے مضر سمجھتے ہیں لیکن ان تک پہنچنے کے لیے ان دونوں کا استعمال کیے بغیر ہمارے لیے کوئی چارہ بھی نہیں سو مجبوراً استعمال کر رہے ہیں۔ اب آپ یقیناً جاننا چاہیں گے کہ یہ صاحب کون ہیں کہ جن کے لیے ہم اپنی صحت تک کو داؤ پر لگا رہے ہیں۔ تو لیجیے جناب ہم آپ کو بتائے ہی دیتے ہیں وہ ہیں اپنے طاہر جاوید مغل۔ یہ وہی محترم ہیں جو ایک دہائی سے زیادہ تک سرگزشت میں ہم سے تاوان وصول کرتے رہے اور پھر ایک دن ہمیں سرگزشت میں چھوڑ کے دیوی کو لے کر جاسوسی میں چلے گئے اور ہم صرف اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ سرگزشت سے ان کے جانے کے بعد ڈائجسٹ کی دنیا سے کچھ ایسا دل جلا کہ تین سال تک کسی ڈائجسٹ کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ گزشتہ سے پیوستہ ماہ ایک عزیز کے ہاں جاسوسی نظر آیا۔ اٹھا کر یونہی ورق گردانی کرنے لگا تو اس میں مغل کا نام دیوی کے اوپر نظر آیا۔ یقین جانیے ان کا نام دیکھ کر میری عجیب کیفیت ہوئی کہ جیسے برسوں کا بچھڑا ہوا کوئی اچانک مل جائے تو بس اسی دن سے جو تعلق سرگزشت سے کبھی ٹوٹا تھا، وہ جاسوسی کی شکل میں جڑ گیا۔ آپ نے مغل کے تعارف کے لیے تین چار لفظ لکھے ہیں جبکہ میرے خیال میں ان کے تعارف کے لیے ایک لفظ ہی کافی ہے، جادو نگار کہ ایسے انداز میں وہ قاری کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ چلاتے ہیں کہ پڑھنے والا سحر زدہ سا ہو جاتا ہے۔ اب آتے ہیں دسمبر کے جاسوسی کی طرف، جو حسبِ توقع یکم دسمبر کو ہی مل گیا۔ سرورق پر دور کہیں کسی کو تکتے ہوئے سوچوں میں گم چینی نما لڑکی نے کوئی خاص اثر دل پر نہیں ڈالا۔ فہرست پر نیم نگاہ کرتے ہوئے

سیدھے دیوی کے چرنوں کو چھوا جہاں وہ اپنے جان جگر کے ساتھ ایک بار پھر ایکشن میں تھی۔ ہٹلر کی سانسیں پوری ہوچکی ہیں اور شاید کہانی بھی اپنے اینڈ کو پہنچنے والی ہے۔ دیوی کو چھوڑتے ہی رنگِ اول کو پکڑا۔ مریم کے خان نے موجودہ صورتحال میں خوبصورت انداز میں نہ صرف خودکش دھماکوں کی حقیقت کھول کر نقلی طالبان کا چہرہ دکھایا ہے بلکہ اصلی طالبان کا مقصد بھی خوب واضح کیا ہے کہ اصل طالبان صرف جارح قوتوں کے خلاف لڑ رہے ہیں اور وہ بھی افغانستان میں۔ صدیقی کا رنگ بھی شروع میں تو خوب رہا لیکن آخر میں ذرا ہلکا رہا۔''

حمزہ خان عرف کنگ خان، بہاولپور سے ''اس ماہ جاسوسی کا شمارہ غیر متوقع طور پر 30 نومبر ہی مل گیا۔ سرورق کچھ خاص نہیں تھا۔ ابتدائیہ میں آپ نے جنوری 2009ء کے شمارے کو خاص بنانے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ انکل اگر آپ ہمارا خط اس میں شامل کریں گے تو یہ خاص الخاص ہوجائے گا۔ وکٹری اسٹینڈ پر براجمان جناب ثاقب تبسم کا تبصرہ کسی بکرا بیچنے والے کا سا لگا۔ بہرحال مبارک قبول کیجیے۔ اس کے بعد جان جاسوسی دیوی کے درشن کیے۔ شروع میں یہ کہانی بہت خوبصورت تھی لیکن اب اس کا معاملہ کچھ اس طرح سے ہے کہ جیسے لسی میں پانی ڈالنے سے وہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اب اس کہانی کا کوئی باعزت سا اختتام کردیا جائے، جاسوسی کا نیا سلسلہ اچھا جا رہا ہے۔ دیکھتے ہیں دائی اماں وجی کے ساتھ کیا سلوک کرتی ہیں۔ ابتدائی صفحات کی کہانی کچھ زیادہ متاثر نہ کرسکی۔ کاشف زبیر کی سپر مین اچھی کہانی تھی۔ آصف ملک کی جدید غلامی امریکی سوچ کی عکاس تحریر تھی۔ عبدالرب بھٹی کافی عرصہ بعد مسرل تہذیب کے ساتھ نظر آئے۔ تمام چھوٹی کہانیاں پسند آئیں۔ پہلے رنگ میں مریم کے خان نے بہت سے حقائق سے پردہ اٹھایا۔ دوسرے رنگ میں مجتبیٰ صدیقی کوئی خاص جنون نہ دکھا سکے۔ ش صغیر ادیب صاحب کی وفات کے بارے میں پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔''

شہناز شانز سے سیال، ضلع خانیوال سے ''آپ اور جاسوسی کی تمام ٹیم میری دعاؤں سے انشاء اللہ خیریت سے ہوگی اور انشاء اللہ العظیم ہمارا یہ فیورٹ ادارہ قیامت تک ترقی کی منازل نہایت کامیابی سے طے کرتا چلا جائے گا۔ اس دفعہ جاسوسی خلافِ توقع تین تاریخ کو ہی جب گھر میں جلوہ افروز ہوا تو خلافِ توقع ہی ہم پر شادی مرگ جیسی کیفیت طاری ہوگئی۔ سانولی سلونی سی ٹائٹل گرل کے عقب میں دانت نکوستے بھورے شیر نما انسان پر اک نگاہِ غلط ڈال کر ورق الٹایا۔ حسبِ توقع New کیئر کے اشتہار کی ماڈل کو دیکھ کر سراہا اور باقی اشتہارات کو دور سے سلام کرتے ہوئے صفحہ نمبر 11 پر آکر دم لیا۔ تو جاسوسی میاں آپ کی برتھ ڈے بھی آگئی چونکہ ہمارے یہاں آج کل کپاس کی چنائی اختتام پر ہے اور سرسبز دیہات میں رہنے کی وجہ سے آج کل جیب بھی خاصی بھاری ہے یعنی جاسوسی میاں آپ کو گفٹ دیا جاسکتا ہے مگر سسپنس گندم کی کٹائی کا انتظار کرے۔ آخر ایک مزدور کو اتنی رعایت تو ملنی چاہیے نا، کیوں انکل جی؟ ثاقب تبسم نگینہ، بکرا، بکرا کی ہانک لگاتے بالآخر اس بار بھی سیٹ مار گئے۔ حسبِ توقع سب سے پہلے رستم اور شانی کی ایکشن سے بھرپور اسٹوری دیکھی، تصور کی نگاہ سے۔ عام لفظوں میں پڑھی اور حافظہ ہونے کے ناتے ڈپٹی ریاض کے لیے وقت سے پہلے ہی ختمِ قرآن کرنا شروع کردیا۔ محفل میں مست انٹر ہونے کی نیت سے ایسی ایک کہانی پر ہی اکتفا کرتے ہوئے تبصرہ لکھ ڈالا۔''

مدثر عالم فرام اوچ دیر... ''دسمبر کا شمارہ خلافِ توقع پہلی ہی تاریخ کو ملا۔ سرورق پر نگاہ پڑی تو حیرت زدہ رہ گیا۔ خاتون فلپائن، چین، کوریا اور جاپان کا آمیزہ نظر آرہی تھی۔ سرورق کا حساب چکتا کرکے محفل ہاؤ ہو دھما چوکڑی مست قلندر کے میدانِ کارزار میں بے خطر کود پڑے۔ ثاقب تبسم نگینہ کو وکٹری اسٹینڈ پر براجمان دیکھ کر خون سنسنا اٹھا... خوشی سے۔ بلیک لسٹ کے بعد نیچے دیکھا تو ایک صدمہ جانکاہ ہمارا منتظر تھا۔ ش صغیر ادیب واقعی ہمارے محبوب مصنف تھے۔ اللہ ان کو جنت الفردوس عطا فرمائے آمین۔ کہانیوں میں سب سے پہلے دیوی پڑھی۔ ہماری توقع کے عین مطابق جہانگیر نے خفیہ راستہ دریافت کرلیا تھا۔ تمام قسط بہت شاندار رہی۔ ڈرامائی طور پر ریاض پکڑا گیا ہے۔ اللہ نہ کرے کہ اسے شانی بچالے۔ دیوی اپنے منطقی انجام تک پہنچ رہی ہے۔ زیادہ سے زیادہ تین یا چار قسطیں باقی ہیں۔ (جی نہیں۔ یہ آخری قسط ہے۔ اس کے بعد آپ مغل صاحب کے ہی قلم سے ایک اور معرکہ آرا داستان ملاحظہ کریں گے۔) اس کے بعد شناخت جیسی بور کہانی دیکھی۔ اس کے بعد رنگ دیکھے جس میں مریم کے خان بازی لے گئیں تاہم ''را'' کے ساتھ موساد بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ احمد اقبال کی ہوم سویٹ ہوم کا مقصد سمجھ میں نہ آیا۔ سپر مین کاشف زبیر صاحب کی اچھی تخلیق تھی۔ جدید غلامی، چٹان، موت کا تعاقب اچھی کہانیاں تھیں۔ انکل یہ بتائیں کہ سائنس فکشن پر مبنی کہانیاں آج کل کچھ زیادہ نہیں ہورہی ہیں، اپنے جاسوسی میں؟''

سمعیہ سحر انصاری، فیصل آباد سے ''سرورق کے بائیں جانب ایک بار پھر اول آنے پر ثاقب تبسم دل جلانے والا تبسم بکھیر رہے تھے۔ فہرست نے ہماری آنکھوں کی معصوم پتلیوں کو چار سو گھما پھرا ڈالا۔ خطوط کی جانب بڑھنے سے پہلے جاسوسی، سسپنس اور آصف دلگداز کو بہت زیادہ سالگرہ کی مبارکباد اور انکل اب آپ نے مجھے وش کرنا ہے کیونکہ مابدولت تین جنوری کو اکیس سال کے ہوجائیں گی۔ ش صغیر ادیب کی وفات کا پڑھ کر اثر نعمانی کی یاد تازہ ہوگئی۔ گزرے سال کے آغاز و اختتام پر دو بہترین لکھاری ہم سے بچھڑ گئے۔ اللہ تعالیٰ ادیب صاحب مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے آمین۔ نومبر اور دسمبر کے شمارے ایک ساتھ لیے اس لیے صرف دیوی پڑھی۔ باقی انشاء اللہ عید کے روز پڑھوں گی؟ طاہر صاحب سمجھ نہیں آتا، آپ سے کیا کہا جائے۔ پہلے ڈولا پھر اجمل بعد میں دراج کو مار دیا، اب ایک دن ناصر اور رستم کو بھی اس انجام سے دوچار کردیں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہم آپ کے کرداروں سے انسانوں سے بڑھ کر پیار کرتے ہیں۔ ہمیں اس کا خوشگوار انجام چاہیے۔''

عصمت علی، مالم جبہ شینکڈ سوات سے لکھتے ہیں ''جاسوسی تین دسمبر کو ملا۔ سرورق پر ایک نگاہ ڈال کر فہرست میں جا پہنچے جہاں اپنے فیورٹ احمد اقبال کا نام دیکھ کر پہلی خوشی ہوئی کش لگا کے۔ دیوی میں رستم اینڈ کمپنی کے بحفاظت پولیس کے گھیرے سے نکلنے پر خوشی ہوئی کش لگا کے اور اینڈ میں ڈپٹی ریاض کو رستم کے شکنجے میں دیکھ کر مزید خوشی ہوئی کش لگا کے۔ شناخت حسبِ سابق بورنگ رہی۔ سرورق کے دونوں رنگ اچھے تھے۔ مختصر کہانیوں میں کاشف زبیر صاحب کی کہانی پسند آئی کش لگا کے۔ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ احمد اقبال صاحب کی ہوم سویٹ ہوم اس ماہ کا تحفہ خاص ثابت ہوئی جسے ہم نے مزے لے لے کر پڑھا کش پر کش لگا کے۔ باقی رسالہ ہم نے عید کے لیے بچا کر رکھا ہے کش لگا کے!''

اے جے کسانہ فرام ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا ''2008ء کا آخری شمارہ یکم دسمبر کو اس وقت ہاتھوں میں آیا جب ہم غروبِ آفتاب کے منظر کو حسرت

بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہماری زندگی اور قید کا ایک اور دن کم ہوگیا تو نہ جانے کیوں دل اداسیوں سے بھر گیا۔ ٹائٹل گرل اپنی ازلی رحم دلی کے باعث دو خون کے پیاسوں کو دیکھ کر پریشان ہورہی تھی۔ کاش ہماری صنف بھی صنفِ مخالف کی طرح صرف زبان سے لڑتی۔ لڑکی کا ہیئر اسٹائل اچھا لگا۔ ش۔ صغیر ادیب صاحب کی وفات نے اداسیوں میں کچھ اور اضافہ کردیا۔ اللہ پاک مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین۔ بھائی ثاقب تبسم نگینہ صاحب کو مبارکباد۔ انکل! آپ ہمارے خط کا جس نزاکت نفاست محبت خلوص اور رحم دلی سے آپریشن کرتے ہیں، ہمیں بہت اچھا لگتا ہے۔ بس اس محبت میں کمی نہیں آنی چاہیے۔ تھینک یو۔ دیوی، مغل صاحب! یہ اچانک آپ کو کیا ہوگیا۔ دراج، اجرالی، پولیس سب مار دیے اور اب ڈپٹی ریاض۔ لگتا ہے کسی نے سلسلے کی تیاریاں ہیں۔ شناخت، ہم ابھی تک اسے شناخت نہیں کرسکے۔ زرینہ بانو کی فیملی سے بہت الرجی ہوں۔ اپنے اور پرائے، مریم کے خان نے اچھی حقیقت بیان کی۔ جنونِ عشق، اوسط سے بھی کم درجے کی کہانی تھی۔ متاثر نہ کرسکی۔ ہوم سویٹ ہوم، ایف بی آئی نے اپنوں پہ اعتبار نہ کیا۔ اپنوں کو دکھ دیے... نے اسے عبرت کا نشان بنا دیا۔ دوسروں کی چوری کی گئی دولت پہ ہوم سویٹ ہوم تعمیر نہیں ہوتے۔''

کاشف سحر کی مبارکباد لاہور سے ''معراج انکل! آپ کو اور جاسوسی کے جملہ اسٹاف کو بکرا عید اور نیا سال مبارک ہو۔ یکم دسمبر کی ایک ڈھلتی ہوئی اور خوشگوار شام تھی۔ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا کہ ہمیں جاسوسی کا دیدار نصیب ہوا۔ ٹائٹل پر موجود حسینہ کو دیکھ کر حواس گم ہوگئے۔ چینی، نکتہ چینی کا ابتدائیہ پڑھ کر انکشاف ہوا کہ جاسوسی کا ہر شمارہ ایک جیسا یعنی خاص ہوتا ہے۔ انعامی تبصرہ پڑھتے ہوئے بھول کر شاید ہم کسی بکرا منڈی میں پہنچ گئے۔ ثاقب صاحب نے خط لکھتے ہوئے بکروں کی عادات و خصائل، خوبیوں اور خامیوں پر ایسی سیر حاصل بحث کی کہ انہیں جامعہ جاسوسی سے ایم اے بکریات (انعامی خط) کی ڈگری مل گئی۔ اب ذرا اسٹوریز سے دو ہاتھ ہوجائیں۔ ابتدائی صفحات پر ہمیشہ بیسٹ رائٹر اور بیسٹ اسٹوریز کی اجارہ داری ہوتی ہے۔ ہوم سویٹ ہوم جس میں احمد اقبال صاحب نے بڑے دلچسپ پیرائے میں ایک ایسے شخص کا احوال بیان کیا جس نے اپنی انا اور دولت کو خون کے رشتوں پر فوقیت دی اور مرتے وقت اس کی انا بھی مٹی میں مل گئی اور دولت بھی چھن گئی۔ اس کے بعد دیوی کی جانب بڑھے اور محبت اور قربانیوں کی بھول بھلیوں میں گم شانی کی داستانِ حیات کا مطالعہ کیا جو گزشتہ ایام کی طرح لہولہان نظر آئی۔ مغل صاحب دیوی کو 120 کی اسپیڈ سے دوڑا رہے ہیں۔ دیکھیے! موت کا فرشتہ کہیں چالان نہ کردے۔ اس قسط میں شانی اور رستم کے بچ نکلنے پر سکون حاصل ہوا۔ ویسے انکل! لگتا ہے اس کہانی کا اینڈ قریب ہے۔ دیوی کے بعد شناخت کی طرف جمپ لگایا اور وکی کے بگ باس سے جا ٹکرایا ویسے وجی کا وکی بننا کچھ پسند نہیں آیا۔ ایشلے نے اس قسط میں بھرپور کردار ادا کیا، پسند آیا۔ اس کے بعد ہنسنے کے لیے کاشف زبیر کے پاس پہنچ گئے۔ مائک کے ذہن میں کاسمک ریز کا جو تصور تھا وہ بہت مختلف نکلا اور انجام چونکا دینے والا تھا۔ آصف ملک کی لکھی جدید غلامی ایک متاثر کن تحریر تھی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب موت کے تعاقب کے ساتھ آئے اور قارئین کو مکمل خوف و ہراس میں پابند کردیا۔ بابر نعیم سزائے معافی لے کر آئے۔ مارک نے جو سزا جولیا اور فلیچر کے لیے تجویز کی، وہ ان کے لیے مناسب تھی۔ وارث شکیل ادریس کی لکھی ہوئی ایک بچکانا کہانی تھی۔ لہو کا سراغ مدیحہ شاہ کی تحریر بہت بور لگی۔ اب ذرا رنگوں میں نہانے کی تیاری کرتے ہیں۔ سرورق کے رنگوں میں مریم کے خان صاحبہ کی اپنے اور پرائے ترتیب کے ساتھ ساتھ معیار کے حساب سے بھی پہلے نمبر پر تھی، پل پل کروٹیں بدلتی موجودہ اسٹوری میں مصنفہ نے بڑے دلچسپ انداز میں اپنے اور پرائے کے فرق کو واضح کیا۔ دوسرے رنگ پر تو تبصرہ کیا ہی نہیں جاسکتا۔''

راشد مرتضیٰ، گلشن اقبال کالونی سے رقم طراز ہیں۔ ''جاسوسی ڈائجسٹ 3 تاریخ کو مل گیا۔ ٹائٹل دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ ایک نہایت خوب صورت لڑکی میری طرف امید بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ آؤ اور ان غنڈوں سے مجھے بچالو۔ لڑکی کی خوبصورت آنکھوں اور چمک دار ہونٹوں نے بہت متاثر کیا۔ ثاقب صاحب کو انعامی خط یعنی وننگ اسٹینڈ پر پایا تو جناب ہماری طرف سے ڈھیروں مبارکباد وصول کیجیے۔ اس کے علاوہ اے جے کسانہ، ٹریل ایس کے اسماعیل اور مسز حسن کے خطوط پسند آئے۔ ڈاکٹر تنویر عباس تابش، لبنیٰ کنول، ایمان ہما، ندا مغل جی اور کہسار کی ملکہ نورالہدیٰ کو اپنے ساتھ بلیک لسٹ میں دیکھ کر نہایت افسوس ہوا بلکہ دلی دکھ ہوا۔ اس کے علاوہ شجاع چوہدری، رفیل کنول ماہی، نوشی چوہدری، ہلال شاہ، رخ خان کو محفل میں نہ پاکر محفل پھیکی پھیکی سی لگی۔ مونا خان اور جبر ناعلی پلیز، پلیز، پلیز اب آپ آ بھی جائیں۔ کاجل، نکھمن، نسوار اور تڑکے کے بغیر محفل سونی سونی سی لگی۔ اب آتے ہیں جناب کہانیوں کی طرف۔ تو سب سے پہلے کاشف زبیر صاحب کی سپر مین پڑھی۔ اس بار بھی کہانی اچھی تھی۔ کاشف صاحب! شاہی اور تیمور واپس کب آرہے ہیں؟ اس کے بعد دل کی دھڑکن دیوی پر جا پہنچے۔ دیوی کی یہ قسط بھی خوب مار دھاڑ والی تھی۔ شروع سے آخر تک ایک ہی سانس میں پڑھ ڈالی یعنی بنا کسی رکاوٹ کے۔ ڈپٹی ریاض کے متعلق تو یہی کہوں گا کہ اب آیا نا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ مجتبیٰ صدیقی کی جنونِ عشق پڑھی اور مدہوش ہوگئے۔ نہایت اعلیٰ کہانی لکھی تھی۔ اس کے بعد مریم کے خان کی اپنے اور پرائے پڑھی، انہوں نے تو کمال کردیا۔ سب سے بہترین کہانی ان کی ہی تھی۔ مریم کے خان! کہیں آپ مریم کنگ خان تو نہیں ہیں؟ اس کے بعد احمد اقبال صاحب کی ہوم سویٹ ہوم پڑھی انہوں نے بھی اچھا لکھا۔ راؤ رشید خان کی شناخت بھی اب دھما کے کررہی ہے اور چھوٹی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔''

افتخار احمد چوہدری کی خیال آرائی سیالکوٹ سے ''سال کا آخری شمارہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ حسبِ روایت ہمارا محبوب شمارہ جاسوسی ڈائجسٹ ہمارے محبوب انکل کی زیرِ ادارت کامیابیوں اور کامرانیوں کے زینے طے کرتا رہا۔ دیگر اسٹاف کی ان تھک محنت اور قارئین کی کوششوں، کاوشوں اور پُرخلوص دعاؤں کی بدولت جاسوسی نے ہر جگہ اپنا لوہا منوایا ہے۔ انکل جی نہ چاہتے ہوئے دل پہ جبر کرتے ہوئے چند ماہ کا گیپ دینا پڑتا ہے۔ سو دو ماہ بعد تمام اہلِ محفل کو خلوص کی چاشنی سے مہکتا ہوا سلام، نیا سال اور جاسوسی کی سالگرہ مبارک ہو۔ جاسوسی کے رخِ زیبا پر نظر پڑی تو محترمہ کی آنکھوں میں ڈوبتے ڈوبتے یاد آیا کہ یہ تو مخالف صنف کا کام ہے سو جس کا کام اسی کو ساجھے۔ ذاکر انکل نے اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اس بار بھی سرورق کے خوفناک مناظر اپنی ہی صنف کے لیے مخصوص رکھے ہیں۔ ثاقب تبسم عرف بکرا صاحب کو G.30 کی سربراہی چوتھی بار بھی مبارک ہو... بمعہ ایک خیالی گلدستے کے۔ محترم کا چوتھی بار وننگ سیٹ پر قابض ہونا باقی صنفِ کرخت کی قلمی صلاحیتوں پر سوالیہ نشان ہے۔ میری بہت سی سویٹ فرینڈز اس دفعہ بلیک لسٹ کی سیر میں مصروف ہیں۔ انکل جی! آپ بھی آج کل میل شاؤنزم کا شکار ہورہے ہیں۔ 30 میں سے صرف 2 خواتین کے تبصرے، خدارا کچھ رحم کیجیے کہ اقبال فرما

گئے ہیں۔ وجود زن سے ہے کائنات میں رنگ۔ کہانیوں میں شناخت کی اٹھان غضب کی ہے، البتہ دیوی اپنی کشش کھوتی جارہی ہے۔ پتا نہیں کیوں آج کل پڑھنے میں مزہ نہیں آرہا۔ طویل انتظار کے بعد اپنے فیورٹ رائٹر احمد اقبال کی تحریر پڑھنے کو ملی۔ ہوم سویٹ ہوم ان لوگوں کا قصہ عبرت ہے جو کہ کانٹے بو کر پھولوں کی توقع رکھتے ہیں۔ رنگوں میں پہلا رنگ مریم کے خان کی اپنے اور پرائے جاسوسی کا جھومر ثابت ہوئی۔ مجتبیٰ صدیقی کی جنون عشق نارمل سی تحریر تھی۔ مختصر کہانیوں میں سائنس فکشن سپر مین، جدید غلامی، بے راہ رو اور چنان چھائی رہیں۔''

دلپسند سیال کی خوش بیانی لاہور سے ''چھ ماہ کی غیر حاضری کے بعد ایک مرتبہ پھر چینی نکتہ چینی میں حاضر ہوا ہوں تڑ کا لگا کے۔ امید ہے سب خیریت سے ہوں گے تڑ کا لگا کے۔ ان سب دوستوں کا شکریہ جنھوں نے اپنے تبصروں میں یاد رکھا۔ سب دوستوں کو نیا سال مبارک ہو تڑ کا لگا کے اور آپ سب لوگ مجھے ہپی برتھ ڈے کی مبارک باد دینا نہ بھولنا۔ یکم جنوری کو میں سالگرہ مناتا ہوں کیک کو تڑ کا لگا کے۔ 2008ء کا سال پاکستان کے لیے مختلف بحران کا سال ثابت ہوا اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ نیا سال پاکستان کے لیے خوش نصیبی کا سال ہو۔ آمین۔ چینی، نکتہ چینی کے کچھ تبصرہ نگار قارئین ہاتھ دھو کر اور کچھ بغیر ہاتھ دھوئے میرے تکیہ کلام ''تڑ کا لگا کے'' کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور وہ بھی بغیر تڑ کا لگائے ہیں جی۔ اپنے تکیہ کلام کی درگت بنتے دیکھ کر میں تڑ کا لگانا ہی بھول گیا۔ اب تو تکیہ کلام استعمال کرتے ہوئے مجھے لجا آرہی ہے۔ ہیں جی۔ حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ ہر دوسرا شخص کچھ نہ کچھ لگانے کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ سب سے پہلے جہانگیر اسلم گوندل نے میرے تکیہ کلام کی نقل کی۔ اس کے بعد اجمل خان، مکھن خان اور آگ خان وغیرہ آگئے تو اب دو نئے چوزے چوں چوں کرتے ہوئے آئے ہیں۔ جن میں ایک شکنجبین بیچنے والا شکر لگا رہا ہے اور دوسرا چرسی بابا چرس کے کش لگا رہا ہے۔ ہیں جی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے تڑ کا لگانے کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ اب تو لجا آرہی ہے، ہیں جی۔ تو کیا آپ لوگوں کو ایسی بھونڈی حرکت کرنے پر لجا نہیں آتی، ہیں جی۔ آپ سب لوگوں کے تبصرے کچھ لگانے کے بجائے بھی اچھے ہوتے ہیں۔ ہیں جی۔ اس مرتبہ وکٹری اسٹینڈ پر خلافِ معمول بکرے کی میں میں سنائی دی۔ ہیں جی۔ پتا چلا کہ یہ جناب ثاقب تبسم نگینہ صاحب ہیں جو کہ اس مرتبہ بکرا نہیں خرید سکے اور اب خود بکرے کی آواز نکال رہے ہیں تاکہ ہمسائے سمجھیں کہ گھر میں بکرا موجود ہے، ہیں جی۔ دیوی جاسوسی کی یادگار کہانیوں میں سے ایک ہے۔ اب لگتا ہے کہ کہانی کا اینڈ قریب ہے۔ اب ریاض بھی رستم سیال کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ اگلی قسط دھما کا خیز ہوگی۔ شناخت فی الحال بور لگ رہی ہے۔ آگے شاید چٹ پٹی ہو جائے۔ اول صفحات کی کہانی ہوم سویٹ ہوم ایک دلچسپ کہانی تھی۔ FBI کا انجام دکھی کر گیا۔ واقعی جوانا اور خود پرستی کا شکار ہوتے ہیں اور ان میں تھوڑی سی بھی لچک نہیں ہوتی تو وہ بھری دنیا میں تنہا رہ جاتے ہیں۔ ان کا انجام بہت ہی کسمپرسی میں ہوتا ہے۔ سرورق کے رنگوں میں پہلا رنگ اپنے اور پرائے، پاکستان کے موجودہ حالات اور خودکش دھماکوں کے پس منظر پر مبنی تھی۔ دوسرا رنگ، جنون عشق بہت تیز رفتار کہانی تھی۔ اس لیے زیادہ اچھی نہیں لگی۔ اس مرتبہ پورا شمارہ بھی زبردست تھا۔''

شان احمد گشکوری کی رائے محمد پور دیوان سے ''دسمبر کا جاسوسی ڈائجسٹ چھ تاریخ کو ملا۔ سرورق کی موصوفہ کچھ خاص نہیں۔ منہ یوں کھلا ہوا ہے جیسے دانتوں میں درد ہو خاتون کے۔ اگر خوبصورتی کے لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو جنوری، اگست، اکتوبر، فروری، مئی کے سرورق خوبصورت، مارچ، اپریل، ستمبر کے سرورق قدرے بہتر اور جون، جولائی، نومبر، دسمبر کے سرورق قبول صورت کہلانے کے حق دار ہیں۔ یہ تو تھی سال 2008ء کے جاسوسی ڈائجسٹ کے ٹائٹلز کے بارے میں میری رائے۔ دیگر لوگوں کی آرا کا انتظار رہے گا۔ خدا کرے اس نئے سال کے آغاز پر ہمارے ملک کے حالات اچھے ہو جائیں اور حکمرانوں کو اللہ تعالیٰ ملک کے بہترین مفاد میں فیصلے کرنے کی توفیق عطا کرے۔ جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز اور تمام قارئین کو نیا سال مبارک اور ڈھیروں دعائیں میری طرف سے۔ اس بار خلافِ معمول چینی، نکتہ چینی کے بجائے پہلے کہانیوں پر تبصرہ ہو جائے۔ آغاز سرورق کے رنگوں سے۔ اپنے اور پرائے مریم کے خان نے کیا کہانی لکھی ہے۔ کمال کی تحریر ہے۔ موجودہ حالات کے عین مطابق بغیر فرضی واقعات کے۔ ایسی تحریروں کو ہر ماہ ضرور شائع ہونا چاہیے۔ کاشف زبیر، اسما قادری اور مریم کے خان ان حقائق کو عوام کے سامنے لانے پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو۔ مجتبیٰ صدیقی کی جنون عشق ٹھیک ہی رہی۔ اپنے اور پرائے کو پڑھنے کے بعد جو اثر ہوا، اس کے بعد ایسا ہی ہوتا تھا۔ ابتدائی صفحات پر احمد اقبال کی تحریر ہوم سویٹ ہوم مغربی اور مشرقی ادب کا عجیب امتزاج لگی۔ احمد اقبال جس طرح آسانی سے تلخ حقائق کو بیان کرتے ہیں، ان کو پڑھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔ اس مرتبہ مختصر کہانیوں لیکن وہ اتنی بھی مختصر نہیں ہیں کہ تعداد زیادہ ہے۔ ان میں سے میں دو ہی پڑھ سکا ہوں۔ کاشف زبیر کی سپر مین مجھے تو کوئی خاص نہیں لگی۔ آصف ملک کی جدید غلامی میں امریکیوں کے فائدے کی بات کی گئی ہے۔''

لبنیٰ کنول ڈھڈیال، ضلع چکوال سے لکھتی ہیں ''3 تاریخ کو بخار کی حالت میں جاسوسی سے ملاقات ہوئی۔ ٹائٹل پر سب سے پہلے عید مبارک پر نظر پڑی۔ ٹائٹل کی کیا تعریف کروں محفل کے مرد حضرات کافی ہیں۔ سب کو نیا سال مبارک ہو۔ جاسوسی کو سالگرہ مبارک ہو۔ اب مجھے مبارک باد پیش کریں کیونکہ 20 جنوری کو میری سالگرہ ہے۔ چینی، نکتہ چینی میں قدم رکھا۔ یہ کیا انکل! آپ نے مجھے دروازے پہ روک دیا۔ کوئی بات نہیں۔ کے ٹو کے پاس آگئی ہوں تو اس کو سر بھی کر لوں گی۔ ثاقب صاحب کو چوٹی پہ کھڑا پایا، مبارک باد پیش قبول فرمائیں۔ سب کے تبصرے اچھے تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے دیوی کے درشن کیے۔ طاہر انکل نے خوش کر دیا۔ واہ، کیا قربانی کا بکرا رستم کے ہاتھ آیا۔ آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔ اب رستم ہٹلر کو حلال کر ہی دے۔ پھر شناخت پڑھی۔ زبردست رہی۔ دائی ماں وجی کے لیے کوئی مشکل نہیں پیدا کرے گی۔ رنگوں میں پہلے جنون عشق پڑھی، بس اچھی تھی۔ پھر اپنے اور پرائے پڑھی جو سب کہانیوں سے زیادہ پسند آئی۔ اس کے بعد ہوم سویٹ ہوم پڑھی۔ انسان دوسروں کے ساتھ برا کرتا ہے تو اس کے ساتھ بھی برا ہوتا ہے۔ چھوٹی کہانیوں میں پہلے بے راہ رو پڑھی۔ پھر وہ رات پڑھی۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ آخر میں نیا سال آپ سب کے لیے بہت ساری خوشیاں اور تھوڑے سے غم لے کر آئے کیونکہ دونوں کا رشتہ بہن بھائی کا جو ہے۔''

زیرو زیرو زیڈ اینڈ فیضی، لاہور سے لکھتے ہیں ''خلافِ توقع خلافِ معمول، خلافِ عادت 2 تاریخ کو لختِ جگر نے جگر پاش انداز میں انٹری ماری۔ دل آویز، دلنشین، دل نگار، رنگوں سے گندھا ہوا سرورق خاص تاثر چھوڑتا چلا گیا۔ ٹائٹل پر ثاقب تبسم جیسی پرسنالٹی کے حامل شخص براجمان تھے۔ حسینہ سرورق کی زلفوں کو الجھی ڈوریوں سے تشبیہ کرنا چاہیے۔ کہانیوں میں ہوم سویٹ ہوم آج کے معاشرے کی عکاسی کرتی ہے۔ ہم سب جانتے بوجھتے بھی انجان بنے

بیٹھے ہیں۔ یہ معاشرہ بے حس ہو گیا ہے۔ دیوی میں رستم اور شانی کے ملاپ سے کہانی اختتام کی جانب بڑھ رہی ہے۔ اپنے اور پرائے موجودہ دور کی سیاست کو واضح کرتی تحریر ہے۔ امریکا پس پردہ کیا کیا کر رہا ہے، ہر شخص جانتا ہے۔ جنونِ عشق ایک خاص قبیلے کے حالات کو بیان کر رہی ہے جو طاقت کے نشے میں چور ہر چیز کو اپنی ملکیت سمجھتے ہیں۔''

ڈاکٹر نعیم اکبر سحر، مانسہرہ سے لکھتے ہیں ''ذاکر چاچو نے ہمارے خوابوں میں راج بسیرا کرتی حسینہ کو اسکین کر کے بعینہ سرورق پر منتقل کر دیا۔ کبھی کبھی [illegible] داں کو کچھ کچھ ہونے لگتا ہے۔ فہرست جاسوسی کے عین مزاج کے مطابق ہے۔ اتنی خوبصورت فہرست کا نئی عرصے بعد دیکھنے کو [illegible] راست اترے چینی، نکتہ چینی میں جہاں ثاقب تبسم نگینہ اول نمبر پر براجمان، ہمارے قارئین سے مبارکاں وصول کرنے کے لیے موجود تھے۔ ثاقب! [illegible] ہو۔ بکروں کی خصوصیات۔ عادات، اقسام حتیٰ کے بکروں کے جذبات کو بہت ہی دلچسپ انداز میں پیش کیا۔ مجھے ثاقب کی اس بکرانہ تحریر سے اندازہ [illegible] ہمارے دوست نے بکریالوجی میں PHD کیا ہوا ہے۔ گولیوں کی بوچھاڑ اور دوستوں کی زندگی کے ٹوٹتے تار اور موت سے جڑتے رشتے اعلان کر رہے ہیں کہ عنقریب دیوی الوداع ہونے والی ہے۔ دیوی کی جدائی ہمارے لیے بھی بہت مشکل مرحلہ ہے۔ انکل ذاکر کے بڑے بھائی مرحوم ظفر حسن کی رحلت اور ہمارے محبوب لکھاری ش صغیر ادیب کی جدائی ایسے سانحات ہیں کہ جن سے کوئی مفر نہیں۔ میں مرحومین کے لواحقین کے غم میں برابر کا شریک ہوں اور دعا گو ہوں۔ ہوم سویٹ ہوم احمد اقبال کا ایسا شاہکار ہے جو ہمیں احساس دلاتا ہے کہ واقعی جو بویا ہے وہ کاٹنا پڑے گا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی دیوی ایک ایسی لازوال تحریر ہے جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہمیشہ خیالات منتشر کر رہ جاتے ہیں۔ راؤ رشید خان کی شناخت میں فی الحال الجھاؤ کافی زیادہ ہیں۔ چند ایک اقساط کے بعد مطلع صاف ہو جائے گا تو تبصرہ کر سکوں گا۔ بقیہ رسالہ بھی چاٹ چکا ہوں۔ پہلا رنگ بہت پسند آیا۔ عالمی تناظر میں سیاست کی شطرنج کی بساط بچھا کر عالمی کھلاڑی اپنی پسند کے مہروں کے ساتھ اپنی ہی پسند کا کھیل کھیلتے ہیں۔ اپنی پسند کے نتائج اخذ کرتے ہیں۔''

سیف اللہ خان کا خط کوئٹہ سے ''دسمبر کی یخ بستہ ہواؤں میں جاسوسی کی آمد گرم ہوا کے جھونکوں کی طرح محسوس ہوئی۔ سرورق پر ایک خستہ حال ہیرو، پرانی روسی ساختہ رائفل لے کر شاید اوپر بلخ کی طرح ہنستے ہوئے صاحب کا نشانہ لے رہے تھے۔ جبکہ اداکارہ پریانکا سے ملتی جلتی ٹائٹل گرل ہونٹ نیم وا کیے، بڑی محویت سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس طرح کے دیکھنے کو نظرانداز کر کے ہم نے محفلِ غریباں میں ڈیرے ڈال دیے۔ پہلی مڈبھیڑ ثاقب تبسم سے ہوئی جو بکرا منڈی لگائے نظر آئے۔ حسب دستور ہماری طرف سے اس کی مبارک باد قبول کیجیے۔ ابتدائی صفحات پر احمد اقبال کے مخصوص تیکھے پن کے ساتھ ہوم سویٹ ہوم موجود تھی۔ واقعی پتھر برسا کر پھولوں کی امید رکھنا حماقت ہے۔ کہانی کا سطر سطر ہمارے معاشرے کی حالت کی غمازی کر رہا تھا۔ جاسوسی میں سائنس فکشن کہانیوں کا سلسلہ خوش آئند ہے۔ کاشف زبیر کی سپر مین اور آصف ملک کی جدید غلامی اس سلسلے کی اچھی تحریریں تھیں۔ عبدالرب بھٹی صاحب نے اس بار مسریات پر طبع آزمائی کی تھی۔ لہو کا سراغ ایک پیچیدہ قتل کی واردات کا احاطہ کرتی ہوئی، روایتی کہانی تھی۔ نئی نویلی کہانی شناخت آہستہ آہستہ ہمیں اپنے سحر میں گرفتار کر رہی ہے۔ اگر راؤ رشید صاحب اس میں ایکشن اور تھرل کی آمیزش کچھ زیادہ کر دیں تو کہانی کو مزید چار چاند لگیں گے۔ دیوی شاید اب اختتام کے قریب ہے کیونکہ ڈپی ریاض، رستم اور شانی کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ ویسے مغل صاحب کی یہ تحریر مدتوں ہمیں یاد رہے گی۔ سرورق کا پہلا رنگ اپنے اور پرائے بھارتی عزائم کو چاک کرتی ہوئی داستان تھی۔ نہ جانے کیوں وہاں جب پٹاخہ بھی پھٹتا ہے تو سارا الزام پاکستان کے سر تھوپ دیا جاتا ہے لیکن قبائلی علاقوں میں نہ جانے کیوں بھارت کے کردار پر حکومت خاموش نظر آرہی ہے۔ آخر میں ش صغیر ادیب کے لیے دعا گو ہوں۔ اللہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!''

عبدالعزیز خان ممکوئی کا نامہ ضلع میانوالی سے ''سال 2008ء کا آخری شمارہ موسم سرما کی پہلی بارش میں بھیگتے ہوئے مبلغ چالیس روپے میں دستیاب ہوا۔ اگلا سال 2009ء سب دوستوں کے لیے خوشیوں و کامرانیوں کا سورج لے کر طلوع ہو۔ آمین۔ جاسوسی اور سسپنس ڈائجسٹ کے جنوری کے شمارے کے ساتھ ہی اڑتیس سال مسلسل اشاعت کے مکمل ہو جائیں گے۔ جو آپ اور جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کامیابی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اللہ کرے جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز دن دگنی، رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین۔ 15 جنوری کو میری اٹھارویں سالگرہ ہے۔ امید ہے تمام دوست ہپی برتھ ڈے ضرور کہیں گے۔ انکل! آپ بھی کہہ دیں نا (ہپی برتھ ڈے) دسمبر 2008ء کا جاسوسی میرے سامنے میز پر پڑا ہے اور سفید ورق رنگین ہوتا جا رہا ہے۔ اس دفعہ سرورق کے انداز ہی کچھ نرالے تھے۔ ٹائٹل گرل بڑی خوبصورت نظر آرہی تھی۔ حسینہ کی نشیلی آنکھوں میں ڈوبے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے، ادھر ڈوبے ادھر نکلے کے مصداق نکلے اور اشتہارات کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے سیدھے چینی دان میں جا پہنچے۔ جہاں مسندِ صدارت پر ثاقب تبسم نگینہ صاحب انگوٹھی میں فٹ نگینے کی طرح جھلملا رہے تھے اور سب کو بکروں سے تشبیہ دے رہے تھے۔ تبصرہ بہت اچھا تھا۔ سال کے آخری ونر ہونے کے لیے مبارکباد۔ اس دفعہ ان ساتھیوں کے تبصرے اچھے تھے۔ عابد بنگش، جہانگیر اسلم گوندل، محمد آصف دلگداز، ابن مقبول جاوید احمد صدیقی، نوبی اے، ملک آصف علی اعوان، وغیرہ۔ محمد عاصم بنیامین رنگپوری صاحب، پہلی بار جاسوسی میں قدم رکھنے پر خوش آمدید، ویلکم، اھلاً وسھلاً مرحبا، بخیر راغلے۔ ابتدائی صفحات میں احمد اقبال کی تحریر ہوم سویٹ ہوم پڑھی۔ کہانی کی تصویر دیکھی تو یہ احساس ہوا کہ یہ تصویر پہلے بھی کہیں دیکھی ہے۔ اسی تصویر کو دیکھنے کے لیے اسٹاک میں موجود رسالہ سسپنس جو ستمبر 99ء کا تھا۔ اس کے آخری صفحات میں علیم الحق حقی صاحب کی تحریر دادا، چوزی اور موذی کی تصویر تھی۔ ہوم سویٹ ہوم اچھی تحریر تھی۔ اس کے مطالعے کے بعد اپنی من پسند کہانی دیوی پڑھی۔ رستم کافی عرصے بعد جوش میں دکھائی دے رہا ہے۔ رستم اور شانی کا شکریہ کہ وہ ہمارے ضلع میں آئے۔ میانوالی میں۔

یہ ہیں ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے نامے شامل نہ ہو سکے۔

ڈاکٹر تنویر عباس تابش، تحصیل وضلع ڈیرہ غازی خان۔ ایم فرحان، کوہاٹ۔ انجم فاروق، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔ نگینہ ایمان گل سیال، خانیوال۔ سردار ظفر اقبال وڑائچ، تحصیل کبیر والہ، ضلع خانیوال۔ محمد ضیاء الرحمن بھٹی، ڈایا ہزانوالی، ضلع منڈی بہاالدین۔ ندا مغل جی، مرغزار کالونی، گجرات۔ مصدق محمود دانش، گاؤں کنگ سہالی، تحصیل وضلع گجرات۔ شکیل محمود چیمہ، ملتان۔ یمنیٰ عزیز، خانیوال۔ اطہر قریشی، حیدرآباد سندھ۔ نعیم مشتاق، گوجرانوالہ۔ پرویز فیروز، گلگت۔ ثمر بہار، بہاولپور۔ منظر کیانی، راولپنڈی۔ عبدالعلیم غازی، پارہ چنار۔

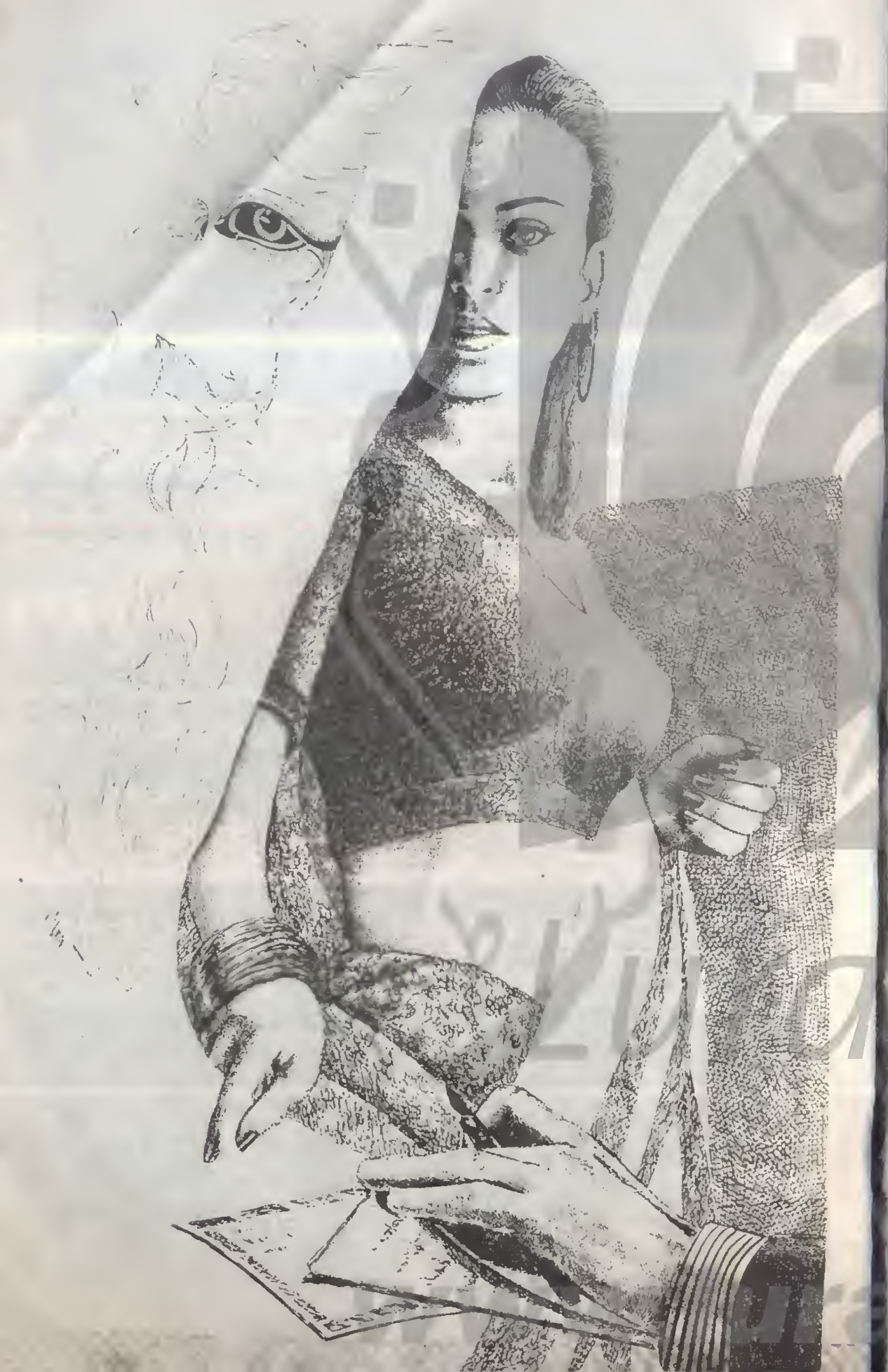

غیرت

ناصر ملک

ایک بے غیرت کی داستان اس کے نزدیک بے محبت ہونا زیادہ بڑا عیب تھا سو اس نے اپنی زندگی اسی اصول کے مطابق گزاری اسے اپنی جوان بیوی کی طلب کی گہرائیوں کا خوب اندازہ تھا اورساتھ ہی اپنی کوتاہ دستی کا بھی ! دوسری طرف بیوی اپنے مقدر پر پوری شاکر تھی اور اپنے شوہر پر قانع. مگر بھوسے کے محافظ جب خود ہی چنگاریوں کو ہوا دینے لگیں تو شعلے بلند ہونے سے کون روک سکتا ہے !

دو کشتیوں میں پیر رکھنے والا پاگل ہو نہ ہو، نفسیاتی مریض ضرور بن جاتا ہے۔ ایک کشتی پرانی طرز کے چپوؤں پر چلنے والی ہو اور ہر آن اُس کے ڈوب جانے کا خطرہ دل کو دہلاتا رہتا ہو... دوسری طرف جدید طرز کی موٹر بوٹ ہو، بٹن دبانے پر اسٹارٹ ہو کر پانی پر کسی دوشیزہ کی طرح نخرے سے پھسل پھسل کر چلتی ہو تو جلتی پر تیل کا کام کر جاتی ہے۔ اجمل بھی ایسی ہی دو کشتیوں پر سوار ہو کر بپھرے ہوئے دریا کو پار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہر صبح سائیکل پر سوار ہو کر شہر کے پُر رونق اور جدید رہائشی علاقے میں واقع سردار رب نواز کی کوٹھی کے پورچ میں پہنچتا، سائیکل ایک خاموش گوشے میں دیوار کے ساتھ کھڑی کرتا اور کپڑے بدلنے کے لیے سرونٹ کوارٹر کی طرف چلا جاتا۔ کوارٹر سے نکلتا تو اُس کی جون بدلی ہوتی۔ عام استعمال کے لباس کی جگہ ڈرائیوروں والا سفید اُجلا لباس دن پوچھے اُس کی اوقات ہر ایک پر ظاہر کرنے لگتا۔ ایسے میں اُس کی شخصیت بھی دو کشتیوں پر سوار دکھائی دیتی۔ چہرہ اُسے آسودہ حال ظاہر کرتا، لباس اُسے غریب زادہ قرار دیتا۔

گاڑی پرتا کی پھیرتا۔ گاڑی کا بونٹ چمک جاتا، اُس کا اپنا بونٹ میلا ہو جاتا۔ گاڑی ریورس کرتا اور موڑ کر لان کے بڑے بڑے گملوں کے متوازی کھڑی کر کے ہارن بجانے لگتا۔ سردار رب نواز کی نو دس سالہ بیٹی سیڑھیاں اُتر کر گاڑی میں شاہانہ تمکنت سے آ بیٹھتی۔ وہ اپنے بیٹے کی ہم عمر بچی کی تعظیم کرنے پر مجبور تھا۔ گوری چٹی، نازک اندام اور سنجیدہ مزاج عقیدت پر اُسے بے حد پیار آتا۔ جی چاہتا کہ اُس کے پُر گداز نرم نرم گالوں کا بوسہ لے کر اپنی روح کو تسکین پہنچائے مگر جرأت نہ ہوتی۔ مبادا کہ پدرانہ محبت میں لیا گیا ایک بوسہ اُسے بے عزت کر کے یہاں سے نکلوا دے اور وہ ان چند نگوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے، جن پر اُس کا مہینا گزرتا تھا، سائیکل چلتی تھی۔ سائیکل کے پہیوں کی طرح اُس کی زندگی بھی ایک ہی ڈھرے پر تیز گام بنی رہتی تھی۔

وہ عقیدت کو اسکول پہنچا کر کوٹھی پہنچتا۔ سردار رب نواز کے حکم کا منتظر رہتا۔ جو حکم ملتا، بجالاتا پھر وہیں آن کھڑا ہوتا۔ دن میں ایک مرتبہ بوڑھے مالک کی جوان مالکن کو لے کر بازار جانا پڑتا اور اُسے شاپنگ کروانا پڑتی۔ وہ غصے میں ہوتی تو بے دریغ شاپنگ کر ڈالتی۔ اچھے موڈ میں ہوتی تو ستاروں والے کسی ہوٹل میں بیٹھ کر آئس کریم کھاتی اور خالی ہاتھ گھر لوٹ آتی۔ زور سے کھینچ کر دو چار سانسیں لے کر تھک جانے والا اُس کا بوڑھا شوہر اُس کی ناز برداریاں اُٹھاتے اُٹھاتے

نہیں تھکتا تھا۔ وصال رات کے کسی پہر میں جوانی کی مرمریں کلائی پر اُس کی گرفت کانپ جاتی تو اپنی کمزوری پر دولت کے قوت بخش ٹانک انڈیلنے لگتا۔ پچھلے پہر میں سمجھ آتی کہ چولہے میں ایندھن ختم ہو جائے تو زور زور سے پھونکیں مارنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ عشرت بیگم نے شاید ان تمام باتوں پر غور و خوض کرنے کے بعد اُس کی بیوی بننے کا فیصلہ کیا تھا ورنہ دونوں کے درمیان شادی کا بندھن نہایت غیر فطری اور از حد مضحکہ خیز تھا۔ آگ کا تپتا چولہا اور خنک رات میں کھلے صحن میں پڑے ہوئے گھڑے کے پانی کے مابین اتصال کیسا؟ آگ بجھ جاتی ہے یا گھڑا ٹوٹ جاتا ہے۔

سردار رب نواز کی پُر تعیش اور نہایت آرام دہ کوٹھی میں نہ تو کبھی گھڑا ٹوٹا تھا اور نہ ہی چولہا بجھا تھا۔ عقیدت سردار کی پہلی بیوی کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ اتنی ہی پیاری اور محبت سے بھرپور تھی جتنی اُسے اس عمر میں ہونا چاہیے تھا۔ اُس نے عشرت بیگم کو بھی سوتیلی ماں کے طور پر نہیں لیا تھا بلکہ گلے میں بانہیں ڈال کر لاڈ سے کہتی۔ ''ماما! میں کتنی خوش بخت ہوں۔ اپنے کمرے میں جاتی ہوں تو ماں بیڈ پر بیٹھ کر مسکراتے لبوں سے لوریاں سناتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے زمانے کی نظروں میں اَبدی نیند سونے والی میرے کمرے میں ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ ایک ماں کی نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہوں تو دوسری ماں مجھے بانہوں میں بھر کر پیار کرنے لگتی ہے۔ ایک ماں کا نعم البدل دوسری ماں ہو سکتی ہے۔ میرے پاس ماں بھی ہے، ماں کا نعم البدل بھی ہے۔ ہائے! کوئی دنیا میں میرے جیسا نہیں ہے۔''

عشرت بیگم تمام رات بڑھاپے کی ٹھنڈی ٹھار بے گداز چادر اوڑھے کروٹ پر کروٹ بدلتی رہتی مگر دونوں جانب غروب کی تیرگی دکھائی دیتی۔ اُس کی ذات کے مشرق میں طلوعِ سحر کی شفق کبھی پھوٹ نہ پائی۔ جسم اکڑ جاتا تھا۔ ایسے میں عقیدت کا نرم، پُر گداز اور زندگی کی حرارت سے بھرپور جسم اُسے نکور دینے لگتا۔ وہ بچپنے کی چادر اوڑھ لیتی۔ جوانی میں نہ تو کھٹارا گاڑی مزہ دیتی ہے اور نہ ہی بے بی سائیکل پر سفر طے ہوتا ہے۔ جوانی موٹر سائیکل مانگتی ہے۔ کھلے آسمان تلے، تازہ فضا میں، لہراتے بل کھاتے، شور مچاتے سفر طے کرنا چاہتی ہے۔ اُس کی بدقسمتی تھی کہ اتنی بڑی کوٹھی میں اُس کے لیے ہر چیز تھی... موٹر بائیک نہیں تھی۔

اس سوسائٹی میں صبر و رضا کو دقیانوسی خیال کیا جاتا تھا۔ چھین لینے کو طاقت اور خرید لینے کو رواج کا نام دیا جاتا تھا۔ وہ مخلوط پارٹیوں میں اپنی دوستوں کے ساتھ یا دوستوں کے پاس بیٹھ رہتی تھی مگر تاریخ بدلنے سے پہلے اپنے بوڑھے نشیمن میں لوٹ آتی۔ رنگ برنگ سجے ہوئے آراستہ لان میں ٹہلتی مگر رقص نہیں کرتی تھی۔ پوری رغبت سے کھاتی مگر پینے کے شغل سے کنی کترا کر نکل جاتی۔ ہر ایک سے ملتی مگر بانہیں کھول کر نہیں بلکہ مسکرا کر دو ہاتھ کا فاصلہ حائل کر لیتی۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے، وہ بھی تشنہ آرزوؤں کی کڑی دھوپ میں جلتی رہتی تھی مگر کسی کو دیکھ کر نہ تو جلتی تھی اور نہ کڑھتی تھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کسی نے نظر کے آتشی عدسے سے اُس کے تن بدن میں آگ بھڑکا دی ہو۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ خوبصورت نہیں تھی یا دُنیا سے بے زار رہتی تھی۔ وہ آنکھوں سے گھس کر دل کے خرمن میں آگ بھڑکانے والا حُسن رکھتی تھی۔ ڈائٹنگ اور سلمنگ کے عذاب سے گزرے بغیر اُس کا بدن دیکھنے والے کو عذاب میں ڈال دیتا تھا۔ تیس میں بہ مشکل بیس بائیس کی دکھائی دیتی تھی۔ مرد تو مرد ہے، اُس کی ہم عمر اور ڈھلکے گلوں والی میک اَپ زدہ خواتین بھی اُس کی پُر جان شخصیت کو دیکھ کر رشک کرتی تھیں اور گاہے بہ گاہے اپنی پسندیدگی کا اظہار بھی کرتی رہتی تھیں۔ ایک معروف این جی او کے نیٹ ورک کو کامیابی سے سنبھالنے والی مسز رعنا نے بھری محفل میں کہہ دیا تھا۔ ''عشرت! تیری آنکھوں کے عشرت کدے سے جتنی صراحیاں بھر لی جائیں، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یوں لگتا ہے کہ ان آنکھوں کی مستی کے دیوانے ہزاروں میں نہیں، لاکھوں میں ہیں۔ تم کب تک اُجڑے ہوئے مے کدے میں مُردوں پر ساقی گری کرتی رہو گی؟''

طنز نے روح میں دور تک گھاؤ لگا دیا تھا مگر وہ اپنے جذبات کو آنکھوں کے پیچھے، زبان کے تلے چھپا لینے پر نہ صرف قدرت رکھتی تھی بلکہ عادی بھی تھی۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ''مسز رعنا! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں بڑی مطمئن اور آسودہ زندگی بسر کر رہی ہوں۔''

مسز رعنا نے نفیس شیشے کا گلاس نما بلوریں پیالہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ جام نہیں، جان ہے۔ جان ہے تو جہان ہے۔ لو پیو، پینے سے آدمی سچ بولنے لگتا ہے!''

وہ حسبِ عادت مسکرا کر پلٹ گئی۔ دور جا کر مسز شبانہ واسطی کے پاس کھڑی ہو گئی۔ گردن موڑ کر مسز رعنا سے مخاطب ہوئی۔ ''واقعی آپ میں جان بھی ہے، جہان بھی ہے

نصف مسلمان

ممتاز انگریزی مصنف آئن اسٹیفن خاصے پاکستانی واقع ہوئے ہیں۔ انہیں پاکستانی لینڈ اسکیپ' کھانوں' رسم و رواج اور یہاں کے عوام سے بے پناہ محبت ہے۔ چنانچہ ان کی تحریر کردہ کتابوں میں ان کا یہ جذبہ ہمیں جگہ جگہ ملتا ہے۔

وہ پاکستان کے معاملے میں بقول ان کے قدرے ''جانب دار'' تھے۔ حکومت نے بھی ان کی تصانیف کو سراہا اور نوازا تھا۔ کچھ عرصہ پیشتر ان کی وفات ہو گئی۔ آئن اسٹیفن پاکستانیوں کی دیگر خصوصیات کے علاوہ ان کی پرسنل ہائجین یا ذاتی صفائی کے بے حد معترف تھے۔ ایک کتاب میں انہوں نے لاہور کی میاں میر نہر کے کنارے طلوع آفتاب کے وقت بیٹھے ایک مزدور کے بارے میں لکھا ہے کہ پہلے تو بوڑھے مزدور نے بڑے اہتمام سے نہر کے ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں لگا لگا کر غسل کیا پھر مسواک سے دانت صاف کیے' بالوں میں تیل لگایا' کنگھی کی اور پھر اپنے پرانے میلے کچیلے کپڑے پہن کر رزق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ان کا کہنا ہے کہ بڑے بڑے امیر کبیر لارڈ وغیرہ یورپ میں یوں اپنے جسم کو ہفتوں پانی سے ''آلودہ'' نہیں کرتے۔ لیکن پاکستان میں امیر غریب بھی صبح سویرے غسل کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ پاکستانیوں کی ذاتی صفائی کا تو میں بھی قائل ہوں کیونکہ صفائی ہمارا نصف ایمان ہے لیکن ہماری صفائی ہماری ذات سے شروع ہو کر اپنی ذات پر ختم ہو جاتی ہے مگر بازاروں' گلی محلوں بلکہ اپنے گھر میں کچرا اور گند ڈالنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور اس میں ہمیں کمال حاصل ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کی کتاب ''الو ہمارے بھائی ہیں'' سے اقتباس

مرسلہ: محمد صدیق عباسی

اور آپ پی کر سچ بھی بولنے لگتی ہیں۔''

پھر دل میں بولی۔ ''پانی ٹھنڈا ہوتا ہے مگر جان اور جہان کو ملانے والا پانی ٹھنڈا ہرگز نہیں ہوتا۔ مجھ پر اُترنے والی رات کا تقاضا ہے کہ میں ٹھنڈے پانی پر گزارہ کروں۔ گرم پیوں گی تو ہونٹ جل اُٹھیں گے۔ حلق سے سینے تک انگارے بھر جائیں گے۔ ایسی حالت میں فائر بریگیڈ کی طلب انسان کو چیخنے چلانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ میں مدد نہیں، خاموشی چاہتی ہوں۔''

شبانہ واسطی نے پیار سے کہنی چبھوئی۔ ''وہ بوڑھی کیا نصیحتیں کرتی ہے؟''

اُس نے چونک کر شبانہ واسطی کی طرف دیکھا اور حیران ہوئی۔ ایک بطخ دوسری بطخ کو گیلی مٹی میں چونچ گدگدانے کا طعنہ دے رہی تھی۔ مسز رعنا اور مسز شبانہ دونوں ہم عمر تھیں۔ دیکھنے میں بھی ہم عمر لگتی تھیں۔ وہ بولی۔ ''آپ کی تعریف کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ مسز شبانہ ابھی بھی دیکھنے میں جوان نظر آتی ہیں۔''

اُسے اعتبار نہیں آیا۔ نظروں ہی نظروں میں چند لمحے تک اُس کے سچ کو جانچتی رہی پھر اُس کی سنجیدگی پر اعتبار کر کے مسکرانے لگی۔ ''دیکھنے میں کیا، میں تو ویسے بھی جوان ہوں کیونکہ میں خود پر توجہ دینے کی عادی رہی ہوں۔''

گیارہ بجے کے قریب پارٹی کی رونق مچل کر دوسری سمت میں لڑھکنے لگی تو وہ میزبان سے اجازت لے کر کے باہر آ گئی۔ ڈرائیور گاڑی کی ڈکی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا جماہیاں لے رہا تھا۔ قریب آ کر بولی۔ ''سوری اجمل! مجھے پھر دیر ہو گئی۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ رات کو بڑے محتاط انداز میں گاڑی چلاتا تھا۔ وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی۔ ''میں خاصی تھک چکی ہوں۔ چاہتی ہوں کہ فوراً بیڈ پر جا کر گر جاؤں۔ کیا تم گاڑی تیز نہیں چلا سکتے؟''

وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ ''سامنے سے آنے والی گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہیں۔ ایسے میں تیز چلاؤں گا تو نقصان ہو سکتا ہے۔''

وہ خاموش ہو گئی اور آنکھیں موند کر نیم دراز ہو گئی۔

اجمل اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کیے بیٹھا دل ہی دل میں اُسے کوس رہا تھا۔ ''اگر جلدی تھی تو پارٹی کو جلد خیرباد کہہ دیتیں۔ آپ کو بیڈ روم میں پہنچا کر میں نے سائیکل پر گھر پہنچنا ہے۔ میری بیوی میرے بچے کو سُلا کر میرے انتظار میں جاگنے کا عذاب جھیل رہی ہو گی۔ اکیلے میں ڈر رہی ہو گی۔ مجھے آپ سے کہیں زیادہ جلدی ہے مگر ٹریفک والے کہتے ہیں کہ کبھی نہ پہنچنے سے دیر سے پہنچنا کہیں بہتر ہوتا ہے۔''

www.urdutech.com

وہ دونوں لگ بھگ ہم عمر تھے۔ ہم پلہ ہوتے تو شاید بات بن جاتی۔ اجمل نے بیک مرر میں آنکھیں موندے نیم دراز عشرت بیگم کو دیکھا۔ دل میں خیال آیا۔ 'اگر درخت کے پتوں کی چمک دمک دیکھ کر خوش رہا جائے اور اُسے باقاعدگی سے پانی نہ دیا جائے تو اُس کی جڑیں سوکھ جاتی ہیں۔ پیڑ کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ یہ کیسا پیڑ ہے جو برسوں سے تشنہ ہے۔ نہ سوکھتا ہے، نہ کھوکھلا ہوتا ہے۔ کہیں اِس پر کوئی مالی مہربان تو نہیں ہو گیا جو آنکھ بچا کر آتا ہو اور جڑیں سیراب کر کے منہ چھپا کر چلا جاتا ہو؟'

پورچ میں گاڑی رکی تو وہ خود کو سمیٹ کر نڈھال قدموں سے اپنے منتظر کے پاس جانے لگی۔ فرسٹ فلور پر واقع بیڈ روم کی نیلی جذبات انگیز روشنی کھڑکی سے باہر جھانک کر اُسے اپنی جانب بلا رہی تھی۔ اجمل نے گاڑی لاک کی اور چابی چوکیدار کی ہتھیلی پر رکھ کر اپنی سائیکل کو ہینڈل سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔ گدی پر ہاتھ مار کر نہ دکھائی دینے والی گرد کو عادتاً جھاڑتے ہوئے چوکیدار سے مخاطب ہوا۔ ''لے بھئی ظفر اقبال! ہم نے ڈیڑھ دن کی ڈیوٹی ختم کر لی اور صبح دم حاضر ہونے کے لیے رخصت ہونے لگے ہیں۔''

چوکیدار مسکرا کر گیٹ کی طرف بڑھا۔ اجمل نے لات گھمائی، سائیکل کو اَتھرے گھوڑے کی طرح ٹانگوں کے بیچ دبوچ لیا اور دائیں پاؤں سے پیڈل پر زور بڑھا دیا۔ اگر وہ لگ بھگ سولہ گھنٹے جنت میں رہا تھا تو اَب نکل کر جہنم میں داخل ہو گیا تھا۔ اگر جہنم سے نکلا تو سامنے جنت کھڑی تھی۔ نصف گھنٹے میں وہ اپنی گلی میں پہنچا۔ گلی کو کراس کرنے والی بڑی بڑی نالیوں کے سبب اُسے سائیکل سے اُترنا پڑتا تھا۔ سائیکل کو کان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا اپنے گھر کی طرف بڑھا۔ محلے بھر کے بند کواڑ اُسے طعنہ دینے لگے کہ رات آدھی بیت چکی ہے۔ اکلوتے کمرے سے چھن چھن نکلتی روشنی بتلا رہی تھی کہ سعدیہ کی رات اَبھی شروع نہیں ہوئی۔ دستک دینے پر سعدیہ نے دروازہ کھولا۔ دوپٹا درست کرتے ہوئے خمار آلود لہجے میں بولی۔ ''کیا آج پھر بیگم صاحبہ کسی پارٹی میں جاتے ہوئے تمہیں ساتھ لے گئی تھیں؟''

وہ اثبات میں سر ہلا کر گھر میں داخل ہوا۔ سائیکل کو اسٹینڈ پر لگایا اور کنڈی لگا پیچھے پیچھے آتی ہوئی سعدیہ کو یکبارگی سے بانہوں میں بھر لیا۔ وہ اپنی آواز کو دباتے ہوئے دُہائی دینے لگی۔ ''ہائے اللہ! یہ کیا کر رہے ہو؟ تین طرف کے چوباروں کی کھڑکیاں کھلی ہیں۔ کسی نے جھانک کر دیکھ لیا تو...''

وہ ہنس کر بولا۔ ''تو کیا ہوگا؟ سب یہی کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں کون جاگ رہا ہوگا اور کون جھانکا تانکی کرکے ہماری محبت کے راز چرانا چاہے گا؟''

اُس نے درست کہا تھا۔ محلہ غریبوں کا تھا۔ غریب سارا دن جسم کے بل پر تھے کمانے میں گزار کر گھر لوٹتے تھے۔ کھانا کھا کر ایسے اتنا غنیل ہوتے تھے جیسے دنیا میں سونے اور کمانے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔ وہ اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لیے گھر کے واحد پندرہ ضرب بیس فٹ کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کے ایک گوشے میں دو چارپائیاں جوڑ کر رکھی ہوئی تھیں۔ دیوار کی جانب ندیم چارپائی کے بازو سے چمٹ کر سو رہا تھا۔ اُس کے ننھے ننھے خراٹے کمرے کی خاموش فضا میں گونج رہے تھے۔ پہلو میں بیوی تھی، سامنے بیٹا تھا۔ جب بیٹا نہیں تھا تو سب کچھ بیوی ہی تھی۔ بیٹے کے دنیا میں آنے پر اُس کی حیثیت ثانوی ہو گئی تھی۔ دروازہ کھولنے کے لیے آتی تو پہلا پیار جھپٹ لیتی۔ اگر بیٹا جاگ رہا ہوتا تو باسی پیار پر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔ دل کو سمجھانے کے لیے توجیہہ ڈھونڈ لاتی۔ ''میرے حسن کا دیوانہ اگر میرے بجائے ندیم کو دیوانوں کی طرح پیار کرتا ہے تو کیا ہوا؟ وہ میرا وجود ہی تو ہے۔ اُس کی رگوں میں دوڑنے والا خون میرا ہی تو ہے۔ اجمل جس طرف بھی جائے، میرے خون کو ہی اپنے سانسوں کی گرمی پہنچانے پر مجبور ہوگا۔''

اجمل جوتے اُتار کر چارپائی پر چڑھ گیا۔ بیٹے کے برابر لیٹتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''میں نے مہینوں تمہارے آنے کا انتظار کیا تھا، تم چند گھنٹے میری راہ نہیں دیکھ سکتے۔''

اُسے کندھوں سے پکڑ کر اپنی جانب موڑا اور سینے سے لگا لیا۔ بچپنے کی نیند توڑنے موڑنے سے نہیں ٹوٹتی۔ اجمل کے کھینچنے، سینے سے لگانے اور چہرے پر جگہ جگہ بوسے دینے کے باوجود ندیم سویا رہا۔ کلیجا سیراب کرنے کے بعد چارپائی سے اُترا اور شرارت سے بولا۔ ''مون! تم بھی سوتے ہوئے ربڑ کی گڑیا بن جاتی تھیں۔ یاد ہے نا؟ جیسے مرضی ہلاؤ جلاؤ، توڑو موڑو، مجال کہ آنکھ کھل جائے۔ ندیم تم پر گیا ہے۔''

ندیم نے خطوط باپ کے اور جلد کی رنگت ماں کی چرائی تھی۔ تیکھے نقوش کے تلے سرخی مائل سانولی رنگت اُس پر بہت جچتی تھی۔ ہونٹ بھی ماں پر گئے تھے۔ خون کی طرح گہرے سرخ، پُرگداز اور لکیردار! اسکول اور گھر کی درمیانی دھوپ میں دُنیا بھر کی تمازت ہونٹوں کے دونوں جزیروں پر چپک جاتی اور دیکھنے والے کی آنکھوں کو خیرہ کرنے لگتی۔ ایسے میں ماں صدقے واری جاتی، باپ بھی ٹھٹک کر بیٹے میں دس برس پرانی مون کو تلاش کرنے لگ جاتا۔ کہنے پر مجبور ہو جاتا۔ ''مون! کیا تمہیں اپنے حسن کی جوانیوں پر اعتبار نہیں رہا تھا یا اپنی جوانی کو بچپنے میں لپیٹ کر مجھے ستانے لگی ہو؟''

وہ اُس کے لیے کھانا گرم کر رہی تھی۔ سوچنے لگی۔ 'اجمل نے شادی کی پہلی رات میں گھونگھٹ اُٹھاتے ہی مجھے سعدیہ سے مون بنا دیا تھا۔ چاند ہزاروں سالوں سے اپنی تاب و تمکنت برقرار رکھے کھڑا ہے۔ انسان تو ڈھلتا سایہ ہوتا ہے۔ میں بھی کچھ ڈھل چکی ہوں اور باقی ڈھلنے والی ہوں۔ پھر یہ مجھے کیوں مُون کہتا ہے؟... کیا اس کی نظر میں میرے حُسن کی تاب وہی ہے جو پہلے دن تھی؟'

دس سال پہلے چاند اُس کی زلف چہرے سے ہٹنے پر شرما جایا کرتا تھا، اَب وہ چاند کہلائے جانے پر دل ہی دل میں شرمسار ہو جاتی تھی۔ اجمل منہ ہاتھ دھو کر چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا تو اُس نے کھانا چن دیا۔ پلٹ کر ندیم کی طرف جانے لگی تو اُس نے ہاتھ تھام لیا۔ ''سامنے نہیں بیٹھو گی تو کھانا نہیں کھاؤں گا۔ یہ جانتے ہوئے بھی بھاگنے کی کوشش کرتی ہو۔ ہر روز بھول جاتی ہو کہ تمہارا دن ندیم کا ہوتا ہے، تمہاری رات میرے حصے میں آتی ہے۔ میرے ساتھ بے ایمانی مت کیا کرو ورنہ میں دن میں تم دونوں کے بیچ حائل ہو جایا کروں گا۔''

بیٹے کی طرف والہانہ قدموں سے جانا چاہتی تھی، بیٹے کے باپ نے اپنا حق جتا کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔ وہ مسکرا کر بیٹھ گئی۔ حسبِ عادت اجمل نے پہلا نوالہ اُس کے منہ میں ڈالا اور مسکرا کر کہا۔ ''اِن چند گھڑیوں کے حصول کے لیے میں سارا دن عذاب میں گزار لیتا ہوں۔''

وہ شرما گئی۔ محبت کرنے والی بیوی تھی۔ جانتی تھی کہ اُس کے محبوب کو اُس کی کون سی خوبی زیادہ اچھی لگتی ہے۔ وہ اُس کی شرما جانے کی ادا کو دیکھ دیکھ کر ابھی تک سیراب نہیں ہوا تھا۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ زندگی بھر اِس سے اُکتانے والا نہیں۔ کبھی گاتے ہے گاتے ساتی گری کر لیتی اور اپنے یقین کو آزما لیتی۔ ٹوہ لینے لگی۔ ''آج اتنی دیر کیوں ہو گئی؟''

''بیگم صاحبہ کو ایک تقریب میں لے کر گیا تھا۔''

''اصولاً تو سردار صاحب کو اُن کے ساتھ جانا چاہیے۔''

وہ اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''وہ ہر بار اُنہیں ساتھ چلنے کا کہتی ہے، وہ ہر مرتبہ ٹال جاتے ہیں یا انکار کر دیتے ہیں۔ شاید احساسِ کمتری کا شکار ہیں۔ سوچتے ہوں گے کہ جوان بیوی کے ساتھ محفل میں جا کر ہر ایک کی نظروں میں کھٹکنے لگیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فطری طور پر تنہائی پسند واقع ہوئے ہوں۔''

''بعض اوقات اس طرح ہوتا ہے کہ میں ندیم کو پیار کرنا چاہوں تو وہ مسکرا کر باہر بھاگ جاتا ہے۔ میں خفت زدہ ہو کر اُس کے دوست رضی کو پکڑ کر چومنے لگتی ہوں۔ ایسے میں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنے ندیم کو چوم رہی ہوں۔ رضی کو جانتے ہو نا؟ وہی... رشید ڈینٹر کا چھوٹا بیٹا... جو آپ کی سائیکل کا چمٹا توڑ لایا تھا۔''

وہ اچنبھے سے بولا۔ ''ہاں، جانتا ہوں اُسے مگر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''

وہ شرما کر، تھوڑا مسکرا کر بولی۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ بیگم صاحبہ کی خفت آپ پر پیار بن کر چھلک جاتی ہو؟... کبھی کبھی!''

''اے... اے مُون! انسانوں کی طرح سوچا کر۔'' وہ ہنستے ہنستے بے حال ہونے لگا۔ خود پر قابو پانے کی کوشش میں بے قابو ہو گیا۔ کھانے کی ٹرے کو دوسری چارپائی پر رکھ کر بے قابو کرنے والی کو قابو کرنے کے لیے بانہوں میں جکڑنے لگا۔ وہ کھلکھلا کر ہنسے جا رہی تھی۔ پھسل کر نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''اَب بس بھی کریں۔ ہنسنے سے مجھے ہچکی لگ گئی ہے۔ میں نے تو ہائی داوے بات کی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا کہ چور کی ڈاڑھی میں تنکا پھیل کر شہتیر بننے لگا ہے۔ پلیز! اَب کچھ نہیں کہتی، چھوڑ دیں۔''

وہ اُس پر پیار بھری نگاہ ڈال کر دوبارہ کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔ وہ پورے انہماک سے اپنے وجیہہ اور بے تحاشا پیار کرنے والے مجازی خدا کو دیکھنے لگی۔ سوچنے لگی۔ 'محبت سے ایک ٹک دیکھتے رہنا آنکھوں کی عبادت ہوتی ہے۔ آنکھوں کی تقلید میں دِل بھی جائے نماز پر جا کھڑا ہوتا ہے۔ اجمل... میرا اجمل... پرستش کے لائق ہے۔ دس سالوں میں مجھے اپنے دل کے فلک پر چاند کی طرح براجمان کیے بیٹھا ہے۔ لوگ دِنوں میں نظر سے اتار پھینکتے ہیں۔ یہ برسوں میں نہیں بدلا۔ نہ بدلنا خدائی وصف ہے۔ میری محبت کا خدا بھی ایسا ہی ہے۔'

ایسے میں ندیم نے کروٹ بدلی۔ خواب میں بڑبڑانے لگا۔ ''امی! دیکھ لو، ابو نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ کہتے تھے کہ آج مجھے گھمانے پھرانے کے لیے واٹر پارک میں لے جائیں گے۔ نہیں لے کر جائیں گے تو میں خود چلا جاؤں گا۔''

مُون نے شکوہ بھری نگاہوں سے اجمل کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''آپ ندیم سے وہ وعدہ نہ کیا کریں جسے پورا نہ کر سکیں۔ اسکول سے آتے ہی تیاری میں مصروف ہو گیا تھا۔

تیار ہوکر آپ کا انتظار کرتا رہا۔ اِس طرح بچوں کے ذہن پر بُرا اثر پڑتا ہے۔''

وہ سر جھکا کر بولا۔ ''ٹھیک کہتی ہو مگر میں کیا کرتا؟ اب بیگم صاحبہ کو انکار تو نہیں کیا جا سکتا تھا نا!''

وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''مگر یہ تو کیا جا سکتا تھا کہ اُسے تقریب میں پہنچا کر آپ گھر آ جاتے اور ندیم کو واٹر پارک کی سیر کرا دیتے۔ ندیم کو گھر ڈراپ کر کے واپس بیگم صاحبہ کے پاس چلے جاتے۔''

وہ ایسا کر سکتا تھا۔ عشرت بیگم کو اُس کے دو تین گھنٹوں کے غیاب پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''سوری ہنی! غلطی ہوگئی۔''

وہ مسکرا کر اُس کے قریب آ گئی۔ اجمل ایسا ہی تھا۔ جھٹ سے غلطی تسلیم کر کے لہجے میں معذرت بھر لیتا تھا۔ شکوہ دور کرنے کا اِس سے اچھا طریقہ دُنیا میں کوئی نہیں۔

☆☆☆

سردار رب نواز دو مرتبہ اسمبلی کا رُکن منتخب ہونے اور سیاسی بگھی میں سیر کرنے کا لطف حاصل کر لینے کے بعد سیاست سے کنارہ کش ہو چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ چھٹتی نہیں ہے کافر منہ کو لگی ہوئی، درست ہوگا مگر اُس نے غلط ثابت کر دیا تھا۔ مے، زَن اور اقتدار... تینوں سے دست بردار ہونا دِل گردے کا کام ہے۔ اُس نے بغیر کسی مجبوری کے اقتدار کی کرسی سے دست برداری کا اعلان کر دیا تھا۔ اُس کے دونوں چھوٹے بھائی اُس سے ہمیشہ نالاں رہتے تھے۔ وہ سخت جاں تھے، ہر معاملے کو سخت ہاتھوں سے نمٹنا مردانگی خیال کرتے تھے۔ خاندانی روایات اُن کی معاونت کرتی تھیں اور وہ سردار کی عدم موجودگی میں اُسے بے حمیت، بُزدل اور منافق قرار دیتے تھے۔ خاندانی روایات میں بڑے بھائی کو باپ کا مقام حاصل تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کھل کر سامنے نہیں آتے تھے۔ پشت پیچھے اپنی سی کوششیں کرتے رہتے تھے۔

کروڑوں کی جائیداد وراثت میں ملی تھی۔ پیدائشی سیر تھا، اپنی محنت سے سوا سیر بن گیا تھا۔ پہلی بیوی سے قلبی لگاؤ رکھتا تھا۔ اُس کی زندگی میں کسی اور عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد کئی سال تک وہ شادی نہ کرنے کے ارادے پر سختی سے قائم رہا تھا مگر جب اُس نے عقیدت کی شخصیت میں ماں کی کمی محسوس کی تو ڈانواں ڈول ہو گیا۔ عشرت بیگم کے ساتھ شادی کے پیچھے نفسانی طلب اور جسمانی ضرورت ہرگز نہیں تھی۔ اُسے اپنے بُڑھاپے کا پوری طرح احساس تھا۔

وہ جاگیردار تھا مگر روایتی انداز سے سوچنے اور عمل کرنے کا عادی نہیں تھا۔ اُس نے ایک شادی دفتر کے توسط سے عشرت تک رسائی حاصل کی تھی۔ پہلی ملاقات میں اُس نے اپنی ضرورت کی ڈبیا سے ڈھکن اُٹھاتے ہوئے پوری طرح باور کرا دیا تھا کہ اُسے بیوی کی نہیں، بیٹی کے لیے محبت کرنے والی ماں کی ضرورت ہے۔ تبھی اُس نے بے تحاشا خوبصورت اور نازک اندام عشرت سے کہہ دیا تھا۔ ''تم بہت خوبصورت ہو، تمہاری جوانی بہت دل کش ہے۔ اِس کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی ہم سر تمہارے جذبات کے آنگن میں اُترے اور تمہیں سراہے۔ میں تمہارے لائق نہیں ہوں، زبان سے بہلانا چاہو گی تو تمام عمر فریب دیتا رہوں گا۔ ہاتھوں سے سراہی جانا چاہو گی تو صاف کہتا ہوں کہ میرے ہاتھ کپکپانے لگیں گے۔ ڈوبتے سورج کی تمازت کچھ عرصے کی مہمان ہے۔''

وہ سر جھکائے بیٹھی سوچ رہی تھی۔ یہ باتیں دو انسانوں میں پُل باندھنے والی مسز شفق نے اُسے اپنے پاس بٹھا کر چند دِن پہلے ہی سمجھا دی تھیں۔ ہولے سے بولی۔ ''مجھے یہ باتیں بتلا دی گئی ہیں۔''

وہ بولا۔ ''میں کسی پر یقین نہیں رکھتا۔ لوگ اپنا مطلب نکالنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینا بُرا خیال نہیں کرتے۔ شادی دفتر والی مسز شفق بھاری فیس کے لالچ میں جھوٹ بول سکتی ہے۔ اِس لیے تمہیں باور کرا رہا ہوں کہ کل کسی موقع پر تمہیں دُکھ یا تاسف نہ ہو۔ مجھ پر گلہ نہ ہو کہ میں نے تم پر صورتِ حال پوری طرح آشکار نہیں کی تھی۔''

چند لمحے تک سانس لینے کے لیے توقف لیا پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''عشرت! میری دولت کا شمار نہیں۔ نوٹ اوڑھا کر سلا سکتا ہوں، سونے اور ہیروں کے لمس سے جگا سکتا ہوں۔ تم لاکھ مانگو، میں کروڑ دے سکتا ہوں۔ شادی دو انسانوں کے مابین ایسا معاہدہ ہے جو فریقین میں سے کسی ایک کی موت پر ہی ٹوٹتا ہے۔ میں جیسا دکھائی دے رہا ہوں، حقیقت میں بھی ایسا ہی ہوں۔ تمہاری بدنی ضرورت پوری نہیں ہوگی، تمہاری غربت ختم ہو جائے گی۔ یہ بات میں نے مسز شفق کو بھی بتلا دی تھی۔''

وہ خاموشی سے انگلیاں چٹخاتی رہی۔ دل ہی دل میں اپنے ہونے والے مجازی خدا کی حقیقت بیانی پر خوش ہو رہی تھی۔

وہ بات کو بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ہمارا معاہدہ بہ حسن و خوبی چل سکتا ہے۔ تم اپنی حد میں رہو گی۔ میں اپنی قیود میں بیٹھوں گا۔ تم اپنے جسم، اپنے جذبات اور مستقبل کی قربانی دے رہی ہو اور میں تمہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ میں اِس قربانی

کو رائیگاں نہیں جانے دوں گا۔ تمہارے بہن بھائیوں کے بہترین مستقبل کی ضمانت دیتا ہوں۔ تم اُن کے بارے میں جو چاہو گی، کر سکو گی۔ تمہیں جتنی رقم کی ضرورت پڑے گی، اُس سے دُگنی مہیا کر دوں گا۔''

اُس نے اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر کہا۔ ''میری فیملی جس کسمپرسی اور غربت میں دن گزار رہی ہے، اُسے میں ہی جانتی ہوں۔ وہاں جذبات تو کیا، بدن ہی سرے سے جل جاتا ہے۔ مسز شفق نے مجھے باور کرایا ہے کہ میری پانچوں بہنوں کی شادی، اکلوتے بھائی کا مستقبل اور اچھا رہن سہن آپ اپنے ذمے لے رہے ہیں۔ اُجڑتے ہوئے باغ کو بچانے کے لیے ایک پیڑ کو کاٹ کر بیچنا پڑے تو دیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں آپ کے ساتھ بہ خوشی شادی پر رضامند ہوئی ہوں۔ مجھ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا گیا۔ میں جانتی ہوں کہ بک رہی ہوں، پوری قیمت ملی تو زندگی میں کوئی گلہ نہیں کروں گی۔''

سردار رب نواز نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ''تو ٹھیک ہے۔ کڑکتی دوپہر میں اپنی تاروں بھری چھاؤں پیش کرتا ہوں۔ چلی آؤ۔''

عشرت نے بڑھے ہوئے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔ ہاتھ کے پیچھے براجمان پُرحدت بدن بھی برف کی چادر اوڑھے کھسک آیا۔ وہ عقل مند تھی۔ بے وقوف ہوتی تو بلا سوچے سمجھے انکار کر دیتی۔ سردار نے اُسے اپنے پُرتعیش اور شاہانہ تخت پر ملکہ بنا کر براجمان کر دیا۔ دونوں کی شادی بڑی سادگی سے سرانجام پائی تھی۔ شادی کے بعد دونوں فریقوں نے معاہدے کی مکمل طور پر پاسداری کی تھی۔ عشرت کو بہ یک وقت عقیدت کے لیے ماں بننا تھا اور خالی بیڈ روم میں ایک مرمر کی مورتی سے لپٹ کر جوانی کی راتیں گزارنا تھیں۔ اُس نے کبھی بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔

سردار رب نواز بھی اپنے معاہدے پر پوری طرح عمل پیرا تھا۔ عشرت کے میکے کو کرائے کے چھوٹے سے تاریک آنگن والے گھر سے اُٹھا کر بہترین رہائشی علاقے میں واقع چھوٹی سی خوبصورت کوٹھی میں لے آیا تھا۔ اُس کی بہنوں اور بھائی کی تعلیم و تربیت اور رہن سہن کے لیے ضرورت سے دُگنی رقم ہر ماہ عشرت کے حوالے کر دیتا تھا۔ گزشتہ سال عشرت کی دو بہنوں کی دھوم دھام سے شادی ہوگئی۔ شادی کے جملہ اخراجات سردار نے اُٹھائے تھے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی ذات سے کوئی گلہ نہیں تھا۔

تاریخ بدلنے سے قبل ہی وہ بیڈ روم میں داخل ہوگئی۔ سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر لائٹ آن کرنا ہی چاہتی تھی کہ سردار کی بھاری آواز کمرے میں گونج اُٹھی۔ ''لائٹ مت آن کرو۔ چند لمحوں بعد تمہاری آنکھیں نائٹ بلب کی کم روشنی میں دیکھنے کی عادی ہو جائیں گی۔''

اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ رُک گیا۔ پلٹ کر بیڈ کی طرف دیکھنے لگی۔ سگریٹ کا ننھا سا انگارہ بیڈ سائیڈ سے نکلتا دکھائی دیا۔ سردار کے لبوں پر جا کر رُک گیا۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں بولی۔ ''میں تھکی ہوئی ہوں۔ چینج کر کے لیٹ جانا چاہتی ہوں۔''

وہ کچھ نہ بولا۔ خاموشی کو اجازت خیال کرتے ہوئے اُس نے لائٹ آن کر دی۔ روشنی نے دونوں کی نگاہیں چُندھیا دیں۔ سردار کی نگاہیں روشنی سے خیرہ ہوگئیں پھر مسلسل مجسمۂ حسن کی لَو پر تپنے لگیں۔ وہ دِل میں سوچنے لگا۔ 'عشرت مجھ بوڑھے کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے، تقریب میں شریک جوانوں اور ادھیڑ عمروں پر کیسی برق گراتی ہوگی؟'

حسد اور رقابت پر خود ہی شرمسار ہو کر سوچنے لگا۔ 'پری کو اپنے پنجوں میں دبوچ کر میں نے ہی زیادتی کا ارتکاب کیا ہے۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ وہ جوانی کی عمر میں خود پر بڑھاپا طاری کر لے۔ مخمل کے پُرگداز ٹیلوں جیسے گالوں پر ناخنوں سے لکیریں ڈال لے۔ جذبوں پر برف کی سلیں جما سکتی تھی، وہ اُس نے میرے لیے جما دیں۔'

وہ چینج لینے کے لیے ڈریسنگ کی طرف بڑھی تو اُس نے آواز دے کر اپنے پاس بلا لیا۔ وہ قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔ جماہی لیتے ہوئے بولی۔ ''جی! آپ کچھ کہنا چاہتے تھے۔''

''تم اِس لباس میں، اِس حلیے میں بہت سوہنی لگ رہی ہو۔ ایسے ہی لیٹ جاؤ۔''

''مگر میں اِن کپڑوں میں...''

''ایک رات کی ہی تو بات ہے۔ مان لو۔''

وہ مان گئی۔ اکثر بغیر ضد کیے مان جایا کرتی تھی۔ برابر میں لیٹ کر بولی۔ ''آپ بعض اوقات عجیب سی فرمائشیں کرنے لگتے ہیں۔''

وہ اُسے اپنے بے حد قریب کرتے ہوئے بولا۔ ''ہماری رفاقت میں سب کچھ عجیب انداز میں ہی تو ہو رہا ہے۔''

شجر بوڑھا ہو یا جوان، اُس کی چھاؤں جھلستے وجود کو سکون بخشتی ہے۔ وہ تقریب کی تپتی دھوپ بدن پر لے کر آئی تھی۔ چھاتی سے لگ کر شانت ہونے لگی۔ ہولے سے بولی۔ ''آپ بہت اچھے ہیں۔''

سردار ایک تمسخرانہ ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ شیشے کی ایش

www.urdutech.com

ٹرے میں سگریٹ کو مسلتے ہوئے بولا۔ ''آج بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ جانتا ہوں کہ تم اس وقت سونا چاہتی ہو مگر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں جگانا چاہتا ہوں۔ ناراض تو نہیں ہو جاؤ گی؟''

وہ آہستگی سے سر کو نفی میں دونوں طرف گھما کر بولی۔ ''نہیں تو!''

وہ سردار کی معمول آشنا تھی۔ اُسے علم تھا کہ سردار کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہا۔ اُسے وقت دینے کے لیے اُس کے سینے کے گھنیرے بالوں سے کھیلنے لگی۔ دس پندرہ منٹ گزر گئے۔ سردار ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''عشرت! میں اُس علاقے سے تعلق رکھتا ہوں جہاں رواج، فطری غیرت اور جذباتی احتیاطوں کو ہر احساس پر فوقیت حاصل ہے۔ ایک ایسے خاندان کا خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے جہاں عورت کو چار دیواری کے اندر کی سلطنت پر راج کرنے دیا جاتا ہے مگر دروازے کو عبور کر کے باہر کی دنیا میں جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ میری دو پھوپھیوں میں سے ایک نے صرف اس لیے حویلی کے اندر سسک سسک کر جوانی اور بڑھاپا گزار دیا کہ اُس کی حیثیت کا رشتہ خاندان میں نہیں تھا۔ خاندان سے باہر بیاہنے کا رواج ہمارے ہاں نہ ہونے کے باعث اُس سے عورت کے احساسات و جذبات تک کو چھین لیا گیا۔ میری بات کو سمجھ رہی ہو نا؟''

اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ایسا کرتے ہوئے اُس کی پیشانی پر آگے کی جانب نکلے ہوئے بال سردار کے گال پر لہرا گئے۔ اپنے لمس سے اپنے ہونے کا احساس دلا گئے۔ سردار نے اُس کے دوپٹے کو سرکاتے ہوئے زلفوں میں انگلیاں ڈال دیں اور بولا۔ ''جان! میرا خاندان ایسا ہی ہے جیسا جاگیرداروں کے بارے میں لکھا جاتا ہے، الزام دیا جاتا ہے۔ میں اُن لوگوں میں بس فٹ تھا۔ تبھی اُس خود ساختہ جنت یا جہنم سے نکل بھاگا۔ میں نے عقیدت کی ماں کو نہ صرف محبت دینے میں انتہا کر دی بلکہ اُسے مکمل آزادی دے رکھی تھی۔ میں اُس سے بہت محبت کرتا تھا۔''

وہ سانس لینے کو رُکا۔ وہ پیار سے بولی۔ ''مجھے اپنا حصہ مل رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے آپ کی ذات سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں۔ تم جو کہتی ہو، اُسے بھی اور جو نہیں کہہ پاتی ہو، اُسے بھی۔ یزدانی رحمت کے سوتوں کے علاوہ دُنیا کے تمام دریا خشک ہوتے رہتے ہیں۔ جہنم کی آگ کے سوا ہر آگ بجھ جاتی ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک مخصوص وقت پر جا کر انسان کی رگوں میں دوڑنے والا گرم خون بھی ٹھہر جاتا ہے۔ میں قبل از وقت ٹھہر گیا ہوں۔ اپنی خود غرضی اور بیٹی کی شخصیت میں پیدا ہونے والے خلا کے ڈر سے میں نے تمہاری زندگی میں خلا ہی خلا بھر دیا ہے۔ یہ بھی مانتا ہوں کہ ماغر و مینا کو نگاہوں میں رکھ کر اپنے اندر کے مرد کو تسکین دیتے ہوئے تجھے انگاروں کی سیج پر لٹاتا رہتا ہوں۔ یہ سب غلط ہے۔ چند دن پہلے مجھے یہ احساس ہوا تھا کہ ایسے نہیں ہونا چاہیے۔ تب سے یہی بات میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گئی ہے۔''

وہ سہم سی گئی۔ ذہن میں اندیشوں کے اَن گنت سنپولیے کلبلانے لگے۔ 'کیا سردار مجھے طلاق دینے کے لیے تمہید باندھ رہا ہے؟'

وہ بولی۔ ''میں نے کہا نا کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔''

''تم جھوٹ کہتی ہو۔ میں نے ان گنت سالوں پر محیط ازدواجی زندگی گزاری ہے۔ گناہ بھی کیے ہیں۔ اَب بھی میرا بدن تمہاری طلب میں مچلتا رہتا ہے۔ تم جوانی سے بھرپور عورت ہو۔ اپنے بدن کی پکار کو نظر انداز کرتی رہتی ہو اور میں اپنے ضمیر کا مجرم بنا تم سے نظریں چُراتا رہتا ہوں۔ ایسا کب تک چلے گا؟ ہندوستان کے بادشاہ ایسا ہی کرتے تھے۔ جوان اور خوبصورت عورتوں کو لونڈیاں بنا کر حرم میں ڈال دیتے تھے۔ اُن پر خواجہ سرا تعینات کر کے جوانی کے جذبات پر اپنی اندھی غیرت کا تیزاب انڈیل دیتے تھے۔ بے چاریوں کی زندگی میں شاہ کی التفات کے باعث ایک مرتبہ سہاگ رات آتی تھی اور صبح کے سورج کی آمد کے ساتھ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتی تھی۔ پھر سورج رہ جاتا، تارے رہ جاتے مگر زندگی کا روشن چاند تنہائیوں کی سیاہ مہیب بدلیوں کے پیچھے چھپ جاتا۔ میں نے بھی تمہارے ساتھ ایسا ہی سلوک کیا ہے۔ چار دن کی چاندنی میں تمہیں نہلاتا رہا، پھر اندھیری رات کے سپرد کر کے مُردے کی طرح لمبا لیٹ گیا۔ اَب تمہیں دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہتا ہوں۔ کوئی ترکیب سجھائی نہیں دیتی تو تم سے چہرہ چھپانے لگتا ہوں۔''

وہ نہایت نیچی آواز میں بات کر رہا تھا۔ اُسے پیار بھی کرتا جاتا تھا۔ کروٹ لے کر اُس کے ہونٹوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہونٹ جوانی میں انگارے ہوتے ہیں، بڑھاپے میں ماس کے لوتھڑے بن جاتے ہیں۔ لوتھڑا کبھی گرم نہیں ہوا، انگارہ کبھی سرد نہیں ہوا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ایسے ہونٹوں میں آدمی دُنیا کا فساد چھپا ہوتا ہے، میں کہتا ہوں کہ تم فساد کو سامنے آنے سے روکنے کے لیے انہیں دانتوں میں دن رات کچلتی رہتی ہو۔ مجھ سے تمہاری حالت

دیکھی نہیں جاتی۔''

اُس کے لیے بولنا ناگزیر ہوگیا۔ وہ بولی۔ ''آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ جس محرومی کی طرف اشارہ کناں ہیں، وہ میرے نزدیک کبھی بھی اتنی اہم نہیں رہی۔ پھر آپ نے شادی سے پہلے مجھ سے کچھ بھی چھپایا نہیں تھا۔ میں اپنی مرضی سے آپ کی دُلہن بنی تھی۔ آپ نے ایک سال تک دُلہن بنائے رکھا، مجھے تو اس کی امید بھی نہیں تھی۔ اب جو چیز آپ کے اختیار میں نہیں، اُس پر گلہ یا شکوہ فضول ہی تو ہے نا!... عورت بیوہ بھی تو ہو جاتی ہے، عورت مطلقہ ہو کر بھی تو تنہا ہو جاتی ہے، کوئی نہ خریدے تو دکان میں عمر بھر بجی رہتی ہے... میں خوش نصیب ہوں کہ آپ جیسے ہمدرد انسان کی ہم راہی میں دنیا جہان کی نعمتوں سے سرفراز ہو رہی ہوں۔ آپ الٹے سیدھے انداز میں نہ سوچا کریں۔ ایک معاہدے کے تحت آئی تھی، محبت کے جذبے کی ترنگ میں آپ کے پاس رہ رہی ہوں۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔''

وہ بڑی توجہ سے اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ ملاحظہ کر رہا تھا۔ خاموش ہونے پر بولا۔ ''سال بھر تمہارے وجود کو اپنی ضرورت اور کھلونا سمجھ کر کھیلتا رہا۔ بنجر ہونے پر احساس ہوا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ محبت کرنے والے سود نہیں، زیاں سامنے رکھتے ہیں۔ تم اگر میری امانت میں خیانت کرتے ہوئے بدن کی پیاس بجھانے لگتیں تو مجھے تمہارے وجود سے نفرت ہو جاتی مگر تم... تم بہت عجیب ہو۔''

سردار نہ جانے کس امتحان سے گزر رہا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے اُس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے۔ لہجہ بھرا گیا تو عشرت کو پتا چلا۔ وہ چونک کر اُٹھ بیٹھی اور آنسو پونچھتے ہوئے فرطِ ہمدردی سے بولی۔ ''آپ کو کیا دُکھ ہے؟''

وہ کچھ نہیں بولا۔ ایک ٹک اپنی بیوی کو دیکھے گیا۔

''بولتے کیوں نہیں؟'' وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے بولی۔ ''ایسی کیا بات ہے جو مجھے بتاتے ہوئے آپ ہچکچانے لگے ہیں۔ کسی نے میرے بارے میں کچھ کہہ دیا ہے؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں۔ مجھے تمہاری تنہائی کا دُکھ اندر ہی اندر کھائے چلا جا رہا ہے۔''

وہ آزردگی سے مسکرانے لگی۔ سوچنے لگی۔ 'یہ دُکھ تو مہینوں سے تمہاری جان سے چمٹا ہوا ہے۔' پھر ہولے سے بولی۔ ''آپ خواہ مخواہ ہلکان ہوتے رہتے ہیں۔ میں اب ایسی بھی تنہا نہیں ہوں۔ میری بیٹی دن بھر میرے ساتھ رہتی ہے، میرا بہت پیار کرنے والا شوہر رات بھر میری دھڑکن سنتا رہتا ہے۔''

وہ خود پر طنزیہ انداز میں ہنسا پھر بولا۔ ''کیا تم ماں بننا نہیں چاہتیں؟''

وہ سر جھکا کر تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں ... ہوں، بننے کا کیا سوال ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ عقید... میری بیٹی نہیں ہے؟''

وہ بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے اندر کی ... عقیدت کے نام پر دھڑکتی رہتی ہے مگر کیا یہ دھڑکن مصن... نہیں ہے؟ ہر عورت چاہتی ہے کہ اُس کی کوکھ سے اُس کا ... جنم لے جس پر وہ اپنی ممتا کے تمام تر خزانے لٹا دے۔ سچ ... میری جان! کیا تم ماں بننا نہیں چاہتی ہو؟''

جھوٹ بولنے کے لیے آنکھیں چُرانا پڑتی ہیں۔ وہ ... چُرانے کے لیے اُس کے سینے پر گال رکھ کر لیٹ گئی اور بو... ''میں ماں بن چکی ہوں۔''

''چلو مان لیتا ہوں۔'' سردار نے ہتھیار ڈالتے ہو... کہا۔ ''مگر میں چاہتا ہوں کہ تم ایک بیٹے کی ماں بنو۔ میں ... کا باپ کہلاؤں۔ میری کروڑوں کی جائیداد کا ایک وار... ہونا چاہیے جو میرے بعد، تمہارے بعد ہمارا نام لیوا ہو۔''

وہ کچھ نہیں بولی۔ سردار کی بے سروپا باتوں کا اُس ... پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ''عشرت ... کوئی ترکیب سوچو۔ تم ماں بنو، میں باپ بنوں۔''

وہ کچھ نہ سوچ پائی تو زِچ ہو کر بولی۔ ''مگر ہم ماں با... بن چکے ہیں۔ آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔ ہماری جائیداد ... وارث ہماری عقیدت ہے۔''

وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ ''تم سمجھ نہیں رہی ہو یا سمجھ... ہی نہیں چاہتیں۔ میں کیسے سمجھاؤں؟''

وہ سینے پر گال رگڑتے ہوئے بولی۔ ''آپ کچھ نہیں ... کہیں اور آرام سے سو جائیں۔ رات کافی گزر چکی ہے۔''

وہ خاموش ہوگیا۔ یوں جیسے چابی کا کھلونا چابی ختم ہو... پر رُک جاتا ہے۔ وہ تھکے تھکے انداز میں اُس سے کھیلتی رہی ... سچ ہے کہ وہ اتنے پر ہی راضی تھی۔ کافی دیر گزر گئی۔ سرد... جاگتا رہا، سوچتا رہا اور پھر عشرت کے سر اُٹھانے پر چونک... گیا۔ وہ بولا۔ ''تمہیں قید کیے بیٹھا ہوں، یہ گناہ ہے۔ ... آزاد کرتا ہوں تو زندہ بچنا محال دکھائی دیتا ہے۔ تم ایسا کیو... نہیں کرلیتیں کہ میری نظروں میں لائے بغیر میری امانت م... خیانت کر ڈالو...''

آدھی سوئی، آدھی جاگتی عشرت کے کانوں میں جیسے پ... ہوا سیسہ اُتر گیا۔ یکبارگی سے اُٹھ بیٹھی اور پھٹی پھٹی نگاہو... سے اپنے مجازی خدا کو دیکھنے لگی۔ دیکھنے کا انداز ایسا تھا ج...

...دار کو کچا چبا ڈالنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ دانت کچکچا کر بولی۔ ''...آپ کو اندازہ ہے کہ آپ نے کتنی غلط بات کی ہے؟''

...ی ناگن اُتر کر اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ...ڈالے رہی گی۔ اُس کے پاس سوائے رُخ پھیرنے کے ...چارہ نہیں تھا۔ کروٹ بدل کر بولا۔ ''ہاں! جانتا ہوں۔''

''...ں زندگی میں پہلی مرتبہ گستاخی کی مرتکب ہوئی ...کندھے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑتے ہوئے بولی۔ ''...آپ ہوش میں نہیں ہیں۔ میں آپ کی بیوی ہوں، کوئی ...نہیں ہوں۔ میرے ماں باپ غریب تھے مگر بے غیرت ...نہیں کہ آپ مجھ سے ایسی گندی بات کہیں۔ بے حیائی کی ...اجازت دینا اتنا ہی اچھا عمل ہے تو میری طرف دیکھ کر بات ...کریں۔ منہ کیوں چھپانے لگے ہیں؟''

رات کے سناٹے میں اُس کی تیز غصے سے بھری آواز ...بہت دور تک گئی ہوگی۔ سردار نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''آہستہ بولو عشرت! دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''

''دیواریں مُردہ ہیں۔ ان کے کان بے سماعت ہیں ...ورنہ آپ کی بات سُن کر دھڑام سے ہم پر آن گرتیں۔'' غصے سے اُس کے گال تمتمارہے تھے۔ ''سردار رب نواز خان... ...ایک غیرت مند شوہر... ایسا ہو سکتا ہے، میں نے کبھی سوچا بھی ...نہیں تھا۔''

وہ نظریں جھکائے لیٹا رہا۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد ...اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگائی اور حلق میں کڑوا دھواں ...اُتارتے ہوئے بولا۔ ''طعنہ مت دو، مجھے کسی نہ کسی طرح ...جائیداد کا وارث پیدا کر دو۔ میری قبر پر اُٹھنے والے دو ہاتھ ...پیدا کر دو۔ یہ گناہ ہے، جانتا ہوں مگر میرے لیے گناہ کر لو۔ یہ گناہ تم پر نہیں، مجھ پر عائد ہوگا۔ میں سزا بھگت لوں گا مگر خدا کے لیے...''

وہ عجیب سی نگاہ اُس پر ڈال کر بیڈ سے اُتری اور تیز تیز قدموں سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''میں ...ماں ہوں، میرے پاس اِس بیڈروم کے علاوہ بھی سونے کی جگہ موجود ہے۔ تم باپ ہو مگر خود کو باپ سمجھ نہیں رہے ہو، اکیلے پڑے رہو۔ میں عقیدت کے پاس جا رہی ہوں۔''

وہ جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ اُس نے اپنے پیچھے زوردار آواز سے دروازہ بند کر کے اپنی خفگی کا اظہار کر دیا تھا۔ اُس نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ سردار کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو چکی تھی۔

عقیدت کے بیڈ پر لیٹ کر وہ سسکیاں لینے لگی۔ شادی کے بعد پہلی مرتبہ رو رہی تھی۔ پہلی مرتبہ اُسے احساس دلایا گیا تھا کہ وہ بھی عورت ہے، عورت بھی وہ جس کی گود خالی ہے۔ اُس کی ممتا عقیدت کے وجود میں تسکین تلاش کرلیتی تھی، آج پتا چلا تھا کہ وہ ممتا دیکھنے والوں کی نگاہوں میں ہمیشہ کھوکھلی قرار دی جاتی تھی۔ بوڑھے شجر نے بھی اُسے کہیں اور بسیرا کرنے کا حکم صادر کر دیا تھا۔ اُس کا دل بھر آیا۔ وہ ہچکیاں لینے لگی۔ ہچکیوں کی تال پر سوچنے لگی۔ 'ہائے اللہ! کیسے امتحان میں ڈال دیا ہے تو نے۔ میں ایسی تو کبھی بھی نہیں رہی کہ مجھے گندے جوہڑ میں اپنی مرضی سے اُترنے کا حکم دے دیا جائے۔ میں تیرے کیے پر راضی و شاکرہ ہوں۔ تو مجھ پر راضی کیوں نہیں ہوتا؟ دنیا میں کہیں ایسا نہیں ہوا کہ کسی غیرت مند شوہر نے اپنی بیوی کو گھر سے باہر جھانک کر نظروں کی تپش کم کرنے کا حکم دیا ہو۔ اے مجھے عورت بنا کر دُنیا میں بھیجنے والے! تو ہی بتلا، میں کیا کروں؟ تیری مانوں یا اُس محروم شخص کی جسے تُو نے میرا مجازی بنا کر مجھ پر اُتارا ہے؟'

بے اختیار ہو کر خوابیدہ عقیدت سے لپٹ گئی۔ اُس کی نیند کا خیال کیے بغیر اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ عقیدت کے چہرے پر رگڑنے لگی۔ وہ ہڑبڑا کر جاگ گئی۔ چند لمحے آنکھیں گھما گھما کر دیکھتی رہی پھر ماں کا چہرہ آہستگی سے ہٹا کر بولی۔ ''ماما! کیا ہوا؟ کیا پاپا نے کچھ کہہ دیا ہے؟''

وہ کچھ نہ بولی بلکہ بے تحاشا چومنے لگی۔ چومنے سے دل کو قرار ملتا تھا۔ آج نہیں مل رہا تھا۔ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ''میری جان... میری بیٹی! تم دُنیا کو کیوں بتلا نہیں دیتیں کہ تم میری ممتا کی تسکین ہو۔ تمہارے وجود نے جوان عورت کے گرم بدن کی حرارت کو اپنے ننھے سے وجود میں جذب کر رکھا ہے۔ تم سب کو بتلا کیوں نہیں دیتیں کہ تم نے ہی میری کوکھ سے جنم لیا تھا... وہ خواب تھا... تمہیں جنم دینے والی میں ہی تھی۔ وہ میرا ہی روپ ہی تو تھا جس نے تمہارے بے دانت منہ میں اپنا دودھ ٹپکایا تھا۔ ہائے! کوئی کیوں مجھے تمہاری حقیقی ماں ماننے کو تیار نہیں؟''

عقیدت بری طرح گھبرا گئی۔ بڑی مشکل سے خود کو ماما کی بانہوں سے نکال کر بیڈ سے اُتری اور بھاگتی ہوئی پاپا کے دروازے پر آئی۔ دستک دیتے ہوئے بولی۔ ''پاپا! میں آپ کی بیٹی، عقیدت ہوں۔ کیا اندر آ سکتی ہوں؟''

زیادہ کمروں والے گھروں میں دستک دینے کا رواج آپوں آپ جڑ پکڑ لیتا ہے۔ سردار جلدی سے دروازے پر آیا۔ غیر مقفل دروازے کو کھول کر اچنبھے سے بیٹی کو دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے بیٹا؟ خیریت تو ہے نا؟''

وہ شعلہ بار نگاہوں سے باپ کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''آپ نے ماما سے کیا کہا ہے؟''

سردار کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں نے تو کچھ نہیں کہا بیٹا!''

دل میں ڈر سما بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا کہ کہیں عشرت نے وہ سب کچھ عقیدت سے نہ کہہ دیا ہو جو سُن کر ناراض حالت میں کمرے سے نکلی تھی۔ اس نے عقیدت کا ہاتھ پکڑا تو اُس نے بُری طرح جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''آپ اچھے نہیں ہیں۔ ماما سارا دن میرے ساتھ رہتی ہیں، میں نے آج تک اُن کی پیشانی پر سلوٹ نہیں پڑنے دی۔ آپ کے پاس رات گزارنے کے لیے آتی ہیں، زلا کر کمرے سے نکال دیتے ہیں۔ کیوں؟''

بیٹی پہلی مرتبہ سینہ تان کر باپ کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ باپ خشمگیں نگاہوں سے بیٹی کا غصے سے لال ہوتا چہرہ دیکھ کر بولا۔ ''بیٹا! کیا اپنے پاپا سے ایسے لہجے میں بات کی جاتی ہے؟''

وہ بولی۔ ''پاپا وہ ہوتا ہے جو ماں کا شوہر ہوتا ہے۔ ماں کو کمرے سے نکالنے والا باپ نہیں ہوتا، کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ میں آپ سے اُس وقت تک بات نہیں کروں گی جب تک آپ ماما سے معافی نہیں مانگ لیتے۔''

وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ عقیدت کے بیڈروم سے نکل کر سر جھکائے آتی ہوئی عشرت پر نگاہ پڑ گئی۔ وہ عقیدت کے قریب آئی۔ کمر میں بازو حمائل کر کے بیڈروم کی طرف لے جانے لگی۔ پہلو سے لگ کر گھسٹ کر جاتی ہوئی عقیدت نے آدھ راستے میں رُک کر پیچھے مُڑ کر دیکھا اور تلخی سے بولی۔ ''آپ نے کہا تھا کہ یہ میری ماما ہیں، انہیں دُکھ نہیں دینا۔ میں نے ہمیشہ آپ کی بات مانی مگر آپ نے انہیں دُکھ دیا ہے۔ کل مجھے علم نہیں تھا مگر آج جانتی ہوں کہ یہ میری حقیقی ماما ہیں۔ جو دُنیا سے چلی گئی تھی، وہ ایک خواب تھی، ایک سہانا سپنا تھی۔ خواب والی ماما سے کہیں زیادہ معتبر اور خوبصورت یہ ماما ہیں جو سارا دن مجھے دکھائی دیتی رہتی ہیں۔ آج کے بعد یہ میرے ساتھ سویا کریں گی۔ آپ کے کمرے میں نہیں...''

اُس کی بات اَدھوری رہ گئی۔ عشرت اُسے پہلو میں لیے بیڈروم میں داخل ہو گئی۔ سینے سے لگا کر لرزتی ہوئی آواز میں سمجھانے لگی۔ ''میری جان! پاپا سے ایسے لہجے میں بات کرنا گناہ ہوتا ہے۔ تم جیسی سمجھ دار بیٹی سے مجھے یہ توقع ہرگز نہیں تھی۔ تم جانتی ہو کہ وہ تم سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ اَب وہ تمام رات جاگتے رہیں گے اور دُکھی ہوتے رہیں گے۔''

وہ بھی رونے لگی۔ روتے روتے کہنے لگی۔ ''اگر دُکھی ہوتے ہیں تو میری بلا سے۔ مجھے اُن کی کوئی پروا نہیں ہے۔ مجھے صرف اور صرف اپنی ماما کی پروا ہے۔ جو میری ماما نہیں کرے گا، میں اُسے دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گی۔''

ایسے میں سردار دروازہ کھول کر سر جھکائے کمرے میں داخل ہوا۔ بیٹی کی بات سُن کر ٹھٹک گیا۔ جلدی سے بیٹی کے قریب آ کر بولا۔ ''میں معافی چاہتا ہوں بیٹا!''

وہ اپنے باپ کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ ''آپ میری ماما کی انسلٹ کی ہے، میری نہیں۔''

اُس کا لہجہ فرطِ کرب سے بھرا گیا۔ ''میں تمہاری ماما سے بھی معافی چاہتا ہوں۔ تم دونوں ماں بیٹی مجھے معاف کر دو۔''

دونوں نے چونک کر سردار کی طرف دیکھا۔ پھر بیٹی ماں کی طرف اجازت کناں نگاہوں سے دیکھا اور اجازت پا کر باپ کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ سردار نے بیٹی کی موجودگی کا دھیان نہ رکھتے ہوئے عشرت کی کمر میں اپنا دایاں بازو حمائل کرتے ہوئے اُسے بھی اپنے قریب کر لیا اور بولا۔ ''میرا تم دونوں کے علاوہ پوری دنیا میں کوئی نہیں۔ مجھ سے جھگڑ کر اپنی ہر بات منوا لیا کرو، ہر ضد پوری کروا لیا کرو مگر ناراض نہ ہوا کرو۔ میں ناراض ہوا تو منانے کی ہمت نہیں دوں گا۔''

عشرت نے جلدی سے اُس کے منہ پر داہنا ہاتھ رکھ اور دل ہی دل میں کہا۔ 'اللہ نہ کرے کہ کبھی ایسا ہو۔ میرے سرتاج پر آئی مصیبت خدا مجھ پر اُتار دے۔'

پھر فاتحانہ نگاہوں سے اپنے سرتاج کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''عقیدت میری بیٹی ہے۔ بیٹی اپنی ماں کے حق کے لیے باپ سے لڑ سکتی ہے تو یقیناً پوری دُنیا سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔''

وہ آزردگی سے مسکرا کر عشرت کی آنکھوں کو وارفتگی سے چومنے لگا۔ بیٹی سینے سے لگی ہوئی تھی۔ بیوی گردن کا ہار ہوئی تھی۔ بیٹی نے نظر اُٹھا کر اپنے ماں باپ کی دیوانگی کو نہیں دیکھا تھا۔ تینوں الگ الگ جذبات لیے جُدا ہوئے۔ کہتے ہیں، ازدواجی دریا پر اولاد پُل باندھ سکتی ہے۔ اختلاف کناروں پر کھڑے ماں باپ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر پُل کے وسط میں کھڑی اولاد کی طرف لپکتے ہیں اور یوں عارضی طور پر بچھڑے ہوئے دِل پھر باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔

بیٹی کو سلا کر دونوں سرنہوڑائے اپنے کمرے میں آ گئے۔ دیواروں نے کافی دیر تک اپنے کان کھلے رکھے مگر بوڑھے دِل کی دھڑکن کی تال پر نغمہ ریز عشرت کے تنفس کی مدھم سی آواز کے علاوہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

عقیدت گاڑی سے اُتر کر بیگ جھلاتی ماں کی بانہہ

میں چھپ گئی۔ وہ گاڑی کو لاک کر کے اُترا اور دونوں کے قریب آ کر مؤدبانہ انداز میں بولا۔ ''بیگم صاحبہ! میں نے آپ سے آج کے آدھے دن کی چھٹی مانگی تھی۔ کیا مجھے جانے کی اجازت ہے؟''

وہ ٹک کر اُسے دیکھنے لگی اور بولی۔ ''مگر میں نے تو ہاتھ شاپنگ پر جانے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ تم کل چلے جانا۔''

وہ مایوسی سے پلٹتے ہوئے بولا۔ ''آج نہیں تو کل بھی نہیں۔''

عشرت کو حیرانی ہوئی۔ وہ اونچی آواز میں بولی۔ ''کیا تمہارا جانا بہت ضروری ہے؟''

وہ برآمدے کی سیڑھیاں اُترتے ہوئے امید کی ڈور سے اُلجھ کر رُک گیا۔ پلٹ کر بولا۔ ''میں نے اپنے بیٹے کو واٹر پارک کی سیر کرانے کے لیے لے کر جانا ہے۔''

''یہ تو کوئی مجبوری نہ ہوئی۔'' عشرت بیگم نے کندھے اُچکا کر کہا۔ ''کل سنڈے ہے، کل چلے جانا۔''

دِل کو ٹھیس لگی۔ ایک نظر عقیدت کو دیکھا۔ چشمِ تصور میں اپنے ندیم کو دیکھا۔ دونوں کا آج کے دِن جانا ضروری تھا بھی اور نہیں بھی۔ نظریں جھکا کر بڑی آہستگی سے بولا۔ ''بیگم صاحبہ! واقعی یہ کوئی مجبوری نہیں ہے۔ عقیدت کے لیے اُسے آج کا دِن پھر انتظار اور کوفت میں گزارنا چاہیے۔ ایک نوکر باپ کا بیٹا ہے، اوقات میں رہے تو اچھا ہے۔''

وہ ناراض ہونے کے بجائے غمزدہ سی ہو گئی۔ چند لمحے کھڑی ہونٹ کاٹتی رہی پھر عقیدت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''سوری اجمل! مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ عقیدت اور میں کل چلے جائیں گے تم آج ہی چلے جاؤ۔''

عقیدت نے ستائش بھری نگاہوں سے ماں کو دیکھا پھر مسکرا کر اجمل کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''کیا میں آپ کے ساتھ واٹر پارک دیکھنے جا سکتی ہوں؟''

وہ حیرت آمیز نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیوں نہیں مگر... ہم تو سائیکل پر جائیں گے، آپ کیسے ہمارے ساتھ چل سکتی ہیں؟''

عشرت نے چٹکی بجاتے میں مسئلہ حل کر دیا۔ عقیدت کی طرف تائید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہم سب گاڑی میں جائیں گے۔''

عقیدت چونکی ''ہم سب؟''

''ہاں بیٹا! میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چل رہی ہوں۔'' عشرت نے اُس کے گال پر پیار سے چپت لگاتے ہوئے کہا۔ ''آپ چینج لیں، اپنے پاپا سے اجازت لیں اور پھر چلتے ہیں۔ اسی بہانے اجمل کے بیٹے ندیم سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔''

وہ ہنسی ''ماما! اس وقت وہاں جا کر کیا کریں گے؟ شام کے اندھیرے میں چلیں گے۔'' وہ ہاتھ لہرا کر مخصوص انداز میں اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''رنگ برنگی لائٹیں دیکھیں گے، پانی کا بہاؤ، یوں اوپر... یوں نیچے۔ ہائے سچ! کتنا مزہ آئے گا۔''

عقیدت کلانچیں بھرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھ گئی۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ عشرت سوچ رہی تھی۔ 'غریب اور امیر کے بچے ایک سے ہوتے ہیں۔ ہم ہی انہیں الگ نظروں سے دیکھنے کی غلطی کرتے ہیں۔'

اجمل سوچ رہا تھا۔ 'بیگم صاحبہ کتنی اچھی ہیں۔ انہیں ساتھ لے کر اپنے گھر جاؤں گا تو محلہ بھر کی گاڑی کو دیکھ کر مجھ پر رشک کرنے لگے گا۔ مُون نے کتنی بار عشرت سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ملوانے کی کوئی صورت نہیں بنی۔ آج خدا نے موقع بنا دیا ہے۔'

عشرت اپنی بیٹی کے پیچھے جاتے ہوئے رُک کر بولی۔ ''بیٹے کو سیر کے لیے لے کر جانے والا باپ کسی کا ڈرائیور نہیں ہوتا۔ تم بھی باپ بننے کے لیے اپنی یونیفارم تبدیل کر لینا۔''

وہ چونک کر اثبات میں سر ہلانے لگا۔

شام ڈھلنے سے کچھ پہلے ہی سرونٹ کوارٹر کی طرف بڑھ گیا جہاں اُس کا لباس کھونٹی پر لٹکا اپنے پہننے والے کی شام کے اُترنے کا انتظار کر رہا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر تینوں مین گیٹ کو عبور کر گئے۔ کھڑکی میں دونوں طاقچوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہوئے سردار رب نواز کے حلق سے یاسیت آمیز گہری سانس خارج ہوئی۔ اُس نے بڑبڑا کر کہا۔ ''جوان العمر ملازم سے چند قدم دور چلتے ہوئے بھی اُس کی بیوی سمجھی جائے گی۔ میرے پہلو سے چپک کر چلتی ہے تو دیکھنے والے اُسے میری بیٹی کہنے لگتے ہیں۔ ہائے! جہاں اتنا کچھ ایجاد کر لیا گیا ہے وہاں عمر کی کیسٹ کو ریورس کرنے والی کوئی مشین کیوں اَب تک ایجاد نہیں ہو پائی؟''

دوسری طرف گاڑی مینا لک روڈ سے اُتر کر اجمل کی گلی کے سامنے رُک چکی تھی۔ وہ اُترتے ہوئے خفت آلود لہجے میں بولا۔ ''بیگم صاحبہ! جسٹ اے منٹ... میں ندیم کو لے کر آتا ہوں۔''

بچے نشیب و فراز کو نہیں سمجھتے، مرضی کرتے ہیں۔

عقیدت لپک کر اُتری اور بولی۔ ''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ آپ کا گھر دیکھنا چاہتی ہوں۔''

وہ الجھ گیا۔ شرمساری سے بولا۔ ''وہاں آپ کے دیکھنے کے لائق کوئی شے نہیں ہے۔''

عشرت نے بھی بیٹی کی تقلید کی۔ گلی میں قدم رکھتے ہوئے بولی۔ ''چلو اجمل! یہاں تک آ گئے ہیں تو تمہاری بیوی سے ملے بغیر واپس جانا نہایت نامناسب ہوگا۔''

وہ نہ چاہتے ہوئے اُن کے ساتھ چل پڑا۔ دستک دینے پر دروازہ ندیم نے کھولا۔ والہانہ انداز میں باپ کے گلے لگنا چاہتا تھا اور آج پھر دیر سے آنے کا شکوہ کرنا چاہتا تھا مگر باپ کے ساتھ دو اجنبیوں کو دیکھ کر ٹھٹک کر رُک گیا۔ نووارددوں کے حلیے سے مرعوب ہو کر پیچھے ہٹ کر راستہ دیتے ہوئے بولا۔ ''ابو! خوش آمدید...''

پہلے چھاتی سے لگ کر ویلکم کہتا تھا، آج چند قدم پیچھے کھڑا ہو کر خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ اُس کے عقب میں مُون نمودار ہوئی۔ آن کی آن میں سمجھ گئی کہ آنے والے اجنبی نہیں بلکہ اُس کے سرتاج کے مالک ہیں۔ عشرت کو سرتاپا بڑی توجہ سے دیکھا۔ پسندیدگی کا احساس عود کر آیا۔ گلے لگنا چاہتی تھی مگر یہ نہیں جانتی تھی کہ آنے والوں میں ملنے کا کون سا طریقہ رَوا ہوتا ہے۔ جھجک کر سلام کرتے ہوئے بولی۔ ''بیگم صاحبہ! گھر کبھی چھوٹا محسوس نہیں ہوا، آپ اور چھوٹی بی بی آئیں تو پتا چلا کہ ہمارا گھر بہت ہی چھوٹا ہے۔''

وہ مسکراتی ہوئی عقیدت کے ساتھ گھر میں داخل ہوگئی۔ مہمانوں کی تواضع کے لیے محلے کی دُکان سے کولڈ ڈرنک لینے کے لیے اجمل اُلٹے قدموں گھر سے نکل گیا۔ اپنی مُون پر یقین تھا کہ وہ بیگم صاحبہ کی خدمت اور مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑے گی۔

پلٹا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ چاروں آپس میں پوری طرح گھل مل چکے تھے۔ ندیم اور عقیدت اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر کتابوں کی الماری کے سامنے کھڑے تھے۔ عشرت بڑے سہل آمیز انداز میں چارپائی پر براجمان تھی۔ دروازے کے بیچ میں کھڑے ہو کر اُس نے مُون کو باہر برآمدے میں آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اُس کے پیچھے پیچھے باہر آ گئی۔ کولڈ ڈرنکس لے کر ٹرے میں سجاتے ہوئے رازداری سے بولی۔ ''یہ کیا کرنے آئے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''یہ ندیم کو لینے کے لیے آئے ہیں۔ عقیدت واٹر پارک دیکھنا چاہتی تھی۔ بیگم صاحبہ نے سوچا کہ سبھی اکٹھے چل کر دیکھ لیتے ہیں۔''

وہ اشتیاق آمیز انداز میں بولی۔ ''تو کیا میں بھی چلوں؟''

وہ سوچنے لگا کہ کہیں بیگم صاحبہ کو ناگوار نہ گزرے۔ اُسے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر مُون مایوسی سے بولی۔ ''پر میں کیسے جا سکتی ہوں۔ ڈھیر سارا کام پڑا ہے۔ نمٹاتے نمٹاتے شام ہو جائے گی۔''

دس پندرہ منٹ کے بعد جب عشرت نے چلنے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ گاڑی کی چابی اُٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ مُون سے بولا۔ ''تم دروازہ بند کر لینا۔ ہمیں واپسی میں دیر ہو سکتی ہے۔''

عشرت چونکی۔ ''تو کیا یہ ساتھ نہیں چل رہی؟''

مُون نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں بیگم صاحبہ! گھر کو اکیلا تو نہیں چھوڑا جا سکتا نا!''

عشرت نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ بڑے پیار سے بولی۔ ''گھر میں سب سے زیادہ قیمتی شے تو تم ہو۔ تمہارے علاوہ یہاں کوئی چیز چوری کیے جانے کے لائق نہیں۔ ہم تمہیں ساتھ لے کر ہی جائیں گے۔''

مُون نے گھبرا کر اپنے سرتاج کی طرف دیکھا۔ وہ کندھے اُچکا کر بولا۔ ''بیگم صاحبہ ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔''

دِل میں یکبارگی سے خوشی بھر گئی۔ جلدی جلدی خود کو تیار کیا اور اُن کے ساتھ باہر آ گئی۔ تالا لگاتے ہوئے سوچنے لگی۔ 'خدا جانے مجھے ان کے ساتھ جانا چاہیے یا نہیں...'

گاڑی میں عشرت اور ندیم کے درمیان پھنس کر بیٹھی تو دل ہی دل میں گھبرا سی گئی۔ اُس کا سرتاج ہر روز دو کشتیوں میں پیر رکھ کر سنبھل سنبھل کر چلتا تھا۔ مُون کا پہلا تجربہ تھا۔ سوچ میں پڑ گئی۔ 'اتنی آرام دہ اور ٹھنڈی ٹھار گاڑی میں تمام دن گزارنے کے بعد اجمل کس طرح سائیکل پر سوار ہو جاتا ہے؟ امیروں کی بڑی بڑی اور کشادہ کوٹھیوں میں زندگی اوپر نیچے آتی رہتی ہے۔ غریبوں کے گھر میں ایک مرتبہ عدم توازن اُتر آئے تو جان لبوں پر آنے لگتی ہے۔ میرے سرتاج کا سر دن میں کئی مرتبہ سرد گرم ہوتا ہوگا۔ کسی دن بیمار پڑ گیا تو میرا کیا ہوگا؟'

گاڑی میں بیٹھ کر وہ سڑکیں بھی خوبصورت دکھائی دینے لگی تھیں جن پر بادل ناخواستہ پیدل چل کر وہ ترکاری وغیرہ لینے کے لیے بازار کی طرف جاتی تھی۔ جو باتیں اجمل ہر رات اُسے سمجھانے کی کوشش کرتا تھا، آج بِنا کسی کے سمجھائے سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ اُسے معاشرتی اور طبقاتی تقسیم کا ادراک ہو گیا۔ سائیکل اور کار میں فرق نظر آ گیا۔

واٹر پارک آ گیا۔ وہ اُترے اور ریسپشن کی طرف بڑھ گئے۔

دس منٹ کے بعد تینوں گراسی پلاٹ کے وسط میں فکسڈ چیئرز پر براجمان ہو چکے تھے۔ ندیم اور عقیدت دونوں پانی کے چینلوں کے بل پر اپنا اپنا بچپنا ہوا میں اڑانے میں مصروف ہو گئے۔ اجمل بڑی محویت سے اپنے بیٹے کے چہرے پر رقصاں سچی خوشی کی پرچھائیاں دیکھ رہا تھا۔ ایسے میں عشرت نے مُون سے کہا۔ ''یوں لگتا ہے جیسے دونوں کئی سالوں سے اکٹھے کھیلتے چلے آ رہے ہوں۔ بچے کتنی جلدی بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ بڑے بے تکلف ہونے میں پوری عمر ضائع کر دیتے ہیں۔''

مُون نے تعجب سے عشرت کو دیکھا۔ عجیب سی یاسیت اور بے عنوان اُداسی چہرے کے خال و خط میں اُتری ہوئی تھی۔ اُس نے اجمل سے کہا۔ ''مجھے پانی سے ڈر لگتا ہے۔ آپ دونوں کے قریب قریب رہیں۔ پاؤں پھسل گیا یا کچھ ہو گیا تو...''

وہ مسکرایا۔ ''یہ تمام ڈراے بازی بچوں کے لیے ہے اور بچوں کی نفسیات اور مہارت کو مدنظر رکھ کر کی جاتی ہے۔ تمہیں گھبرانے یا ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

وہ مطمئن نہ ہوئی بلکہ سہمی سہمی نگاہوں سے اپنے ندیم کو دیکھتی رہی۔ عشرت نے کہا۔ ''اجمل! تم مُون کی بات مان لو۔ جب تک تم دونوں بچوں کے قریب نہیں جاؤ گے، اِس کی توجہ اُدھر ہی رہے گی۔''

وہ اُٹھ کر شور مچاتی جھیل کی طرف چلا گیا۔ متحرک پانی میں قمقموں اور بلبوں کی رنگ برنگی روشنیاں منعکس ہو کر عجیب سماں باندھ رہی تھیں۔ اُس نے دل ہی دل میں خیال کیا تھا کہ دونوں عورتیں اُس کی موجودگی میں کھل کر گفتگو نہیں کر رہیں۔ عورتوں کی من پسند تفریح تعارف اور بے لاگ گفتگو ہی ہوتی ہے۔ پودوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے سوچنے لگا۔ 'کار کے بغیر زندگی بے کار ہے۔ سائیکل پر گھنٹوں عذاب جھیلنا پڑتا ہے۔ کار چند منٹوں میں ہی شانت کر دیتی ہے اور منزل تک بھی پہنچا دیتی ہے۔ عقیدت اور ندیم میں یہی فرق ہے۔ کاش! ایسا ہو کہ میں اِس فرق کو ختم کر سکوں۔ کوئی ایسا بزنس، کوئی نوکری یا کچھ بھی...'

رات دھیرے دھیرے کھسک رہی تھی۔ اُنہوں نے پُرتکلف کھانا منگوایا۔ کھانے کے بعد واپسی کی تیاری کرنا چاہی تو عقیدت اور ندیم بپھر گئے۔ وہ ابھی یہاں سے جانے پر رضامند نہیں تھے۔ ندیم نے دھڑلے سے کہہ دیا۔ ''ابو! ڈیڑھ ماہ کی ضد پر ہتھیار ڈالتے ہوئے مجھے یہاں لائے ہیں۔ پھر کبھی یہاں آ پاؤں گا یا نہیں، اِس لیے کچھ دیر اور دے دیجیے۔''

اُسے ندامت ہوئی۔ استفہامیہ نگاہوں سے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''اوکے مین! جاؤ۔ عقیدت! تم بھی جاؤ۔ خوب کھیلو۔ جب جی بھر جائے، تب لوٹنا۔ واپسی کی فکر نہ کرنا۔''

مُون نے عجیب سی نظروں سے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھا اور دل میں سوچا۔ 'مجھے کھانا گرم کرنے میں دیر ہو جائے تو اجمل چیخ اُٹھتا ہے... اگر اُس کی بانہوں میں آنے کے بجائے ندیم کی طرف بڑھنے لگوں تو لال بھبوکا ہو جاتا ہے۔ یہ اپنے سرتاج سے دُور رات گئے تک بڑی بے فکری سے بیٹھی ہوئی ہے۔ کیا وہ اِس پر خفا نہیں ہوتا؟'

عشرت بڑے غور سے مُون کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر سامنے سے روشنی پڑ رہی تھی۔ خال و خط روشن تر تھے۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ''مُون! تمہارے ہونٹ بڑے سیکسوئل ہیں۔''

وہ جھینپ کر اجمل کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ لوہے کی ریلنگ پر دونوں ہاتھ رکھے اُن کی جانب پشت کر کے کھڑا تھا۔ مُون نے شرما کر عشرت کو دیکھا اور بولی۔ ''جی! مگر آپ مجھ سے کہیں زیادہ خوبصورت اور اسمارٹ ہیں۔''

عشرت اُس کی کسی بات کا جواب دیے بغیر کسی تشنہ عاشق کی طرح اُسے فرطِ محبت سے دیکھتی رہی۔ دل نے صدمہ پہنچانے کی کوشش کی۔ 'سندر وہی جسے راجہ چاہے...' سامنے بیٹھی ہوئی مُون کو اُس کا راجہ اپنے پیار بھرے آسمان پر چاند کی طرح چڑھائے رکھتا ہے۔ وہ چمکنے لگتی ہے تو آب و تاب میں اِس کا اپنا کوئی کردار نہیں، چاہنے والے کی محبت کا اعجاز ہے۔ تمہیں چاہنے والے کا دل ترنگ اور آرزو کھوتا جا رہا ہے۔ اپنی دھڑکن پر گرفت کمزور کیے جا رہا ہے، ایسے میں تمہاری جولانیوں کو مہمیز کیسے کر سکتا ہے۔ تم خوبصورت ہو، یہ خوبصورت تر ہے۔ تم مرنے والی ہو، یہ ہمیشہ کے لیے امر ہونے والی ہے۔''

گیارہ بجنے والے تھے جب عقیدت اور ندیم بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ اُن کے قریب آئے اور تھکے تھکے انداز میں واپس جانے کا ارادہ ظاہر کرنے لگے۔ عشرت نے پوچھا۔ ''ندیم بیٹا! دل بھر گیا؟''

دو محبت کرنے والوں کے تاج محل میں پرورش پانے والا مسکرا کر بولا۔ ''بھلا دل بھی کوئی بھرنے والی شے ہوتی ہے؟ جتنا بھرتے جائیں گے، اتنا بڑا خلا پیدا ہوتا جائے گا۔''

عشرت اور مُون نے یکبارگی استعجاب آمیز نگاہوں سے اُسے دیکھا اور مسکرانے لگیں۔

سردار رب نواز اپنی زمینوں کے معاملات سدھارنے کے لیے گاؤں گیا ہوا تھا۔ ہفتے میں دو تین دن گاؤں میں رہنا اُس کے معمولات میں شامل تھا۔ ایسے میں عشرت سارا دن ٹی وی پر پروگرام دیکھا کرتی تھی۔

آج بھی اونچے شملے والے لوگوں کی کالونی میں واقع پُرتعیش اور بڑے قد والی کوٹھی کے بڑے سے بیڈروم میں وہ بیڈ پر نیم دراز ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ شراب میں نشہ نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا تو سب سے پہلے اپنے پیندے کے بل پر بوتل ناچنے لگتی۔ ٹی وی کی ننھی سی اسکرین میں سوائے متحرک تصویروں کے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر کچھ ہوتا تو وہ بھی اپنے بال سفید کر بیٹھتا۔ کبھی لڑکھڑا کر گر پڑتا۔ کبھی کسی دوشیزہ کی جوانی کو منعکس کرتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر شور مچانے لگتا۔

بوتل پُرسکون تھی۔ پینے والی دھڑکن کی یک زدہ سردیوں پر کمبل میں لپٹے پیروں میں نادیدہ پائل باندھے محوِ رقص تھی۔ دائیں پنڈلی پر بائیں پیر کا لمس بھی عجیب لگ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں گلابی ہو رہی تھیں۔ ائرکنڈیشنر نے کمرے کو خاصا سرد کر دیا تھا مگر اُس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے جن میں ٹی وی کی اسکرین میں سے پھوٹنے والے رنگ منعکس ہو کر لرزنے لگے تھے۔ اُس نے جذبات آگیں سانس حلق میں اُتار کر تکیے کے نرم گداز کو سینے میں اُتارنے کی اپنی سی کوشش کر ڈالی۔ چین نہیں آیا۔ ریموٹ سے ٹی وی آف کر دیا۔ کمرے میں یک لخت گھپ سا اندھیرا اچھل گیا۔

خود پر جبر کیا جا سکتا ہے مگر جوانی میں نہ تو دھڑکن پر قابو پایا جا سکتا ہے اور نہ ہی سانسوں کی بڑھتی گھٹتی رفتار پر دسترس قائم رہتی ہے۔ ٹی وی کا ننھا سا سرخ بلب روشن تھا۔ اسکرین یوں مُردہ تھی جیسے مرنے والے کی روح نے اچانک اُس کا ساتھ چھوڑ کر ٹھنڈا اٹھار کر دیا ہو۔ مُردہ اسکرین اپنے آخری منظر کو اُس کی نگاہوں میں ٹھہرانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

وہ اپنی آنکھیں ملتے ہوئے آہستگی سے اُٹھی، کھڑکی تک آئی اور پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگی۔ کھڑکی کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ باہر تھکی ماندی شام بھاگ جانے کی تیاریوں میں مشغول دکھائی دی۔ اطراف کے امیرزادوں کی کوٹھیوں پر سکوت طاری تھا۔

وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑبڑائی۔ ”یہ اچانک مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں۔ سردار رب نواز جیسے قد آور اور نامور شخص کی بیوی ہوں۔ بیوی بھی وہ جسے وہ خاص کہتا ہے۔ میرے جیسی دنیا میں کوئی نہیں۔ پھر میں لڑکیوں کی طرح کیوں بے چین رہنے لگی ہوں؟“

اُس کے باپ نے سردار رب نواز کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اُسے اپنے لیے جیون ساتھی چننے کی پوری آزادی دی گئی تھی۔ اُس نے اپنی مرضی سے سردار جیسے بوڑھے شوہر کو قبول کیا۔ قبولیت دائمی ہوگی تو کہلائے جانے کی حق دار رہے گی۔ کہیں نقب لگ گئی تو پلکوں سے جھٹک کر پھینک دی جائے گی۔

اُس نے آج تک اپنے شخصی قلعے میں کسی جانب بھی نہ نقب لگنے دی تھی نہ کسی کو زقند بھرنے کی اجازت دی تھی۔ ایسے میں سردار کا رویہ اچانک عجیب سا ہو گیا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی کہ اُس سے رفاقت میں کہاں غلطی سرزد ہوئی ہے؟ جتنا سوچتی، اتنا ہی اُلجھ جاتی۔ کوئی سراغ، کوئی سرا ہاتھ نہیں لگ رہا تھا۔ برسوں سے برف پر لگی سِل کو سردار نے باتوں ہی باتوں میں چولہے پر چڑھا دیا تھا۔

وہ گزشتہ کئی دنوں سے آنکھوں پر پٹی باندھے ٹٹولنے میں مصروف تھی۔ انگلیاں چھلنے کو آ گئی تھیں مگر کوئی لمس آشنا کا جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا۔ سردار کو کس قسم کا شک گزرا تھا؟ وہ سوچنے لگی۔ کیا اجمل کے ساتھ تقریبات میں جانے پر سردار برانگیختہ ہوا ہے؟ پھر خود ہی تردید کرنے لگی۔ سردار کا لہجہ غصے بھرا نہیں تھا بلکہ شکست خوردہ تھا۔ تو کیا وہ واقعی اُس کی تنہائی سے خوفزدہ ہو گیا ہے؟ یا اُسے کسی نے بہکا دیا ہے؟... وہ ٹھٹک کر اُلجھ گئی۔ ہاتھ ریشم کے اُلجھاؤں میں ڈال بیٹھی۔ کون؟ بصد کوشش الزام لگانے والا کہیں دکھائی نہیں دیا تھا۔

بیڈ سے اُتر کر پھر کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ جب وہ گھر سے نکلنے لگتی یا گھر میں داخل ہونے لگتی، سردار اِسی کھڑکی میں کھڑا ہو کر اُسے دیکھا کرتا تھا۔ آج سردار کی جگہ پر وہ خود آن کھڑی ہوئی تھی۔ سردار دکھائی نہیں دیا۔ اُس نے ابھی کافی دیر تک اوجھل رہنا تھا۔ کھڑکی کھولی تو گرم ہوا کا جھونکا اُس کی زلفوں کو اُڑا گیا۔ وہ عجیب سی ہونے لگی۔ پشت پر... ائرکنڈیشنر سے نکلتی ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا سرسرا رہی تھی، چہرے پر سہ پہر کی گرم ہوا تھپڑوں کی طرح پڑ رہی تھی۔ اُسے اجمل کا دُکھ یاد آ گیا۔ ایک مرتبہ اُس نے اجمل سے پوچھا تھا۔ ”تم اتنے سنجیدہ کیوں رہتے ہو؟ تمہیں کیا دُکھ ہے؟“

اُس نے سر جھکا کر کہا تھا۔ ”دِن جنت میں گزرتا ہے، رات دوزخ میں اپنے پیاروں کے ساتھ کاٹتا ہوں۔ یہ ایسا روگ جان کو لگا ہے کہ کسی دَم ہنسنے مسکرانے کی اجازت نہیں دیتا۔“

وہ حیرانی سے مستفسر ہوئی تھی۔ ”میں سمجھی نہیں، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“

وہ جواب دیے بغیر پیٹھ پھیر کر چلا گیا۔

[illegible] گیا۔ پتا چل گیا کہ دِن کس جنت میں [illegible] رات کس جہنم میں گزارنا پڑتی تھی؟ پردے کو [illegible] سختی سے دبوچ کر کھڑی کھڑکی سے باہر جھانک [illegible] میں اچانک بے دھیانی میں پردے سے جھول [illegible] پردے کا ہُک ٹوٹ گیا۔ وہ لہرا کر قالین پر دھپ سے گر گئی۔ پردہ اُس پر غریب کی چادر کی طرح گر کر سایہ فگن ہو گیا۔ اُس نے پردے کو ہٹانے کی کوشش نہیں کی بلکہ وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گئی۔ گرنے سے تھوڑی سی تکلیف کا احساس ہوا تھا مگر اس کی جذباتی کیفیت پر احسان کرتے ہوئے وہ بھی مزہ دے گیا۔ وہ آنکھیں موندے گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

کافی دیر گزر گئی پھر ملازمہ کی دستک پر چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ چائے دینے کے لیے آئی تھی۔ چائے کا کپ تھام کر پھر کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔

کھڑکی میں اُسے سامنے والی کوٹھی کا لان دکھائی دے رہا تھا۔ پہلے خالی تھا، اب ڈھلتی سہ پہر میں آباد ہو چلا تھا۔ اُجلے لباسوں میں ایک جوڑا جوانی کی مست الست اٹھکیلیاں کرنے میں مشغول تھا۔ وہ چائے پینے کے دوران جیتا جاگتا منظر دیکھتی رہی۔ اُس نے سیکڑوں ازدواجی جوڑے دیکھے تھے۔ جوڑوں کی خلوت میں جھانکنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ آج قدرت اُسے ایک لباس میں پھنسے ہوئے دو انسانوں کی خلوت سے آشکار کر رہی تھی۔ دونوں یہ سمجھ رہے تھے کہ انہیں کوئی نہیں دیکھ رہا۔ محبت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ بھیڑ میں بھی دل تنہائی ڈھونڈ لیتا ہے۔ وہ بڑی محویت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

اچانک اُس کی نظر دھندلا گئی۔ سر جھٹک کر نظروں کا فوکس درست کیا تو چونک پڑی۔ اُس کے سامنے اجمل اور مُون کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دنیا و مافیہا سے غافل دکھائی دے رہے تھے۔ اجمل اپنی مُون کی زلفوں میں انگلیوں کی کنگھی پھنسا کر تشنہ ہونٹوں کی پیاس بجھاتے ہوئے بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ لان میں کھڑی مُون اور ونڈو میں کھڑی عشرت کے محسوسات الگ تر نہیں تھے۔ لان میں اجمل کا ہاتھ سرخ پیراہن میں ملبوس مُون کے جسم کے جس حصے کو چھوتا، کھڑکی میں کسی کی طرح ساکت کھڑی عشرت کے جسم کے اُسی حصے کو انگارا بنا دیتا تھا۔ انگارا جلا کر خاکستر کر دیتا ہے مگر یہ کیسا دہکتا ہوا انگارا تھا جو روح میں طمانیت اور ہیجان بھر دیتا تھا۔ وہ پریشان ہو گئی۔ مون لان میں کھڑی ہے یا کھڑکی میں عشرت کا روپ اوڑھے کھڑی ہے؟ کس طرح بدن کا پیغام بغیر کسی تار کے اُس تک پہنچ رہا ہے؟

اجمل نے اپنے ایک ہاتھ سے اپنی مون کا ننھا سا ہاتھ تھاما۔ دوسرے ہاتھ سے آستین کا کپڑا فولڈ کیا۔ کلائی سے کچھ اوپر والہانہ نظروں سے کسی چیز کو دیکھتا رہا۔ پھر ہونٹوں سے لگا کر چومنے لگا۔ کھڑکی میں کھڑی عشرت کا سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ بازو میں اُسی جگہ پر سرسراہٹ ہونے لگی۔ پھر یوں لگا جیسے آگ لگ گئی ہو۔ اُس نے جلدی سے کف ہٹا کر کلائی کو دیکھا۔ وہاں ایک ننھا سا تِل دکھائی دے رہا تھا۔ تِل نے اس طرح سے آگ پکڑ لی تھی کہ پورا جسم آن کی آن میں دہکنے لگا تھا۔ ارد گرد نظر دوڑائی۔ کہیں پانی دکھائی نہیں دیا۔ آگ پر پانی ڈالنا ضروری ہوتا ہے۔ اُس نے بازو اُٹھا کر تِل کو اپنی زبان سے لگا لیا۔ کچھ سکون ملا۔ پھر زبان بھی عجیب سے انداز میں سلگنے لگی۔ بے اختیار ہو کر دیوانوں کی طرح اپنے ہی تِل کو چومنے لگی۔ کچھ ایسی چیز تھی جو تِل سے نکل کر دل اور پھیپھڑوں میں اترتی جا رہی تھی اور سکون ہی سکون دیتی جا رہی تھی۔ اِس خود کشید شدہ شراب میں ایسا عجیب سا نشہ موجود تھا کہ بوتل بھی ناچنے پر مجبور ہو گئی۔

ایسے میں اُن کا تین چار سالہ بچہ بھاگتا ہوا اُن تک پہنچا۔ ان کے بیچ بانہیں پھیلا کر کھڑا ہو گیا اور اپنے وجود کا احساس دلانے لگا۔ وہ دونوں جھینپ کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے اور بچے کی ناز برداریاں کرنے لگے۔ ان کی دنیا میں تیسرا آ گیا تھا۔ عشرت کی دنیا میں بھی کوئی آ چکا تھا۔ گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز نے اُسے چونکا کر پورچ کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔

اجمل اور عقیدت گاڑی سے اُترے تھے۔ لان میں دکھائی دینے والا جوڑا ازدواجی جنت کے ایک محل سے نکل کر دوسرے میں قدم رکھ رہا تھا۔ بے اعتدالی سے دھڑکتا ہوا دِل اُسے سمجھانے لگا تھا کہ جسے وہ دیکھ رہی ہے، وہ اجمل نہیں ہے۔ جسے نہیں دیکھ رہی، وہ اجمل ہے۔

بہکتا ہوا جمود ٹوٹ گیا۔ وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ ایک رسالہ اُٹھا کر ورق گردانی کرنے لگی۔ کسی تحریر پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ نظر نے زندہ انسانوں کی کہانی جاگتے تھرکتے ابدان کے ساتھ دیکھی تھی۔ مُردوں کی طرح لیٹے ہوئے بے سُدھ لفظوں پر اعتبار کرنے کو جی نہیں مان رہا تھا۔ ملازمہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اطلاع دینے کے انداز میں حسبِ عادت بولی۔ ”بیگم صاحب! عقیدت بی بی آ گئی ہیں۔ کیا آپ کے

لیے اور چائے لاؤں؟''

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

ملازمہ جاتے ہوئے اپنے پیچھے دروازہ بند کر گئی۔ وہ رسالہ بند کر کے بائیں کلائی پر چمکتے ہوئے تل کو دیکھنے لگی۔ جان دار جسم پر بے جان تل آج کتنا شوخ ہو گیا تھا۔ انگلی کی اگلی پور کے لمس سے تل کو سہلانے لگی، بہلانے لگی، سلانے لگی۔ جتنا ہمکتی، اتنا ہی بے چین ہو کر نخرے دکھانے لگتا۔ وہ سوچنے لگی۔ 'بدن کی سفید چمکتی چادر پر لگے ہوئے اس کالے دھبے کو اُتار پھینکنے کے لیے کتنے جتن کیے مگر اس نے جان نہیں چھوڑی۔ ماں کہتی تھی کہ نئی نکور عمارت کو نظرِ بد سے بچانے کے لیے منڈیر پر پرانی کالی ہنڈیا رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ آج کیا ہوا ہے؟ بدنظروں سے بچانے والا کالا دھبا ہی پورے بدن کی عمارت میں سوہنا لگ رہا ہے۔ کہیں اسے نظر نہ لگ جائے۔'

اچانک دِل بیٹھ سا گیا۔ جسے دکھانے کے لیے اس چمکتی دمکتی دُنیا میں اُتری تھی، اُس کی نظریں بڑھاپے کی زد میں آ کر دُھندلا گئی تھیں۔ ازدواجی خلوت میں سردار کا ہاتھ اُس کی کلائی پر کانپ جاتا تھا... ایسے میں نظر تل کو بھرے بازو پر کیسے تلاش کر پاتی؟ اپنی نظر کی کمزوری پر وہ کہنے لگا تھا کہ ''جان! جاؤ، میری خاطر میرے محل میں، اپنے دِل میں کسی رقیب کو جگہ دو۔ میرا بڑھاپا تیرے نشیب و فراز سے اب نہیں بہلتا، اِس کے لیے کوئی جیتا جاگتا کھلونا پیدا کرو۔''

دو آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے۔ ایک امتحان میں پورے نمبروں سے پاس ہوئی تھی۔ ممتحن نے انعام دینے کے بجائے دوسرے کمرۂ امتحان میں بٹھا دیا تھا۔ تل کو انگلی سے چھو کر اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے بڑبڑائی۔ ''تم میرے ساتھ ہی دُنیا میں آئے تھے۔ میری ہر رات کے گواہ ہو۔ میرے ہر دِن کے امین ہو۔ بتاؤ! کیا میں کبھی ایسی رہی ہوں کہ میرا جان سے پیارا شوہر مجھے کسی اور کی بانہوں میں جانے کا حکم دے؟ کیا میں تمہیں سردار رب نواز کے علاوہ کسی اور کو دکھا سکتی ہوں؟''

اپنے سوال کا جواب خود ہی دینا پڑتا ہے۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے سسکنے لگی۔ دُنیا میں سردار کے علاوہ کوئی بھی ایسا نہیں تھا جسے وہ اپنا دہکتا ہوا تل پیش کر سکتی اور کہہ سکتی۔ ''لو دیکھو! ایک ننھا سا دل جو نہ تو دھڑکتا ہے اور نہ ہی رقص کرتا ہے مگر عشق کے خون کو آن کی آن میں اپنی جانب کھینچ لیتا ہے۔ دِل خون دیتا ہے، تل خون پیتا ہے۔''

ایسے میں دیکھنے والا کمرے کے دروازے پر پہنچ کر دستک دینے لگا۔ اُس نے چونک کر دروازے کی سمت نگاہ اُٹھائی۔ اَدھ کھلے دروازے میں اجمل کھڑا دربارِ حُسن میں حاضری دینے کی اجازت طلب کر رہا تھا۔ وہ جلدی سے کف برابر کر کے ننھے سے سیاہ تل کو چھپانے لگی۔

وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ ''بیگم صاحبہ! سردار صاحب کا فون آیا ہے۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

وہ چونک گئی۔ جلدی سے اُٹھ کر اُس کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی گراؤنڈ فلور پر آ گئی۔ فون اُٹھا کر بولی۔ ''جی! خیریت تو ہے نا؟''

سردار کی بھاری آواز سنائی دی۔ ''تم گھبرا کیوں گئی ہو؟ میں نے تو حال دریافت کرنے کے لیے فون کیا ہے۔ کہو! کیسی ہو؟''

وہ خود پر قابو پا کر بولی۔ ''بالکل ٹھیک ہوں۔''

چند اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد رابطہ منقطع ہو گیا۔ ریسیور کریڈل پر رکھ کر مُڑی۔ اجمل کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگی۔ 'سردار عجیب حرکتیں کرنے لگا ہے۔ موبائل فون کے بجائے فکسڈ لائن پر رابطہ کرنے کی کیا تُک ہے بھلا؟'

کمرے میں پہنچی تو یاد آیا کہ زندگی میں پہلی مرتبہ اجمل اُس کے بیڈ روم تک پہنچا تھا۔ اچانک جیسے کوئی برق کوندا ذہن میں لپک گیا ہو۔ سوچا۔ 'کیا سردار نے اُسے بیڈ روم کا راستہ دکھانے کے لیے یہ حرکت کی ہے؟'

گراؤنڈ فلور پر بلوا کر خیریت دریافت کرنے کا کوئی اور مقصد سمجھ میں نہیں آیا تو وہ سلگ اُٹھی۔ اپنے ارزاں ہونے کا بُری طرح احساس ہوا۔ کیا وہ اِس قابل رہ گئی تھی کہ ملازم کو اُس کی خواب گاہ میں بھیجا جائے۔ عورت کی عقل کی ٹرین ایک مرتبہ پٹڑی سے اُتر جائے تو بہ مشکل چڑھتی ہے۔ وہ خود کو تسلی دینے کے لیے جتنی تو جیہیں سوچتی، اتنا ہی اُلجھ جاتی۔ بے بسی سے رونے لگی۔ ہچکیاں تھیں کہ تھمنے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ غصے اور دُکھ میں بے اختیار ہو کر اُس نے موبائل پر سردار سے رابطہ کیا۔ رابطہ ہونے پر وہ چیخ پڑی۔ ''آپ نے اجمل کو میرے بیڈ روم کا راستہ کیوں دکھایا ہے؟''

سردار نے گھبرا کر کہا۔ ''کیا مطلب؟ میں ایسا کیوں کروں گا؟''

وہ رونے لگ گئی۔ سردار سامنے نہیں تھا، اگر موجود ہوتا تو اُس کی حالت کو دیکھ کر سانس لینا بھول جاتا۔ وہ بولا۔ ''خدا کے لیے عشرت! تم روتی ہو تو میرا دِل کٹنے لگتا ہے۔ میں اَب اتنا مضبوط نہیں رہا۔ رونا بند کرو اور مجھے بتاؤ کہ اجمل کیوں

تمہارے کمرے میں آیا ہے؟''

وہ زِچ ہو کر ہونٹ کاٹنے لگی۔ بے بسی سے بولی۔ ''آپ مجھے میرے سیٹ پر فون کرتے ہیں۔ آج ایسی کون سی قیامت آن ٹوٹی کہ آپ نے فکسڈ لائن والے سیٹ پر فون کیا اور اجمل کو مجھے بلانے کے لیے بھیج دیا... کیوں؟ کیا میں ایسی ہوں کہ میرے کمرے میں ملازم منہ اُٹھائے داخل ہوتے پھریں؟''

سردار نے ایک طویل سانس لے کر کہا۔ ''میری جان! تم غلط سمجھی ہو۔ اجمل ایسا نہیں ہے۔ میں نے واقعی اُسے تمہیں بلانے کے لیے بھیجنے کی غلطی کی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے دانستہ یہ کام کیا ہے۔ میں نے دو تین مرتبہ تمہارے نمبر کو ٹرائی کیا مگر رابطہ نہیں ہوا۔ اِس لیے...''

وہ چیخ پڑی۔ ''مجھے طفل تسلیوں سے مت بہلائیں۔ سُن لیں۔ اگر اُس رات کی کہی ہوئی بات پر عمل کر رہے ہیں تو کان کھول کر سُن لیں... آپ بہت غلط کر رہے ہیں۔ میں عورت ہوں۔ جیتا جاگتا انسان ہوں۔ بھیڑ بکری نہیں ہوں کہ آپ کا جب جی چاہے، ذبیحہ قرار دے کر قربانی طلب کر لیں۔ میں مر سکتی ہوں مگر ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں لے سکتی۔ سمجھ رہے ہیں نا آپ؟''

سردار کی زبان تالو سے چپک گئی۔ بہ دقت تمام وہ بولا۔ ''عشرت! تم غلط سمجھ رہی ہو۔''

''میں اَب تک غلط فہمیوں کا شکار رہی ہوں۔ اَب آنکھ کھل گئی ہے۔ نہ جانے آپ کی غیرت کیوں کمر کے بَل زمین پر جا گری ہے۔''

سردار نے سنبھلنے کے لیے آسرا لیا۔ ''دیکھو! زبان کو سنبھالو۔ مجھے بے غیرت کہو گی تو وقت سے پہلے بیوہ کہلاؤ گی۔''

''میں شوہر کی زندگی میں ہی بیوگی کا احساس دِل میں محسوس کرنے لگی ہوں۔'' وہ رونے لگی۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ فون کو بند کیے بغیر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور خود بانہیں کھول کر اوندھے منہ لیٹ کر سسکیاں لینے لگی۔ فون کے ننھے سے اسپیکر میں سے سردار کی بے تاب پُکار گونجنے لگی۔ ''عشرت! عشرت! تم بولتی کیوں نہیں ہو؟ کیا ناراض ہو گئی ہو؟... پلیز! مجھ سے ناراض ہونے کے بجائے میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو...''

بھنبھناہٹ کی طرح گونجنے والی صدا چند لمحوں کے بعد معدوم ہو گئی۔ اُس کی سسکیوں نے نہ رُکنا تھا، نہ رُکیں۔ اچانک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھلا۔ عقیدت بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ ماں کو اوندھے منہ لیٹے دیکھ کر ہنسنے لگی۔ چھلانگ لگا کر اوپر چڑھ گئی۔ قریب ہوئی تو چونک پڑی۔ ہنسی ٹھہر گئی۔ گھبرا کر بولی۔ ''ماما! آپ رو رہی ہیں؟ کیوں؟ پھر پاپا نے کچھ کہہ دیا ہے کیا؟''

وہ سیدھی ہو گئی۔ بیٹی برابر میں لیٹ کر رونے کا سبب دریافت کر رہی تھی۔ اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''میری جان! آپ کے پاپا تو زمینوں پر گئے ہوئے ہیں۔ وہ یہاں نہیں ہیں۔ میں تو بس ویسے ہی رو رہی تھی۔''

عقیدت اُس کے چہرے پر اپنے گال رگڑتے ہوئے بولی۔ ''ماما! میں بچی ہوں مگر مجھے بچہ نہ بنائیں۔ میں جانتی ہوں کہ آنسو بلاوجہ آنکھوں سے نہیں نکلتے مگر چھپانے کے لیے آپ کی مَن گھڑت دلیل کو جھٹلانا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔ اِس لیے کرید کر جھوٹ بولنے پر مجبور نہیں کرتی۔ مگر پلیز ماما! اَب مسکرا دیں۔ آپ ہی تو کہتی ہیں کہ انسان اپنی اولاد کو دیکھ دیکھ کر جیتا ہے۔ میرے لیے جئیں، جینے کے لیے مسکرائیں تو جانوں کہ آپ مجھ سے کتنا پیار کرتی ہیں!''

وہ زبردستی مسکرا کر عقیدت کو پوری طاقت سے بانہوں میں بھینچ کر پیار کرنے لگی۔

☆☆☆

اجمل نے سائیکل مخصوص جگہ پر کھڑی کی تو مُون لپک کر قریب آ گئی۔ ہمیشہ کی طرح مسکرا کر ویلکم کہہ کر اُس سے لپٹ گئی۔ وہ شوخی سے بولا۔ ''دَم تو لینے دیا کرو۔''

''مرد کو دَم لینے کی مہلت دے دی جائے تو وہ سانس لینے کے بہانے فضا میں خوبصورت عورتوں کی خوشبو سونگھنے لگتا ہے۔'' وہ ہنسی اور اُس کی سینے والی جیب سے جھانکتے ہوئے کاغذ کو کھینچ کر دیکھنے لگی۔ اُمید بھری نظروں سے کوئی خاص چیز تلاش کرتی رہی۔ چند لمحوں کے بعد مایوسی سے نفی میں سر ہلا کر پلٹ گئی۔ وہ اُس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے برآمدے میں آیا۔ شانوں سے پکڑ کر اپنی جانب موڑتے ہوئے بولا۔ ''مایوسی گناہ ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ...''

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ''کہ ایک نہ ایک دِن ہمارا پہلا انعام نکلے گا اور ہم راتوں رات امیر ہو جائیں گے۔ ہمارا ندیم بہت اچھے اسکول میں پڑھے گا۔ ہمارا اپنا خوبصورت سا گھر ہو گا۔ اپنی کار ہو گی... ہے نا؟''

اَجمل نے اُس کے چہرے پر چھائی ہوئی یاسیت کو دیکھ کر سینے سے لگا لیا۔ گال سہلاتے ہوئے بولا۔ ''مُون! تم بہت اچھی ہو۔ نااُمیدی تمہارے چہرے پر سجتی نہیں۔ پہلا انعام لاکھوں میں کسی ایک کا نکلتا ہے۔ ہم لاکھوں تو کیا، ہزاروں میں بھی ایک نہیں۔ ہمیں اپنی محبت کو لاکھوں میں یکتا

کرنا ہوگا۔ ایسا ہم بہ آسانی کر سکتے ہیں۔"
"سات سال ہو گئے ہیں مگر..."
"تو کیا ہوا؟ ہماری رقم ضائع نہیں ہوئی بلکہ محفوظ پڑی ہے۔"
"زیادہ چانسز کے لیے اور بونڈ لے لیتے ہیں۔"
وہ قطعیت سے بولا۔ "نہیں۔"

وہ کمرے میں داخل ہوا۔ ندیم چارپائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا نصاب کی کسی کتاب کی ورق گردانی کرنے میں غیر معمولی حد تک منہمک تھا۔ اُس نے باپ کی آواز سُن لی تھی مگر اَن جان بنا رہا۔ قدموں کی چاپ پر بھی متوجہ نہ ہوا۔ اجمل مسکراتے ہوئے اُس کے قریب چلا گیا۔ کانوں سے ہونٹ لگا کر سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ "میرے ندیم! آج تو میں نے کوئی غلطی نہیں کی، پھر یہ منہ کیوں پھولا ہوا ہے؟"

منہ بہ دستور پھولا رہا۔ وہ گردن پر گدگدی کرنے کے لیے اپنے ہونٹ رگڑنے لگا۔ ندیم کندھے اُچکا کر بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ ناکام ہو کر کھلکھلا کر ہنس پڑا اور اجمل سے لپٹ گیا۔ پیار کرتے ہوئے بولا۔ "میں تو ناراض ہونے کی ریہرسل کر رہا تھا۔ کبھی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے تو اداکاری میں کوئی جھول نہ رہے اور آپ کو پوری طرح یقین آ جائے کہ میں ناراض ہوں۔"

وہ کھانا کھا کر لیٹا تو سوچ میں پڑ گیا۔ دو چارپائیوں والے گھر میں آج ندیم کے ساتھ سونے کی باری مُون کی تھی۔ ایک رات بیٹے کے ساتھ ماں سویا کرتی، دوسری رات باپ اپنی پدرانہ تشنگی کو سیراب کرتا۔ اِس معمول میں کبھی بے قاعدگی نہیں ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف پیٹھ کیے اپنے اپنے حصے کی سوچوں سے نبرد آزما تھے۔ اجمل سوچ رہا تھا۔ 'کیا قسمت کبھی اُسے لاکھوں میں ایک بنا دے گی؟'

مُون سوچ رہی تھی۔ 'غریبوں کی قسمت کبھی نہیں چمکتی۔ دِل کو تسلی دینے کے لیے اور ہر تین ماہ آنکھوں میں سہانے سپنے سجائے رکھنے کے لیے شغل اچھا ہے۔ قرعہ اندازی والا دن مایوس کرتا ہے، اگلے دِن سے پھر وہی کاروبار شروع ہو جاتا ہے۔ ہر بار آس لگ جاتی ہے کہ آنے والی قرعہ اندازی پر ندیم کے نام پر خریدا ہوا پرائز بونڈ ہی اول انعام یافتہ قرار پائے گا اور آناً فاناً ہم زمین سے اُٹھ کر فلک کی بلندیوں پر براجمان ہو جائیں گے۔'

اجمل نے گریجویشن کے بعد بہت ہاتھ پیر مارے مگر کوئی اچھی نوکری نہ مل سکی۔ ماں باپ کے رُخصت ہونے پر وہ بادل ناخواستہ ڈرائیور بن گیا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ اُس کی شادی مُون جیسی عورت کے ساتھ ہو گئی ورنہ ڈرائیور کی مختصر سی تنخواہ پر شاید کوئی بھی گزارہ نہ کر پاتی اور کچھ ہی عرصے میں چھوڑ کر چلی جاتی۔ ندیم کی پیدائش آپریشن کے ذریعے ہوئی تھی۔ نارمل انداز میں ڈیلیوری ممکن نہیں تھی اس لیے آپریشن کرنا پڑا۔ آپریشن کے دوران کوئی ایسی پیچیدگی ہو گئی کہ اُسے ہمیشہ کے لیے بانجھ ہونا پڑا۔ ندیم صحت مند تھا۔ اُسے دیکھ کر مُون نے دِل کو تسلی دے لی اور خدا کا شکر کیا کہ وہ اُن عورتوں سے کہیں بہتر حال میں تھی جن کی گود سدا خالی رہتی ہے۔

ندیم اُن کی محبت کا واحد مرکز تھا۔ دونوں چاہتے تھے کہ اُسے شہر کے کسی اچھے اسکول میں پڑھائیں مگر اپنی آمدنی دیکھ کر ہونٹ کاٹنے لگتے۔ مکان کا کرایہ دینے، مہینے کا راشن خریدنے اور یوٹیلٹی بلوں کی ادائیگی کے بعد اتنی مختصر سی رقم بچتی تھی جس سے فرنیچر سے عاری سرکاری اسکول کا خرچ بہ مشکل پورا کیا جا سکتا تھا۔ ندیم کی تیسری سالگرہ پر مُون نے اُسے ساڑھے سات ہزار روپے والا نیا جاری شدہ پرائز بونڈ تحفے میں دیا تھا۔ بونڈ خریدنے کے لیے وہ ڈیڑھ سال سے بچت کی رقم اکٹھی کر رہی تھی۔ اُسے ہر بونڈ ہولڈر کی طرح یقین تھا کہ کسی نہ کسی دِن کاغذ کا یہ سرکاری ٹکڑا اُنہیں غربت کی دوزخ سے نکال کر امارت کی فردوس میں لے جائے گا۔ طویل عرصہ گزرنے پر اُسے نااُمیدی سی ہونے لگی تھی۔ ایسے میں اجمل اُس کی ڈھارس بندھاتا رہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کی مُون اُمید کے طاقتور ٹرانس میں رہے اور معمول کی خوش اندامی برقرار رکھے۔

وہ پہلو کے بل لیٹا ڈرائیونگ سے مختلف نوعیت کی جاب کے حصول کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لمبا عرصہ گزرنے پر اُسے یقین کرنا پڑا تھا کہ یہ معمولی سی نوکری اُس کے خوابوں کی تکمیل میں کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ دونوں نے کروٹ بدلی اور آمنے سامنے ہو گئے۔ وہ عموماً اِس اتفاق کا شکار ہوتے رہتے تھے۔ مُون نے سرگوشی کی۔ "کیا سوچ رہے ہیں؟"
"تم کیا سوچ رہی تھیں؟"
"میں ندیم کے بارے میں فکرمند ہوں۔"
"کیوں؟ کیا اُس کی اَبھی سے شادی کرنا چاہتی ہو۔"
"اوں ہوں..." وہ جھینپ کر بولی۔ "آپ ذرا جلدی چھٹی کر کے آ جایا کریں اور اُسے تھوڑا سا پڑھا دیا کریں۔ اُس کے سبھی کلاس فیلو ٹیوشن لیتے ہیں۔ وہ آگے نکل جائیں گے، یہ پیچھے رہ جائے گا۔"

...بیٹے کے بارے میں سوچتی ہو، بیٹے کے باپ پر کوئی ... ہے نا؟"
... دیکھتے لگی۔ تاثرات سے پتا چلا کہ ... ہے تو گہرا سانس لے کر آنکھیں موند کر ... ہوئے سے بولی۔ "بیٹے کے دل میں میری ... ہے۔ جب ہماری بہو آ جائے گی، دِل کے ... بدل جائے گا۔" پھر اُس کے سینے پر ہاتھ ... کر بولی۔ "میں جانتی ہوں کہ میری جگہ صرف اور صرف ... ہے۔ اپنے گھر کے بارے میں نہیں سوچوں گی تو کس لیے فکرمند رہوں گی؟ دِن رات آپ کی سلامتی کی ... مانگتی رہتی ہوں۔ آپ ہیں تو سب کچھ ہے اور اگر...
... اللہ نہ کرے۔ ایسا سوچوں تو مجھے موت آ جائے۔"
اجمل نے طمانیت سے مسکرا کر اُس کا سینے پر دھرا ہوا ... تھام لیا اور چومتے ہوئے بولا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ... کری چھوڑ کر کوئی اور تلاش کرنی چاہیے۔ یہاں لگی بندھی ... اہ ہے۔ کوئی ترقی نہیں، کوئی اضافہ نہیں۔ آج ہمارا خرچ ... ہے، کل زیادہ ہوگا۔ تب ہم اتنی تنخواہ میں کیسے گزارہ کر ... یں گے۔"
"مثلاً؟" مون نے پوچھا۔ "آپ کس قسم کی نوکری ... ش کرنا چاہتے ہیں؟"
"جیسی بھی ہو، تنخواہ یہاں سے زیادہ ہو۔"
"اگر اجازت دیں تو میں کوئی نوکری کر لوں۔ آپ پر ... جھ ہلکا ہو جائے گا۔" اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا کیونکہ وہ ... د بار کام کرنے کی اجازت طلب کر کے ڈانٹ کھا چکی ... ں۔ آج اجمل ہتھے سے اکھڑنے کے بجائے مسکرا کر بولا۔ "میری مُون! یہ درست ہے کہ عورتوں کا اِس دور میں کام کرنا ... یوب نہیں سمجھا جاتا مگر نہ جانے کیوں میں کام کی نیت سے ... ہارا گھر سے نکلنا برداشت نہیں کر سکتا۔ تم مجھ سے یہ بات نہ ... یا کرو۔ مجھے دُکھ ہوتا ہے۔"
"تو کیا آپ کو مشین کی طرح کام کرتے دیکھ کر میں خوش ... تی رہوں؟" وہ بولی۔ "دوسری گلی میں ایک گارمنٹس فیکٹری ... ہے۔ سُنا ہے کہ وہ کٹے ہوئے کپڑے گھروں میں بھیج دیتے ... ں، سِل جائیں تو اُٹھا لے جاتے ہیں۔ معاوضہ بھی اچھا دیتے ... ں۔ پڑوسن حمیدہ بتلا رہی تھی کہ دِن میں ڈیڑھ دو سو روپے ... سانی سے بن جاتے ہیں۔ میں سلائی کا کام جانتی ہوں۔ ... سارا دِن فارغ رہنے سے بور ہو جاتی ہوں۔ اگر کام پکڑ لوں تو ... ادِن اچھا گزر جائے گا۔ اجمل پلیز!"
اجمل نے منہ بنا کر کروٹ بدل لی۔ وہ اُس کی ناراضی کو بھانپ کر اُٹھ بیٹھی اور کندھے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑتے ہوئے بولی۔ "آپ ناراض ہوتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے میں بھری دُنیا میں آن کی آن میں تنہا ہو گئی ہوں۔ ایسے تو نہ کیا کریں۔"

وہ فوراً ہی مان گیا۔ محبت کرنے والے ملکوں کی سرحدوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ زندگی کی سرحدی لکیر کو بے اختیار عبور کر کے محبوب سے جا ملتے ہیں۔ ایسے میں ایک چارپائی سے کھسک کر دوسری پر جانے میں کیا تردد ہو سکتا تھا؟ اجمل کی سرگوشی اُبھری۔ "تم آدھی میری ہو، آدھی ندیم کی ہو۔ ایک ہاتھ میرا، ایک ندیم کا ہے۔ اِن ہاتھوں سے صرف ہم دونوں کو سنبھالو گی، کسی اور کا کام نہیں کرو گی۔ کل بھی یہی کہتا تھا، آج بھی اور ہمیشہ میرے منہ سے یہی نکلتا رہے گا۔"

وہ کسمسائی۔ "ہائے اجمل! اِس سے کہیں بہتر تھا کہ آپ کچھ دیر اور ناراض رہتے۔ تھوڑی دیر میں سو جاتے۔ اَب نہ خود سوئیں گے اور نہ ہی مجھے سونے دیں گے۔"

☆☆☆

وہ ڈیوٹی پر پہنچا تو عقیدت اور بیگم صاحبہ کو اپنا منتظر پایا۔ بیگم صاحبہ کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ "ہمیں سردار صاحب نے گاؤں بلایا ہے۔ تم ہمیں وہاں چھوڑ آؤ۔"

وہ "جی بیگم صاحبہ!" کہہ کر گاڑی صاف کرنے لگا۔ یونیفارم پہن کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اُن کے آنے سے پہلے ائرکنڈیشنر چلا کر گاڑی کو ٹھنڈا کرنا ضروری تھا۔ پانچ سات منٹ تک دونوں بیگ اُٹھائے پہنچ گئیں۔ وہ شہر سے باہر جانے والی سڑک پر عازم سفر ہو گیا۔

وہ گاؤں میں بارہا مرتبہ آ چکا تھا۔ کبھی سردار صاحب کو چھوڑنے اور کبھی بیگم صاحبہ کو لینے یا چھوڑنے کے لیے گاؤں دیکھنا پڑا۔ گاؤں کی فضا بڑی خوشگوار اور پُرسکون تھی۔ شہر کی تنگ گلیوں میں پرورش پانے والے اجمل کو گاؤں کی آب و ہوا اور رہن سہن بہت بھلا لگتا تھا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہیں رہ جائے۔ وہیں مُون اور ندیم کو بلوا لے مگر اُس کی یہ خواہش پوری ہونے والی نہیں تھی۔ عقیدت ساتھ والی سیٹ پر براجمان تھی جبکہ اُس کی ماں عقبی سیٹ پر بیٹھی اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ ایک دو مرتبہ اُس نے عادتاً بیک مرر میں جھانکا تو بے دھیانی میں عشرت کی بڑی بڑی اور گہری آنکھوں میں ڈوب سا گیا۔ پھر ٹپٹا کر سامنے دیکھنے لگتا۔

ڈیڑھ گھنٹے کا سفر سردار زب نواز کی بڑی سی حویلی کے مرکزی دروازے پر اختتام پذیر ہوا۔ دونوں اُتر کر حویلی کے

اندر چلی گئیں جبکہ وہ مہمان خانے میں آن بیٹھا۔ لگ بھگ نصف گھنٹے کے بعد سردار اُس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے مہمان خانے میں آیا۔ وہ بیمار اور خاصا کمزور دکھائی دے رہا تھا مگر اچھے موڈ میں تھا۔ اُس کے سلام کا جواب دے کر بولا۔ ''اجمل! تم کچھ دیر آرام کرلو۔ کھانے کے بعد بیگم صاحبہ کو لے کر واپس چلے جانا۔ عقیدت میرے پاس رہے گی۔''

اُس نے مؤدبانہ لہجے میں دریافت کیا۔ ''آپ کب آئیں گے؟''

''دو تین دنوں کے بعد آسکوں گا۔''

''عقیدت بی بی کی پڑھائی متاثر ہوگی۔''

''اُسے نہیں دیکھ پاؤں گا تو میری صحت متاثر ہوگی۔'' سردار نے مسکرا کر کہا۔ ''دو تین چھٹیوں سے کچھ نہیں بگڑتا۔ تھوڑا فریش ہوجائے گی۔ ویسے بھی گاؤں کی آب و ہوا انسان کی صحت اور دماغ پر بڑا اچھا اثر ڈالتی ہے۔''

وہ سر ہلا کر بیٹھ گیا۔ سردار کے جانے کے بعد سوچ میں پڑ گیا۔ اُس کے علم کے مطابق یہ پہلا موقع تھا کہ عشرت بیگم عقیدت اور سردار صاحب کے بغیر گھر میں دو تین دن تک اکیلی رہیں گی۔ وہ اس کا مون سے موازنہ کرنے لگا۔ وہ ایک رات بھی اُس کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ دن میں بور ہوتی تھی، رات کو ڈرنے لگتی تھی۔ ندیم کے بڑے ہونے پر اُس میں کچھ حوصلہ پیدا ہوا تھا۔ اُدھ رات تک اُس کا بادلِ ناخواستہ انتظار بغیر کسی ڈر یا واہمے کے کرلیا کرتی تھی۔ وہ سر جھٹک کر بڑبڑانے لگا۔ ''مجھے کیا؟ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہم چھوٹوں کی سمجھ میں کہاں آتی ہیں۔ بیگم صاحبہ کی جگہ پر اگر مون ہوتی تو وہ ایک دن کے لیے جدا ہونا قبول نہ کرتی۔''

دوپہر کو سردار صاحب کے ایک ملازم نے اُسے پورچ میں چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر پورچ میں پہنچا۔ عشرت بیگم تیار کھڑی تھی۔ عقیدت اور سردار صاحب اُسے گڈبائی کہہ رہے تھے۔ اُس نے گاڑی میں پانی ڈالا۔ سرسری نگاہ سیٹوں پر ڈالی۔ پچھلی نشستوں پر گھی اور دودھ کے ڈبے، سبزیوں اور پھلوں کی اچھی خاصی مقدار اور اَن گنت چھوٹی بڑی پوٹلیاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سوچنے لگا کہ اتنی لدی پھندی گاڑی میں بیگم صاحبہ کہاں بیٹھیں گی؟ تب حیرانی سوا ہوگئی جب عشرت بیگم اُس کے برابر میں اگلی نشست پر بیٹھ گئی۔ اُس نے گاڑی بڑھادی۔

مین روڈ پر پہنچے تو عشرت نے اُسے مخاطب کیا۔ ''اجمل! تمہاری بیوی اور ندیم کیسے ہیں؟''

وہ چونک کر اپنے خیالوں سے نکلا اور گڑبڑا کر بولا۔

''جی بیگم صاحبہ! وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ اکثر آپ کو یاد رہتے ہیں۔''

''کیا عقیدت کو بھی یاد کرتے ہیں؟''

''جی بیگم صاحبہ! میری بیوی بہت شدت سے عقیدت بی بی کو یاد کرتی رہتی ہے۔ کہتی ہے کہ کبھی اُس سے ملنے کوٹھی آؤں گی۔''

''لے آنا۔ اچھا ہے۔ چند منٹ بیٹھ کر باتیں ہی کرے گی۔'' عشرت نے کہا اور اپنے ناخنوں سے نیل پالش کھرچنے میں مصروف ہوگئی۔ اجمل کن انکھیوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دل میں عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ کچوکے لگانے لگا۔ ''آج پہلی مرتبہ وہ تمہارے برابر بیٹھی ہے اور تم اپنے حواس کھونے لگے ہو؟ کیا اسے ہی ا... کہتے ہیں؟''

وہ نادم سا ہو کر سامنے دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد نظر بہک گئی۔ وہ اپنی دُنیا میں گم دکھائی دی۔ اجمل کو احساس ہوا کہ وہ خوش نہیں، مطمئن نہیں بلکہ عجیب سی مضطرب کیفیت میں مستغرق تھی۔ عجیب سی بے چینی اُس کی حرکات سے عیاں تھی۔ نہ رہ سکا تو پوچھ بیٹھا۔ ''بیگم صاحبہ! کوئی پریشانی ہے؟''

وہ جلدی سے بولی۔ ''نہیں تو...'' پھر خود پر توجہ دیتے ہوئے بولی۔ ''کیا میں پریشان دکھائی دے رہی ہوں؟''

''جی بیگم صاحبہ!'' وہ پورے وثوق سے بولا۔ ''خدا کرے کہ آپ کو کوئی پریشانی نہ ہو مگر چہرے سے ایسی دکھائی دیتی ہیں۔''

وہ پہلے سے زیادہ غمزدہ دکھائی دینے لگی۔ دل میں حسرت کرنے لگی۔ 'میرا دُنیا میں کوئی غم خوار نہیں، کوئی کندھا نہیں ہے جس پر سر ٹکا کر چند اشک بہالیا کروں اور دِل غبار اُتار کے ہلکا کرلیا کروں۔ جو ایک کندھا نصیب بخشا، اُس پر عجیب سی قنوطیت اور بڑھاپا طاری ہو چکا ہے آبلہ دسوختہ پائی میں بھاگتی ہوئی اُس ٹھنڈی چھاؤں تلے کر سکون پالیتی تھی، اَب وہ چھاؤں بھی طعنہ زَن رہتی ہے۔ اُس کا گلہ کس سے کروں؟'

''اجمل! تمہاری بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ندیم کے بعد کسی بچے کی ماں نہیں بن سکتی۔ کیا تمہیں دوسرے بچے کی تمنا نہیں ہوتی؟ میرا کہنے کا مطلب ہے کہ بیٹا اور بیٹی دونوں انسان کے لیے لازمی ہوتے ہیں۔ میری بیٹی ہے، بیٹا نہیں ہے۔ دِل بیٹے کے لیے تڑپتا رہتا ہے۔ تمہارا بیٹا ہے، بیٹی نہیں ہے۔ کیا بیوی کے بعد ایک رَنگ برنگ پیکر کو اپنے صحن میں اچھلتا کودتا دیکھنے کی خواہش نہیں رکھتے ہو؟'' وہ اُس کے چہرے پر نگاہیں گاڑے ہوئے تھی۔

وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ ''میری بیوی... مجھے بہت پیاری ہے۔ میرے دِل میں بیٹی کی تمنا بہت سے مچلتی رہتی ہے مگر میں جانتا ہوں کہ یہ خواہش لبوں پر آئی تو مون پر غم کا پہاڑ اُترنے لگے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ ...ں پر رقصاں مسکراہٹ کو نوچ کر اُس کی جگہ پر نہ ختم ہونے والا ایک لرزاں کرب مسلسل چپکا دوں۔''

''یعنی تم اپنی بیوی کی خوشی کے لیے اپنی خواہش کا گلا دبائے بیٹھے ہو؟''

''جی! آپ ایسا سمجھ سکتی ہیں۔'' اجمل نے آہستگی سے جواب دیا۔ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ وہ کون سا موضوع لے بیٹھی تھی۔ وہ بولا۔ ''جو ہماری قسمت میں نہیں لکھا ہوا، اُس کی خواہش کرنے کے بجائے ہم دونوں ندیم کے اچھے مستقبل کے لیے خدا سے دعاگو رہتے ہیں۔ وہ اچھا اور بڑا انسان بن جائے، ہماری محنت ثمر بار ہوجائے گی۔''

''اگر تم دوسری شادی کرلو تو ہوسکتا ہے خدا تمہیں بیٹی دے دے۔'' عشرت بیگم نے پوری دلیری سے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ ''نصیب کے بعض اوراق بندے کے ہاتھ میں تھما دیے جاتے ہیں۔ اُن پر تحریر کاری کا اختیار بھی سونپ دیا جاتا ہے۔ بہ لحاظِ شریعت، تم دوسری شادی کرسکتے ہو۔''

وہ عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھنے لگا پھر جھینپ کر بولا۔ ''بیگم صاحبہ! آپ مون کو نہیں جانتیں۔ شادی کرنا تو بہت دُور کی بات ہے، دوسری شادی کے تذکرے پر ہی وہ خودسوزی کرلے گی۔''

''کیا!'' عشرت نے آنکھیں پھیلا کر پُر استعجاب لہجے میں کہا۔ ''کیا وہ تم سے اتنی محبت کرتی ہے؟''

وہ کھسیانا سا ہوگیا۔ خفت کے باوجود پورے یقین سے بولا۔ ''جی بیگم صاحبہ! وہ دُنیا کا ہر دُکھ برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے مگر بیٹے اور شوہر میں کسی کی شراکت کا دُکھ برداشت نہیں کرپائے گی۔ مجھے پورا یقین ہے۔''

''تمہارے سمجھانے سے بھی نہیں سمجھے گی؟''

''نہیں۔ قطعاً نہیں۔'' وہ مسکرایا۔ ''بلکہ میرا اندازہ ہے کہ وہ غصے میں بے قابو ہو کر میرا سر پھوڑ دے گی۔''

وہ خاموش ہوگئی۔ سوچنے لگی۔ 'محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ اتنی طاقت دیتی ہے کہ بندہ دُنیا جہان کی مخالفت اور مخاصمت کا بوجھ ہنس کر اُٹھالیتا ہے۔ بہ یک وقت اتنا کمزور بھی کردیتی ہے کہ اپنے محبوب کے سینے پر نصب ہونے والی نادیدہ نیم پلیٹ کو دیکھ کر دھڑکن ٹھہر جاتی ہے۔ سانس سینے میں ہی کہیں اٹک جاتی ہے۔' وہ چند لمحوں تک کن انکھیوں سے اجمل کو دیکھتی رہی، پھر گہرا سانس حلق میں اُتار کر دُکھ سے سوچنے لگی۔ 'ہائے میرے سرتاج! تم کیا ہو؟ پاس آتے ہو تو چولہے کی راکھ میں دَبی ہوئی چنگاریوں کو استخوانی ہاتھوں سے ہوا دینے لگتے ہو۔ میں پاس آتی ہوں تو برف کی سِل پر جما دیتے ہو۔ اَب ایک نیا امتحان میرے لیے تیار کیے بیٹھے ہو۔ کیا کروں؟ کہاں سے بیٹا لاؤں اور تمہاری جھولی میں لا پھینکوں؟... بازار میں بکنے والی شے ہوتی تو تم مجھ سے کہیں پہلے خرید چکے ہوتے۔ کہتے ہو کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنی حیا کی چادر اُتار پھینکوں۔ کسی کے گناہ کو اپنی کوکھ میں لے کر پرورش کروں اور جیتا جاگتا انسان بنا کر تمہاری دولت کا وارث بنادوں؟... یہ کیسے ممکن ہے؟'

اجمل اپنی سوچوں میں گم تھا۔ اُسے علم نہیں تھا کہ اُس کے پہلو میں بیٹھی ایک جواں سال عورت اپنے نہ دکھائی دینے والے بوڑھے شوہر پر بری طرح برس رہی ہے۔ کوس رہی ہے۔ خود کو ملامت کررہی ہے۔ ایسے میں اچانک ہی عشرت نے اُس سے پوچھ لیا۔ ''اجمل! تم پڑھے لکھے ہو۔ کیا مجھے بتا سکتے ہو کہ غیرت کیا شے ہے؟''

وہ چونکا۔ ''میں سمجھا نہیں بیگم صاحبہ؟''

وہ سمجھانے کے سے انداز میں بولی۔ ''غیرت ایک جذبے کا نام ہے۔ کس جذبے کا؟ یہ پوچھنا چاہ رہی ہوں۔''

کار میں کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ اجمل سوچتا رہا۔ کامل جواب دینے کے لیے الفاظ مجتمع کرتا رہا۔ پھر بولا۔ ''غصہ بہتے ہوئے بے قابو دریا کا نام ہے۔ اِس دریا کا کوئی عنوان نہیں ہوتا۔ کوئی نام نہیں ہوتا۔ اِسے کوئی عنوان دے دیا جائے، کوئی نام دے دیا جائے، ڈیم بنا کر اِس کی جولانیوں کو لگام ڈال دی جائے تو غیرت کہلانے لگتا ہے۔''

عشرت بیگم کو اُس کی فصاحت کی خبر نہیں تھی۔ وہ استعجاب آمیز نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''دریا میں سیلاب آتا ہے، آن کی آن میں سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے اور پھر جیسے چڑھتا ہے، ایسے ہی دَم توڑ دیتا ہے۔ غیرت ڈیم زدہ دریا کو کہتے ہیں۔ تمام عمر قطرہ قطرہ، لہر لہر، موج موج رستا رہتا ہے۔ نہ کسی کو تاراج کرتا ہے اور نہ ہی اپنی موت مرتا ہے۔ بس سسک سسک کر رِستا رہتا ہے۔''

''تمہارا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ غیرت کا جذبہ کبھی نہیں مرتا۔''

''ہاں بیگم صاحبہ! یہ خون میں جینز کی طرح سرایت

کیے رہتا ہے۔ جب تک خون بہتا ہے، یہ بھی بہتا رہتا ہے۔ خون کے ساتھ ہی مرتا ہے۔'' وہ بولا۔ ''مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

وہ سر جھٹک کر جواب دیے بغیر باہر دیکھنے لگی۔ شہر کی حدود میں داخل ہو جانے کی وجہ سے اجمل کو اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کرنا پڑی۔ وہ عشرت کے بدلے ہوئے رویّے کے باعث خاصا اَپ سیٹ ہو چکا تھا۔ وہ کسی کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا مگر عشرت کے بے تکلفانہ رویّے کی بدولت اُسے اُس کی پریشانیوں اور الجھنوں کے بارے میں تجسس سا رہنے لگا تھا۔ سمجھ دار آدمی تھا۔ بہ خوبی سمجھتا تھا کہ خود ہی اِس تالاب میں کودے گا تو فوراً باہر اُچھال دیا جائے گا۔

گھر جانے سے پہلے عشرت نے بازار سے ایک سیلولر فون سیٹ خریدا۔ سِم خریدی اور آن کر کے اپنے پرس میں رکھ لیا۔ گاڑی سے اُتری تو اُسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اُس کے پیچھے پیچھے بیڈروم تک آیا۔ دروازے میں متذبذب انداز میں رُک گیا اور اجازت طلب نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ''ہاں ہاں! آ جاؤ نا۔''

وہ آہستگی سے چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور دیوار کے ساتھ لگے ہوئے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''جی بیگم صاحبہ! میرے لیے کیا حکم ہے؟''

وہ اُس کی طرف فون سیٹ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''سردار صاحب نے کہا تھا کہ تمہارے پاس اپنا فون ہونا چاہیے۔ کسی وقت بھی تم سے رابطہ کرنا پڑ جاتا ہے۔ لو! سردار صاحب کے فون پر رابطہ کر کے اُنہیں اطلاع کر دو۔''

وہ گھبرا کر بولا۔ ''مگر بیگم صاحبہ! میں اَبھی فون خریدنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ یہ خریدنے سے میرے گھر کا بجٹ بُری طرح متاثر ہو جائے گا۔''

عشرت مسکرائی۔ ''یہ میری طرف سے تحفہ سمجھ کر رکھ لو۔''

اجمل نے ہاتھ نہیں بڑھایا بلکہ پریشان سی نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اُس پر اتنی نوازش کس لیے کی جا رہی تھی؟

عشرت اُٹھ کر قریب آ گئی۔ دوسرے صوفے پر بائیں ہاتھ کی طرف بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''سردار صاحب نے مجھے الگ سے پیسے دیے تھے اور کہا تھا کہ تمہاری تنخواہ سے اِس کی قیمت نہیں کاٹی جائے گی۔ کیونکہ ہم اپنی ضرورت کے پیشِ نظر تمہیں دے رہے ہیں۔ میں نے اِس میں اپنا نمبر فیڈ کر دیا ہے۔ گھر جا کر ندیم سے میری اور عقیدت کی بات کروا دو۔ از اِٹ او کے؟''

عشرت نے بایاں ہاتھ اُس کی جانب بڑھا دیا۔ ہاتھ میں ننھا سا فون سیٹ دَبا ہوا تھا۔ اجمل نے اُس بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ نظر پھسل کر ملیح اور دار جلد والے بازو پر پھیلنے لگی۔ کف صوفے کے آرم سے رگڑ کر سمٹ چکا تھا اور کلائی اور کہنی کے عین وسط میں رنگ کا ایک ننھا سا تِل چمک رہا تھا۔ اجمل کے پورے بدن کا خون سمٹ کر چہرے میں اکٹھا ہو گیا۔ وہ یک ٹک اس تِل کو دیکھے جا رہا تھا۔ عشرت نے اُس کی آنکھوں اِرتکاز کو بھانپ کر اپنے بڑھے ہوئے بازو کی طرف دیکھا۔ اُس کی اپنی نظر بھی تِل پر آن ٹھہری۔ چند ثانیوں کے بعد اُٹھا کر اجمل کی غیر معمولی محویت کو دیکھا تو بے طرح شرما کر ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ کف برابر کرتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ ''سوری اجمل! مجھے خیال نہیں رہا تھا۔''

اجمل کی نظروں کے سامنے اُس کا من چاہا منظر کو جیسے پکڑ کر کھینچ لیا گیا تو وہ چونک گیا اور شرمسار سا دکھائی دینے لگا۔ خود کو دِل ہی دِل میں ملامت کرنے لگا۔ وہ اوباش انسان نہیں تھا مگر ایک تِل کو دیکھ کر پاگلوں کی طرح بے اختیار ہو گیا تھا۔ دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔ ''بیگم صاحبہ! وہ دراصل ایسا ہی ایک تِل مون کے بائیں بازو پر موجود ہے۔ روز دیکھتا ہوں۔ نہ جانے کیا بات ہے کہ جتنا دیکھتا ہوں، اتنا ہی بے اختیار ہونے لگتا ہوں۔ معذرت مجھے کرنی چاہیے کہ میری نظر بھٹک گئی، بہک گئی۔''

اُس نے جلدی سے کہا۔ ''کوئی بات نہیں اجمل! حیرت اِس بات پر ہے کہ مون کے بازو پر بھی ایسا ہی تِل ہے۔ اِس تِل کی طرح پیدائشی ہی ہو گا۔ اچھا چھوڑو اِس فضول تذکرے کو۔ یہ فون اپنے پاس رکھ لو۔'' اِس مرتبہ اُس نے بائیں بازو کو چھپائے رکھا اور دائیں ہاتھ سے فون اُس کے قریب صوفے پر رکھ دیا اور اُٹھ کر بیڈ کی دوسری جانب کونے میں..... رکھی ہوئی سنگھار ٹیبل کی طرف بڑھ گئی۔ شیشے کے سامنے ٹھہر کر آویزے اُتارتے ہوئے بولی۔ ''عقیدت ندیم کو بُری طرح مس کرنے لگی ہے۔ ہو سکے تو آتے جاتے کبھی ندیم کو ساتھ لے آیا کرو۔ دونوں کچھ دیر کھیل کود کر دل بہلا لیا کریں گے۔''

وہ بولا۔ ''جی اچھا بیگم صاحبہ! کیا اَب میں جاؤں؟''

وہ اُس کی جانب پلٹی۔ ''کیا یہاں بیٹھنا بُرا لگتا ہے؟''

''نن... نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ سراسیمگی سے اُس کی زبان ہکلا گئی۔ ''دراصل میں نے گاڑی کی صفائی کرنا تھی۔ گرد سے اَٹ گئی ہے۔ رات اَوس پڑی تو گاڑی کی سروس کروانا پڑ جائے گی۔''

وہ بے پروائی سے بولی۔ ''کوئی بات نہیں۔ کچھ دیر بیٹھو، پھر چلے جانا۔'' وہ زیورات اُتار کر دروازے میں آئی۔ ملازمہ کو چائے بنا کر لانے کا حکم دیا اور اُس کے سامنے بیڈ پر تکیہ ٹکا کر بیٹھ گئی۔ ''عقیدت اپنے پاپا کے پاس رہ گئی ہے۔ میرے پاس ہوتی تھی تو دِل بہلا رہتا تھا۔ اُس کی عدم موجودگی میں میں تمہیں سُننا چاہتی ہوں۔ تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

وہ سر جھکا کر بولا۔ ''میرے پاس بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ روٹی کمانے کے چکر میں دِن آپ لوگوں کی خدمت میں گزار کر گھر جاتا ہوں اور رات کو بیٹے اور بیوی کی سنتے سنتے سو جاتا ہوں۔ بس...''

وہ بولی۔ ''تم جانتے ہو کہ میں بھی تمہاری طرح غریب محلے میں واقع چھوٹے سے کرایے کے گھر سے اُٹھ کر یہاں آئی تھی۔''

''جی بیگم صاحبہ!''

''پھر ایسا کیوں ہے کہ تم میرے سامنے بھی غریب بنے رہتے ہو؟''

''غربت محرومی سے بڑھ کر عادت بن جاتی ہے۔''

''مون نے کبھی تمہیں غربت کا طعنہ نہیں دیا؟''

''نہیں... البتہ میری طرح امیر بننے کے خواب دیکھتی رہتی ہے۔ ہم دونوں نے ایک پرائز بونڈ خرید رکھا ہے۔ تین مہینوں تک خواب بُنتے رہتے ہیں۔ ایک دِن اپنے ہی ہاتھوں سے خوابوں کی کرچیاں پرائز لسٹ کی فوٹو کاپی میں لپیٹ کر گلی کے نکڑ پر میونسپلٹی کی طرف سے نصب شدہ کوڑے کرکٹ کے ڈرم میں پھینک آتے ہیں۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے پاس کتنی مالیت کا بونڈ ہے؟''

''ساڑھے سات ہزار روپے والا بونڈ خرید رکھا ہے۔''

''اُس پر کتنا انعام ملتا ہے؟''

اُسے تمام تفصیلات زبانی یاد تھیں۔ بارہا مرتبہ حساب و شمار کر چکا تھا۔ وہ بولا۔ ''پہلا انعام ایک کروڑ روپے... دوسرا تیس لاکھ روپے اور تیسرا انعام بہتر ہزار روپے... انعام پر ٹیکس کی کٹوتی بھی کی جاتی ہے۔''

وہ لطف لیتے ہوئے بولی۔ ''تم کس انعام کے لیے دُعا مانگتے ہو؟''

وہ معصومیت سے بولا۔ ''پہلے یا دوسرے انعام کے لیے۔''

''اگر انعام نہ لگا تو...''

وہ مسکرا دیا۔ نچلے ہونٹ کے ایک گوشے کو دانتوں تلے دبا کر بولا۔ ''گزشتہ سات برسوں میں یہی تو ہوتا چلا آ رہا ہے۔''

''حیرت ہے کہ اتنے طویل عرصے کی ناکامی نے تم دونوں میاں بیوی کو ابھی تک مایوس نہیں کیا!'' وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''دُنیا اتنی تیز ہو چکی ہے کہ لمحوں، منٹوں یا گھنٹوں میں فیصلہ کر کے آگے بڑھ جاتی ہے۔ تم سات برسوں میں مایوس ہو کر آگے نہیں بڑھے۔''

وہ بولا۔ ''اگر میرے پاس آگے بڑھنے کا راستہ موجود ہوتا تو شاید میں کب کا مایوس ہو کر آگے بڑھ چکا ہوتا۔''

''تم گریجویٹ ہو۔ کوئی ڈھنگ کی نوکری تلاش کیوں نہیں کرتے ہو؟''

''میری گلی میں ایک آدھ نہیں، سات آٹھ گریجویٹ رہتے ہیں۔ سب نوکری کی تلاش میں صبح سے شام تک مارے مارے پھرتے ہیں۔ ہر شام... ناکامیاں چہرے پر سجائے مایوس ماں کی گود میں سر ڈال کر روتے ہیں۔ ایسے میں میں خود کو بہت بہتر خیال کرتا ہوں۔'' وہ بولا۔ اِسی اثنا میں ملازمہ نے چائے سرو کر دی۔ وہ کپ اٹھا کر لبوں سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اپنے لیے نہیں، اپنے بیٹے کے تابناک مستقبل کے لیے بونڈ خریدا تھا اور اس کی خاطر ہی پہلے انعام کی تمنا دل میں رکھتا ہوں۔ اس کے علاوہ میری نہ تو کوئی تمنا ہے، نہ خواب اور نہ ہی کوئی خواہش... میں سوچتا ہوں کہ خدا نے مون کو میرے حوالے کر کے مجھے دُنیا میں متوازن کر دیا ہے۔''

عشرت دلچسپی آمیز نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ چائے پینے کے بعد اجمل سے بیٹھا نہ گیا اور وہ اجازت لے کر عشرت کے عشرت کدے سے نکل آیا۔ کافی دیر تک اُس کی بدلی ہوئی ذہنی کیفیت کے بارے میں سوچتا رہا مگر کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔

شام کو گھر پہنچا۔ سائیکل کھڑی کر کے ندیم کو اُٹھا کر سینے سے لگایا اور پُر مسرت لہجے میں بولا۔ ''آج اپنے پیارے پیارے ندیم کے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔ بوجھو تو کیا ہے؟''

مون تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے قریب آ گئی۔ ''ایک بیٹے کے لیے، صبح سے شام تک انتظار کرنے والی بیوی کے لیے آپ سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی شے پیاری نہیں۔''

''ہوں...'' وہ شرارت سے مسکرایا پھر جیب سے فون نکال کر ندیم کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری ماں

کہتی تھی کہ تم اپنی دوست عقیدت کو یاد کرتے رہتے ہو۔ آج کل دنیا فاصلوں کو سمیٹنے میں بہت جلد بازی دکھاتی رہتی ہے۔ یاد کرنے کا نہیں، یاد کو دوسرے تک پہنچانے کا زمانہ ہے۔ لو! عقیدت بی بی سے بات کرو۔''

ندیم نے فون جھپٹ لیا۔ چند لمحے اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''مگر ابو! مجھے تو چلانا ہی نہیں آتا۔''

تینوں قدم ملا کر چلتے ہوئے کمرے میں آئے۔ ندیم نے اُسے آپریٹنگ سسٹم کے بارے میں تھوڑا بہت، جتنا جانتا تھا، سمجھایا۔ بیگم صاحبہ کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے ''ہیلو'' کی آواز سن کر اُس کے کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''بیگم صاحبہ سے بات کرو۔ وہ تمہاری بات عقیدت بی بی سے کرادیں گی۔''

پہلی مرتبہ موبائل فون ہاتھ میں آیا تھا۔ ہیجان آمیز خوشی چہرے سے پھوٹنے لگی تھی۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''آنٹی! میں ندیم بول رہا ہوں۔''

اجمل نے تفاخر آمیز نظروں سے اپنی بیوی کو دیکھا اور اُسے بازو سے پکڑ کر برآمدے میں لے آیا۔ ''بیٹا اپنی دوست سے بات کرنا چاہتا تو ماں باپ کو پرے ہٹ جانا چاہیے۔ کھل کر باتیں کرنے کا موقع دینا چاہیے۔''

مُون نے اَدا سے غصے بھری آنکھیں دکھائیں اور بولی۔ ''شرم کریں۔ وہ بچے ہیں، کوئی جوان تھوڑا ہیں کہ ماں باپ سے چھپ کر باتیں کریں گے۔''

''بچوں کے بڑا ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے؟ بس اتنی سی...!''

اجمل نے اُس کی کمر میں بازو حمائل کر کے ''بس اتنی سی'' کا اظہار کچھ یوں کیا کہ وہ سر سے پاؤں تک سُرخ ہوگئی۔ جھینپ کر اُسے دھکا دیتے ہوئے بولی۔ ''پرے ہٹیں۔ آپ تو بس بہانہ تلاش کرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔''

وہ ہنستا ہوا کمرے میں ندیم کے پاس چلا گیا جبکہ مون اُس کے لیے کھانا گرم کرنے میں مصروف ہوگئی۔ دل میں اپنے شوہر کے جنوں انگیز والہانہ پن کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ شروع دن سے ایسا ہی تھا۔ ذرا بھی تبدیل نہیں ہوا تھا۔ وہ اکثر اندیشوں میں مبتلا ہوجاتی کہ ایک بیٹے کے بعد دھرتی کے بنجر ہونے پر کہیں کاشت کار اپنے ارادوں کو ڈانواں ڈول کر کے اُٹھ نہ جائے مگر وہ بنجر دھرتی پر بہ دستور سجدہ ریز تھا۔ سر اُٹھا کر ادھر اُدھر دیکھنا بھی گناہ خیال کرتا تھا۔ دل وفورِ فخر سے چھاتی میں پھیل سا گیا۔ دُنیا میں کوئی اور شوہر ایسا نہیں تھا۔

جب ٹرے میں کھانا سجا کر کمرے کی طرف بڑھی تو بے اختیار مسکرانے لگی۔ باپ بیٹے کے کسی مسئلے پر الجھنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ بڑبڑائی۔ ''اللہ! بچے کے ساتھ بچہ بن جاتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ اس طرح بچہ بگڑ جاتا ہے۔ ایسا کہ کبھی سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ روز سمجھاتی ہوں، روز سمجھ کر بھی نہیں سمجھتے۔''

وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ محبت میں صرف سمجھایا جاتا ہے، سمجھا نہیں جاتا۔

☆☆☆

رات کا پچھلا پہر طاری تھا۔ موسمی حالات کے برعکس خنکی سوا ہوگئی تو عشرت کو ائرکنڈیشنر بند کرنا پڑا۔ سردار کو اتنی رات گئے جاگتے اور سگریٹ پیتے دیکھ کر قدرے خفگی سے بولی۔ ''اِنہی عادتوں کی وجہ سے آپ کی صحت بگڑ کر رہ گئی ہے۔ اپنی صحت کا خیال رکھا کیجیے۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔ لمبا کش سینے میں اُتار کر کروٹ بدل گیا۔ وہ بولی۔ ''آپ کے لیے دُودھ گرم کرلاتی ہوں۔ پی کر سو جائیے۔''

''نہیں۔ میرا جی نہیں چاہ رہا۔ ویسے بھی دودھ مجھے موافق نہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' وہ حیرت آمیز لہجے میں بولی۔ ''ڈاکٹر نے مجھے تاکید کی تھی کہ آپ کو زیادہ سے زیادہ دودھ پلایا جائے۔''

اُس کے انکار کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ ہی دیر میں دودھ کے ساتھ پلٹی اور بڑے پیار سے دودھ پلانے لگی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''تم جس پیار سے مجھے دُودھ پلا رہی ہو، اِس پیار کے ساتھ اپنے بچوں کو مائیں پلایا کرتی ہیں۔''

وہ ہنسی۔ ''جوانی میں بیوی محبوبہ بن کر پہلو میں گھستی ہے اور آگ لگا دیتی ہے، بڑھاپے میں ماں بن کر پہلو میں لے کر سُلانے کے لیے ہمکانے لگتی ہے۔''

دودھ ختم ہوگیا۔ سردار کو نیند نہیں آئی۔ وہ کچھ دیر تک اُس کے سو جانے کا انتظار کرتی رہی۔ پھر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وجہ دریافت کرنے لگی۔ ''آپ کو نیند کیوں نہیں آرہی؟ اپنی پریشانی میرے ساتھ شیئر کرلیں تو دِل کا بوجھ ہلکا ہوجائے گا۔''

وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ ''دِل کی بات کرتا ہوں تو مجھے بے غیرتی کے طعنے دینے لگتی ہو۔ اپنا خون جلانے کے لیے جاگتا ہوں تو سُلانے کی فکر میں ہلکان ہونے لگتی ہو۔

پریشانی تمہارے ساتھ کیسے شیئر کرسکتا ہوں؟ تم مدد کرسکتی ہو مگر کرنا نہیں چاہتیں۔ ایسے میں سوائے کُڑھنے کے، کوئی چارہ نہیں۔''

وہ سُن سی رہ گئی۔ کئی دنوں سے اس تذکرے سے پہلو بچا رکھتی آئی تھی۔ پوچھ کر پھنس گئی۔ بات بدلنے کی غرض سے بولی۔ ''عقیدت نے آتے ہی ندیم سے ملنے کی رَٹ لگا لی ہے۔ سمجھ نہیں آتی کہ کہاں وہ اپنی سہیلیوں تک کو خاطر میں نہیں لاتی تھی اور کہاں اَب ندیم کے لیے باؤلی ہوئی جاتی ہے۔''

سردار نے شکوہ کناں نگاہوں سے اُسے دیکھا اور دل میں کہا۔ ''پھنسنے پر چکنی مچھلی کی طرح تڑپ کر نکل جاتی ہو۔ میری تڑپ کو نہیں دیکھتیں۔'' آہ بھرنے کے سے انداز میں حلق سے سانس خارج کرتے ہوئے وہ بولا۔ ''کل دوپہر کو اُسے بلوا لینا یا عقیدت کو لے کر اجمل کے گھر چلی جانا۔''

کافی دیر تک دونوں کے بیچ خاموشی حائل رہی۔ سردار نے سکوت توڑا۔ ''تم میری پریشانی کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں؟''

وہ چونک کر بولی۔ ''نہیں تو...''

سردار معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ ''کنّی کترانے لگی ہو؟''

وہ زِچ ہوگئی۔ ہونٹ بھینچ کر خاموش رہی۔ وہ بولا۔ ''میرے لیے کچھ نہیں کرسکتی ہو تو جاؤ، سو جاؤ۔ میری قسمت میں جاگنا لکھا ہے، جاگتا رہوں گا اور اپنے دُکھ پر کُڑھتا رہوں گا۔''

وہ تڑپ کر بولی۔ ''آپ پہلے تو ایسے نہیں تھے!''

''جیسا تم سمجھ رہی ہو، ویسا میں اَب بھی نہیں ہوں۔'' سردار نے اُس کا ہاتھ تھام لیا اور نرمی سے سہلاتے ہوئے بولا۔ ''تمہارے پوچھے بغیر بتلانے چلا ہوں۔ جانتا ہوں کہ تم نہیں مانو گی مگر اپنی سی کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ دیکھو! میرے چھوٹے بھائی صاحبِ اولاد ہیں۔ خدا نے بیٹوں کی نعمت سے نواز رکھا ہے۔ میرا بیٹا نہیں ہے۔ بیٹی پرایا دھن ہوتی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے مرنے کے بعد میرے بھائی تمہیں اور میری بیٹی کو کوڑی کوڑی کا محتاج بنا کر گھر کے کسی کونے کھدرے میں لا پھینکیں۔ وہ ایسی ہی ذہنیت رکھتے ہیں۔ عقیدت کے ساتھ گھر سے نکلنے والی خاندانی دولت پر خون کی ندیاں بہانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ تمہیں بھی مشکلات میں ڈال دیں گے۔ ایسے میں صرف ایک ہی طریقہ باقی رہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ میں کسی نہ کسی طرح ایک بیٹے کا باپ بن جاؤں۔ وہ میرے بیٹے کو

یونیورسل ہوم سروسز
آپ بھی منگوا سکتے ہیں

کتب

خوشگوار زندگی کے راز
رابرٹ ایچ شلر / ریاض محمود انجم
قیمت سروس چارجز و ڈاک خرچ -/310 روپے

روحانی خوشیاں اور کامیابی
ڈورس پوزی سٹیفن ولیمز / امجد محمود
قیمت سروس چارجز و ڈاک خرچ -/340 روپے

صحت

جگرین + جوارش زرشک + طاقت کیپسول + دوالکبد
معدہ اور جگر کی اصلاح کر کے چہرے کی رنگت کو سرخ کرتی ہے جسم کو طاقت ور بناتی ہے
ہیپاٹائیٹس اے۔ بی اور سی میں مفید اور موثر ہے
قیمت مکمل کورس بمع سروس چارجز و ڈاک خرچ -/900 روپے

وظائف

۱۔ حل المشکلات
جب بہت سارے کام اور مشکلات درپیش ہوں اور کچھ سمجھ نہ آرہی ہو کہ کیا کرنا چاہئے۔ اس وظیفہ کو 11 دن سے 40 دن تک پڑھنے سے تمام کام اللہ پاک کی رحمت سے آسان ہو جاتے ہیں اور مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم شامل حال ہوتا ہے
ہدیہ بمع سروس چارجز و ڈاک خرچ 650 روپے

۲۔ کشائش رزق کے لئے
یہ دعا رزق میں اضافہ اور برکت کے لئے پڑھی جاتی ہے ۱۱ دن سے پہلے پہلے اللہ پاک کے فضل سے رزق میں فراوانی کے آثار شروع ہو سکتے ہیں ہدیہ بمع سروس چارجز و ڈاک خرچ 450 روپے

۳۔ نصیب کشائی
جن بچیوں بچوں کے رشتے نہ ہوتے ہوں یا جو والدین اپنے بچوں کے رشتوں کے لئے پریشان ہوں یہ وظیفہ صرف 4 دن پڑھنے سے اللہ پاک کی رحمت شامل حال ہو جاتی ہے
ہدیہ بمع سروس چارجز و ڈاک خرچ 450 روپے

۴۔ نجات مشکلات
یہ دعا اس وقت پڑھی جاتی ہے جب خاص ضرورت یا مشکل درپیش ہو عام چھوٹی موٹی ضرورت کے لئے نہ پڑھیں
ہدیہ بمع سروس چارجز و ڈاک خرچ 786 روپے (11 دن)

۵۔ اولاد کے لئے
جن لوگوں کے آنگن میں ابھی تک پھول نہیں کھلے ہیں اس وظیفہ کے وسیلہ سے اللہ پاک کی رحمت سے اولاد کی نعمت سے سرفراز ہو سکتے ہیں۔ (بیوی یا شوہر میں سے کوئی بھی یہ وظیفہ کرسکتا ہے) (7 دن)
ہدیہ بمع سروس چارجز و ڈاک خرچ 550 روپے

۶۔ نافرمان اولاد
جن لوگوں کے بچے نافرمان۔ کام چور۔ بری عادتوں کے شکار یا بے روزگار ہیں یہ نوافل ان لوگوں کے لئے مخصوص ہیں۔
(صرف 11 دن کے لئے) ہدیہ بمع سروس چارجز و ڈاک خرچ 550 روپے

نوٹ: منی آرڈر بنام ولید احمد معرفت پی او بکس نمبر 3006 ارسال کریں

اسٹاکسٹ
ولید احمد
پوسٹ بکس نمبر 3006 لاہور
V.P بھی منگوا سکتے ہیں
فون نمبر
0321-9420799
0300-6507997
042-7013754
ای میل Waleedjan11@yahoo.com

سینے سے لگا نہیں گے، اُس کے ہاتھ کو کبھی روکنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ بیٹے کی چھاؤں میں بیٹھ کر تم اور عقیدت دونوں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاؤ گی۔ میری بدقسمتی یہ ہے کہ نہ تم میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہو اور نہ ہی کوئی اور تدبیر سوجھتی ہے۔''

سردار کے ہاتھ میں دبا ہوا عشرت کا پُرگداز ہاتھ پسینے سے تر ہو گیا۔ سر جھکا کر بولی۔ ''سردار صاحب! میں سمجھتی ہوں۔ بچی نہیں ہوں۔ مجھے آپ کے بعد درپیش ہونے والی مشکلات کا اندازہ ہے مگر... میں آپ کی خواہش پوری کرنے کے لیے اپنے بدن پر غلاظت چپکانے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔ آپ کو مجھ پر یقین کیوں نہیں؟ میں ایسی نہیں ہوں۔ میں آپ کی ہوں، آپ کے علاوہ کوئی مجھے چھوئے، مر جاؤں گی مگر ایسا نہیں ہونے دوں گی۔''

سردار چند لمحوں تک مُردے کی طرح بے حرکت پڑا رہا۔ پھر نظروں کو اُس پر مُرتکز کرتے ہوئے بولا۔ ''جان! میں بے غیرت نہیں ہوں۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تمہیں چھونا تو کجا، کوئی میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت بھی نہ کرے۔ غیرت اسی چیز کا نام ہے۔ میرے پھوپھی زاد بختاور خان نے غیرت کے نام پر ایک قتل کر دیا تھا۔ جیل چلا گیا۔ پانی کی طرح پیسا بہایا مگر کوئی بات نہ بنی۔ اسے سزائے موت ہو گئی۔ میرے پھوپھا نے بیٹے کو بچانے کے لیے اپنی دو بیٹیوں کا رشتہ دے کر صلح کی۔ ہر غیرت کا لگ بھگ یہی انجام ہوتا ہے۔ تم میری بیوی ہو۔ عقیدت میری بیٹی ہے۔ میں آج نہیں تو کل آنکھیں بند کر لوں گا۔ غیرت کا علم بلند رکھنے کے چکر میں تمہیں اور اپنی بیٹی کو اُن درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ جاؤں گا۔ فرق صرف اتنا پڑے گا کہ آج میری طبیعت کو غیرت کے نام پر کچوکا لگے گا، کل مجھے خبر نہیں ہوگی مگر زخم آ چکا ہوگا، یہ الگ بات ہے کہ مجھے تکلیف نہ ہوگی۔''

سردار کی بات کانوں کے رستے سیدھی دماغ میں اُتر رہی تھی۔ اُسے پہلی مرتبہ سردار کی پریشانیوں کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اپنے لیے نہیں، اپنی بیٹی کے لیے غمزدہ تھا۔ اپنی بیوی کی آئندہ زندگی کے لیے پریشان تھا۔ وہ بولی۔ ''ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ اپنی زندگی میں ہی اپنی تمام جائیداد بیٹی کے نام منتقل کرا دیں۔''

''تو کیا میرا خاندان عقیدت کو اُس کے حصے کی جائیداد سونپ دے گا؟'' سردار نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''کبھی بھی نہیں... وہ اُس جائیداد کے لیے عقیدت پر زندگی تنگ کر دیں گے۔ میں بیٹی کا فائدہ کرنے کے چکر میں اُلٹا اُسے مصیبت میں پھنسا دوں گا۔''

''اگر آپ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں تو میرے نام کر دیجیے۔'' عشرت نے ڈرتے ڈرتے صلاح دی۔

سردار نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم بھی اُن کا مقابلہ نہیں کر پاؤ گی۔''

''آپ کا خیال ہے کہ چھوٹا سا بچہ ہم دونوں کی حفاظت کرے گا؟''

''ہاں! مجھے یقین ہے۔''

''یقین کی وجہ؟''

''میری خاندانی روایات مجھے یقین دلاتی ہیں۔ ہمارے ہاں بچہ پیدا ہوتے ہی جوان مانا جاتا ہے۔ اُسے وراثت کے حصول میں کوئی مشکل درپیش نہیں آتی۔'' سردار نے کہا۔

''میڈیکل سائنس بہت ترقی کر چکی ہے۔ پیسے والوں کے لیے دُنیا میں سب کچھ ممکن ہو کر رہ گیا ہے۔ کیا ہماری کمی پوری نہیں کی جا سکتی؟'' عشرت نے اُسے ایک نئی راہ سجھائی۔

''میں نے ہر دروازے پر دستک دے کر دیکھ لی ہے۔ کوئی اُمید نہیں دلاتا۔'' سردار کے لہجے میں مایوسی عود کر آئی۔

''ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

سردار نے نفی میں سر ہلایا۔

عشرت سردار کی آنکھوں سے بے بسی کے عالم میں رستے ہوئے آنسو دیکھ کر دل گرفتہ ہو گئی۔ گلوگیر آواز میں بولی۔ ''ہائے! زندگی نے یہ کیسا مقام مجھ پر اُتار دیا ہے۔ میں بڑی محنت سے اُس عورت کو ہمیشہ کے لیے سُلانے میں کامیاب ہوئی تھی جو کسی جوان آدمی کو دیکھ کر پگھل جاتی ہے۔ میں نے خود پر ایسا خول چڑھا دیا تھا جس پر پڑنے والی ہر جذبات انگیز نگاہ پھسل جاتی ہے۔ آپ کے لیے۔ صرف آپ کی غیرت کے لیے! آپ مجھے وہ خول اُتارنے کا حکم دیتے ہیں، میں اتارنا نہیں چاہتی۔ عقب میں سمندر، سامنے جنگل... یہ کون سا مقام ہے۔ میرا سائیں میرے کانوں میں سائیں سائیں کی بھیانک آوازیں اُتارنے پر مجبور ہے۔ مانتی ہوں تو مرتی ہوں، نہیں مانتی تو آپ مرتے ہیں۔ ایسے میں میں کیا کروں؟''

وہ سردار کی چھاتی پر چہرہ رکھ کر رونے لگی۔ سینے کے ملگجے سفید بالوں کو تر کرنے لگی۔ سردار اُس کی زلفوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہماری سوسائٹی کی عورتیں اپنے تشنہ جذبات کو سیراب کرنے کے لیے اِدھر اُدھر ماری ماری پھرتی ہیں۔ جوانی تو جوانی رہی، بوڑھے اپنی استخوانی ہڈیوں میں جواں خون کی سرعت بھرنے کے لیے دھوپ میں لیکتے رہتے ہیں۔ سوائے جنسی تسکین کے، اُن کے سامنے کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ تمہارے پاس ایک مقصد ہے۔ تم اگر بہکو گی تو میرے لیے۔ کوکھ میں گناہ رکھ کر اُس کی پرورش کرو گی تو اپنے مجازی خدا کے لیے۔ اتنے برسوں سے دیکھتا ہوں، تمہیں بہکانے کے لیے کھلی اجازتیں دیتا آیا ہوں مگر تم نہیں، خاص تھیں۔ تمہارے قدم نہیں ڈگمگائے۔ مجھے تم پر یقین ہے۔ مجھ بوڑھے پر احسان کر دو گی تو مرتے دَم تک دم بھرتا رہوں گا۔''

وہ ہچکیاں لینے لگی۔ سوچنے لگی۔ 'اپنے مجازی خدا پر احسان کر کے اپنی نظروں میں ہمیشہ کے لیے گر جاؤں گی....' بہ وقت تمام لہجے پر قابو پا کر بولی۔ ''بہ فرضِ محال میں آپ کا حکم بجا لاتی ہوں تو کیا آپ کسی اور کے خون کو اپنا بیٹا مان لیں گے؟ جھوٹی بنیادوں پر کتنی بلند عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے؟ ایک نہ ایک دن گر جاتی ہے۔ ایسے میں میرا کیا بنے گا؟''

سردار نے اُس کے بالوں کو جھٹکا دیا۔ چہرہ اپنی جانب موڑ کر درشتی سے بولا۔ ''یہ تم نے کیا کہہ دیا ہے عشرت! وہ میرا نہیں، کسی اور کا بیٹا ہوگا مگر اُس کی رگوں میں تمہارا خون ہی دوڑتا ہوگا۔ میں تمہارے بدن کو آنکھوں سے لگاتا ہوں، کیا تمہارے خون کو جھٹلا دوں گا؟''

''کیا دُنیا میں آج تک کسی بیوی نے ایسا کیا ہے؟'' عشرت نے پہلو بدلا۔

''ہاں!'' سردار نے اُس کی زلفوں کو آہستگی سے چھوڑ دیا۔ لہجے میں شدید نوعیت کی نقاہت عود کر آئی۔ ''ایسی ہی ایک عورت میری نظروں سے گزری تھی۔ اُس نے اپنے شوہر کی مجبوریوں پر اپنے عورت پن کو قربان کر دیا تھا۔ تم اُس سے کبھی ملی نہیں ہو مگر اُسے اچھی طرح جانتی ہو۔''

عشرت نے چونک کر استفسار کیا۔ ''کون تھی وہ؟''

''میری پہلی بیوی... بانو بیگم!'' سردار کی آواز پھٹ سی گئی۔

وہ فرطِ حیرت و استعجاب سے سُن ہو گئی۔ یوں لگا جیسے کسی نے دس منزلہ عمارت کی چھت پر سے آن کی آن میں دھکا دے دیا ہو۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے مجازی خدا کو دیکھنے لگی۔

وہ آزردہ لہجے میں بولا۔ ''میں شروع دن سے پیار

WWW.JBDPRESS.COM

نسیم حجازی کے شاہکار تاریخی ناول

آخری معرکہ -/300
جب سومنات کے بڑے بت کو توڑنے کی باری آئی تو ہندو راجے اور پجاری سلطان کے قدموں میں گر پڑے اور کہا "ہم اس کے وزن کے برابر سونا دینے کیلئے تیار ہیں"۔ سلطان کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا اور اس نے جواب دیا "میں بت فروش نہیں، بت شکن کہلانا چاہتا ہوں" نسیم حجازی کی ایک ولولہ انگیز تحریر

اندھیری رات کے مسافر -/225
اندلس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کی تباہی کے لرزہ خیز مناظر، بوڑھوں، عورتوں اور جوانوں کی ذلت و رسوائی کی الم ناک داستان

قیصر و کسریٰ -/300
ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی، تہذیبی، مذہبی حالات اور فرزندان اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

پاکستان سے دیارِ حرم تک -/125
تاریخی پس منظر میں لکھا جانے والا ایک دلچسپ سفرنامہ حجاز

گمشدہ قافلے -/300
انگریز کی اسلام دشمنی، بنیے کی عیاری و مکاری اور سکھوں کی معصوم بچوں اور مظلوم عورتوں کو خون میں نہلانے کی لرزہ خیز سچی داستان

داستانِ مجاہد -/200
فتح دیبل کے بعد راجہ داہر نے راجوں مہاراجوں کی مدد سے دو سو ہاتھیوں کے علاوہ 50 ہزار سواروں اور پیادوں کی نئی فوج بنائی، فاتح سندھ کی معرکۃ الآرا داستان

پردیسی درخت -/275
اسلام دشمنی پر مبنی ہندوؤں اور سکھوں کے گٹھ جوڑ کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کیلئے تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے سے بھی گریز نہ کیا

قافلہ حجاز -/300
راہِ حق کے مسافروں کی ایک بے مثال داستان

خاک اور خون -/300
سسکتی، تڑپتی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خونچکاں

معظم علی -/275
لارڈ کلائیو کی اسلام دشمنی، میر جعفر کی غداری، بنگال کی آزادی و حریت کے ایک مجاہد معظم علی کی داستان شجاعت

سفید جزیرہ -/150
بحرالکاہل کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

کلیسا اور آگ -/225
فرڈی نینڈ کی عیاری، مسلمان سپہ سالاروں کی غداری، سقوط غرناطہ اور اُندلس میں مسلمانوں کی شکست کی داستان

پورس کے ہاتھی -/125
1965ء کی جنگ کے پس منظر میں بنیوں اور برہمنوں کے سامراجی عزائم کی شکست کی داستان، جنہیں ہر محاذ پر منہ کی کھانی پڑی

محمد بن قاسم -/225
عالم اسلام کے 17 سالہ ہیرو کی تاریخی داستان، جس کے حوصلے اور حکمت عملی نے ستاروں پر کمندیں ڈال دیں

ثقافت کی تلاش -/100
نام نہاد ثقافت کا پرچار کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدروں کو طبلوں کی تھاپ، گھنگھروؤں کی چھنا چھن کے ساتھ پامال کیا

آخری چٹان -/275
سید خوارزم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاتاریوں کے سیل رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

اور تلوار ٹوٹ گئی -/300
شیر میسور (ٹیپو سلطان شہید) کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے جاہ و جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

شاہین -/275
اُندلس میں مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی

سو سال بعد -/125
گاندھی جی کی مہاتمائیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی منہ بولتی تصویر

انسان اور دیوتا -/225
برہمنی سامراج کے ظلم و بربریت کی صدیوں پرانی داستان جس نے اچھوتوں کو راہِ عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا

یوسف بن تاشفین -/225
اُندلس کے مسلمانوں کی آزادی کیلئے آلام و مصائب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیلیں روشن کرنے والے گمنام سپاہی کی داستان

جہانگیر بکس
• لاہور 042-7220879 • راولپنڈی 051-5539609 • ملتان 061-4781781 • فیصل آباد 041-2627568 • حیدرآباد 0300-3012131 • کراچی 021-2765086

کرنے والا خاوند تو تھا مگر باپ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ بانو بیگم میں میرے حکم پر اس عذاب سے گزرنے کی صرف ایک مرتبہ سکت پیدا ہوئی، طوعاً و کرہاً گزر گئی۔ عقیدت کی پیدائش کے بعد وہ سُولی پر چڑھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔''

اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہے؟ لرزتے ہوئے ہونٹوں سے بس یہی نکلا۔ ''تو کیا عقیدت آپ کی بیٹی نہیں ہے؟''

وہ دُکھی انداز میں مسکرایا۔ ''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ میری بیٹی نہیں ہے۔ وہ میری بانو بیگم کی بیٹی ہے تو میری بھی ہے۔ آج یہ راز پہلی مرتبہ میرے ہونٹوں پر آیا ہے۔ تب، جب مجھے یقین ہوگیا کہ تم میری بانو بیگم ہی ہو۔ عشرت کا رُوپ اوڑھ کر میرے درد کا درماں بننے کے لیے پلٹی ہو۔ میرے لیے مَر سکتی ہو، جان دے سکتی ہو مگر مجھے رُسوا نہیں کرسکتیں۔ میں یہ سب کچھ اَب بھی نہ بتاتا مگر تمہارے تذبذب کو کنارے لگانے کے لیے مجبوراً بتلانا پڑا۔ میں اگر عقیدت کو اُس کے پورے حقوق کے ساتھ سینے سے لگا سکتا ہوں، پوری دُنیا میں اُسے اپنی بیٹی کہہ سکتا ہوں تو کیا تمہارے لختِ جگر سے غیریت برتوں گا؟''

وہ تھک کر سردار کے پہلو میں گرگئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ عقیدت اور بانو بیگم کے بارے میں سوچنے لگی۔ دل نہیں مانتا تھا مگر حقیقت کو جھٹلانا بھی بس میں نہیں تھا۔ کوئی باپ اپنی بیٹی اور بیوی کے بارے میں اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اتنے برسوں میں اُس کی ممتا بھی دھوکے کا شکار رہی۔ اُسے سردار کے رویے میں کوئی ہلکا سا بھی جھول دکھائی نہیں دیا تھا۔ وہ باپ نہیں تھا مگر اُس نے باپ ہونے کا بھرپور عملی ثبوت دے رکھا تھا۔ آنکھ اُٹھا کر اپنے مجازی خدا کی طرف دیکھا۔ اُس کی امید بھری نگاہوں کی تاب نہ لا کر سر جھکا لیا۔ ہولے سے مخاطب ہوئی۔ ''مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔''

سردار نے قدرے اطمینان سے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ''اوکے! مگر یہ دھیان رہے کہ میرے پاس سالوں مہینوں کا وقت نہیں ہے۔''

وہ چونک کر بولی۔ ''ہائے اللہ! ایسی بدفال تو منہ سے نہ نکالیں۔ خدا میری عمر بھی آپ کو لگائے۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔ اُس کے ہاتھوں کو پکڑ کر والہانہ انداز میں چومنے اور آنکھوں سے لگانے لگا۔ جانے کیا ہوا؟ آج یوں لگا جیسے سردار جوان ہوگیا ہو اور اُس کے ہاتھوں میں آگ بھر گئی ہو۔ چند ہی لمحوں میں عشرت کے رَگ و پے میں سرور سا بھر گیا۔ وہ سوچنے لگی۔ 'یہ مجھے کیا ہورہا ہے؟ کیا میں بدل گئی ہوں؟ کیا سردار کی گرفت کا نشہ بدل گیا ہے؟'

اُسے یہ معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ اُس کے ذہن کے علاوہ کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا اور جو وہ نہیں رہا تھا، وہ اُس کا جواں سال بدن تھا جس پر اُس نے قبل از وقت بڑھاپا لپیٹ دیا تھا۔ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بہ دقت تمام بولی۔ ''آپ آئندہ اس موضوع پر بات نہیں کریں گے۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اگر میں آپ کے لیے کچھ کرسکی تو خاموشی سے کر گزروں گی اور اگر مجھ میں اتنی ہمت نہ ہوئی تو مجھے معاف کردیجیے گا۔ میں اول و آخر آپ کی ہوں۔ آپ کے دُکھ کو پوری شدت سے محسوس کرچکی ہوں مگر بیوی اور عورت کی جنگ میں کون جیتتا ہے، قبل از وقت کچھ کہہ نہیں سکتی۔ دُعا کیجیے گا کہ بیوی جیت جائے، عورت ہار جائے۔ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

سردار نے اثبات میں سر ہلایا اور دل ہی دل میں کہا۔ ''میں غیرت جیسے پیچیدہ فلسفے میں عمر بھر اُلجھتا رہا ہوں، یہ کون سا مشکل سوال ہے؟ تم سے کہیں بہتر جانتا ہوں کہ یہ تذکرہ رگوں سے خون نچوڑنے لگتا ہے۔ میں خود کو اپنے ہاتھوں قتل کرکے یہ بات چھیڑتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ غیرت کو ممتا کی خاطر خون میں نہلانا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ میں اس مشکل پر قابو پانا جانتا ہوں مگر تم نہیں جانتی ہو۔''

وہ کروٹ بدلتے ہوئے بولا۔ ''آخری بات! میں باپ دادا کے دَور سے زمینوں کے مزاج کو دیکھتا چلا آیا ہوں۔ ہر زمین کی صلاحیت مختلف ہوتی ہے۔ ہر بیج کی نمو منفرد ہوتی ہے۔ بہ خوبی جانتا ہوں کہ پیاسی زمین کے لیے کون سا پانی تریاق ہوتا ہے۔ کس پانی پر فصل اچھی ہوتی ہے، کس پر بے ثمر فصل اُگتی ہے۔ اَجمل بہت اچھا انسان ہے۔''

عشرت کا ذہن سنسنا اُٹھا۔ یکبارگی سے پورے بدن میں آگ کی سی تپش بھر گئی۔ یہ سردار نے کیا کہہ دیا تھا؟... بے اعتدالی سے دھڑکنے والے دِل نے عجیب سا سوال اُس کے سامنے رَکھ دیا۔ ''کیا جاگیردار ایسے ہوتے ہیں؟''

☆☆☆

سردار رَب نواز سے چھوٹا احمد نواز حویلی کے بیڈروم میں اپنی بیوی سے ہم کلام تھا۔ ''کافی دِنوں سے ایک خیال دِل کو بے چین کرتا رہتا ہے۔ بڑا بیٹا میٹرک میں پہنچ چکا ہے۔ اگلے برس وہ ہاتھ سے نکل کر کالج کی فضاؤں میں اونچی نیچی پروازیں کرنے لگے گا۔ پھر ایک دِن ایسا آئے گا کہ ہمارے سامنے سینہ سپر ہوکر جوان پیڑ کی طرح ایستادہ ہوجائے گا اور کہے گا کہ میں نے فلاں لڑکی سے شادی کرنی ہے۔ ہم اُس کی بات مان لیں گے یا رَد کردیں گے۔ دونوں صورتوں میں بیٹا

ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

بیوی زرینہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''تمہارا خون ہے۔ تم بہتر طور پر جانتے ہو۔ زیادہ نہیں، کچھ نہ کچھ تو باپ کی عادتیں پڑے گا۔''

وہ لہجے کو تھوڑا سا سخت کرکے بولا۔ ''تم اس انداز میں بات نہ کیا کرو۔ جو کہہ رہا ہوں، اُسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ ... کی کسی لڑکی کو بہو بنا کر حویلی میں لائے گا تو کروڑوں کی جائیداد ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ امیر نواز کا بڑا بیٹا عمران پڑھائی اور شکل و صورت میں ہمارے بیٹے پر بھاری ہے۔ عشرت بھابھی کا جھکاؤ بھی امیر نواز کی طرف زیادہ ہے۔ ہم سوچتے رہ جائیں گے اور امیر نواز اپنی بیوی اور بیٹے کی مدد سے بھائی رَب نواز کی تمام جائیداد پر ہاتھ صاف کرجائے گا۔''

وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ''عشرت جب بھی حویلی میں آتی ہے، نور بانو اُس کے ساتھ ہر وقت چپکی رہتی ہے۔''

امیر نواز کی بیوی نورینہ کو حویلی میں پیار سے نور بانو کہا جاتا تھا۔ اُس کا شوہر امیر نواز واجبی شکل کا مالک تھا۔ احمد نواز کی بیوی زرینہ اُس کی سگی بہن تھی۔ اپنی بڑی بہن کے برعکس نور بانو نہ صرف بہت خوبصورت تھی بلکہ پڑھی لکھی بھی تھی۔ اُس کا رویہ بہت پیار بھرا تھا جس کی وجہ سے حویلی کی تمام ملازمائیں اُس کے آگے پیچھے پھرتی رہتیں اور اُس کے گن گاتی رہتی تھیں۔ اُس کے دو بیٹے تھے۔ دونوں شکل و صورت میں ماں پر گئے تھے۔ بالخصوص عمران تو اپنے چھوٹے بھائی ارسلان اور کزن رئیس پر ہر لحاظ سے فوقیت رکھتا تھا۔

احمد نواز نے تشویش سے پیشانی کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''زرینہ! میں چاہتا ہوں کہ رئیس کے لیے بھائی رَب نواز سے اُس کی بیٹی کا ہاتھ مانگ لوں۔ کوشش کرکے نکاح پڑھوا کر کام پکا کرلوں۔ ایک مصیبت تو یہ ہے کہ تم کسی کام کی نہیں ہو۔ بندہ اپنے مفاد کے لیے گدھے کو باپ کہہ لیتا ہے مگر تم عشرت بیگم سے اچھے تعلقات قائم نہیں کرسکی ہو۔''

وہ اکڑ کر بولی۔ ''تو تم نے کون سا بھائی رَب نواز کو اپنی مٹھی میں کرلیا ہے جو مجھے ... کہتے رہتے ہو۔ عشرت پر نور بانو کا جادو چلا ہوا ہے۔ وہ نک چڑھی میرے پاس بیٹھے تو میں اسے شیشے میں اتارنے کی کوشش کروں۔ دونوں کے بیچ بیٹھ کر مطلب کی بات نہیں کرسکتی۔ نور بانو کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو سارا کام خراب ہوجائے گا۔''

احمد نواز دل ہی دِل میں اپنے بڑے بھائی کی جائیداد کا حساب لگانے لگا۔ چونکہ اُس کا بیٹا نہیں تھا، اس لیے تمام دولت عقیدت کی جھولی میں گرنے والی تھی۔ اِس جھولی سمیت عقیدت کو حاصل کرلینے کا مطلب اپنی دولت کو دو سے ضرب دینا تھا۔ ضرب کے اصول کو مضبوطی سے پکڑ لیا جائے تو دِنوں میں ہی بیلنس زمین سے اُٹھ کر آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگتا ہے۔ وہ دو تین برسوں سے اپنی بیوی کو سمجھاتا چلا آرہا تھا کہ وہ عشرت بیگم کو ہاتھ میں کرے۔ وہ اُسے ہاتھ میں کرنے کے بجائے اُس سے دو ہاتھ کرنے کے چکر میں پڑی رہتی تھی۔ حویلی کی چہار دیواری کے اندر رہتے ہوئے بھی وہ زمینوں کی وسعت کی اہمیت سے واقف نہیں تھی۔ وہ اپنی بھتیجی کو بہو بنا کر لانا چاہتی تھی۔ احمد نواز اِس حق میں نہیں تھا۔ خالی ہاتھ دکھائی دینے والی لڑکی کو بہو بنا کر اپنی آنکھوں پر بٹھانے کی حماقت نہیں کرسکتا تھا۔

اُسے بہ خوبی احساس تھا کہ عقیدت ایسا باٹ تھی کہ اُسے جس پلڑے میں رکھا جاتا، وہ پلڑا جھک کر زمین سے لگ جاتا۔ وہ اِس باٹ کو اپنے پلڑے میں رکھ کر امیر نواز پر برتری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ایک تیر سے دو پرندے گرانا چاہتا تھا۔ بیٹا بڑے بھائی کا داماد بن کر راج کرنے لگتا اور دونوں بیٹیاں چھوٹے بھائی کے آنگن میں چاند بن کر اُترتیں اور آنکھوں کے سامنے رہتے ہوئے عیش کرتیں۔ اُس نے قبل اَز وقت ہی اِسے قدرت کا بہترین فیصلہ قرار دے رکھا تھا۔ تینوں بھائیوں کی اولادیں اپنے گھروں میں کھپ جاتیں۔ خاندان کے باہر قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس من چاہے جوڑ توڑ میں اُسے نور بانو کی طرف سے ہمیشہ تشویش لاحق رہتی تھی۔ عشرت کا جادو اُس کے بڑے بھائی کے سر پر چڑھ کر بولتا تھا اور نور بانو عشرت بیگم کے بہت قریب ہوچکی تھی۔ عقیدت اور عشرت جب بھی حویلی میں چند دن یا چند گھنٹے گزارنے کے لیے آتیں، وہ نور بانو کے کمرے میں ہی گھسی رہتیں یا اُس کی معیت میں گھومنے پھرنے نکلتیں۔ کبھی کبھار تو یوں محسوس ہونے لگتا تھا کہ وہ صرف ان سے ملنے کے لیے ہی آتی تھیں۔ احمد نواز نے کبھی اپنی بیوی کو ان کے ساتھ ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ اِسی لیے آج فیصلہ کُن انداز میں بات کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ ''زرینہ! تم اپنی بھتیجی کو بہو بنانے کا خیال دِل سے نکال دو۔ اُس کے لیے تمہارے خاندان میں بڑی گنجائش موجود ہے۔''

وہ اُسی لہجے میں ترخ کر بولی۔ ''عقیدت میں سُرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں؟ جو تم چاہتے ہو، وہ میں نہیں چاہتی۔ میری خواہش تمہیں بُری لگتی ہے۔ ایسے میں یہی کیا جاسکتا ہے کہ بیٹے کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی جائے۔ جدھر جانا چاہے گا، چلا جائے گا۔ ویسے بھی اَبھی اُس کی عمر ہی کیا ہے؟''

وہ غصیلی نگاہوں سے اُسے گھورنے لگا۔

وہ بات کو بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''میرے بھائی کی ایک ہی بیٹی ہے۔ دو بیٹے ہیں۔ ہمارے بچوں سے عمریں ملتی جلتی ہیں۔ ایک ہی گھر میں ہماری اولاد خوش رہے گی۔''

سردار کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔ وہ لینے پر رضامند نہیں تھا، وہ دو بیٹیوں کو بھوکے ننگے بھتیجوں کے حوالے کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ دانت پیس کر بولا۔ ''سیانے ٹھیک کہہ گئے ہیں۔ عورت پاؤں کی جوتی ہوتی ہے۔ پاؤں تلے دبی رہے تو شانت رہتی ہے۔ اُٹھا کر جھولی میں بٹھاؤ تو ماتھے پر لگنے لگتی ہے۔ آئندہ اگر تم نے اپنے بھائی اور اُس کے خاندان کا نام لیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔''

وہ ایک کڑی نگاہ اُس پر ڈال کر خاموش ہوگئی۔ دل میں بولی۔ ''تم سے بُرا تو شاید دُنیا میں کوئی نہیں ہوگا۔ تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ جب جی چاہے گا، بٹن دبا کر اپنے پیچھے پیچھے چلانا شروع کردوں گی۔ تم بھی عقیدت کو بہو بنانے کا خیال دل سے نکال دو۔ کیا ہوا جو میرے بھائی کے پاس اتنی دولت نہیں ہے۔ تمہاری دولت کس کے کام آنی ہے؟ بیٹیوں اور بیٹے کے لیے سب کچھ سینت سینت کر رکھتے آئے ہو۔ اُنہی کے کام آئے گی۔ تھوڑا سا حصہ اگر میرے بھتیجوں کو مل گیا تو قیامت نہیں آجائے گی۔''

برانگیختگی کے عالم میں کوئی ترکیب سجھائی نہیں دیتی مگر احمد نواز غصے کی حالت میں بھی سردار رَب نواز کے دِل کو مٹھی میں لینے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ اچانک اس کے لبوں پر شاطرانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہاتھ بڑھا کر فون اُٹھایا اور بھائی سے رابطہ کرنے لگا۔ رابطہ ہونے پر بولا۔ ''بھائی! تمہیں ناوقت تکلیف دینے پر معذرت چاہتا ہوں مگر کیا کروں... اچانک تمہاری طرف سے دل بے قرار ہونے لگا تھا۔''

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''تم نے بہت اچھا کیا احمد نواز! کافی دِنوں سے حویلی کی خیر خیریت سے آگاہ نہیں تھا۔ سناؤ! بھابھی اور بچے کیسے ہیں؟''

وہ زرینہ پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر بولا۔ ''سب ٹھیک ہیں۔ تمہاری بھابھی بھی میری طرح تمہاری طرف سے فکرمند تھی۔''

اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد احمد نواز اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے بولا۔ ''بھائی! تم جانتے ہی ہو کہ اپنا رئیس پڑھائی میں بہت تیز ہے۔ قصبے کے اسکول میں ہمیشہ اچھی پوزیشن لیتا ہے۔ اُس کا ہیڈ ماسٹر مجھے ملا تھا۔ اُس نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ قصبے کے اسکول سے نکال کر لاہور کے کسی اچھے اسکول میں رئیس کو ڈال دیا جائے تو وہ بہت اچھے نمبر حاصل کرے گا۔ اس اسکول میں برائے نام پڑھائی رہ جاتی ہے۔ تم میری بات کو سمجھ رہے ہو نا؟''

سردار رب نواز کچھ دیر خاموش رہا۔ بات کی تہ تک پہنچ قدرے درشتی سے بولا۔ ''اگر تم یہ چاہتے ہو کہ رئیس کو میں اپنی کوٹھی میں رکھ کر امتحان دلاؤں تو صاف کہے دیتا ہوں کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ حویلی اور کوٹھی کے معاملات میں بہت فرق ہے میرے بھائی! یہاں صرف اور صرف عشرت کی مرضی چلتی ہے۔ وہ اپنی دُنیا میں کسی کی آمد کو برداشت نہیں کرتی۔ ہاں، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اپنے صاحبزادے کو بورڈنگ اسکول میں بھیج دو۔''

احمد نواز کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ اُسے اپنے بھائی سے ایسے کورے جواب کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ اب کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سردار رب نواز نے اُسے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ ''احمد نواز! شہر اور قصبے کے اسکولوں کے ماحول میں بہت فرق ہوتا ہے۔ تم اگر رئیس کو لاہور بھیجو گے تو اُسے ایک دو سال کا عرصہ ایڈجسٹمنٹ کے لیے درکار ہوگا۔ وہ پڑھائی پر توجہ نہیں دے سکے گا۔ بہتر یہی ہے کہ ہیڈ ماسٹر کی بات کو نظر انداز کردو اور رئیس کو اُسی اسکول میں پڑھنے دو۔ اگر اُسے ٹیوٹر کی ضرورت ہے تو میں شہر سے کسی کو جوائن کرکے حویلی میں بھیج دیتا ہوں۔''

احمد نواز نے اپنی مایوسی کو چھپاتے ہوئے قدرے بے رُخی سے کہا۔ ''اگر اپنے تایا کے گھر میں رئیس کے چند دِن رہنے کے لیے گنجائش نہیں نکل سکتی تو اُس کے لیے شہر سے ٹیوٹر بھیجنے کی تکلیف کیوں اُٹھاتے ہو۔ اُسے بورڈنگ میں بھیجنا ہے یا کسی ٹیوٹر کو شہر سے لانا ہے، یہ میں بہتر جانتا ہوں۔ مجھے تو پہلے سے ہی تمہاری محبت کا اندازہ تھا۔ یہ تو بیٹے اور بیوی کی فرمائش پر اتمامِ حجت کرنے چلا تھا۔ بھابھی کو سلام دینا اور میری بیٹی عقیدت کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھنا۔ خدا حافظ!''

سردار رَب نواز کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ سُنے ہوئے کو کافی جان کر مزید کچھ سننا نہیں چاہتا تھا۔ دہکتے انگارے کو ہوا دینے کے لیے زرینہ نے طنز کیا۔ ''کیا رئیس کا سامان باندھ دوں؟ آخر اپنے پیارے تایا جی کے ہاں دو چار مہینے رہنے کے لیے جارہا ہے۔''

احمد نواز نے آتش بار نگاہوں سے اُسے گھورا اور کروٹ بدل لی۔ ایک وار کی ناکامی پر مایوس ہونے کے بجائے کسی کارگر وار کے بارے میں آنکھیں موند کر سوچنے لگا۔ دل نے دماغ کو چھیڑا۔ ''میں صدر ہوں۔ جو چاہتا ہوں، کھل کر اُس کا اظہار کردیتا ہوں۔ تم وزیرِ باتدبیر ہو۔ میری خواہش کو پورا کرنا تمہارا کام ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سردار رَب نواز کی بیٹی رئیس سے بیاہی جائے۔ حُسن اور جائیداد کی تمام تر دولتیں میری جھولی میں آن گریں۔ تم سوچو کہ یہ کیسے ممکن ہے۔''

دماغ نے اپنی رگوں کو ٹٹولا۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی پھر دل سے کہا۔ ''عشرت کے حُسن کا جادو سردار بھائی کے سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ میں کوئی ایسی تدبیر کرتا ہوں کہ اُس کا شوہر اُس سے متنفر ہوجائے۔ اُسے گھر سے نکال دے یا ناکارہ کل پُرزے کی طرح گھر کے کونے کھدرے میں پھینک دے۔''

دل نے کہا۔ ''پھر کیا ہوگا؟''

''پھر یہی ہوگا کہ سردار بھائی جو پہلے ہی نرینہ اولاد کے دُکھ کا شکار ہے، دل شکستہ ہوکر سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں گنوا بیٹھے گا۔ میں ہمدرد بن کر اُس کے پاس جاؤں گا تو میرے دام میں آجائے گا۔''

دل نے قہقہہ لگایا۔ ''جو بھی تدبیر ہو، میری خواہش پوری ہو... بس!''

دماغ ادھیڑبُن میں مشغول ہوگیا۔ کیا ہو، یہ دل نے بتا دیا تھا۔ کیسے ہو، یہ سوچنا اُس کا کام تھا۔

٭٭٭

''میں نے آپ کے لیے ہاتھوں پر مہندی لگائی تھی۔ رات کو دکھانا یاد نہیں رہا۔ یہ دیکھیں!''

اجمل ہتھوڑی، پلاس اور پیچ کش لیے سائیکل کے چین کور کو متوازن کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ چین گھومتے ہوئے کور سے رگڑ کھاتی رہتی تھی اور خاصی ناپسندیدہ آواز دیتی تھی۔ سامنے بیٹھی مُون نے فریم کے بیچ سے بایاں ہاتھ نکال کر اُس کی نگاہوں کے سامنے کردیا۔ اجمل نے مسکرا کر پیچ کش رکھ دیا اور ہاتھ پکڑ لیا۔ فیشن میگزین دیکھ دیکھ کر مہندی لگا کر ہاتھ سجانے کا ہنر مون کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ بیل بوٹوں اور پُرپیچ ٹہنیوں پر نظر پھسلنے لگی۔ وہ شرارت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میرے لیے لگائی ہوتی تو میرا نام لکھا ہوتا۔''

مون نے اٹھلا کر دائیں ہاتھ کی اُنگلی ہتھیلی کی ننھی سی وادی میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھیں۔ آپ کا نام لکھا ہوا ہے۔''

اُس نے غور کیا۔ سرسری طور پر دیکھنے میں پھول دکھائی دیتا تھا۔ غور کیا تو ''اجمل'' لکھا دکھائی دیا۔ چومنے کا ارادہ رکھتا تھا کہ اجمل کے اوپر بنے ہوئے پھول پر نگاہ پڑ گئی۔ غور کرنے پر ''ندیم'' کا لفظ پڑھنے میں کامیاب ہوگیا۔ پتا چلا کہ لکھنے والی نے اجمل نہیں، ندیم اجمل لکھا تھا۔ وہ ہاتھ کو مصنوعی خفگی سے جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''ہونہہ! آپ کے لیے مہندی لگائی ہے۔ چکر دینا بھی سیکھ گئی ہو۔ بیٹے کا نام لکھتی ہو، شوہر کو دھوکا دیتی ہو۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ پہلے دل کے کارنس پر سے مجھے اتار دیا تھا، اب ہتھیلی بھی اپنے بیٹے کے نام الاٹ کرچکی ہو۔''

وہ دیوار سے ٹیک لگا کر ہنسنے لگ گئی۔ ''میرے بیٹے سے جیلس کیوں ہوتے ہیں؟ اُسے دل میں ٹھاؤں یا قسمت کی لکیروں میں سجاؤں، آپ کو کیا؟'' بائیں بازو کی آستین اوپر کرکے اُس کی نظروں کے سامنے لہراتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو تو صرف یہ اچھا لگتا ہے۔ اِسی پر گزارہ کریں۔''

بارہا کا دیکھا بھالا ننھا سا سیاہ تل نئی تمکنت سے نگاہوں کو ساگانے لگا۔ دو پل ہی گزرے تھے کہ تل کے نیچے والی زمین نے اپنا رَنگ بدل لیا۔ سرخی مائل سنولائی ہوئی جلد اچانک سرخ و سپید ہوگئی۔ تِل مزید نمایاں ہوکر اِٹھلانے لگا۔ اُس نے آنکھیں جھپکیں۔ جلد پھر سنولا گئی۔ محویت ٹوٹنے سے پہلے سمجھا گئی۔ ''ایسا تغیر پہلے دیکھنے میں آیا؟ کبھی نہیں... تمہاری نظر دھوکا کھانے لگی ہے۔ ایک لمحے میں مون کا بازو دیکھتے ہو۔ دوسرے لمحے میں عشرت کا بازو دیکھتے ہو۔ دونوں بانہوں پر تِل ایک جیسے ہیں مگر دونوں کی رنگت میں نمایاں فرق ہے۔''

نظر دھندلا گئی۔ سر جھٹک کر سوچنے لگا۔ 'ایسا تغیر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا کہ مون کے بازو پر نگاہ ڈالوں اور مجھے عشرت کا تِل دکھائی دینے لگے۔ مجھے اچانک کیا ہوگیا ہے؟ دونوں میں اتنی مماثلت کیوں ہے؟ اگر ہے بھی تو میں بے اختیار ہوکر اِس کی زَد میں کیوں آرہا ہوں؟'

مُون برسوں سے اپنے شوہر کی اِس کمزوری سے لطف کشید کرتی آرہی تھی۔ جانتی تھی کہ وہ ہر مرتبہ اُس کے تِل کو ایسے دیکھتا ہے جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو مگر آج اُس کے چہرے کے تاثرات قدرے اجنبی سے لگے۔ وہ پوچھنے لگی۔ ''کیا سوچنے لگے؟''

اجمل نے نفی میں سر ہلایا۔ بازو پکڑا اور تِل کی پذیرائی کرنے لگا۔ ایسے میں سوچ رہا تھا۔ 'میں سمجھتا رہا کہ مون کے بازو کا تِل دُنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے مگر عشرت کی سپید چمک دار جِلد پر موجود تضاد نے میری سوچ کو آناً فاناً باطل کردیا۔ کیا ہماری محبت میں کمی واقع گئی ہے؟'

سائیکل ٹھیک ہوگئی تو وہ الوداع کہہ کر گھر سے نکل آیا۔

پرانی کشتی سے اُتر کر نئی کشتی میں سوار ہوا تو عقیدت اسکول بیگ اُٹھائے بھاگی آئی۔ گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں دَس منٹ لیٹ ہوچکی ہوں۔ گاڑی تیز چلا کر اسکول ٹائم میں پہنچا دیجیے گا۔''

وہ زیرِ لب مسکرایا۔ مین گیٹ تک لے جانے والی بجری

کی روش پر ہی تھا کہ عشرت بیگم کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ رُک کر انتظار کرنے لگا۔ وہ قریب آکر بولی۔ ''بے بی کو اسکول ڈراپ کرکے مجھے مسز رعنا کے ہاں پہنچا دینا۔''

وہ ہمیشہ عقبی نشست پر بیٹھتی تھی۔ گاؤں سے لوٹنے پر اگلی نشست پر بیٹھنے لگی تھی۔ اجمل چاہتا تھا کہ وہ پہلے کی طرح پچھلی سیٹ پر بیٹھا کرے مگر اُسے اپنے برابر میں بیٹھنے سے روک دینے کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ اجمل نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھا۔ وہ خاصے اہتمام سے نکلی تھی۔ اُسے قدرت نے خوب بنا کر دُنیا میں بھیجا تھا۔ وہ ہلکا پھلکا میک اَپ کرکے خوب سے خوب تر بن جاتی تھی اور دیکھنے والوں کے دِل پر بجلیاں گرانے لگی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اپنے اندر عجیب سی گہرائی رکھتی تھیں۔ یوں کہ ڈوب کر بھی کچھ ہاتھ نہیں لگتا تھا۔ اجمل کی دھڑکن یکبارگی سے تیز ہوگئی۔ دل تِل دیکھنے کو مچل گیا مگر وہ چھپا ہوا تھا۔ چھپی ہوئی چیز انسان کے تجسس کو مہمیز کرنے لگتی ہے۔ ڈرائیونگ پر بہ دقت تمام اپنی توجہ مرکوز کرکے سوچنے لگا۔ 'برسوں سے اِس چمکتے وجود کو دیکھتا آرہا ہوں۔ کبھی نظر نے ابتدائی نظارے سے آگے کچھ نہیں مانگا۔ مونگ کے دانے کے برابر سیاہ تِل کو دیکھ لینے کے بعد بہت کچھ دیکھنے کی آرزو دِل میں مچلنے لگی ہے۔ میں ایسا تو کبھی بھی نہیں رہا۔ پھر یہ ماجرا کیا ہے؟'

کہتے ہیں کہ محبت زندگی میں ایک مرتبہ ہوتی ہے۔ وہ ایک مرتبہ محبت کرچکا تھا۔ مُون کو پانے کے بعد آج تک اُس نے کسی کو نگاہ اُٹھا کر نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کسی حسین چہرے نے اُسے متوجہ کیا تھا۔ وہ اپنی پہلی اور آخری محبت پر نہ صرف مکمل طور پر مطمئن تھا بلکہ روح تک آسودہ تھا۔ تبھی عشرت کے بارے میں اِس انداز سے سوچنے پر بھی دل ہی دل میں ندامت محسوس کرنے لگا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ مون کے بجائے عشرت کو محبت پاش نظروں سے دیکھ کر کبیرہ گناہ کا مرتکب ہورہا ہو۔ گناہ نظریں جھکانے اور نظریں چرانے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ بھی نظریں چرا رہا تھا۔

جب تک عقیدت کا اسکول دکھائی نہیں دیا، عشرت ماں بن کر چپ کی چادر اوڑھے بیٹھی رہی۔ عورت پہلے بیوی بنتی ہے، پھر اُس پر ممتا کا پُرتقدس روپ اُترتا ہے۔ جونہی عقیدت گاڑی سے اُتری، وہ ایک دَم پلٹ کر ماں سے عورت بن گئی اور بولی۔ ''اجمل! کسی پُرسکون ہوٹل میں چلو۔ آئس کریم کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔''

''آپ تو مسز رعنا سے ملنا چاہتی تھیں؟'' اجمل نے اُسے یاد دلایا۔

''اَب میں اُس سے نہیں، تم سے ملنا چاہتی ہوں۔'' اُس نے رُکتے رُکتے کہہ ہی دیا۔

اجمل چونک گیا۔ کچھ کہنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ کہہ نہ سکا اور خاموشی سے مین روڈ پر آگیا۔ دل میں سوچنے لگا۔ 'تجھے روز دیکھتی ہو، ملتی ہو، مل کر بھی تمہارا ملنے کو جی چاہنے لگا ہے۔ میں ان لفظوں سے کیا معنی اخذ کروں؟'

ہوٹل کی پارکنگ میں گاڑی رک گئی۔ وہ اُترتے ہوئے بولی۔ ''تم بھی آؤ نا!''

وہ استعجاب آمیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ ہکلا کر بولا۔ ''مم... میں بھی؟''

''ہاں بھئی!'' وہ بولی اور مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اجمل نے گاڑی لاک کی۔ چابی ہپ پاکٹ میں ڈال کر سست قدموں سے اُس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ گیٹ میں کھڑے ہوکر عشرت نے پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔ ''حُسن اور عشق کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ آگے بڑھو اور چولی کو مضبوطی سے تھام لو۔ چولی کے پیچھے دھڑکتا ہوا دِل بھی تمہیں پکار رہا ہے... چلے آؤ میرے محبوب!''

ہوٹل کے ہال میں اکا دُکا میزیں آباد تھیں۔ اِس وقت یہاں کم لوگ آیا کرتے تھے۔ بڑے گملے والے مصنوعی پودے کے عقب میں پڑی ہوئی میز پر دونوں بیٹھ گئے۔ یہ پُرسکون گوشہ تھا۔ ویسے بھی یہاں آنے والوں کو سکون کی ڈشیں طمانیت بھرے ہاتھوں سے پیش کی جاتی تھیں۔ ڈرائیور کے یونیفارم میں اجمل خود کو اِس ماحول میں مس فٹ سمجھ کر احساسِ کمتری کا شکار ہورہا تھا۔ کندھے اُچکا کر سوچا۔ 'جسے فکر ہونی چاہیے، اُسے نہیں ہے۔ میں کیوں ہلکان ہو جارہا ہوں۔'

عشرت لپک کر قریب آنے والے ویٹر کو اپنے پسندیدہ فلیور کی آئس کریم لانے کا آرڈر دے کر مضطرب انداز میں انگلیاں چٹخانے لگی۔ وہ بیک وقت مسکرا بھی رہی تھی اور بے چین بھی دکھائی دے رہی تھی۔

اجمل سے نہ رہا گیا تو دھیرے سے بولا۔ ''بیگم صاحبہ چھوٹے منہ سے بڑی بات نکل رہی ہے۔ آپ مجھے نارمل دکھائی نہیں دیتیں۔ پریشان ہیں، پریشانی کو چھپانے کی کوشش بھی کررہی ہیں۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

کوئی جواب دینے کے بجائے عشرت نے اُس پر اپنی سیاہ آنکھیں مرتکز کردیں۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے۔ اجمل نے پہلو بدل کر کہا۔ ''ویری سوری بیگم صاحبہ! مجھے شاید! چھوٹا منہ بند ہی رکھنا چاہیے تھا۔''

وہ دل میں سر ہلا کر مسکرائی اور بولی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں اجمل! شاید ٹھیک کہتے ہو کہ میں نارمل نہیں ہوں۔ میں جو کچھ کرنا چاہ رہی ہوں، اُس میں نہ تو میری مرضی شامل ہے نہ ہی مجھے اس کام کو سرانجام دینے کا سلیقہ ہے۔ سوچ رہی ہوں آگے بڑھاؤں یا پچھلے قدموں لوٹ جاؤں۔ یہی تذبذب مجھے بے چین کررہا ہے۔''

''میں ڈرائیور ہوں۔ یہی کہہ سکتا ہوں کہ جو شخص بیچ سڑک پر گاڑی کے سامنے ہچکچانے لگے، قدم کبھی آگے، کبھی پیچھے رکھنے لگے، وہ گاڑی تلے روندا جاتا ہے۔ جو آگے بڑھ جاتا ہے، بچ جاتا ہے۔ جو فوراً پیچھے ہٹ جاتا ہے، وہ بھی بچ جاتا ہے۔'' اجمل نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''آپ بھی ایسا ہی کریں۔ ہچکچاہٹ میں سوچنے کے بجائے فوراً فیصلہ کریں اور اُس پر عمل درآمد کرلیں۔ یہی مناسب ہوگا۔''

وہ چند لمحوں تک اُسے کھوجتی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ اُس کی کہی ہوئی بات کی معنویت پر غور کرتی رہی پھر بولی۔ ''تمہارے کہنے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جو گاڑی سے ٹکرانا چاہے، وہ تذبذب کے عالم میں کھڑا رہے۔ کبھی آگے قدم رکھے، کبھی پیچھے!''

اجمل حیرت اور پریشانی سے بولا۔ ''میں نے یہ تو نہیں کہا۔''

اسی دوران ویٹر نے آئس کریم سرو کردی۔ وہ ٹشو پیپر میں لپٹا ہوا کپ اپنی جانب سرکاتے ہوئے مسکرائی۔ ''تم نہیں سمجھو گے اجمل!''

وہ سر جھکائے عشرت کی بدلی ہوئی آنکھوں اور رویے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُلجھنے لگا۔ اُسے اندازہ نہیں تھا کہ آئس کریم کا ہر ٹھنڈک بھرا چمچ عشرت کے ذہن میں انگارے بھرتا جارہا تھا۔ وہ یک ٹک اُسے دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ 'ڈالی پر لٹکتا ہوا پھل کتنا مغرور ہوتا ہے۔ توڑ کر کھایا جائے تو اُس کا وقار برقرار رہتا ہے۔ اپنے آپ ٹوٹ کر گرتا ہے تو بے وقعت ہوجاتا ہے۔ کوئی کھاتا نہیں، کوئی اُٹھاتا نہیں۔ کوئی اُٹھا بھی لے تو چند لمحے پکڑ کر رکھنے کے بعد پرے پھینک دیتا ہے۔ میں اپنے نوکر کے پیروں میں ٹوٹ کر گرنا چاہتی ہوں۔ وہ ٹھوکر مار کر گزر جائے گا۔ تب میں کیا کروں گی؟'

اُس کے اِرادے ڈانواں ڈول ہونے لگے۔ جس کام کو سہل جانا تھا، وہ ایسا بھی سہل نہیں تھا۔ سوچنے لگی۔ 'مجھے اچانک ٹوٹ کر اجمل کی جھولی میں گرنا زیب نہیں دیتا۔ مجھے اپنے آپ کو توجہ کے لائق بنانا چاہیے۔ جب اجمل مجھ پر توجہ دینے لگے، مجھے اِس کی توجہ کو بھڑکانا ہوگا تاکہ وہ ہاتھ بڑھا کر توڑنے پر مجبور ہوجائے۔'

اپنی سوچی ہوئی ترکیب کو سراہتے ہوئے سر ہلانے لگی۔ وہ بولا۔ ''بیگم صاحبہ! چلیں؟''

عشرت نے چونک کر اپنے کپ میں جھانکا۔ آہ بھر کر سوچنے لگی۔ 'جوانی کا برتن خالی ہوگیا اور پتا نہیں چلا۔ اجمل کے سامنے بیٹھے رہنے کا بہانہ آئس کریم تھی۔ کپ خالی ہوگیا اور پتا نہیں چلا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جوانی اور ملاقات کی عمر کو سدابہار ہونا چاہیے۔'

ایک طویل سانس لے کر اُٹھ گئی۔ بل ادا کرنے کے بعد گاڑی میں آبیٹھی۔ اجمل نے استفہامیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''کہیں بھی لے چلو۔ میں کچھ دیر گھر سے باہر گزارنا چاہتی ہوں۔''

اجمل نے گاڑی اسٹارٹ کی اور بے منزل سفر کا آغاز کردیا۔

عشرت نے کچھ دیر شیشوں کے باہر بھاگتی دوڑتی دُنیا کا مشاہدہ کیا۔ اوورٹیک کرنے والی کاروں کے اندر کی دنیا کو جھانک کر دیکھا پھر بور ہونے لگی۔ کہتے ہیں کہ دو انسانوں کی شباہت ایک جیسی نہیں ہوسکتی۔ کوئی سے دو... ایک جیسے دُنیا میں ڈھونڈے سے بہ مشکل ملتے ہیں مگر اُسے ہر چہرہ ایک سا دکھائی دینے لگا۔ ہر گاڑی کے اندر، باہر... ایک ہی طرح کا معمول... سر میں ہلکا ہلکا درد محسوس کرتے ہوئے سوچنے لگی۔ 'میں شاید بہت زیادہ تھک گئی ہوں۔ بور ہورہی ہوں تبھی تو سر درد کرنے لگا ہے۔ میں اجمل کی شک آلود نگاہوں پر پیچ کے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے کیسے ماروں؟ اِسے کیسے بتلاؤں کہ میں اُس بوڑھے برگد کی چھاؤں سے اکتا چکی ہوں۔ میں بدن میں چبھنے والی تیز دھوپ تلاش کرتی پھرتی ہوں۔ اجمل اچھا انسان ہے، سمجھ کر بھی نہیں سمجھتا۔ کسی بُرے آدمی کو سمجھانے کے لیے ایک اشارہ ہی کافی ہوتا ہے مگر پھر اُس سے جان چھڑانے کے لیے عمر کافی نہیں رہتی۔ ہائے! کس عذاب میں پڑ گئی ہوں؟'

کل تک اجمل کے چہرے پر چھایا ہوا ٹھہراؤ اُس کے نزدیک قابلِ ستائش تھا۔ آج دل میں اُس کی پارسائی کھٹکنے لگی تھی۔ خاموشی سے اُسے کوسنے لگی۔ ''ایسا بھی کیا کہ آدمی ہمیشہ ہی نیکوکار بنا رہے۔ کبھی کبھار لذتِ گناہ سے روشناس ہونا بھی ادائے بندگی قرار پاتا ہے۔ میٹھے اور کڑوے میں فرق دیکھنے کے لیے دونوں کو زبان پر رکھنا پڑتا ہے۔''

کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔ چھٹی میں دو تین

گھنٹے باقی تھے۔ ایسے میں مُون یاد آ گئی۔ وہ کچھ وقت اُس کے ساتھ بوریت محسوس کیے بغیر گزار سکتی تھی۔ وہ اجمل سے مخاطب ہوئی۔ ”مجھے اپنی مون کے پاس لے چلو۔ میں وہیں بیٹھ کر چھٹی ہونے کا انتظار کروں گی۔“

وہ خوش ہو کر بولا۔ ”وہ بھی آپ سے مل کر بہت خوش ہوگی۔“

اُس کے اعضا میں پھُرتی بھر گئی۔ فراٹے بھرتی گاڑی دس پندرہ منٹ بعد اجمل کی گلی کے سامنے رُک چکی تھی۔

☆☆☆

دونوں میاں بیوی ایک رشتے دار کے ہاں شادی کی ہنگامہ خیزیوں سے نبرد آزما ہونے کے بعد واپس آ رہے تھے۔ پورا دن خاصی مصروفیت میں گزارنے کے باعث خاصے تھکے ہوئے تھے۔

امیر نواز کی آنکھوں میں دولہا کے سر پر سجا ہوا سہرا اور سرخ عروسی بڑے گھیر والے لہنگے میں سمٹ کر چھپی دُلہن کا عکس ابھی تک ٹھہرا ہوا تھا۔ ایسے میں اچانک سہرے تلے دبے چہرے کے خال و خط بدل گئے۔ وہ چونک سا گیا۔ اپنے بیٹے عمران کو دیکھ کر نہال ہو گیا۔ خوش کن تصور میں گم رہتے ہوئے اُس نے بہو کا گھونگھٹ اٹھایا۔ بہو کا چہرہ دیکھ کر دَم بخود رہ گیا۔ لاشعور میں چھپی خواہش کتنا خوبصورت رُوپ اوڑھ کر نظروں میں کھب کر دِل میں اُترنے لگی تھی۔ سرخ عروسی جوڑے میں ملبوس سرخ و سپید گڑیا جیسی دکھائی دینے والی عقیدت کے بارے میں سوچنے لگا۔ ’میرا بیٹا لاکھوں میں ایک ہے۔ اُس کے لیے کروڑوں میں الگ دکھائی دینے والی دُلہن لانا پڑے گی۔ ایسی پوری دُنیا میں صرف عقیدت ہی نظر آتی ہے۔ کم سنی میں بدن کی اُٹھان پر نظر نہیں ٹکتی، جوانی میں قدم رکھے گی تو ہر قدم سیدھا میرے عمران کے دِل پر دھرے گی۔‘

پہلو میں نرمی سے کہنی چبھو کر نور بانو نے چھیڑا۔ ”کیا سوچ رہے ہیں؟“

وہ ہڑبڑا سا گیا۔ ”ایں... کچھ بھی تو نہیں۔“

وہ مسکرائی۔ ”کچھ ہے سہی۔ تصور میں کون ہے جسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے ہیں اور اکیلے اکیلے خوش ہو رہے ہیں۔ مجھے بھی تو کچھ پتا چلے۔“

امیر نواز نے چلتی گاڑی کے شیشے کے پار دیکھا۔ ایک نظر ڈرائیور پر ڈالی اور پھر وفورِ اشتیاق سے اپنی محبوب بیوی کو دیکھنے لگا۔ آنکھوں سے عجیب سی خوشی مترشح تھی۔ وہ بولا۔ ”نور بانو! تم نے میری زندگی میں آتے ہی میری آنکھیں اپنے نور سے خیرہ کر دی تھیں۔ اردگرد کچھ دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ آج دولہا اور دلہن کو دیکھا۔ تصور میں اپنی بہو دیکھا۔ دِل نے کہا کہ آنگن میں تمہاری چاندنی ماند پڑنی ہی کر رہ گئی ہے۔ نیا چاند اُتارنا پڑے گا۔“

وہ پیار سے، شکوہ کناں نگاہوں سے اپنے شوہر کو دیکھنے لگی۔

وہ ابھی تک اپنے تصور میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ بولا۔ ”سہرا اُٹھایا تو عمران دکھائی دیا۔ گھونگھٹ اُٹھایا تو عقیدت کا نور بھرا چہرہ نظر آیا۔ مجھے اپنے بیٹے کی قسمت پر رشک آنے لگا ہے۔ تمہاری جوانی نگاہوں میں تصویر کی طرح جمی رہتی تھی۔ سوچتا تھا کہ مرتے دم تک تمہیں ہی دیکھنا پڑے گا۔ اَب سوچتا ہوں کہ تم کہیں دکھائی نہیں دیتی ہو۔ کیا بہو اتنی ہی خوبصورت ہے؟“

وہ ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ خفا ہو کر دروازے کی طرف سمٹ گئی۔ وہ مسکرایا۔ ”ناراض ہو گئی ہو نا؟ بھلے ہوتی رہو۔ پہلے سوچا کرتا تھا کہ تمہاری ناراضی میں ایک پل نہیں گزرے گا۔ اَب سوچتا ہوں کہ بہو کے آنے پر تمہاری طرف دیکھنے کی آرزو بھی نہیں رہے گی۔“

وہ اوپر سے ناراض ہو رہی تھی۔ دِل ہی دِل میں اُسی خوش کن تصور کی بانہوں میں ہوا کے دوش پر اُڑ رہی تھی جسے اُس کا شوہر من میں سجائے اونچے بول بولنے لگا تھا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا پڑتا ہے۔ وہ پتھر پھینکتے ہوئے بولی۔ ”بیٹے پر ماں کا پہلا حق ہوتا ہے۔ بیٹے کی ہر چیز کو سب سے پہلے ماں چھوتی ہے۔ دِل بھرنے پر کسی اور کو ہاتھ لگانے کی اجازت دیتی ہے۔ میں آپ سے پہلے عقیدت کو سینے سے لگاؤں گی۔ میرا جھوٹا کھائیں گے تو اپنی اوقات میں آ جائیں گے۔“

پتھر دل پر لگا۔ زخمی کرنے کے بجائے مزہ دے گیا۔ وہ قریب کھسک کر بولا۔ ”تم نے اشاروں اشاروں میں بھابھی پر اپنی خواہش واضح کر دینی تھی تاکہ وہ کسی اور سمت میں قدم اُٹھانے سے گریز کریں۔“

وہ اُس کی بے تابی پر مسکرائی۔ ”عقیدت کی عمر ہی کیا ہے؟ اَبھی بچی ہے۔ شادی کی عمر کو پہنچنے میں ابھی دس بارہ سال دیر ہے۔ اتنی جلدی کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہیں لگتا۔“

”بھائی کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ یہ نہ ہو کہ کسی دن ہماری جانب سے مایوس ہو کر اپنے سسرال سے آئی ہوئی کوئی انگوٹھی اپنی بیٹی کی انگلی میں ڈال دیں۔“ وہ تشویش آمیز لہجے میں بولا۔ ”بھائی احمد نواز بھی اِسی خیال میں رہتا ہے۔ پہلے پہنچ کر ہمارا راستہ کاٹ دے گا۔ ایسے میں بہت مشکل ہو جائے گی۔“

وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ”عمران اور عقیدت بچپن سے

ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ میں دیکھتی رہتی ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ پاتے۔ جب مجھے پتا چلتا ہے کہ عقیدت یہاں آ رہی ہے تو میں فوری طور پر عمران کو ہوسٹل سے بلوا لیتی ہوں۔ بزرِ دست جو کیا جا سکتا ہے، وہ کر رہی ہوں۔ دِل سے چاہتی ہوں کہ وہی میری بہو بنے۔ آپ کو چاہیے کہ یہ بات اپنے بھائی کے کانوں سے گزار دیں۔ وہ عمران کو ذاتی طور پر پسند کرتے ہیں۔“

”بھائی کے تالو سے عشرت بھابھی کی زبان چپکی ہوئی ہے۔ وہ جو کہتی ہے، بھائی بلا چون و چرا مان لیتا ہے۔ اِسی لیے کہتا ہوں کہ عشرت سے بات کرو۔“

وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔ ”عشرت، عقیدت کو حقیقی ماں سے زیادہ چاہتی ہے۔ اُس کے میکے والے اُس کا رشتہ لینا چاہتے ہیں۔ عشرت نے واضح طور پر انکار کر دیا۔ انکار کی وجہ پوچھنے پر اُس نے مجھے بتلایا تھا کہ اُس کے میکے میں کوئی بھی عقیدت کے شایانِ شان رشتہ موجود نہیں۔ وہ عقیدت کی جائیداد اور دولت پر للچاتے رہتے ہیں۔ ایسے میں اگر میں اُس سے رشتے کی بات کروں گی تو وہ میرے بارے میں بھی وہی رائے قائم کر لے گی۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔“

امیر نواز خاموشی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ نور بانو نے بات آگے بڑھائی۔ ”آپ باجی زرینہ اور بھائی احمد نواز کی فکر نہ کریں۔ وہ جتنا بھی زور لگا لیں، عشرت رشتہ دینے پر رضامند نہیں ہوگی۔ عقیدت کا رئیس کی طرف ذرّہ بھر رجحان نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ اُس سے ملنا جلنا تک گوارا نہیں کرتی۔ ایسے میں ہمیں فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“

وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اچانک فون کا بزر بول پڑا۔ ننھی سی اسکرین پر بڑے بھائی کا نمبر جلنے بجھنے لگا تھا۔ اُس نے کال ریسیو کر کے فون کان سے لگایا۔ ”جی بھائی! آپ کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہوں۔ کافی دِنوں سے عمران ملنے کے لیے نہیں آیا۔ سوچا کہ اُس کے بورڈنگ ہاؤس میں جا کر مل آؤں۔ مجھے پتا سمجھاؤ۔“ سردار رب نواز کی آواز سنائی دی۔

وہ پتا بتانے کے بعد بولا۔ ”خیر تو ہے بھائی؟ آپ کو بیٹھے بٹھائے کیسے بھتیجے کی یاد نے بے چین کرنا شروع کر دیا؟“

وہ بولا۔ ”پہلے تو مہینے میں ایک آدھ مرتبہ ملنے کے لیے گھر آ جاتا تھا۔ دو تین ماہ سے نہیں آیا تو فکر ہونے لگی۔“

امیر احمد نواز سے تقریباً چمٹ کر بیٹھی نور بانو سردار کی باتیں غور سے سُن رہی تھی۔ فون جھپٹ کر بولی۔ ”سلام بھائی! وہ دراصل آج کل ٹیوشن لینے کے چکر میں خاصا مصروف رہتا ہے۔ کہتا ہے کہ میرٹ بنانے کے لیے خاصی محنت کرنا پڑتی ہے۔“

سردار نے کہا۔ ”وہ بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ میں فون بند کر کے اُس کے پاس جا رہا ہوں۔“

رابطہ منقطع ہو گیا۔ احمد نواز نے فاخرانہ انداز میں چھاتی پُھلا کر نور بانو کو دیکھا اور مسکرانے لگا۔ وہ منہ بنا کر بولی۔ ”ایسے کیا دیکھتے ہیں؟ عمران میرا بیٹا ہے۔ میں نے اُس کی تربیت اس انداز میں کی ہے کہ سردار بھائی تو کیا، دُنیا میں ہر بیٹی کا باپ للچائی ہوئی نگاہ سے میرے بیٹے کو دیکھے گا۔ آپ پر جاتا تو بس ڈیرے داری سیکھتا رہتا۔ کتوں اور مرغوں کی نسلوں پر صبح شام بحثیں چھیڑتا رہتا۔ ہاں تو! سچ کہہ رہی ہوں۔“

وہ خفا ہو کر دروازے کی طرف کھسک گیا۔ دونوں میں پھر فٹ بھر کا فاصلہ حائل ہو گیا۔ شادی والے گھر سے لے کر حویلی تک وہ بیسیوں مرتبہ اکٹھے ہوئے، خفا ہو کر دُور ہوئے۔ بیٹا دونوں کو کھینچ کر ایک لکیر پر کھڑا کرتا تھا۔ بہو تصور کے بَل پر دونوں کو دھکیل کر لکیر کے دونوں سروں پر لا کھڑا کرتی۔ یہ بات سمجھانے یا بتانے سے شعور میں جاگزیں نہیں ہوتی، تجربے کے بعد کھلتی ہے۔ ایک بار کھل جائے تو کبھی بند ہونے کا نام نہیں لیتی۔ گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے تو ایک مرتبہ پھر فون کا بزر بولنے لگا۔ اُس نے نمبر دیکھا۔ عمران ہمیشہ اِسی نمبر سے فون کیا کرتا تھا۔

سردار نے مسکرا کر نور بانو کو دیکھا۔ ”دیکھ لو۔ جسے بار بار اپنا بیٹا قرار دیتی ہو، وہ اپنے باپ کو فون کر رہا ہے۔“

اُس نے زبان چلانے کے بجائے ہاتھ چلایا اور فون جھپٹ لیا۔ آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے بولی۔ ”ہیلو میری جان! کیسے ہو؟ تمہیں کتنی مرتبہ کہہ چکی ہوں کہ دِن میں ایک مرتبہ فون پر ضرور رابطہ کیا کرو۔ میرا حکم بھول کر خاموش رہتے ہو تو سانس اٹکنے لگتی ہے۔“

بیٹے نے ہنس کر کہا۔ ”میرے پاس فون نہیں ہے اور نہ ہی اسکول والے رکھنے دیتے ہیں۔ اجازت ملتی ہے تو کال سینٹر پر آ کر فون کرتا ہوں۔ ابا جی کی طبیعت کیسی ہے؟“

دور بیٹھ کر دل کے تاروں کو چھیڑنے والے بیٹے کے باپ کو شرارت بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”شکر ہے کہ تم نے میرے سمجھانے پر باپ کی خیریت دریافت کرنے کی عادت اَپنا لی ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ اور ہاں بیٹا! کچھ ہی دیر میں تمہارے تایا جی تم سے ملنے کے لیے پہنچ رہے

ہیں۔ اُن کی خوب خاطر مدارات کرنا۔ سمجھ رہے ہو نا؟''

وہ بچہ نہیں تھا۔ ماں باپ کی چشمِ تصور کی تمام تر وارداتوں سے آشنا تھا۔ شرارت آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں کسی لالچ کے بغیر دونوں چچاؤں کی دل سے عزت کرتا ہوں۔ آپ کو بہو کا لالچ ہے۔ سیانے کہتے ہیں کہ لالچ کی بنیاد پر قائم ہونے والے رابط ہمیشہ بے ثمر رہتے ہیں۔ دُعا کرتا رہتا ہوں کہ میری ماں کو کبھی مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔''

ماں کو بیٹے کی بات اچھی نہیں لگی۔ فون امیر نواز کی طرف بڑھاتے ہوئے خفگی سے بولی۔ ''بیٹا! اَب اپنے ابا جی سے بات کرلو۔''

دونوں باپ بیٹا گفتگو کرنے لگے۔ وہ بے نیاز سی ہو کر گاؤں کے کچے پکے گھروں کو دیکھنے لگی۔

حویلی میں زرینہ بیگم کو غصے میں تلملائے ہوئے پایا۔ وہ حسبِ عادت پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ دریافت کرنے لگی۔ ''باجی! تم غصے میں دکھائی دیتی ہو، خیریت تو ہے؟''

زرینہ نے پھنکار کر کہا۔ ''تم دونوں میاں بیوی نے سردار بھائی کو سر چڑھا رکھا ہے۔ تمہاری خوشامدی باتوں کی وجہ سے اُن کا مزاج آسمان کو چھونے لگا ہے۔''

وہ زیرِلب مسکرائی۔ ''پر ہوا کیا ہے باجی؟''

''ہمارا اِرادہ تھا کہ رئیس کو شہر کے کسی اچھے اسکول میں داخل کرواتے ہیں تاکہ میٹرک میں اچھے نمبر لے سکے۔ سردار بھائی سے بات کی۔ اُنہوں نے لگی لپٹی کے بغیر کہہ دیا کہ وہ اپنی کوٹھی میں کسی غیر متعلق فرد کو رہنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ نور بانو! میرا بیٹا رئیس اَب اُن کے لیے غیر ہو گیا ہے۔ عشرت بھابھی چاہے تو رہے، نہ چاہے تو راستہ ناپے۔ جب اُن کا جی چاہتا ہے، یہاں آن دھمکتے ہیں۔ ہم نے تو کبھی نہیں کہا کہ وہ غیر متعلق ہیں، یہاں نہ آیا کریں۔''

نور بانو خوشی کو دَباتے ہوئے بولی۔ ''باجی! تم بھی سمجھنے کی کوشش کیا کرو۔ اِس حویلی میں وہ برابر کے شریک ہیں۔ شہر والی کوٹھی صرف اور صرف اُن کی ہے۔ وہ کسی کو آنے دیں، یہ اُن کی مرضی پر موقوف ہے۔ اِس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے؟ جب اُنہوں نے عمران کو اپنے پاس رکھنے سے انکار کیا تھا، تب ہم تو ناراض نہیں ہوئے تھے۔''

رضیہ بڑی تھی۔ نور بانو کو بے وقوف سمجھتی تھی۔ اِسی زعم میں اُسے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ پہلو میں بٹھا کر سمجھانے لگی۔ ''دیکھو نور بانو! تم میری چھوٹی بہن ہو۔ ہم دونوں ایک ماں کے پیٹ سے نکلی ہیں۔ ایک دوسرے کا فائدہ ہم نہیں سوچیں گی تو کون سوچے گا۔ میں کچھ عرصے سے دیکھ رہی ہوں کہ تمہارا جھکاؤ عشرت بیگم کی طرف تھا۔ یا دہ ہو گیا ہے۔ یہ تمہارے لیے مناسب نہیں ہے۔''

وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''تو مناسب کیا ہے؟''

''حویلی کے مرد اَتھرے گھوڑوں کی مانند ہوتے ہیں۔ جتنی بھی سرکشی دکھائیں، لگام تھامے ہاتھوں کے اشارے پر چلتے ہیں۔ میں نے شوہر کی لگاموں پر ہاتھ کبھی نرم پڑنے نہیں دیا۔ تم بھی ایسا ہی کرو۔ اُسے اچھی طرح سمجھا دو کہ سردار بھائی کا رویہ درست کرنے کے لیے ہمیں عشرت بیگم کو دھتکارنا ہوگا۔ اُن کے غرور کو پاش پاش کرنا ہوگا۔''

''مگر کیوں؟''

''تاکہ کل ہمیں اس دکھ کا سامنا نہ کرنا پڑے کہ ہم رئیس کے لیے سردار بھائی سے رشتہ مانگیں اور وہ عادت کے مطابق بے رُخی کے ساتھ انکار کر دے۔ دیکھ نور بانو! ہم دونوں بہنیں ہیں۔ بہنیں رہیں گی تو راج کریں گی۔ ایک دوسرے کی دُشمن بنیں گی تو دُشمن دراڑوں میں گھس کر دانت کھٹے کرنے لگیں گے۔ میں نے سوچ رکھا ہے کہ تینوں بھائیوں کو کاٹھ کا اُلو بناتے ہوئے حویلی پر ہم دونوں راج کرتی رہیں گی۔ کل بچے جوان ہو جائیں گے۔ میرا بیٹا عقیدت سے بیاہا جائے گا۔ تمہارے دونوں بیٹوں کو میں اپنا بیٹا بنالوں گی۔ خدا نے ہمارے بچوں کے مستقبل کا کتنا اچھا انتظام کر رکھا ہے۔ اگر سردار بھائی عشرت کے اشاروں پر ناچتے رہے تو ہمارا منصوبہ تلپھٹ ہو جائے گا۔ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

نور بانو نے سر ہلایا۔ دل میں بولی۔ ''بڑی بہن ہو کر پیٹھ میں چھرا گھونپنا چاہتی ہو، سمجھنے کا حکم بھی دیتی ہو۔'' اُس کے پاس سے اُٹھتے ہوئے دلاسہ دینے لگی۔ ''باجی! تم بہت اچھی ہو۔ جیسا کہو گی، ویسا ہی کروں گی۔ ہمارا مذہب بھی بڑوں کا احترام کرنے کا درس دیتا ہے۔ میں پورے احترام سے یقین دلاتی ہوں کہ آپ کا حکم مانتی رہوں گی۔''

وہ دروازے سے نکلتے ہوئے پلٹ آئی۔ طاق پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''تم پیار نہیں کرتی ہو۔ کل جب سردار بھائی نے عمران کو اپنے ہاں رکھنے سے انکار کر دیا تھا تو تم بڑی خوش ہوئی تھیں۔ تم نے کہا تھا کہ عمران کی جگہ پر رئیس ہوتا تو سردار بھائی دھکا دینے کے بجائے آنکھوں پر بٹھاتے۔ تمہاری نظر میں عمران اور رئیس برابر نہیں ہیں مگر میرے نزدیک دونوں ایک جیسے ہیں۔''

زرینہ لہجے کی کڑواہٹ کو چھپاتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں غلط فہمی ہے۔ دونوں میرے بیٹے ہیں۔''

نور بانو نے مسکرا کر کہا۔ ''اس کا ثبوت مانگوں گی تو پھر ناراض ہونے لگو گی مگر تنہائی میں بیٹھ کر سوچنا۔ کیا جو چیز تم رئیس کے لیے پسند کرتی ہو، وہ عمران کی گود میں ڈالنا چاہو گی؟''

وہ پورے اعتماد سے گھاؤ لگا کر اور اپنی بڑی بہن پر ٹھہری سی نگاہ ڈال کر کمرے سے نکل گئی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر سوچنے لگی۔ 'میں پہلے عمران کی ماں ہوں پھر کسی کی بہن ہوں۔ وہ بچپنے سے نکل کر لڑکپن کی سرحد پر کھڑا ہو چکا ہے اور اُس کی آنکھوں نے اَبھی سے اپنی ماں کو سمجھانا شروع کر دیا ہے کہ دُنیا میں اگر کوئی لڑکی ہے تو وہ صرف اور صرف عقیدت ہے۔ میں خاندان کی ترتیب کا کیا کروں؟ مجھے اپنے بیٹے کی خوشیوں کو ہمیشہ کے لیے زندہ رکھنے کی فکر ہے۔ تم اپنی فکر کرو۔'

وہ اپنی پیشانی پر فکر و تردد کی غماز شکنوں کا جال سجائے بیڈ شیٹ کی شکنیں درست کر رہی تھی کہ کارنس پر پڑے موبائل فون کا بزر بج اُٹھا۔ امیر نواز کمرے میں نہیں تھا۔ وہ لپک کر فون تک آئی۔ آن کر کے کان سے لگایا۔ بیٹا کانوں میں محبت سے رَس ٹپکانے لگا۔ ''امی جان! جانے کیا ہے کہ کتاب کھولتا ہوں، آپ کا چہرہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ کوئی گیت سنتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے آپ جھولے میں ڈال کر لوری سنانے لگی ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو بڑی مشکل سے اجازت لے کر آپ سے باتیں کرنے کے لیے ہوسٹل سے باہر چلا آیا۔ سنائیں! کیسی ہیں آپ؟''

وہ دِل پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''ہائے میری جان! تم اِتنے رومانٹک موڈ میں تو کبھی بھی نہیں رہے۔ آج کوئی خاص واقعہ پیش آ گیا ہے؟''

''کیا اپنی ماں کو دِل کا حال بتانے کے لیے کسی خاص واقعے کی درپیشگی ضروری ہوتی ہے؟'' وہ شرارت سے بولا۔

''نہیں مگر... چلو ٹھیک ہے۔ مان لیتی ہوں کہ تم مجھے مس کر رہے ہو۔ پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''سردار بھائی تمہارے پاس آئے تھے، اُنہوں نے اپنی آمد کی کیا وجہ بتلائی؟''

وہ بولا۔ ''پڑھائی ٹھیک جا رہی ہے۔ انکل مجھ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ اُن کے بہ قول آنٹی مجھے بہت مس کرتی ہیں۔''

نور بانو خوش ہو گئی۔ بیٹے کو سمجھانے لگی۔ ''تمہاری آنٹی تمہیں بہت چاہتی ہے۔ کبھی کبھار ملنے کے لیے چلے جایا کرو۔ نہ جا سکو تو فون پر بات کر لیا کرو۔''

''میں آنٹی کو نہیں، عقیدت کو مس کرتا ہوں۔ اُسے فون کرنا چاہتا ہوں مگر اُس کے پاس اپنا فون نہیں ہے۔''

وہ ہنسی۔ ''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''میں اُسے تحفے میں فون دینا چاہتا ہوں۔''

وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔ ''ہوں! تو یہ بات تھی۔ میں تمہارے لہجے میں گھلی ہوئی شیرینی پر فکرمند تھی۔ اَب سمجھی ہوں اور تمہیں سمجھا رہی ہوں کہ سردار بھائی کو پتا چلا تو وہ تمہاری چمڑی اُدھیڑ دیں گے۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''اِسی ماہ کی تیرہ تاریخ کو عقیدت کی سالگرہ ہے۔ میں اُسے برتھ ڈے گفٹ دوں گا تو کسی کو بھی بُرا نہیں لگے گا۔''

''مجھے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟''

وہ لاڈ سے بولا۔ ''پوچھ نہیں رہا امی جان! فون خریدنے کے لیے پیسے مانگ رہا ہوں۔ ابا جی سے مانگوں گا تو پیسوں کے بجائے جھڑکیاں سننے کو ملیں گی۔''

وہ بولی۔ ''ٹھیک ہے میری جان! میں ڈرائیور کے ہاتھ کل پیسے بھجوا دوں گی۔ مگر ایک بات یاد رکھنا۔ تم دونوں بچے ہو، بچے رہو گے تو سب کو اچھے لگو گے۔ بڑوں جیسی حرکتیں کرو گے تو نظروں میں کھٹکنے لگو گے۔ تم سردار بھائی کی گڈ بک میں درج ہو۔ میں چاہوں گی کہ ہمیشہ اُن کے دِل میں سمائے رہو۔ او کے!''

نور بانو نے فون کو فرطِ محبت سے چوما اور رابطہ منقطع کر دیا۔ مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل آئی۔ صحن میں کمر پر ہاتھ رکھے بڑی بہن ملازموں کے لتے لینے میں مصروف دکھائی دی۔ نور بانو بڑبڑاتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ 'اِنہی عادتوں کی وجہ سے تو سردار بھائی دونوں میاں بیوی کو پسند نہیں کرتے۔'

☆☆☆

وہ برسوں سے کمرے کی اُداس، پُرسکوت اور یکسانیت زدہ فضا میں سانسیں لے رہی تھی۔ اُس کے پھیپھڑے اِسی سیلن کے عادی ہو گئے تھے۔ کمرے سے نکل کر بھی خود کو ہمیشہ کمرے میں کھڑا محسوس کرتی تھی۔ سردار رب نواز نے کھڑکی سے کود کر رنگ بھری دُنیا میں جانے کا حکم دے کر جذبات میں ہلچل مچا دی تھی۔ بلبل تب بھی صیاد کے لمس کو عافیت سمجھتی رہی... جب صیاد نے ہاتھوں سے دھکیل کر آزاد فضاؤں میں پہنچا دیا تو رنگ برنگے مناظر اُسے اپنی جانب کھینچنے لگے۔ ہڑبڑا کر جاگ اُٹھی۔ بدن انگڑائیوں کے بل پر اِٹھلانے لگا اور نکوٹین کے عادی جرثوموں کی طرح خون میں بے تابیاں بھرنے لگا۔ وہ سوچنے لگی۔ 'مجھے یکبارگی سے کیا ہو گیا ہے؟ میں وہی ہوں، زمانہ وہی ہے، زمانے والے وہی ہیں مگر میں اَب ویسی نہیں رہی ہوں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سردار مجھے

آزمائش کی بھٹی میں جھونک کر میرے اندر کی عورت کو پرکھنا چاہتا ہے؟ کیا میرے جیتنے پر وہ واقعی نالاں ہوگا اور ہارنے پر تالیاں بجا کر داد دے گا؟‘

گزشتہ چند دنوں میں اُس نے اجمل کو بھی اُسی بھٹی میں دھکیلنے کی اپنی سی تمام کوششیں کر ڈالی تھیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا تھا۔ اُس کی ہر اوچھی حرکت پر اُسے یوں حیرت زدہ نظروں سے دیکھتا کہ وہ اپنے آپ میں کٹ کر رہ جاتی۔ اُس کے جدا ہونے پر پشیمانیوں کا شکار ہو جاتی۔ کبھی خود کو گھٹیا اور پست ذہن خیال کرتی، کبھی اجمل کو بزدلی کے طعنے دیتے ہوئے کوسنے لگتی۔ پل میں ماشا، پل میں تولہ ہوتے لوگوں کو دیکھا سنا تھا۔ پہلی مرتبہ خود کو زندگی کی رفعتوں اور پستی پر دھڑکن کی طرح اوپر نیچے ہوتے دیکھ رہی تھی۔ ہر شام کو سردار کی اُمید بھری سوالیہ نگاہوں کا سامنا کرتے ہوئے شرمساری اور خفگی کے جذبات سے مغلوب ہو کر سوچنے لگتی۔ ’ماتائی جذبہ ایسا نامعتبر اور ہوس زدہ تو نہیں ہوتا کہ اُس کے لیے گناہ کے آلائش بھرے فرش پر ننگے پیر چلتے ہوئے فخر سے سر بلند رکھا جائے۔‘

وہ دیکھ رہی تھی کہ سردار ہر چڑھتے دن میں کمزور پڑتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اُسے کوئی چیز اندر ہی اندر کھائے چلی جا رہی ہے۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی، اُس کی مدد کرنا چاہتی تھی مگر سردار کے تقاضے کے اعادے کے ڈر سے لب بستہ رہتی۔ سردار نے اپنا دکھ اُس کے سامنے طشت از بام کر دیا تھا۔ آج آئینے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے اُس نے پوری استقامت سے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہر حال میں اجمل کے برف میں جمے ہوئے قدموں کو سرکا کر انگاروں پر رکھنا ہے۔ وہ اِشاروں کو سمجھنے اور اُن پر ناچنے والا مرد نہیں تھا۔ اُس کے لیے خود کو جان دار اشارہ بنانا ہوگا۔

وہ پورچ میں آ کر اجمل کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ وہ عقیدت کو اسکول چھوڑنے گیا تھا۔ ہارن کی آواز سن کر مین گیٹ کے باہر آ گئی۔ گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ اُسے شہر کے ایک معروف ہوٹل میں چلنے کا حکم دیا۔ وہ عجیب طنزیہ سی نگاہ ڈال کر رہ گیا۔

عشرت نے فون پر ہوٹل کی انتظامیہ سے رابطہ کیا اور تھرڈ فلور پر کمرا بک کراتے ہوئے کن انکھیوں سے اجمل کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر ثبت استعجاب کو بھانپ کر سر جھٹکتے ہوئے سوچنے لگی۔ ’میں جانتی ہوں کہ تم میرا دل سے احترام کرتے ہو مگر مجھے تمہارے احترام کی نہیں، تمہاری بدتمیزی اور اشتعال کی ضرورت ہے۔ تمہاری پارسائی میرے کسی کام کی نہیں۔‘

ہوٹل پہنچ کر اُس نے اجمل کو ساتھ لیا اور استقبالیہ کاؤنٹر سے چابی لے کر لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ ایک دو مرتبہ اجمل نے کچھ کہنا چاہا مگر اُس کی عدم توجہی کے باعث کچھ کہہ نہ پایا۔ وہ گزشتہ چند دنوں سے اُس کی بدلی ہوئی ذہنی کیفیت کا مشاہدہ کرتا آ رہا تھا۔ دل میں سوچ رہا تھا۔ ’آج شاید کوئی ڈراما دیکھنے کو ملے گا۔ نہ جانے بیگم صاحبہ کو کیا ہو گیا ہے؟ پہلے تو کبھی ایسی نہیں تھی۔ خدا کرے کہ پہلے جیسی بن جائے اور مجھے وہ نہ دیکھنا پڑے جو میں نہیں دیکھنا چاہتا۔‘

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے کا ماحول اُس کی سوچ سے کہیں بہتر تھا۔ ہر چیز بڑی نفاست اور خاص ترتیب سے پڑی دکھائی دی۔ ابھی وہ کمرے کے وسط میں کھڑے جائزہ ہی لے رہے تھے کہ روم بوائے دستک دے کر اندر داخل ہوا۔ پیشہ ورانہ انداز میں اُس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اسپلٹ ائرکنڈیشنر آن کیا۔ آرام دہ صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مؤدبانہ انداز میں بولا۔ ”میڈم! تشریف رکھیے۔ آپ کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، انٹرکام پر حکم دے کر منگوا سکتی ہیں۔“

اُس نے کن انکھیوں سے اجمل کی طرف دیکھا۔ پھر چونک گئی۔ گھبرا کر بولی۔ ”اجمل! میرا پرس تو گاڑی میں ہی رہ گیا۔ پلیز! جلدی سے جاؤ اور اُٹھا لاؤ۔“

اجمل کے جانے کے بعد روم بوائے کو اسپیشل آرڈر دینے لگی۔ ملنے جلنے والیوں نے باتوں ہی باتوں میں اُسے ہوٹل کے آداب سے خاصا روشناس کرا دیا تھا۔ اُن کی فراہم کردہ معلومات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنا مطلب نکالنے لگی۔ روم بوائے کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی۔ کمرے سے نکلتے ہوئے بولا۔ ”میڈم! معزز کرم فرماؤں کی خدمت ہمارا نصب العین ہے۔ یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ جاتے ہوئے خدمت گزار کو یاد رکھیے گا۔“

وہ سر ہلا کر مسکرانے لگی۔ دُنیا ایک ہاتھ سے دیتی ہے، دوسرے ہاتھ سے طلب کرنے لگتی ہے۔ یہ سبق ازبر رکھنے والے کے لیے ہر قفل کسی آواز کے بغیر کھل جاتا ہے۔ وہ صوفہ چھوڑ کر بیڈ پر آ گئی۔ اوندھے منہ لیٹ کر اجمل کا انتظار کرنے لگی۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو اُسے یوں لیٹے دیکھ کر چونک گیا۔

وہ بولی۔ ”دروازہ بند کر دو۔“

اجمل کے بے ساختہ بڑھتے قدم رُک گئے۔ دل دھڑکنے لگا۔ آنکھوں میں استعجاب اور خوف بھر گیا۔

یہ دلچسپ اور یادگار داستان ابھی جاری ہے
بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجیے!

تجربات و حوادث کی شکل میں ملنے والے سرمایۂ حیات کو' دنیا کو لوٹانے والے شخص کا فسانہ اسے اپنے کیے پر پشیمانی نہیں تھی

پرویز بلگرامی

معصوم قاتل

رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ سڑک سنسان پڑی تھی، صرف آوارہ کتے نظر آ رہے تھے جو خود میں مشغول تھے۔ ایک دوسرے کو پنجہ مارتے، گراتے، دانتوں سے پکڑتے، تھوتھنی سے دھکیلتے ہوئے دور تک رگیدتے چلے جاتے۔ ابھی ان کا کھیل جاری تھا کہ دور، کافی دور ہیڈ لائٹ چمکی۔ وہ سب چونک گئے اور سر اٹھا کر ادھر ہی دیکھنے لگے۔

درمیانی رفتار سے سفر کرتی ایک کار ان کے قریب پہنچی پھر کچھ آگے جا کر رک گئی۔ کار کے رکتے ہی دروازہ کھلا اور ایک آدمی باہر نکلا۔ وہ سرتاپا سیاہ پوش تھا اور سایہ سا دکھ رہا تھا۔ نیچے اتر کر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا جیسے اطراف کا جائزہ لے رہا ہو پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سامنے والے بنگلے کی طرف بڑھنے لگا۔ اس پورے علاقے میں ڈھائی ڈھائی سو گز

کے بنگلے قطار میں بنے ہوئے تھے۔اس سیاہ پوش کا رخ جس بنگلے کی طرف تھا، اس کے گیٹ پر بلب روشن نہیں تھا۔سڑک پر لگے کھمبے پر لٹکتے بلب کی ہلکی روشنی وہاں تک پہنچ تو رہی تھی مگر ناکافی تھی۔ وہ سایہ سا دکھنے والا شخص گیٹ پر پہنچ کر رک گیا۔اس نے بند دروازے پر ایک نظر ڈالی پھر اچھل کر اوپر چڑھا اور دوسری طرف کود گیا۔ اندر کودنے کے بعد وہ کچھ دیر تک وہیں دبکا بیٹھا رہا پھر اٹھا اور گربہ پا چلتا ہوا گیٹ کے برابر میں بنے کمرے تک پہنچ کر اندر جھانکا۔ایک شخص فرش پر بستر لگائے سو رہا تھا۔وہ حلیے سے ہی ملازم پیشہ نظر آرہا تھا۔ اس سیاہ پوش نے نہایت احتیاط سے دروازہ بند کیا پھر باہر سے کنڈی بھی لگادی۔

وہ کچھ دیر تک دروازے کے پاس کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر اس نے کمر سے بندھے تھیلے سے پستول نکالا اور بنگلے کے برآمدے تک جا پہنچا۔ بند دروازے پر اس نے ہتھیلی سے دباؤ ڈالا مگر دروازہ نہ کھلا۔وہ برآمدے سے نیچے اتر آیا پھر دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی یا پھر مکینوں کی بدقسمتی... عقبی کھڑکی کھلی نظر آئی۔اس میں گرل بھی نہیں تھی۔فرنچ طرز کی اس کھڑکی میں صرف سائیڈ شیشے لگے ہوئے تھے۔اس نے شیشے پر ہتھیلی سے دباؤ ڈال کر دائیں بائیں حرکت دی۔شیشہ کھلتا چلا گیا۔

وہ کھلی ہوئی کھڑکی سے اندر کود گیا۔خالی کمرے میں ہلکی سی دھمک گونجی۔ وہ دم سادھے کچھ دیر تک بیٹھا رہا پھر اس نے جیب سے پنسل ٹارچ نکالی اور اسے روشن کرکے کمرے کا جائزہ لیا۔کمرے میں بیڈ بھی تھا اور صوفہ سیٹ بھی مگر وہ غیر استعمال شدہ لگ رہا تھا۔شاید وہ کمرا کسی کے استعمال میں نہیں رہتا تھا۔وہ کمرے کے دروازے پر پہنچا اور اسے پار کر کے گلیارے میں آیا۔اس نے برابر والے کمرے میں جھانکا۔ اندر نائٹ بلب کی مدھم نیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور بیڈ پر ایک مرد اور ایک عورت دنیا و مافیہا سے بےخبر خوابوں کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ وہ سیدھا اندر پہنچا پھر اس نے سوئچ بورڈ کے بٹن کو دبا دیا۔ کمرے میں ٹیوب لائٹ کی دودھیا روشنی پھیل گئی۔

روشنی پھیلتے ہی وہ پھرتی سے مرد کے سرہانے پہنچ گیا اور پستول کی نال کو اس کے سر سے لگا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ پستول کی نال کا دباؤ اور کچھ روشنی کا پھیلنا... سونے والے نے آنکھیں پٹپٹا کر کھول دیں۔عورت بھی جاگ گئی تھی۔اس کی نظر جیسے ہی سیاہ پوش پر پڑی، وہ اپنی چیخ کو روک نہ سکی۔تبھی سیاہ پوش کی بھاری آواز گونجی۔ ''خاموش، ورنہ گولی تمہارے شوہر کے سر میں روشن دان بنا دے گی۔''

عورت کی چیخ گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔

''تم... تم کون ہو؟'' مرد نے گھگیاتی آواز میں کہا۔ خوف سے اس کا چہرہ زرد تھا اور جسم کی کپکپاہٹ صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

''ملک الموت کا ہرکارہ! یاد رکھو اگر تعاون کیا تو ٹھیک ورنہ گولی مقدر ٹھہرے گی۔تم مرے تو یہ گھر اتا خود ہی اجڑ جائے گا۔مرد ہی سے گھر ہوتا ہے نا!''

''تم... تم کیا چاہتے ہو؟'' عورت نے حوصلہ جمع کرکے پوچھا۔

''بتا دوں گا مگر پہلے گھر کے تمام افراد کو یہاں بلاؤ مگر یاد رکھنا اگر چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو مفت میں بیوہ ہو جاؤ گی۔''

''ثمینہ! جاؤ جلدی سے امی ابو کو بلا لاؤ۔'' مرد نے تقریباً چیخ کر کہا۔

''اور نوشی کو بھی!'' سیاہ پوش بولا... تو دونوں ہی چونک گئے۔آج تک سنتے آئے تھے کہ ڈاکو، ڈاکا ڈالنے سے پہلے معلومات جمع کرتے ہیں، پلاننگ کرتے ہیں، گھر کے ملازموں سے چھوٹی چھوٹی باتیں معلوم کرتے ہیں۔ یقیناً کسی نے اسے پوری معلومات دی ہے تبھی تو وہ گھر کی لڑکی کا نام لے رہا تھا۔ مرد بھی شاید بات کی تہ تک پہنچ گیا تھا اسی لیے اس نے بیوی سے کہا۔ ''تم جاتی کیوں نہیں ہو؟''

عورت کمرے سے باہر نکل گئی۔اب وہاں صرف مرد اور سیاہ پوش رہ گئے تھے۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی، صرف تنفس کی آواز گونج رہی تھی۔ سیاہ پوش کا تنفس جوش کی وجہ سے اور مرد کا تنفس خوف کی وجہ سے بڑھا ہوا تھا۔مرد کے چہرے پر اس طرح سے زردی کھنڈی ہوئی تھی جیسے وہ یرقان کا مریض ہو۔آج تک اس نے صرف حکم چلایا تھا، آج اس پر کوئی اور حکم چلا رہا تھا۔ شاید اسی لیے وہ نروس تھا۔اگر تھوڑی سی بہادری دکھاتا، ہاتھ چلاتا تو سیاہ پوش کے ہاتھ سے پستول چھین سکتا تھا مگر حوصلہ تو غریبوں کے پاس ہوتا ہے امرا تو ''گارڈ'' کی شکل میں حوصلہ خریدتے ہیں جو گارڈ پر بھروسا کرے، اس سے بہادری کی امید عبث ہے۔تبھی تو وہ بیڈ پر ہاتھ پیر سیدھے کیے پڑا تھا اور یک ٹک سیاہ پوش کو دیکھے جا رہا تھا۔تبھی دروازے پر آہٹ ہوئی اور سیاہ پوش چوکنا ہو گیا۔اس طرح جیسے شکاری کتا اپنے شکار پر جھپٹنے کو تیار ہو جاتا ہے۔

''اے ہے... کیا ہوا میرے لعل کو۔'' بڑی بی نے دروازے سے اندر آتے ہوئے پوچھا پھر نقاب پوش کو دیکھ کر بولیں۔ ''اے میاں! تم کون ہو؟ اور یہ ہاتھ میں کیا ہے؟'' ... نقاب پوش دہاڑا پھر مڑ کر بڑی بی کو لانے والی سے بولا۔ ''... منہ کیا دیکھ رہی ہو، جاؤ نوشی کو بلا لاؤ۔''

... الٹے پیروں واپس ہو گئی۔

''... تم تو ملک الموت بن گئے ہو۔ ہٹاؤ پستول۔'' بڑی بی بولنے سے باز نہ آئیں۔

نقاب پوش نے ان کی طرف دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ اس کی خاموشی نے بڑی بی کے حوصلے کو سوا کر دیا۔ وہ پھر بولیں۔ ''اے ہے، مردار! تو سنتا کیوں نہیں۔ میں کہتی ہوں دور ہٹ، عامر کو چھوڑ دے ورنہ جوتی...''

نقاب پوش نے جھٹکے سے سر اٹھایا پھر غصیلے لہجے میں بولا۔ ''اگر اب ٹرٹر بند نہ کی تو انگلی دبا دوں گا۔ انگلی دبی اور تیرا بیٹا اوپر، سمجھی...!''

بڑے میاں نے بڑی بی کا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا، گویا انہوں نے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔خوف ان کے چہرے سے ہویدا تھا۔ وہ حالات کی نزاکت کو سمجھ رہے تھے۔انہوں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''عامر کی ماں! سمجھنے کی کوشش کرو، یہ ڈاکو عامر کو مار دے گا۔''

''ہاں اگر تم نے عقل سے کام نہ لیا تو میں سب کو مار دوں گا۔''

''ہم... ہم تعاون تو کر رہے ہیں!'' بڑے میاں بولے۔

''مجھے یہی امید ہے، اسی لیے اپنے ساتھیوں کو میں نے اندر آنے سے روک دیا ہے۔ وہ سب پرلے درجے کے بدمعاش ہیں۔ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ آپ کی بہو اور بیٹی دونوں ہی خوب صورت ہیں، اس لیے تعاون کیجیے ورنہ انہیں اندر بلانا پڑے گا۔'' نقاب پوش نے کہا۔

''بولو حکم کرو، چابی چاہیے؟ ثمینہ کے پاس لاکر کی چابی ہے، ابھی دلاتا ہوں۔'' بڑے میاں نے رک رک کر کہا۔

''نقد رقم اور زیورات لاؤ۔''

''ابھی مل جائے گا، بس تم عامر کو چھوڑ دو۔''

''چھوڑ دوں گا۔ اس گھر کا اکلوتا وارث ہے نا۔ اسے تو چھوڑنا ہی پڑے گا، ابھی تو اس کی شادی ہوئی ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو آپ کا خاندان آگے کیسے بڑھے گا۔'' وہ ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر بول رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس گھر کے ایک ایک فرد کی معلومات رکھتا ہے۔ ابھی وہ کچھ اور بولتا کہ قدموں کی چاپ ابھری۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ثمینہ سولہ سترہ سال کی ایک لڑکی کو ساتھ لا رہی تھی۔ لڑکی نے سفید نائٹی پہن رکھی تھی۔ نائٹی اتنی باریک تھی کہ

کیا آپ جانتے ہیں

سچ کڑوا مگر عبرت بھرا ہوتا ہے

اس لیے

اپنے اردگرد پھیلے چہروں کو پہچاننے کے لیے، سسکتی چہکتی عبرت بھری کہانیوں کے لیے، فلم، صحافت، ادب اور دیگر شعبہ ہائے زندگی کی اہم شخصیات سے متعارف ہونے کے لیے ''سرگزشت'' کا مطالعہ ضروری ہے۔تاکہ دوسروں کی زندگی سے سبق حاصل کیا جاسکے

ایک بار

ماہنامہ ''سرگزشت'' پڑھ کر دیکھیں

یہ تمام ڈائجسٹوں سے بے نیاز کردے گا

زیر جامہ تک نظر آرہا تھا۔اس کے چہرے پر کچی نیند سے اٹھنے کا بےزارپن تھا۔وہ حیرت سے نقاب پوش کو دیکھ رہی تھی۔

''اندر آجاؤ۔'' نقاب پوش نے تیز لہجے میں حکم دیا۔سیاہ نقاب سے اس کی آنکھیں لڑکی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں نفرت ہی نفرت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ نظروں کی چنگاری سے لڑکی کو جلا کر بھسم کر دے گا۔

''نوشی! اپنی بھابی کے برابر میں کھڑی ہو جاؤ۔'' نقاب پوش نے حکم دیا۔وہ آواز سنتے ہی چونک گئی۔ یہ آواز اس کی سنی ہوئی تھی مگر کہاں اور کب سنی تھی، یہ یاد نہیں آرہا تھا۔اس لیے وہ اسے بہ غور دیکھ رہی تھی۔نقاب پوش سرتاپا سیاہ لبادے میں چھپا ہوا تھا۔ہاتھوں میں دستانے اور پیروں میں جوتے تھے۔اس نقاب پوش کے جلد کی رنگت کیسی ہے، یہ بھی نظر نہیں آرہی تھی۔نوشی سوچ رہی تھی، چہرہ نہ سہی جسم کا کوئی حصہ ہی نظر آجائے تو کچھ اندازہ ہو... یاد آجائے کہ اس شخص کو کہاں دیکھا ہے۔

''تو تم بی اے پارٹ ون کا ایگزام دینے والی ہو؟ تیاری ہو رہی ہے نا؟'' نقاب پوش نے نوشی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جی... جی ہاں۔''

''تم ایگزام نہیں دے سکو گی۔'' نقاب پوش کا لہجہ سپاٹ تھا۔نوشی نے چونک کر اسے دیکھا۔

''میرے کہنے کا مطلب ہے اگر تمہارے گھر والوں نے تعاون نہ کیا تو ایگزام چھوٹ جائے گا۔''

''ہم سب کوآپریٹ کریں گے۔'' ثمینہ جلدی سے بولی۔

''ثمینہ! ان کو لاکر کی چابی دے دو۔'' بڑے میاں بولے۔

''نہیں، چابی نہیں... زیورات اور روپے اس چادر میں

باندھ کر دے دو۔'' یہ کہہ کر نقاب پوش نے سرہانے رکھی لیڈیز چادر اٹھا کر اس کی طرف پھینکی۔

ثمینہ نے الماری کے قریب جا کر اسے دھکیلا۔ شاید اس کے نیچے پہیے تھے۔ الماری کھسک گئی۔ دیوار میں نصب تجوری نظر آنے لگی۔ اس نے تجوری کھول کر زیورات نکالے۔ نوٹوں کی گڈیاں نکالیں پھر اسے چادر میں باندھ کر نقاب پوش کے پاس لے آئی اور بولی۔ ''اس کے علاوہ گھر میں اور کچھ نہیں ہے۔ بینک کے لاکر میں ہے۔''

سیاہ پوش نے پوٹلی تھامی، ایک نظر سب پر ڈالی اور تیزی سے دروازے پر پہنچا پھر جھٹکے سے مڑا اور وہ کچھ ہو گیا جس کا اندازہ کسی کو نہ تھا۔ ثمینہ چیختی ہوئی عامر کی طرف دوڑی۔ سیاہ پوش نے دروازے پر کھڑے کھڑے فائر کیا تھا۔ گولی عامر کے سر میں لگی تھی۔ خون اچھل اچھل کر باہر نکل رہا تھا۔ تبھی اس نے دوسرا فائر بڑے میاں پر کیا تھا۔ ان کے بھی سر کا نشانہ لیا تھا۔ ثمینہ اور اس کی ساس بین کرنے لگی تھیں، صرف نوشی سکتے کے عالم میں کھڑی تھی کہ نقاب پوش نے پنڈلی سے بندھے چاقو کو نکالا اور نوشی کے چہرے پر گہرا زخم بنا دیا پھر نہایت تیزی سے دوڑتا ہوا بنگلے کے باہر نکل گیا۔

باہر کار موجود تھی۔ کھٹارا صحیح مگر چلتی بہت تیز تھی۔ وہ جا کر کار میں بیٹھ گیا۔ کتوں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر اپنے کام میں لگ گئے۔ اجنبی کو دیکھ کر کتے بھونکتے ہیں مگر اسے دیکھ کر کسی نے بھی بھونکنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ جیسے انہیں کوئی پروا نہ ہو کہ آنے والا شریف ہے یا خونی۔ نقاب پوش جلد سے جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا کیونکہ رات کے سناٹے میں گولی کی آواز دور تک سنی گئی ہو گی۔ اسی لیے وہ تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ ابھی اس نے اپنی جانب والی سڑک پر کار کو موڑا تھا کہ چونک گیا۔ سامنے سے آتی وین پر لگی نیلی سرخ روشنی نے اسے چونکا دیا۔ اس نے کار کی رفتار کم کر دی۔ یوں بھی ان دنوں اسنیپ چیکنگ زوروں پر تھی۔ موبائل والے اسے روک سکتے تھے۔ اس نے تیزی سے چہرے سے نقاب اتارا اور سیاہ قمیص کے بٹنوں کو ڈھیلا کرنے لگا۔ موبائل کی رفتار تیز تھی۔ وہ برابر سے گزرتی چلی گئی۔

☆☆☆

وہ ایک معمولی سا نیم پختہ گھر تھا۔ پوش علاقے کے عقب میں پنپ اٹھنے والی کچی آبادی کے درمیان بنا گھر۔ اس گھر کی حالت بتا رہی تھی کہ اس گھر میں کوئی عورت نہیں رہتی۔ ہر چیز سے بے ترتیبی عیاں تھی۔ کچھ چیزیں ادھر پڑی تھیں تو کچھ اُدھر۔ فرش پر پانی کا جگ گلاس اور پلیٹ پڑے تھے جیسے کسی نے استعمال کے بعد جگہ پر رکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ فرش پر پرانے اخبارات بھی ہوئے تھے۔ دروازے کے قریب ربر بینڈ سے بندھا ہوا اخبار بھی پڑا ہوا تھا۔ شاید تازہ تھا۔

اخبار دروازے پر پڑا تھا اور اس سے چھ ہاتھ کی پر بیڈ تھا۔ پالش ادھڑا بیڈ۔ اس بیڈ پر وہ بیٹھا ہوا تھا۔ کچھ لمحوں پہلے وہ بیدار ہوا تھا جبکہ دن کافی چڑھ آیا تھا۔ سے اندر آنے والی دھوپ نے اسے بیدار کیا تھا۔ چہرے دھوپ کی تپش محسوس ہوئی تھی اسی لیے اس کی نیند ٹوٹی تھی اس نے انگڑائی لے کر بستر چھوڑ دیا اور دروازے پر پڑا کیا ہوا اخبار اٹھا لیا۔

اس کا نام انور تھا۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا اس کے ہاتھ میں جادو ہے۔ وہ مُردہ گھوڑے میں بھی جا ڈال دیتا ہے۔ آس پاس اس سے زیادہ بہتر کوئی اور مستر نہیں تھا۔ اس نے اپنا گیراج بھی بنا رکھا تھا۔ آج سے کچھ پہلے تک وہ خوش و خرم زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی زند جدوجہد سے عبارت تھی۔ جب وہ میٹرک میں تھا تو اس والد جو خود بھی ایک اچھے موٹر مکینک تھے، بیوی اور بیٹی ساتھ کہیں جا رہے تھے کہ سامنے سے آنے والے ایک ٹرک سے ان کی کار ٹکرائی۔ حادثہ اتنا شدید تھا کہ وہ اور ان کی بی نے سڑک پر ہی دم توڑ دیا۔ بچی کھڑکی سے اچھل کر جاگری تھی۔ اسے صرف خراشیں آئی تھیں۔ انور نے حا کے بعد پڑھائی چھوڑ دی اور بہن کی پرورش میں لگ گیا۔ نے اپنے باپ کا گیراج سنبھال لیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ ا کام میں مہارت حاصل کرتا چلا گیا۔ خود میٹرک سے آگے پڑھ نہ سکا تھا مگر اس نے سوچ لیا تھا کہ بہن کو اعلیٰ تعلیم دلا گا۔ شائستہ بھی خوب دل لگا کر پڑھ رہی تھی۔ اسی دوران نے پرانا مکان بیچ دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہاں کے در و دی اماں ابا کی یاد دلاتے رہتے ہیں۔ مکان کی قیمت میں کچھ ملا کر اس نے پوش علاقے سے متصل کچی آبادی میں مکا لے لیا۔ وہیں قریب اس کا گیراج بھی تھا۔ بہن کو اس قریب کے ایک پرائیویٹ کالج میں داخلہ دلوا دیا تھا۔ وہ کا کافی مہنگا تھا۔ بہن کے داخلے کے وقت اس نے اتنی رقم کرائی تھی جتنی رقم میں اس نے گھر لیا تھا۔ اتنی رقم خرچ کے بھی وہ خوش تھا کہ اس کی بہن اس کے خواب کو پورا کر ہے۔ مگر چار ماہ قبل اس کا یہ خواب بھی چُور چُور ہو گیا۔ کا سے آتے ہوئے شائستہ بھی ایک سڑک حادثے کا شکا

گئی۔ اس کے نازک جسم کو تیز رفتار منی بس نے کچل ڈالا۔ وہ سڑک پر ہی تڑپ تڑپ کر مر گئی۔ جن ہاتھوں کو ڈولی اٹھانا تھا انہوں نے اس کے ڈولے کو اٹھایا۔

انور بہن کے غم میں ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔ اب اس کا کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ اس نے گیراج کو شاگردوں کے حوالے کر دیا تھا اور خود سارا سارا دن سڑکوں پر مارا مارا پھرتا۔ آج بھی وہ گیراج جانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ بستر سے اٹھنے کے بعد اس نے خود ہی چائے بنائی۔ اخبار والا اخبار ڈال گیا تھا۔ اس نے اخبار اٹھا لیا۔ پہلے ہی صفحے پر اس کے گیراج سے متصل پوش علاقے کے ایک بنگلے میں ہوئی واردات کی تفصیل چھپی تھی۔ وہ بہ غور اس خبر کو پڑھنے لگا کیونکہ جس گھر میں ڈکیتی ہوئی تھی، وہ اس کی مرحومہ بہن کی سہیلی نوشی کا تھا۔ نوشی کے والد سے وہ ایک بار مل بھی چکا تھا۔

☆☆☆

فیز 6 کی واردات کی گونج ابھی کم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک اور واردات کی خبر اخباروں میں آ گئی۔ خبر کے مطابق رات کے ڈھائی تین بجے ایک سیاہ پوش فیز سیون کے ایک بنگلے میں داخل ہوا۔ اس نے گھر والوں کو جگا کر کہا کہ اس کے آدمیوں نے بنگلے کو گھیر رکھا ہے۔ گھر میں موجود تمام زیورات اور نقد رقم دے دی جائے۔

وہ گھر ایک معروف جیولر کا تھا جو اپنے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ اس علاقے میں کئی سال سے رہ رہا تھا۔ جیولر کے سر پر پستول رکھنے پر نقاب پوش کو ڈھیر سارے زیورات ملے۔ نقد رقم اور زیورات حاصل کرنے کے بعد نقاب پوش نے جیولر کو گولی ماری اور چھوٹی بیٹی کے گال کو خنجر سے چیر کر بہ آسانی فرار ہو گیا۔

مقتل ایک معروف جیولر کا ہوا تھا جس کی شہر میں پانچ دکانیں جبکہ دبئی اور العین میں بھی دکانیں تھیں۔ کئی سیاست دانوں اور ٹریڈ یونین والوں نے محکمہ پولیس کی جم کر خبر لی تھی۔ تھانے میں پچاس سے زائد فون آ چکے تھے۔ اس دباؤ کی وجہ سے تھانے میں ریڈ الرٹ کی سی کیفیت تھی۔ انسپکٹر ملک شہباز کے سامنے تین ایس آئی اور اے ایس آئی بیٹھے تھے۔ اس میٹنگ میں واردات کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا جا رہا تھا۔ انسپکٹر شہباز ملک نے ایس آئی اصغر شاہ کو مخاطب کیا۔ ''شاہ جی! غور کریں کہ فیز 6 اور 7 کی واردات میں کتنی مماثلت ہے۔''

''جی ہاں، کافی مماثلت ہے۔ دونوں وارداتوں میں قاتل اکیلا اندر آیا۔ چوکیدار کو بے ہوش کیا پھر اندر جا کر یہ کہا

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ

جنوری 2009ء کے خاص رنگ
دیکھتا چلا گیا
ڈاکٹر ساجد امجد کی خاص تحریر خاص شمارے کے لیے بطورِ خاص
✦
خاتونِ قصر
ہمایوں بلگرامی کی عرق ریزیٔ تاریخ کے حیران کن باب
✦
ابھاگن
رنجنی پٹیل کی کرم فرمائی سالگرہ نمبر کے لیے خصوصی تحریر
✦
ٹوٹی کمند
مرزا المجد بیگ کی ایک اور کامیابی کا احوال، حسام بٹ کے قلم سے
اس کے علاوہ
دیوتا، اناڑی، محفلِ شعر و سخن، انشائیہ، آپ کے خط
اور دیگر ترجمہ و طبع زاد تحریریں، سب کچھ آپ کے لیے
اور وہ سب کچھ جو سسپنس کی پہچان ہے!
تازہ شمارہ فوری حاصل کریں
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 5895313 فیکس: 5802551

کہ باہر میرے کئی ساتھی ہیں۔ اس طرح گھر والوں کو نفسیاتی دباؤ میں لا کر زیورات و رقم حاصل کی۔ گھر کے سربراہ کو گولی کا نشانہ بنایا۔ لڑکی کے چہرے پر چیرا لگایا اور نہایت چالاکی سے فرار بھی ہو گیا۔''

''اس بات پر بھی غور کریں کہ دونوں لڑکیاں ایک ہی کالج میں پڑھتی ہیں اور آپس میں گہری سہیلیاں بھی ہیں۔''

''سر! کہیں یہ عشق وشق کا چکر تو نہیں۔ لڑکیاں خوب صورت ہیں۔ کوئی ان پر عاشق ہو گیا ہوگا جسے انہوں نے ٹھکرا دیا اور اب وہ اسی کا بدلہ لے رہا ہو۔'' ایک اے ایس آئی نے جواب دیا۔

''ناممکن سی بات ہے۔ بیک وقت دو لڑکیوں سے اتنی گہری محبت نہیں ہو سکتی۔ حقیقت کیا ہے اس کا پتا بھی چلے گا جب...''

ڈی ایس پی نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ ایک سپاہی نے آ کر کہا۔ ''سر! ابرار آیا ہے۔ کوئی خاص خبر لایا ہے۔''

''اندر بھیج دو۔''

سپاہی واپس چلا گیا۔ جب لوٹا تو اس کے ساتھ ایک لمبے قد کا، گوری رنگت والا مدقوق سا نوجوان تھا۔

''بولو، کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''سر جی! میرے گھر کے برابر میں ایک نوجوان رہتا ہے۔ ہر روز شام کو بلیک پینٹ اور شرٹ پہن کر گھر سے نکلتا ہے اور رات گئے لوٹتا ہے۔''

''یہی خاص بات ہے کیا؟'' ڈی ایس پی نے غصیلی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''خاص بات یہ ہے کہ کل میں اپنے دوستوں کے ساتھ نالے کے کنارے جھاڑیوں میں بیٹھا سُٹے لگا رہا تھا۔'' وہ بول رہا تھا اور تمام لوگ حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''سُٹے لگا کر میں کھڑا ہوا تھا کہ میری نظر اسی نوجوان پر پڑی۔ وہ نالے کی طرف چہرہ کیے کھڑا تھا۔ کچھ بول رہا تھا مگر کیا، میں سن نہیں سکا۔ پھر اس نے پنڈلی پر بندھی چھری نکالی اور اسے کیچڑ میں پھینک دیا۔''

''کس قسم کی چھری تھی؟''

''چاقو تھا... گراری دار چاقو... وہ اب تک وہیں پڑا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔'' ڈی ایس پی نے کچھ رقم اس کے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔ اس کے جانے کے بعد ڈی ایس پی انسپکٹر کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''آپ سب خیال رکھیں، اخبارات نے طوفان اٹھا رکھا ہے۔ سیاسی دباؤ الگ ہے۔ قاتل کو جلد سے جلد بے نقاب کرنا ہے۔ اپنے تمام مخبروں الرٹ کر دیں۔ کہیں سے بھی کوئی خبر آئے تو سے معمو سمجھیں۔ چیک کریں۔''

پھر ڈی ایس پی نے انسپکٹر سے کہا۔ ''اس کیس کے او اصغر شاہ ہیں مگر آپ بھی مدد دیتے رہیں۔ اپنی تمام سورسز استعمال کریں تاکہ جلد سے جلد قاتل بے نقاب ہو جائے۔''

''سر! میں چاہتا ہوں کہ اس نوجوان کو چیک کروں۔ اگر وہ واقعی مشتبہ ہے تو اسے یہاں لے آؤں۔'' ایس آئی اصغر شاہ نے کہا۔

''پہلے آپ نالے پر جا کر دیکھیں کہ اس چرسی کی اطلاع صحیح ہے یا...''

''یس سر! میں ابھی جا کر وہاں کا جائزہ لیتا ہوں۔''

''اگر چاقو نہ بھی ملے پھر بھی اس نوجوان کو چیک کریں۔''

''یس سر!'' یہ کہہ کر اصغر شاہ کھڑا ہو گیا۔

دفتر سے باہر آ کر اس نے بائیک نکالی اور سیدھا نالے پر جا پہنچا۔ اس گندے نالے کے اطراف میں دور دور تک جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اتنے لمبے نالے کی تلاشی لینا آسان نہ تھا۔ یہ بھوسے کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے... جیسا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا تھا کہ ایک جگہ ایسے نشانات نظر آئے جو عموماً زمین پر بیٹھنے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ چرسی اسی جگہ بیٹھتے ہیں۔ وہیں ایک جھاڑی کے نیچے اسے سرنجیں پڑی نظر آ گئیں۔ یہ پختہ ثبوت تھا کہ اسی جگہ نشے کے طالب آ کر جمع ہوتے ہیں۔ وہ اس جھاڑی کی سیدھ میں آگے بڑھا۔ ابھی کچھ ہی دور پہنچا تھا کہ اسے کیچڑ میں دھنسا چاقو نظر آ گیا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور اس میں لپیٹ کر چاقو کو باہر نکال لیا۔ وہ تیز دھار کا چاقو تھا۔ چاقو بائیک کے سائیڈ بیگ میں رکھ کر وہ مشتبہ شخص کے گھر پہنچا۔ بند دروازے پر دستک دیتے ہی دروازہ کھل گیا۔ اس نے سامنے کھڑے شخص کا بہ غور جائزہ لیا۔ وہ کوئی زیادہ عمر کا نہیں تھا۔ اٹھائیس تیس کے قریب عمر ہوگی۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں عجیب سی بے رونقی تھی۔

اصغر شاہ کو دیکھ کر وہ چونک گیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''جی فرمائیں، کیسے تکلیف کی؟''

اصغر شاہ کی تیز نظروں نے اس کے چہرے کا جائزہ لے لیا تھا۔ پل بھر کے لیے اس کے چہرے پر حیرت کی جھلک ابھری تھی، وہ بھی اصغر شاہ کی نظروں سے چھپ نہ سکی تھی۔ اسی لیے اس نے رومال میں لپٹا چاقو دکھا کر اندھیرے میں تیر چلایا۔ ''تمہارا کھیل ختم ہو چکا ہے۔ یہ چاقو اور چاقو چلانے

والے ہاتھ دونوں میری نظروں میں آ چکے ہیں۔''

''یہ کون سی نئی بات ہے، جرم بھی کبھی چھپا ہے۔'' وہ ... سے بولا۔

''تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''مجھے ایسا کرنا تھا۔''

''یہ بھی بتا دو۔'' اصغر شاہ نے اسے دھکیل کر اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''جب آپ تہ تک پہنچ ہی گئے ہیں تو ہتھکڑی اور لے چلیے مجھے۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا جیسے وہ اسی دن کا انتظار کر رہا ہو۔

اصغر شاہ کو یقین ہو گیا تھا کہ اس کا تیر نشانے پر لگا ہے۔ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم نے ایسا کیوں کیا... بتاؤ گے نہیں؟''

''مجھے یہی کرنا چاہیے تھا کیونکہ آپ کے سامنے جو شخص کھڑا ہے، وہ زندہ نہیں مُردہ ہے۔ اندر سے مر چکا ہے۔ اسے انہی دو لڑکیوں نے مارا ہے جو آج اپنا بدصورت چہرہ لیے، زخم پر ہاتھ رکھے رو رہی ہوں گی۔ انہیں اپنے حسن پر غرور تھا نا... اسی لیے میں نے وہ چہرے ہی بگاڑ دیے ہیں۔''

''لگے ہاتھوں وہ قصہ بھی بیان کر دو جس نے تمہیں قانون ہاتھ میں لینے پر مجبور کیا۔''

''اس کی وجہ ایک ایکسیڈنٹ ہے۔'' وہ بولا۔

''کھل کر بتاؤ۔''

''ان دو لڑکیوں کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی اسی کالج میں پڑھتی تھی... بہت معصوم سی لڑکی جسے زمانے کی عیاری و مکاری کا پتا نہیں تھا۔ بن ماں باپ کی اس لڑکی کو میں نے پالا تھا۔ اسے بھی میری مجبوریوں کا پتا تھا کیونکہ وہ بھی مجھے بہت چاہتی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جی رہے تھے۔ اسی دوران اس معصوم لڑکی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ مر گئی۔ میں نے اسے حادثہ سمجھا تھا مگر مجھے ایک نئی بات معلوم ہوئی اور میں نے تحقیق شروع کر دی۔ تب پتا چلا کہ اس کی زندگی میں ایک لڑکا آ گیا تھا، زبردستی آ گیا تھا۔ اس لڑکے کا دعویٰ تھا کہ وہ اس لڑکی کو چاہنے لگا ہے جبکہ اس لڑکے کو ایک دوسری لڑکی چاہتی تھی۔ وہ ایک امیر باپ کی بیٹی تھی اس لیے سمجھتی تھی کہ لڑکا اس کی جانب جھک جائے گا مگر ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسی لیے اسے اس غریب لڑکی پر غصہ آنے لگا تھا۔ اس نے یہ ذکر اپنی دوسری سہیلی کے سامنے کیا۔ اس دوسری لڑکی نے اسے ایک نئی راہ بتائی۔ پھر ایک دن...'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور چھت کو ایسے گھورنے لگا جیسے وہاں اسکرین ہو جس پر وہ لڑکی تھرک رہی ہو۔

اسے خاموش دیکھ کر اصغر شاہ نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

''ہوا یوں کہ ایک دن تینوں ہنستی بولتی کالج سے لوٹ رہی تھیں۔ کالج چند فرلانگ کی دوری پر تھا اس لیے تینوں پیدل آتی تھیں۔ وہ تینوں باتوں میں اس طرح مشغول تھیں کہ تیسری سہیلی کو احساس ہی نہیں ہوا کہ کب وہ فٹ پاتھ پر سے نیچے سڑک پر آ گئی ہے۔ دراصل ان دونوں لڑکیوں نے غیر محسوس طریقے سے اسے سڑک پر دھکیلا تھا۔ اس سے پہلے کہ تیسری سہیلی واپس فٹ پاتھ پر آتی، ایک تیز رفتار منی بس آ گئی۔ ڈرائیور نے لڑکی کو بچانے کی بہت کوشش کی مگر بچا نہ سکا اور وہ لڑکی بس کی زد میں آ گئی۔ پہلے میں نے یہی سمجھا تھا کہ کہانی ختم ہو چکی ہے۔ حادثے نے اسے مجھ سے چھینا ہے۔ میں روز شام کو حادثے والی جگہ پر جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ ایک دن ایک فقیر جو وہیں قریبی سڑک کے کنارے بیٹھتا تھا، مجھے دیکھ کر بولا۔

''بھائی جی! آپ روز یہاں آ کر بیٹھتے ہیں۔ میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ لڑکی آپ کی کون تھی؟''

''جس لڑکی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا وہ میری... ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ وہ بولا۔''

''نہیں، اس کا ایکسیڈنٹ نہیں ہوا تھا۔ ایکسیڈنٹ کرایا گیا تھا۔ بس کو آتے دیکھ کر برابر والی لڑکی نے اسے دھکا دیا تھا۔''

''اس بات نے مجھے مجبور کیا کہ میں حقیقت معلوم کروں۔ تحقیق کی تو پوری کہانی علم میں آئی اور میں نے اپنی عدالت سجالی۔ وہ دونوں لڑکیاں قاتل تھیں، اس لیے میں نے ان کے لیے سزا تجویز کر لی۔ جان کے بدلے جان ہوتی ہے مگر میں نے انہیں زندگی بھر تڑپنے کی سزا دی۔ کوئی اپنا مرتا ہے تو کتنا دکھ ہوتا ہے... یہ سمجھانے کے لیے میں نے دونوں گھروں کے سربراہوں کو گولی ماری۔ وہ دونوں کسی مرد کے دل کو بھا نہ سکیں، اس لیے ان کے چہروں پر زخم لگا کر انہیں بدصورت بنا دیا۔''

اس کے خاموش ہوتے ہی اصغر شاہ نے موبائل فون سے انسپکٹر کا نمبر ملایا اور گاڑی و ہتھکڑی بھیجنے کی استدعا کی۔ اسے گرفتار کرتے ہوئے اصغر شاہ سوچ رہا تھا۔ 'ایک ٹوٹے بکھرے شخص کو مزید سزا دلوا کر قانون کا خانہ تو پُر کیا جا سکتا ہے مگر انسانیت کے آگے گردن جھکی رہے گی۔ کاش! یہ شخص قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لیتا۔'

♣

جذبوں، نزاکتوں اور ہنگاموں کے منظر نگار طاہر جاوید مغل کا یادگار سلسلہ

دیوی

نزاکت و لطافت کے
ایک حسین پیکر کی داستان۔ اس کا
عزم آہنی تھا اور ارادے فولادی! دکھوں کے ہم رکاب
اور ہنگاموں کے شانہ بشانہ وہ نت نئے مچلتے واقعات کے جلو
میں زیست کر رہی تھی۔ تمنا کے ساحل کا حصول اس کے
لیے گویا ایک کے بعد دوسرا غم کا دریا عبور کرتے رہنے سے
مشروط ہو گیا تھا۔ دانت نکوستے، پنجے کھرچتے آدمی نما
بھیڑیے اسے بھنبھوڑنے کے درپہ تھے۔ نفس کے ان غلاموں
کو زمینی خدائی کا زعم تھا۔ ان کی لرزہ خیز زیادتیوں
اور وحشتوں سے پناہ اسے جس سائبان تلے مل
سکتی تھی وہ اس کی نظروں میں ہو کر بھی اوجھل تھا!

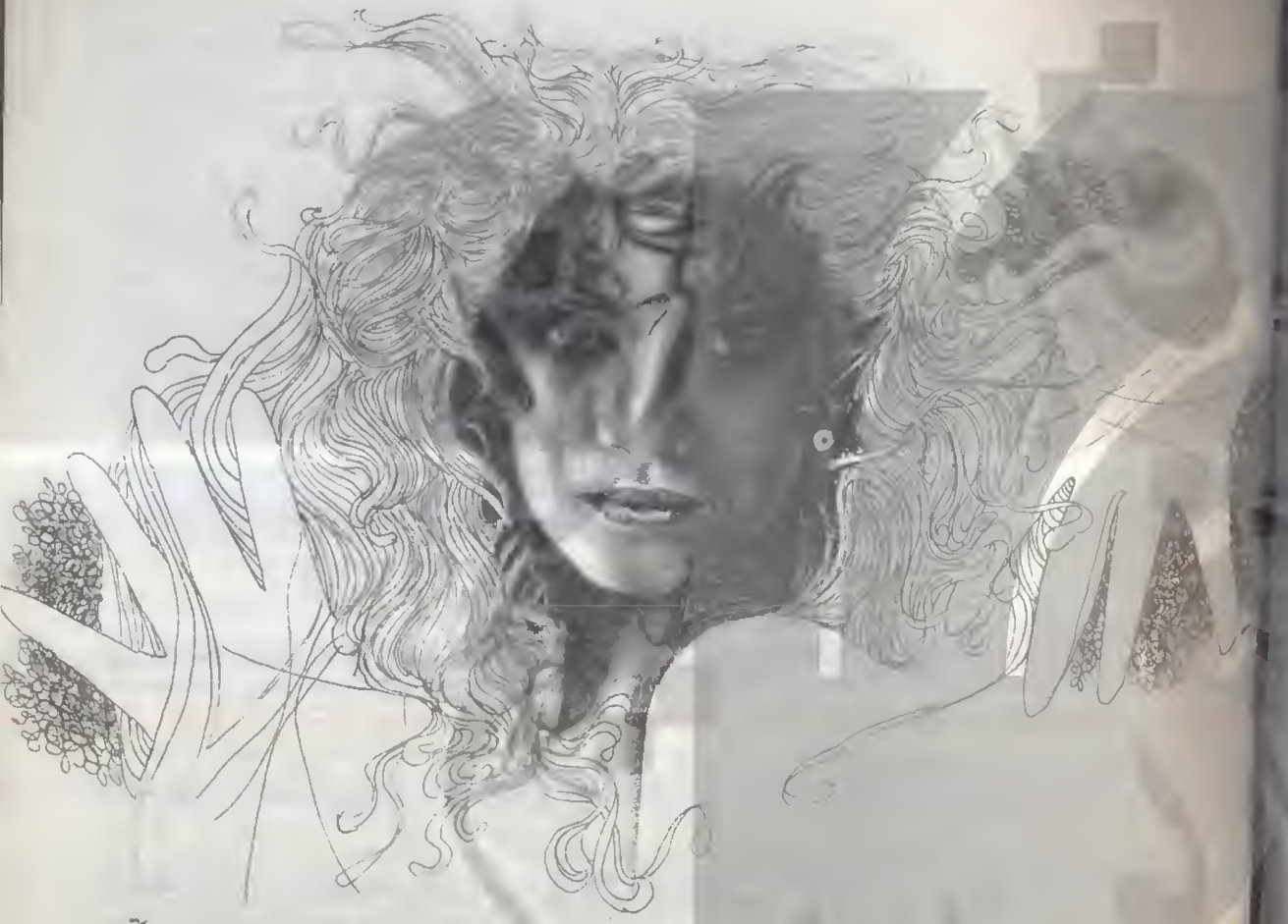

زندگی کے تلاطم میں ڈوبتے ابھرتے کرداروں کی زندگی پیما داستان

ڈپٹی ریاض ہمیشہ کی طرح عام کپڑوں میں تھا۔ اس نے سیاہ پتلون کے اوپر ٹریک سوٹ جیسی نیلی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں کیچڑ آلود جوگرز تھے۔ ایک ٹیلی اسکوپ اس کے گلے سے جھول رہی تھی اور دا کی ٹ کی پتلون کی بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ آتش فشاں کی طرح دہکا ہوا ہے اور رستم پر جھپٹ پڑنے کے لیے بس ایک چھوٹے سے موقع کا منتظر ہے۔ اپنے تین ساتھیوں کی خونچکاں لاشوں کے قریب پہنچ کر ریاض کا چہرہ اور بھی بھیانک نظر آنے لگا... ہاں... یہ ڈپٹی ریاض ہٹلر ہی تھا۔ وہ بدترین شخص جو رستم کو درکار تھا۔

رستم نے شانی کو بار بار آواز دی۔ مجبوراً شانی کو نیچے اترنا پڑا۔ وہ کیچڑ آلود زمین پر سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی ہوئی رستم اور ریاض کے پاس پہنچ گئی۔ ریاض کی آنکھیں شعلہ فشاں تھیں۔ گلے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ وہ بڑے قہر سے بار بار زمین پر تھوک رہا تھا۔ اس کے اردگرد چھ لاشیں تھیں اور ان لاشوں پر بارش تواتر سے برس رہی تھی۔ یہ چھ لاشیں ان سرکردہ افراد کی تھیں جنہوں نے وڈے ڈیرے کے خونی آپریشن کو فائنل شکل دی تھی۔ ممکن ہے کہ ایک دو اور بھی ہوں مگر اپنی کسی نیکی کے سبب وہ فی الوقت یہاں موجود نہیں تھے۔

رستم پھنکارا۔ ”دیکھ لے ریاضے! میں نے کہا تھا نا، تجھے ایک دن لا لے اور اس کے ساتھیوں کے خون کا حساب دینا پڑے گا... اور تو اپنے آلے دوالے کی دیواریں جتنی مرضی اونچی کر لے میں تجھ تک پہنچ جاؤں گا۔“

ریاض نے ایک بار پھر تھوکا اور بولا۔ ”رستے! اسلحے کے زور پر بھڑکیں مارنا بہت آسان ہوتا ہے۔ اس مال (کلاشنکوف) کو نیچے رکھ کے دیکھ۔“

شانی نے دیکھا کہ یہ فقرہ ادا کرنے سے پہلے ریاض کی نگاہ رستم کی زخمی ٹانگ پر گئی تھی۔ بھاگ دوڑ کے سبب ٹانگ لہولہان ہو گئی تھی اور رستم کے لیے اس پر وزن ڈالنا مشکل ہو رہا تھا۔ شانی نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”نہیں رستم! اس کی باتوں میں نہ آنا... آپ زخمی ہیں۔“

مگر شانی کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی رستم کلاشنکوف کیچڑ میں پھینک چکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے دشمن کو بھنبھوڑنا چاہتا ہے اور چیر پھاڑ دینے کی خواہش رکھتا ہے۔

شانی کے پورے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ اسے لگا کہ وہ لڑکھڑا کر گر جائے گی۔ اس نے ایک کیکر کے تنے کا سہارا لیا... وہ آمنے سامنے تھے۔ دو بدترین دشمن... ایک

مدت سے وہ ایک خوفناک جنگ لڑ رہے تھے۔ مگر کبھی اس طرح ایک دوسرے کے سامنے نہیں آئے تھے۔ فقط ایک دفعہ پوٹھوہار کے ٹیلوں میں وہ چند سیکنڈ کے لیے ایک دوسرے کے رو برو ہوئے تھے۔ رستم نے ریاض کے سینے پر ٹانگ رسید کر کے اسے نشیب میں گرا دیا تھا اور پولیس والوں کے نرغے سے بچ کر نکل گیا تھا۔ آج اس برستی بارش میں، گرجتے بادلوں کے نیچے... ان سنسان درختوں کے اندر... وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے تھے۔ تماشائی نگاہ شانی کی تھی۔ یوں لگتا تھا، اس پورے علاقے میں دور دور تک ان تینوں کے سوا کوئی ذی روح موجود ہی نہیں۔

جیپ کے قریب ایک رائفل پڑی تھی۔ اس کی سنگین اتر کر دور جا گری تھی۔ ریاض نے لپک کر یہ سنگین اٹھالی۔ رستم نے جواب میں وہ خنجر قمیص کے نیچے سے نکال لیا جو کچھ دیر پہلے اس نے اجرالی سردار سے رکھوایا تھا۔ اپنے تہ بند کو اس نے گھٹنوں سے اوپر تک اڑس کر مضبوط گرہ دے لی۔

ریاض جیسے طیش سے دیوانہ ہو کر رستم پر جھپٹا۔ اس کی چنگھاڑ دل ہلا دینے والی تھی۔ اس اچانک حملے سے بچنے کے لیے رستم نے بائیں طرف ہٹنا چاہا مگر بائیں طرف ہٹنے کے لیے دائیں ٹانگ پر وزن ڈالنا ضروری تھا اور دائیں ٹانگ بری طرح زخمی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رستم پوری طرح ریاض کے وار سے بچ نہیں سکا۔ سنگین اس کا دایاں بازو اُدھیڑتی ہوئی گزر گئی۔ شانی بے ساختہ چلّا اٹھی۔ پہلے وار کی کامیابی سے ریاض کا حوصلہ پہاڑ ہو گیا۔ اس نے الٹے ہاتھ کا وار رستم کی گردن پر کیا جو اس کی ٹھوڑی کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ رستم پیچھے ہٹتے ہٹتے درخت کے گرے ہوئے تنے سے ٹکرایا اور پشت کے بل گر گیا۔ ریاض پھر ایک خوفناک چنگھاڑ کے ساتھ رستم پر حملہ آور ہوا اور اس کے اوپر آیا۔ شانی نے رستم کی کراہ سنی۔ شاید سنگین نے دوبارہ اس کے جسم کو زخمی کیا تھا۔

یہ بڑا خوفناک تجربہ تھا... یہ بڑا ہی خوفناک احساس تھا۔ یہ کوئی فلمی منظر نہیں تھا... جیتی جاگتی حقیقت تھی۔ دو افراد جن کے ہاتھوں میں تیز دھار آلے تھے، پوری وحشت کے ساتھ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ کسی بھی وقت ان میں سے کسی کا پیٹ چاک ہو سکتا تھا یا گردن اُدھڑ سکتی تھی... یا کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ چند ہی سیکنڈ میں وہ کیچڑ میں لتھڑ گئے اور ناقابلِ شناخت ہو گئے۔ شانی نے دیکھا، ریاض ابھی تک رستم کے اوپر تھا اور بڑی بے رحمی سے اس کی زخمی ٹانگ پر جوگرز بوٹ کی ٹھوکریں لگا رہا تھا۔ شانی کے دل سے جیسے لہو رسنے لگا۔ یکا یک شانی نے ریاض کو اچھل کر دور گرتے دیکھا۔ اس کا کندھا خون سے سرخ ہو رہا تھا۔ شانی سے دعا نکلی کہ یہ ریاض کا اپنا خون ہی ہو۔ پانی، کیچڑ [illegible] میں گرنے کے بعد ریاض نے دیوانہ وار دائیں بائیں [illegible] چلائے۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ سنگین اس کے ہاتھ سے [illegible] ہے۔ رستم کھڑا ہو گیا۔ یہ گھائل ریاض پر وار کرنے کا بہتر موقع تھا مگر حیران کن طور پر رستم نے اسے وقت دیا۔ یہاں تک کہ خوفناک، نکیلی سنگین دوبارہ اس کے ہاتھ میں آ[illegible] رستم نے ہاتھ کے اشارے سے ریاض کو پھر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ ریاض اپنی ڈکشن کی بدترین گالیاں بکتا ہوا رستم پر جھپٹا۔ اس بار رستم پوری طرح تیار تھا۔ اس نے نہ صرف وار بچایا بلکہ ریاض کی گردن پر ہاتھ چلایا۔ گردن کے عقب سے موٹی چربی کٹ کر لٹک گئی اور ریاض ڈگراتا ہوا لینڈ کروزر کی سائیڈ سے ٹکرایا۔ رستم نے اس کی پشت پر وار کیا۔ خنجر کئی انچ تک ریاض کی چربی اور گوشت میں دھنس گیا۔ رستم نے خنجر کھینچنے کی کوشش کی تو دونوں ایک بار پھر پانی اور کیچڑ میں گرے۔ ریاض کا سر درخت کے تنے سے ٹکرایا تھا۔ سنگین پھر اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ سنگین پر جھپٹا۔ شانی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا کہ رستم نے پھر اسے سنگین تک پہنچنے کا موقع دیا۔ رستم کیا کر رہا تھا؟ کیوں کر رہا تھا؟ کیا وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا؟ وہ کیوں ریاض جیسے موذی کو بار بار موقع دے رہا تھا؟ وہ اپنی شدید زخمی ٹانگ کے سبب کسی بھی وقت ریاض سے زیر ہو سکتا تھا۔

اگلے تین چار منٹ میں بارش کی بوچھاڑ کے درمیان رستم اور ریاض میں سخت خونی جدوجہد ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو زخم لگائے۔ رستم کی دو تین خوفناک ٹکروں نے ریاض کے چہرے کا نقشہ بگاڑ دیا تھا۔ اس خونی لڑائی کے دوران میں رستم نے کم از کم ایک مرتبہ مزید ریاض کو گری ہوئی سنگین اٹھانے کا موقع دیا۔

ریاض اتنا ہانپ چکا تھا کہ اس کی نہایت زہریلی اور قہرناک زبان اب اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ بس زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ اس کا سارا جسم لہولہو تھا۔ پھر اچانک شانی نے دیکھا کہ وہ جان بچانے کے لیے بھاگ اٹھا ہے۔ وہ جو آج تک سب کو بھگاتا ہی رہا تھا، اب خود بھاگ رہا تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ رستم نے جیپ کے پاس گری ہوئی رائفل اٹھائی اور ریاض کے پیچھے لپکا۔

"رستم... رستم!" شانی چلّائی مگر وہ دونوں آگے پیچھے دوڑتے چلے گئے۔

شانی بھی ان کے پیچھے لپکی۔ رستم نے بھاگتے بھاگتے [illegible] دو فائر کیے لیکن گنجان جھاڑیوں اور درختوں کی وجہ سے [illegible] بنانا آسان نہیں تھا۔ دونوں کے درمیان [illegible] قدم کا فاصلہ تھا۔ رستم کسی بھی وقت ریاض [illegible] سکتا تھا۔ ریاض بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ رستم [illegible] ہے جو اس کا پیچھا کر رہی ہے۔ وہ اپنے گھائل جسم [illegible] بار بار پھسل رہا تھا اور اٹھ رہا تھا۔ "تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا کتے۔" رستم اس کے قریب پہنچتے ہوئے وحشی آواز میں دہاڑا۔

ریاض نے بھاگتے بھاگتے اچانک رخ بدلا اور شکستہ مسجد میں گھس کر دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ رستم بگولے کی طرح اس کے پیچھے گیا۔ رستم کی طوفانی ٹکر سے دروازے کی کنڈی ٹوٹ گئی اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ "رستم نہیں... نہیں۔" شانی نے پھر پکار بلند کی۔

رستم کے پانچ چھ سیکنڈ بعد شانی بھی مسجد میں داخل ہو گئی۔ اس نے لرزہ خیز منظر دیکھا۔ رستم رائفل کے وزنی کندے سے ریاض کو بے رحمی سے مار رہا تھا۔ ریاض کے اگلے دانت ٹوٹ گئے تھے، ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ ایک آنکھ کی پلک چر کر نیچے لٹک رہی تھی اور ایک کلائی ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس کی مزاحمت یکسر دم توڑ چکی تھی۔ رائفل کی ضربیں کھا کھا کر وہ مسجد کی دیواروں سے ٹکرا رہا تھا اور گر رہا تھا۔

"نہیں رستم!" شانی کربناک آواز میں چلّائی۔ "یہ مسجد ہے۔"

رستم تو جیسے کچھ سننے اور دیکھنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ شانی کے روکتے روکتے اس نے ریاض کو اندرونی فرش پر گرایا اور اس کی لہولہان گردن پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ پاؤں کے دباؤ سے بے ساختہ ریاض کا منہ کھل گیا۔ رستم نے رائفل کی نال اس کے منہ میں گھسیڑ دی۔ یہ آخری لمحے تھے۔ وہ وحشت ناک آواز میں دہاڑا۔ اس نے بس دو الفاظ ہی کہے۔ "ریاض... ریاض!" شانی اپنی پوری ہمت سے اسے روکنے کی کوشش کرتی رہی مگر اس نے سیون ایم ایم رائفل کا ٹرانیگر دبا دیا۔ ایک بار... دو بار... لیکن یہاں ایک انہونی ہوئی۔ گولی نہیں چلی... رائفل خالی ہو چکی تھی۔

نیم جان ریاض کی آنکھیں موت کی دہشت سے یوں پھٹی ہوئی تھیں جیسے ابھی حلقوں سے باہر نکل آئیں گی۔ رستم نے رائفل پھینکی اور چنگھاڑتا ہوا اس اٹیچی کیس کی طرف بڑھا جو کونے میں رکھا تھا۔ شانی سمجھ گئی کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ وہ پسٹل نکالنے لگا تھا۔ شانی اس سے لپٹ گئی... "نہیں رستم... ایسا نہ کرو۔"

رستم نے پسٹل نکال لیا۔ شانی پوری جان سے رستم کے ہاتھ سے لپٹ گئی۔ اس نے پسٹل کا رخ فرش کی طرف موڑ دیا... "نہیں رستم!" وہ بار بار یہی کہتی جا رہی تھی۔ ریاض سکتہ زدہ پڑا تھا۔

رستم کو فرطِ غضب نے دیوانہ کر دیا تھا۔ اسے جیسے خبر ہی نہیں تھی کہ اسے کون روک رہا ہے... کیوں روک رہا ہے؟ ان لمحوں میں بس اس کی ایک ہی خواہش تھی، وہ ریاض کو ٹھنڈا کر دے... اس نے ریاض کی طرف بڑھنے کی کوشش کی۔ شانی اس کے ساتھ ساتھ گھسٹنے لگی۔ ریاض نے اپنی بچی کھچی طاقت جمع کی اور اپنے کٹے پھٹے جسم کو سمیٹ کر صحن کی طرف بڑھا۔ رستم نے آخری زور لگایا مگر شانی پسٹل کے ساتھ ہی گھسٹتی چلی گئی۔

ریاض لنگڑاتا اور لڑکھڑاتا ہوا بیرونی دروازے سے نکلا اور... گھنے درختوں میں گھستا چلا گیا۔ اس کا رخ جنوب کی طرف تھا...

رستم کو جیسے اچانک جھٹکا سا لگا۔ اس نے چونک کر شانی کی طرف دیکھا۔ اس کی شدید ہیجانی کیفیت ذرا ماند پڑی۔ اس کے بے حد تنے ہوئے اعصاب ذرا ڈھیلے پڑتے محسوس ہوئے۔ تاہم اس کی آنکھوں سے اب بھی شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے اپنے خون آلود ہونٹوں کے ساتھ کچھ کہنے کی کوشش کی مگر کہہ نہیں سکا۔ بڑی حسرت کے ساتھ اس نے گھنے درختوں کی طرف نگاہ دوڑائی۔ پھر شانی کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ کچھ ہی لمحے بعد اس نے پسٹل پر سے اپنی آہنی گرفت ختم کر دی اور شانی سے چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ تب وہ بے دم سا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ سکتے کی سی کیفیت میں تھا... جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟

وہ کتنی ہی دیر دیوار سے ٹیک لگائے ایسے ہی بیٹھا رہا۔ اس کی ٹھوڑی سے اور جسم کے مختلف حصوں سے خون ٹپکتا رہا۔ کھینچا تانی میں شانی کا لباس بھی کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ اس کی کہنیوں اور گھٹنوں سے کھال چِل گئی تھی۔ زخمی انگلیوں سے پھر خون رسنے لگا تھا۔

کچھ دیر بعد رستم اٹھا۔ اسے ایک دم نہ جانے کیا ہوا۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ کھڑکی کی پختہ چوکھٹ پر مارنا شروع کر دیا۔ اس کا چہرہ فرطِ کرب سے بگڑا ہوا تھا۔ چند ہی سیکنڈ میں اس نے ہاتھ کو لہولہان کر لیا۔

"رستم! کیا کر رہے ہو؟" شانی چلّائی اور تڑپ کر رستم کا ہاتھ تھام لیا۔

کھال چھل گئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ اس نے زخمی

ہاتھ کو چوما، سینے سے لگایا اور رونے لگی۔

وہ عجیب آواز میں بولا۔ ''میں نے آپ کو گھسیٹا، آپ کو زخمی کیا۔ مجھے بہت زیادہ سزا ملنی چاہیے... بہت زیادہ ملنی چاہیے۔''

اس کی آنکھیں جو ہمیشہ خشک رہتی تھیں، آج نم ہو گئیں۔ ان میں سے آنسو گرے اور اس کی نرم ڈاڑھی میں جذب ہو گئے۔ شانی نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کے کیچڑ آلود سینے کو چومنے لگی۔ اس کی لہولہو گردن کو چومنے لگی۔ ''نہیں رستم! آپ نے کچھ نہیں کیا ہے۔ جو کچھ کیا ہے میں نے کیا ہے اور... اور میں نے بھی اس لیے کیا ہے کہ... یہ مسجد ہے... خدا کا گھر ہے... اس نے یہاں پناہ لی تھی۔ اس نے پناہ لی تھی یہاں...''

دونوں خاموش رہے۔ ایک دوسرے سے لپٹے رہے۔ دونوں کے جسم خونچکاں تھے... اور رستم کے زخمی جسم سے تو لہو باقاعدہ ٹپک رہا تھا۔ باہر بارش کے ساتھ ہوا بھی شامل ہو گئی تھی اور پانی کی بوچھاڑیں اس شکستہ ویران مسجد کی دیواروں سے ٹکراتی محسوس ہوتی تھیں۔

ایک بہت بڑا طوفان آ کر گزرا تھا... اور اس طرح گزرا تھا کہ ابھی تک رستم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ بالکل آخری لمحوں میں ریاض اس سے بچ کر نکل گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بات بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اب وہ اس جگہ زیادہ دیر نہیں رک سکتے۔ اگر وہ مزید زندہ رہنا چاہتے تھے تو انہیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا۔ اور یہ بات شانی بھی جانتی تھی مگر دوسری طرف وہ رستم کی دگرگوں حالت بھی دیکھ رہی تھی۔ سب سے بری حالت اس کی ٹانگ کی تھی... یوں لگتا تھا کہ ٹانگ کی کھال مختلف جگہوں سے چر گئی ہے اور لہو اگل رہی ہے۔

اس شکستہ بے آباد مسجد کو چھوڑتے ہوئے شانی جذباتی ہو گئی۔ اس نے محراب و منبر کو دیکھا۔ محراب کے ساتھ والی دیوار پر الوداعی انداز میں ہاتھ پھیرا اور دل ہی دل میں بولی... اے خانۂ خدا! ہمیں معاف کرنا۔ ہم تیری ویرانی کو رونق تو نہ دے سکے، الٹا تیرے در و بام کی بے حرمتی کی... تیرے تقدس کو پامال کیا۔ ہم تیرے گناہ گار ہیں... اور اتنے کم نصیب ہیں کہ خواہش کے باوجود کچھ دیر یہاں رک بھی نہیں سکتے... لیکن ہم دعا کرتے ہیں کہ کسی روز تجھے آباد کرنے والے آئیں، تیرے طاقوں میں مدت سے بجھے ہوئے دیے روشن ہوں۔ تیری سنسان دیواروں میں اذان کی آواز گونجے۔ وہ دیوار کو ہاتھ سے چھوتی ہوئی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

سب کچھ جاگتی آنکھوں کا خواب لگ رہا تھا۔ خو... ایک لہر گا ہے بہ گا ہے شانی کے سینے سے اٹھتی تھی اور ... جسم میں پھیل جاتی تھی۔ وہ رستم کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ وہی لینڈ کروزر جیپ ڈرائیو کر رہا تھا جس کے شیشے کلاشنکوف کی مار سے چکنا چور تھے اور جس میں مرنے والوں کا ... لوتھڑوں کی شکل میں جما ہوا تھا۔ وہ دھیمی بارش میں ... واردات سے قریباً بارہ کلومیٹر آگے آ چکے تھے۔ اب ان ... اردگرد چھوٹی بڑی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ ... کے اندازے کے مطابق ان کا رخ مغرب میں بنوں ... پہاڑوں کی طرف تھا۔ ریاض کا طاقتور واکی ٹاکی عین اس جگہ سے ملا تھا جہاں ریاض اور رستم میں کئی منٹ تک دوبدو ... ہوئی تھی۔ اس واکی ٹاکی کے ملنے سے رستم اور شانی کو اتنی ... ضرور تھی کہ زخمی ریاض فوری طور پر اپنے ساتھیوں سے رابطہ نہیں کر سکے گا۔ اس کے باوجود وہ تادیر اس جیپ میں نہیں رہ سکتے تھے۔ ایک کچے راستے پر رستم نے جیپ روک دی۔ اس نے ڈیش بورڈ میں اور نشستوں کے نیچے کوئی کام کی چیز تلاش کرنا چاہی مگر شراب کی چھوٹی بوتلوں، فحش تصویروں والے تاش کے پتوں اور سگریٹ کے پیکٹوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اپنے اٹیچی کیس کے ساتھ وہ دونوں جیپ سے نکل آئے۔ مسجد سے نکلنے کے بعد سے رستم یکسر خاموش تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی گویائی ہی سلب ہو گئی ہے۔ اس کے سپاٹ چہرے سے شانی کے لیے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ شانی کو سب سے زیادہ تشویش اس کی ٹانگ کی طرف سے تھی۔ جیپ سے نکل کر وہ بیس تیس قدم جیپ کے رخ پر ہی چلتے گئے۔ اٹیچی کیس رستم نے ہی تھام رکھا تھا مگر اس کا وزن سہارنے میں شانی اس کی مدد کر رہی تھی۔ ''رہنے دیں شانی!'' رستم نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

شانی نے اٹیچی کے ہینڈ پر سے اپنی گرفت ختم نہیں کی۔ لنگڑاتے ہوئے بیس تیس قدم چلنے کے بعد رستم رک گیا۔ وہ دائیں طرف مڑا۔ یہاں گھاس کی ایک طویل پٹی راستے کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ وہ اس پر آ گیا۔ شانی اور وہ دونوں اس گھاس پر چلنے لگے مگر اب رستم واپس آ رہا تھا۔

''میں سمجھی نہیں رستم؟''

''وہ لوگ ہمارا پیچھا کریں گے شانی۔'' رستم نے... بہ دستور ویران لہجے میں کہا۔

اس کی بات شانی کی سمجھ میں آ گئی۔ کچی زمین پر اپنے پاؤں کے نشان بنا کر رستم نے تعاقب کرنے والوں کو الجھانے کی کوشش کی تھی۔ اب وہ مخالف سمت میں جا رہے

جھاڑیاں گنجان ہوتی جا رہی تھیں۔ کئی جگہوں پر ... تو کہ راستہ مسدود ہو جائے گا۔ یہ بالکل غیر ... بس کہیں کہیں کسی گائے بھینس کا گوبر یا بکریوں ... دکھائی دے جاتی تھیں۔ شانی کو رستم کی قوت ... علم تھا۔ پھر بھی وہ دیکھ رہی تھی کہ اس سے چلنا ... جا رہا تھا۔ اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی مگر اس علاقے میں معالج تو درکنار کوئی انسان بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ رستم کے جسم اور خاص طور سے ٹانگ کی حالت دیکھ دیکھ کر شانی کا دل رو رہا تھا۔

''تھوڑی دیر رک جائیں رستم؟'' شانی نے التجائی لہجے میں پوچھا۔

''نہیں شانی! یہ خطرناک ہو گا۔'' رستم نے مختصر جواب دیا۔

''لیکن آپ کی ٹانگ...''

''آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ٹھیک ہوں۔''

وہ جیسا ٹھیک تھا... شانی کو اچھی طرح نظر آ رہا تھا۔ اس کا تہ بند گھٹنوں تک کیچڑ سے لتھڑا ہوا تھا۔ کرتا سامنے سے پھٹ چکا تھا اور بالائی جسم پر کئی جگہ سنگین کے گہرے کٹ تھے... خاص طور سے بائیں پہلو پر تو گہرا زخم آیا تھا اور یہاں سے مسلسل خون ٹپک رہا تھا۔ خون جو رستم کا تھا... جس کا ایک ایک قطرہ شانی کو اپنی جان سے زیادہ عزیز تھا۔

''آپ کے پہلو کا زخم کھلتا جا رہا ہے۔ پلیز! آپ کہیں بیٹھ جائیں۔'' شانی نے روہانسی آواز میں کہا۔

''شانی آپ سمجھنے کی کوشش کریں... ہمیں زیادہ سے زیادہ دور جانا ہے۔''

رستم نے اسی طرح خود کو گھسیٹتے ہوئے قریباً ایک کلومیٹر سفر مزید طے کیا۔ پھر رستم کی حالت دیکھنا شانی کے بس میں نہیں رہا۔ وہ خود کو نڈھال ظاہر کرتی ہوئی ایک جگہ بیٹھ گئی۔ رستم کو بھی بیٹھنا پڑا۔ شانی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ رستم کے خون اگلتے جسم کو دیکھ سکے۔ بارش اب ہلکی پھوار کی شکل اختیار کر گئی تھی تاہم بادل بہ دستور موجود تھے۔

کچھ دیر دم لینے کے بعد وہ پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ خون کے اخراج کے سبب رستم کا رنگ زرد ہوتا چلا جا رہا تھا۔ شانی جانتی تھی کہ وہ حتی الامکان اپنی حالت کو شانی سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ایک جگہ وہ دونوں ٹھٹک گئے۔ انہیں کہیں قریب سے کچ کچ کی مدھم آواز سنائی دی جیسے کوئی شخص کسی بیل گھوڑے وغیرہ کو ہانکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ رستم نے کرتے کے نیچے سے پسٹل نکال لیا اور آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ دونوں جھاڑیوں میں رک کر انتظار

دل کا بائی پاس کیوں؟

جب دوا سے علاج ممکن ہے

• انجائنا • آرٹریز کی بلاکیج
• دل کے والوز کا لیک ہونا
• دل میں سوراخ کا بغیر سرجری کے
90% تک علاج موجود (انشاءاللہ)

ڈاکٹر میاں منور حسین

◄ دل کا دورہ کیوں؟
◄ کیا سرجری غلط ہے؟
◄ بغیر سرجری علاج کیسے؟
◄ کیا سرجری کے بعد ہارٹ اٹیک نہیں ہوتا؟

ایک مریض جس کی تین آرٹریز بند ہیں۔ 80%,90%,100%، ڈاکٹرز کی اور سرجنز کی رائے ہے کہ فوراً بائی پاس کروایا جائے جبکہ دوسری طرف مریض کہتا ہے کہ مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی اور وہ باوجود اس کے 3 یا 4 کلومیٹر واک بھی کر لیتا ہے۔ صرف اسے کبھی کبھار ہلکی تکلیف ہوتی ہے تو کیا اس کیلئے سرجری ضروری ہے؟ کیا وہ سرجی کے بعد بھی ہارٹ اٹیک سے محفوظ نہیں؟ سرجری سے پہلے بھی وہ ادویات استعمال کر رہا ہوتا ہے اور سرجری کے بعد بھی ادویات استعمال کرتا ہے۔ تو علاج کیا؟ سرجری، دوا، یا دونوں۔ اس کے بارے میں تحفظ کی گارنٹی کیا؟ دوا، سرجری یا احتیاط۔ اگر آپریشن کے بعد مسلسل ادویات استعمال کروانی ہیں اگر ہارٹ اٹیک آپریشن کے بعد بھی ہو گا تو پھر کیوں مریض کو Damage کر کے دوا کھلائی جائے بلکہ اسے اس وقت تک ادویات پر ہی رکھنا چاہیے جب تک وہ اپنے سارے کام بخوبی سرانجام دے سکتا ہے۔ آپریشن کروانے والے اور صرف ادویات استعمال کرنے والے دونوں کی طبعی عمر میں کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ آپریشن کروانے والے زیادہ مسائل کا شکار رہتے ہیں۔ انشاءاللہ شفایابی کا تناسب 90%

منور میڈیکل کمپلیکس
3-ھما بلاک F-1، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور
Ph: 042-5412077, 5422174 Fax: 5411817
E-mail: 791@hotmail.com

کرنے لگے۔

''بیل گاڑی لگتی ہے۔'' شانی نے سرگوشی کی۔ رستم نے سر اثبات میں ہلایا۔

یہ ایک بیل گاڑی ہی تھی۔ اس میں دو توانا بیل بندھے ہوئے تھے اور وہ گاڑی کو تیزی سے کھینچتے چلے جا رہے تھے۔ ''گاڈی'' درمیانی عمر کا سرخ و سپید توانا شخص تھا۔ اس نے غالباً بارش سے لطف اندوز ہونے کے لیے بالائی لباس اتار رکھا تھا۔ اس کے جسم پر فقط ایک دھوتی تھی۔ وہ کچھ گنگنا رہا تھا اور آم چوس رہا تھا۔

رستم نے پسٹل کُرتے کے نیچے چھپایا اور گاڈی کے سامنے آگیا۔ گاڈی (گاڑی بان) لہولہان رستم کو دیکھ کر ٹھٹکا اور اس نے جلدی سے باگیں کھینچ لیں۔ بیل گاڑی رک گئی۔ صحت مند گاڈی جست لگا کر نیچے اترا اور رستم کی طرف بڑھا۔ ''او جواناں! کیا ہوا تم کو؟ یہاں کیسے گھوم رہے ہو؟''

رستم نے کہا۔ ''ہم میاں بیوی آ رہے تھے۔ رستے میں ڈاکوؤں نے گھیر لیا اور گاڑی میں ڈال لیا۔ بڑی مشکل سے جان بچی ہے۔''

گاڈی نے رستم کو سرتاپا دیکھا اور اس کے زخم زخم جسم کو دیکھ کر اس کی روشن آنکھوں میں ہمدردی کی جوت جاگی۔ ''اوئے تیرا تو برا حال ہے برادر! تیری گھر والی بھی ساتھ ہے؟''

اس دوران میں شانی جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلی اور رستم کے پاس آگئی۔ ''اوہو... تیری تو گھر والی بھی کافی پھٹل ہے۔'' گاڈی نے تاسف سے کہا۔

پھر اس خیال سے کہ وہ ایک جوان عورت کے سامنے نیم عریاں ہے، اس نے جلدی سے اپنی بھیگی ہوئی قمیص پہن لی۔ اس کی توانا گردن میں چاندی کا بھاری تعویذ اچھا لگ رہا تھا۔

شانی نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ''بھائی! میرے شوہر کی ٹانگ بہت زخمی ہے۔ کیا تم ہمیں اپنے ساتھ گاڑی پر بٹھا سکو گے؟''

''یہ کوئی کہنے والی بات ہے میری بھین۔'' گاڈی نے صدقِ دل سے کہا اور رستم کے ہاتھ سے کیچڑ آلود اٹیچی کیس لے کر بیل گاڑی پر رکھ لیا۔ پھر اس نے رستم کے منع کرنے کے باوجود اسے اپنے مضبوط کندھے کا سہارا دیا اور بیل گاڑی پر سوار کر دیا۔ شانی بھی رستم کے ساتھ ہی ایک بورئیے پر بیٹھ گئی۔

''تمہارے ساتھ یہ معاملہ کس جگہ پر ہوا ہے برادر؟'' گاڈی نے پوچھا۔

رستم نے اسے مختصراً بتایا کہ وہ کیسے ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھے اور کیسے نکلے۔

''تمہاری سوٹ کیس میں کوئی بہت قیمتی شے تو نہیں۔ اگر ہے تو میں اسے گڈ (بیل گاڑی) کے نیچے چھپا دوں۔''

''نہیں بھائی! بس عام استعمال کا سامان ہے۔'' شانی پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ''یہ ہم کس جگہ پر ہیں بھائی؟''

''ہم عیسیٰ خیل اور بنوں شہر کے درمیان میں ہیں۔ بہت کم آبادی ہے۔ ہمارا چھوٹا سا گراں نور خیل یہاں سے ڈیڑھ میل آگے ہے۔ میرا نام غلام محمد ہے۔'' گاڈی نے بتا دیا۔ اس کے لہجے میں پشتو لہجے کی ہلکی سی جھلک موجود تھی۔

گاڈی غلام محمد نے مڑ کر ایک بار پھر رستم کی حالت دیکھی اور پریشان ہو کر بولا۔ ''برادر! تمہیں تو فوری طور علاج کی ضرورت ہے۔ تمہارا بہت سا خون نکل گیا۔ گراں پہنچ کر میں تمہارے لیے کوئی انتظام کرتا ہوں۔ ضرورت ہوا تو پھر ہم تمہیں بنوں کے اسپتال میں لے جائیں گے۔ ایک دم بے فکر رہو۔''

اس نے بیل گاڑی کو تیز ہانکنا شروع کر دیا۔ ہچکولوں سے رستم کو تکلیف ہو رہی تھی اور یہ تکلیف رستم کے چہرے سے عیاں تھی۔ تاہم شانی جانتی تھی کہ پیدل چلنا اس سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ بارش اب رک گئی تھی۔ اپنے گراں کے نزدیک پہنچ کر غلام محمد نے اپنی بھیگی ہوئی چادر نچوڑ کر رستم کو دے دی تاکہ وہ اپنے خون آلود لباس کو چھپا سکے۔ رستم نے اس چادر سے احتیاط کے ساتھ اپنے جسم کو ڈھانپ لیا۔ پگڑی جو اس کے گلے میں پڑی تھی، اس نے دوبارہ اپنے سر پر باندھ لی۔ شانی نے بھی اپنے کیچڑ آلود لباس کو اپنی اوڑھنی میں اچھی طرح چھپا لیا۔

''لگتا ہے تم دونوں کی نئی نئی شادی ہوئی ہے؟'' غلام محمد نے شانی کے زرق برق لباس سے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔ رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ نور محمد افسردہ لہجے میں بر... ''پھر تو گہنے وغیرہ بھی گئے ہوں گے؟''

''نہیں، کچھ زیادہ نہیں تھے۔ باقی گھر میں ہی چھوڑ آئے تھے۔'' رستم نے مختصر جواب دیا۔

اب آبادی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ بڑی بڑی پگڑیوں والے ایک دو راہ گیر ملے جنہوں نے مقامی لہجے میں غلام محمد سے سلام دعا کی۔ ایک شخص نے غلام محمد کے ساتھ موجود مہمانوں کے بارے میں بھی پوچھا۔ غلام محمد نے گول مول جواب دے کر انہیں مطمئن کر دیا۔

یہ درختوں میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی نیم پہا... بستی تھی۔ سرسبز درختوں میں چھپے ہوئے نیچی چھتوں والے مکانات تھے۔ بارش رکنے کے بعد شلوار قمیصوں میں ملبوس بچے گلیوں میں نکل آئے تھے اور غلیلوں سے چڑیوں کا شکار کر رہے تھے۔ غلام محمد ان دونوں کو سیدھا اپنے گھر میں لے آیا۔ اس گھر میں وہ فقط اپنی جواں سال بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ دو تین کمروں والا یہ گھر صاف ستھرا تھا۔ خاموش کھڑے بچوں کے چہرے بھی روشن روشن تھے۔ بڑا بچہ پانچ چھ سال کا اور چھوٹا ڈھائی تین سال کا تھا۔ غلام محمد کی تھوڑی سی زمین تھی جہاں وہ کاشت کاری کرتا تھا۔ غلام محمد کی بیوی شانی سے باتیں کرنے لگی اور رستم، غلام محمد کے ساتھ بیٹھک نما کمرے میں چلا گیا۔

غلام محمد کی بیوی آسیہ بنوں شہر سے آگے میرم شاہ کی رہنے والی تھی اور پشتو کے علاوہ پشتو لہجے میں اردو بولتی تھی۔ وہ شانی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''چھوٹی بہن! تمہارا شوہر تو بہت زخمی ہے۔ اس کو دیکھ کر امارا دل کانپ گیا۔ کیا تم پولیس میں پرچہ کرائے گا؟''

''ہم غریبوں کی کون سنتا ہے بہن۔ خوامخواہ کی مصیبت ہی گلے پڑتی ہے۔ شکر ہے جان بچ گئی۔''

شانی نے غلام محمد کی بیوی کو بتایا کہ وہ خوشاب سے داؤد خیل جا رہی تھی اپنی شادی شدہ بہن سے ملنے کے لیے... رستے میں یہ واقعہ پیش آگیا۔

اتنے میں بیٹھک سے غلام محمد نے آواز دے کر شانی کو بلایا۔ شانی بیٹھک میں پہنچی۔ رستم کا پھٹا ہوا کیچڑ آلود لباس اب غلام محمد کے لباس سے تبدیل ہو چکا تھا۔ تاہم اس لباس پر بھی جگہ جگہ خون کے دھبے نمودار ہو گئے تھے۔ پہلو کے گھاؤ پر غلام محمد نے پٹی بھی باندھی تھی مگر یہ پٹی بھی سرخ ہو گئی تھی۔ رستم نیم دراز تھا۔ اس نے اپنی شدید زخمی ٹانگ سامنے لکڑی کی تپائی پر رکھی ہوئی تھی۔

شانی لرز گئی۔ گھٹنے سے نیچے ٹانگ کا رنگ نیلگوں ہو رہا تھا۔ اور یہی وہ جگہ تھی جہاں سے ڈیڑھ سال پہلے رستم کی ٹانگ کٹی تھی۔ غلام محمد نے کہا۔ ''ٹانگ کی حالت بالکل اچھی نہیں ہے۔ بہن! میں ڈاکٹر کا انتظام کرتا ہوں۔''

''ڈاکٹر کہاں سے آئے گا؟'' شانی نے چونک کر پوچھا۔

''میری بہن کا بیٹا پکا ڈاکٹر ہے۔ بنوں اسپتال میں کام کرتا ہے۔ آج کل یہاں نور خیل آیا ہوا ہے، میں ابھی اسے لے کر آتا ہوں۔''

شانی نے تذبذب میں رستم کی طرف دیکھا۔ رستم نے رضامندی کے انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور لگتا تھا کہ تکلیف حد سے بڑھی ہوئی ہے۔

غلام محمد چھتری پکڑ کر باہر جانے لگا تو رستم نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھنے لگا۔ رستم نے کہا۔ ''غلام محمد! میں چاہتا ہوں کہ گاؤں میں کسی کو ہمارے بارے میں اور... ہماری حالت کے بارے میں پتا نہ چلے...''

''تم ایک دم بے فکر رہو برادر! میں سب سمجھ رہا ہوں۔ ان چوروں، ڈکیتوں کی سی آئی ڈی بڑی تیز ہوتی ہے۔ اور یہ ڈاکٹر صیب ہے نا، یہ اپنا بچہ ہے۔ اس کی طرف سے کوئی پریشانی نہیں۔ جیسا کہیں گے ویسا کرے گا۔''

رستم کو تسلی دے کر غلام محمد تیز قدموں سے باہر چلا گیا۔ شانی ہمت کر کے رستم کے زخموں کو دیکھنے لگی۔ غلام محمد نے ایک دو جگہ عارضی پٹی بھی باندھی تھی مگر خون پھر بھی رس رہا تھا۔ پہلو کے علاوہ کلائی کا ایک گھاؤ بھی بڑا گہرا تھا۔ ہڈی تک نظر آ رہی تھی۔ شانی کا دل رو رہا تھا۔ وہ اپنی چوٹیں بھول گئی تھی۔ رستم اور شانی کے داغ دار کپڑوں کو بدلنے کے لیے غلام محمد کی بیوی ایک مردانہ اور ایک زنانہ جوڑا لے آئی۔ زنانہ جوڑا شانی کے جسم پر ٹھیک آیا مگر مردانہ جوڑے میں رستم کا بس گزارہ ہی ہو سکا۔ یہ شلوار قمیص تھی۔ یہ گہرے رنگ کی تھی۔ اس پر بھی خون کے ایک دو دھبے نمودار ہوئے مگر یہ زیادہ نمایاں نہیں تھے۔

کچھ ہی دیر بعد اٹھائیس تیس سال کا ایک خوش رو شخص اندر آگیا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں میڈیکل باکس تھا۔ سلام دعا کے بعد اس نے رستم کا معائنہ کیا۔ ٹانگ کی حالت دیکھ کر اس کے کلین شیو چہرے پر تشویش کے سائے لہرانے لگے۔ ''ٹانگ کا زخم تھوڑا پرانا لگ رہا ہے... اور لگتا ہے خاصا سیپٹک ہو گیا ہے۔'' اس نے کہا۔

''ہاں جی! چار پانچ دن پہلے موٹر سائیکل سے گر گئے تھے۔'' شانی نے مختصر وضاحت کی۔

مقامی ڈاکٹر دھیان سے زخم دیکھتا رہا۔ ٹانگ کی مجموعی حالت دیکھ کر اسے الجھن ہو رہی تھی... وہ شانی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''پہلے بھی اس ٹانگ کا کافی بڑا آپریشن ہو چکا ہے۔''

''ہاں جی! یہ کافی پرانی بات ہے۔ ان کی ٹانگ کٹ گئی تھی... بس کے حادثے میں۔''

ڈاکٹر نے اس حوالے سے ایک دو سوال پوچھے۔ شانی نے مناسب جواب دیے تاہم ڈاکٹر کے چہرے پر الجھن برقرار رہی۔ وہ غلام محمد سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''ماموں! میں مرہم پٹی تو کر دیتا ہوں۔ ایک دو زخموں کو ٹانکے لگنے ہیں، وہ بھی لگا دیتا ہوں مگر ٹانگ کی طرف سے مجھے تسلی نہیں ہے... اللہ کرے، ایک آدھ دن میں بہتر ہو جائے ورنہ ان کو اسپتال لے جانا ضروری ہے۔''

غلام محمد نے شانی کی طرف دیکھا۔ شانی بولی۔ ''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! اگر ان کی حالت کچھ ٹھیک ہو جائے تو میں ان کو واپس خوشاب لے جاؤں گی۔ وہاں میرے ایک دو رشتے دار ہیں...''

ڈاکٹر کا نام بایزید خان تھا۔ وہ سرجری کورس بھی کر رہا تھا۔ اس کے میڈیکل باکس میں طبی امداد کا کافی سامان موجود تھا۔ سب سے پہلے تو اس نے رستم کا شدید درد اور بخار کم کرنے کے لیے اسے دو انجکشن دیے۔ پھر اس کے زخموں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے تک اس نے دلجمعی سے کام کیا اور مرہم پٹی مکمل کر لی۔ شانی نے اپنی زخمی انگلیاں اوڑھنی میں چھپائے رکھی تھیں۔ چونکہ انگلیوں کا زخم بھی تھوڑا پرانا تھا اس لیے وہ اسے ڈاکٹر کے سامنے لانا نہیں چاہتی تھی۔ ڈاکٹر بایزید خان نے جاتے جاتے غلام محمد سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ماموں! ان کو بستر پر آرام کی ضرورت ہے۔ یہ اپنی ٹانگ کو جتنا کم سے کم ہلائیں اتنا ہی بہتر ہے۔''

دن ڈھلتے ہی بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ یہ سلسلہ چراغ جلنے تک چلتا رہا۔ اس چھوٹی سی بستی میں بجلی نہیں تھی۔ شام ہونے کے کچھ ہی دیر بعد کھانا وغیرہ کھا لیا گیا اور بستی پر غنودگی چھانے لگی۔ شانی اور رستم کے لیے بیٹھک نما کمرے میں ہی سونے کا انتظام کیا گیا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں وہ دونوں جاگتے رہے۔ باہر تواتر سے بارش کا پانی کچے پکے مکانوں پر گرتا رہا اور گاہے بگاہے بجلی چمکتی رہی۔

رستم اور شانی کی چارپائیاں ساتھ ساتھ تھیں۔ رستم کمر تک چادر اوڑھے چت لیٹا تھا... بالکل خاموش... اور ساکت! شانی نے اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھ دیا۔ اس نے ہاتھ کو تھاما اور اپنے ہونٹوں پر رکھ لیا۔ ہاتھ کتنی ہی دیر رستم کے ہونٹوں پر رکھا رہا پھر رستم کی کھوئی کھوئی آواز شانی کے کانوں سے ٹکرائی۔

''شانی! میں بہت شرمندہ ہوں... مجھے معاف کر دیں۔''

''کس بات کی معافی رستم!''

''میں اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ مجھے اس وقت اس کتے (ریاض) کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آپ کو گھسیٹا... آپ کو زخمی کیا۔ آپ سے کھینچا تانی کی۔ مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے اس ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دوں۔''

''آپ نے کچھ نہیں کیا۔ لیکن اب آپ ایسی باتیں کر کے مجھے تکلیف دے رہے ہیں۔ کیا آپ کے پہلے زخم کم ہیں جو اور زخم لگانے کا سوچ رہے ہیں۔ آپ کو... آپ کو کیا پتا، آپ کے جسم سے نکلنے والا خون کا ایک ایک قطرہ میری جان کو نچوڑ رہا ہے۔''

اس نے بڑے جذباتی انداز میں رستم کا زخمی ہاتھ لیا اور چومتی چلی گئی۔ وہ بڑی نرمی اور آہستگی سے اس کے [illegible] میں چلی آئی۔ اس کے سینے، گردن اور رخساروں کو شانی نے کئی بار بوسہ دیا پھر نرم ریشم کی طرح اس سے لپٹ کر اشک بہانے لگی۔

رستم نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''شانی! بس ایک بار اپنی زبان سے کہہ دیں... آپ نے مجھے معاف کیا۔ میری [illegible] کے لیے مجھے معاف کیا... ایک بار کہہ دیں۔''

اس کا یہ جذباتی پن شانی کو ششدر کر دیا کرتا تھا۔ وہ آج بھی ششدر ہو گئی۔ معافی تو شانی کو مانگنی چاہیے تھی رستم کی زندگی کا اولین مقصد شانی کی وجہ سے ادھورا رہ گیا تھا۔ ریاض، بدترین مات کھانے کے باوجود رستم سے بچ کر نکل گیا... اور وہ اس بہت بڑی بات کو یکسر بھول کر شانی کی چند خراشوں کے لیے اس سے معافی تلافی کر رہا تھا۔

شانی کا دل چاہا کہ اسے اپنے سینے میں سمیٹ لے... اس کی ساری ذہنی اور جسمانی تکلیفوں سمیت۔ اسے ہر بلا سے بچا کر کہیں دور نکل جائے... دنیا کے کسی ان جانے گوشے میں! کیا وہ ایسا کر سکتی ہے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا اس کے لیے ایک بھرپور کوشش کی جا سکتی ہے؟ وہ رستم کے شانے سے لگے لگے اور آنکھیں بند کیے کیے بولی۔ ''آپ جو چاہتے تھے... وہ ہو گیا ہے۔ کم از کم اتنا تو ہو گیا ہے کہ ڈیرے پر ظلم کرنے والے اصل لوگ مارے گئے ہیں۔ ریاض بھی بری طرح زخمی ہوا ہے۔ اور آپ کے ہاتھوں ذلیل و رسوا ہونے کے بعد جان بچا کر بھاگا ہے... کیا یہ سب کافی نہیں ہے؟'' اس نے آخری سوال بہت ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔

رستم کافی دیر خاموش رہا پھر اس نے عجیب دل نگار لہجے میں کہا۔ ''شانی! کاش میرے بس میں ہوتا۔ میں ان لوگوں کو بار بار زندہ کر کے مار سکتا... آپ میری بات چھوڑیں... آپ بتائیں کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟''

''رستم! کیا ہم... ڈپٹی ریاض کو معاف نہیں کر سکتے؟''

''شانی! آپ... آپ...'' وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ زخمی آواز اس کے گلے میں اٹک گئی۔ کتنی ہی دیر گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ نیم تاریکی میں بارش کی صدا گونجتی رہی یا ان کے دھڑکتے دلوں کی آہٹ سنائی دیتی رہی۔ آخر شانی نے ایک بار پھر اسے اپنے نرم بازوؤں میں سمیٹا اور آنکھیں بند کیے کیے بولی۔ ''رستم! زندگی میں بس ایک بار آپ سے کچھ مانگنا چاہتی ہوں، اس کے بعد کبھی نہیں... کچھ نہیں...''

رستم کے جسم میں لرزش نمودار ہوئی۔ اس نے چند گہری [illegible] اور عجیب لہجے میں کہا۔ ''آپ کچھ نہ مانگیں [illegible] آپ بس حکم دیں۔''

[illegible] نے نفی میں سر ہلایا۔ ''حکم نہیں رستم! ایک التجا... [illegible] آخری۔''

''[illegible] بی بی!''

شانی نے رستم کو کچھ اور بھی اپنی بانہوں میں سمویا اور بولی۔ ''رستم! آئیں... اپنی زندگی بچانے کی ایک آخری کوشش کریں... سب کچھ بھول کر، سب کچھ معاف کر کے... یہاں سے کہیں نکل جائیں۔ کسی ایسی جگہ۔ جہاں دشمنی اور بدلے کی یہ آگ نہ پہنچ سکے۔ جہاں بس میں اور آپ ہوں... کوئی نہ ہو... کوئی بھی نہیں۔''

شانی کی بانہوں میں رستم ساکت تھا۔ بالکل بے جان... بے روح... شانی کو لگا، دھڑکن کے سوا اس کے جسم میں زندگی کے کوئی آثار ہی نہیں۔ خاموشی طویل ہوتی جا رہی تھی۔ شانی کے کان رستم کی آواز سننے کے لیے بے تاب تھے۔ آخر یہ آواز ابھری اور شانی کی منتظر سماعت سے ٹکرائی۔ یہ عجیب آواز تھی، یہ عجیب لہجہ تھا۔ رستم نے کہا۔ ''شانی! یہ کیسے ہو سکتا ہے... آپ کچھ کہیں اور میں ماننے سے انکار کر دوں... ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں...''

رستم کی آنکھ سے ٹپکنے والا ایک گرم آنسو شانی کی پیشانی پر گرا اور اس کے رخسار کی طرف بہہ گیا۔

''شکریہ رستم... شکریہ!'' شانی نے کہا اور اس کے گرد اپنی نرم بانہوں کا حصار مضبوط کر دیا۔ وہ کیا تھا۔ ایک سرکش ہوا تھا... ایک بے اماں موج تھا۔ پنجاب پولیس کی ہتھکڑیوں میں استعمال ہونے والا بے شمار لوہا اسے زنجیر کرنے میں ناکام رہا تھا... لیکن ان لمحوں میں وہ کسی ناتواں جسم کی طرح شانی کی بانہوں میں تھا۔ اس نے جیسے خود کو شانی کی بانہوں میں گرا دیا تھا۔ اس کی مرضی کے سپرد کر دیا تھا۔

وہ وارفتگی سے گویا ہوئی۔ ''رستم! آپ کی ٹانگ ذرا بہتر ہو جائے تو ہم یہاں سے نکل جاتے ہیں۔ آپ نے بتایا تھا کہ ہم پارہ چنار اور خرلاچی سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ بس ایک دن کا سفر ہے۔ یہ ایک دن کا سفر کچھ بھی نہیں۔ ہم یہ طے کر لیں گے۔ وہاں خرلاچی کے قریب وہ سب موجود ہیں۔ ناصر، جہانگیر، زری... اور پہلوان... وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جتنا انتظار کر سکے، ضرور کریں گے۔'' اس نے چند لمحے توقف کیا اور رستم کو گفتگو میں شامل کرنے کے لیے بولی۔ ''افغان بارڈر خرلاچی سے کتنی دور ہے رستم؟''

''بس ایک دو میل۔'' رستم نے جواب دیا۔

''یہ کچھ بھی نہیں ہے اور ہم بارڈر پار نہ بھی کریں تو بھی وہ ایسا علاقہ ہے جہاں بڑی آسانی سے کچھ عرصے کے لیے چھپا جا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے شانی... جیسا آپ کہیں۔''

''آپ کی... اپنی رائے کیا ہے؟ کیا ہمیں پارہ چنار اور خرلاچی کی طرف جانا چاہیے؟''

''ہم... کسی بھی طرف جا سکتے ہیں لیکن...''

''لیکن کیا رستم؟''

وہ زخمی آواز میں بولا۔ ''لیکن یہ لوگ ہمیں نکلنے نہیں دیں گے شانی... کسی صورت نہیں... ڈپٹی ریاض بے حد عیار بندہ ہے۔ اسے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اگر ہم نکلے تو کس طرف جائیں گے۔''

''زندگی موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہم اپنی بھرپور کوشش کریں گے رستم! کیا پتا... کیا پتا...'' اس کا گلا رندھ گیا اور وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی۔ چند لمحے بعد وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ''رستم! میرے ابا جی اللہ بخشے کہا کرتے تھے کہ اپنے دل پر پتھر رکھ کر درگزر کرنے والا اور معاف کرنے والا خدا کو بہت پسند ہے۔ کیا پتا رستم! ہماری یہ چھوٹی سی نیکی ہی ہمارے کسی کام آ جائے اور ہم مصیبتوں کے اس گھیرے سے نکل جائیں۔ یہ ہو سکتا ہے نا رستم؟''

''آپ جیسا کہیں گی میں ویسا ہی کروں گا شانی۔'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

شانی نے اس کا زخمی رخسار چوما۔ ''تو پھر آنکھیں بند کر کے سو جائیں... کل جب صبح ہو گی تو ہم ایک نئے انداز سے سوچیں گے۔''

''آپ بھی سو جائیں۔''

''نہیں، میں جاگوں گی۔'' شانی بولی اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی لو مزید مدھم کر دی اور رستم کے لمبے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں چلانے لگی۔ کمرے سے باہر رات کسی ناگن کی طرح آگے کو سرک رہی تھی۔ اس کی پھنکار میں ان گنت اندیشے سرسرا رہے تھے۔

صبح نکھری ہوئی تھی مگر شانی کی آنکھوں میں یہ ''نکھار'' رستم کی تکلیف کے سبب دھندلایا ہوا تھا۔ رات آخری پہر رستم کی ٹانگ کی تکلیف مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ حتی الامکان ضبط کر رہا تھا مگر گاہے بہ گاہے کراہنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ صبح سویرے ہی غلام محمد اپنے ڈاکٹر بھانجے کو بلانے چلا گیا۔ ڈاکٹر

بایزید خان نے آکر رستم کی ٹانگ کی پٹی کھولی... شانی نے دیکھا کہ رستم کی پوری پنڈلی میں تریڑیں سی نمودار ہو گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ گوشت مُردہ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ کانپ گئی۔ ٹانگ کی یہ کیفیت اس حصے تک تھی جو ڈیڑھ دو سال پہلے رستم کے جسم سے دوبارہ جوڑا گیا تھا۔

تو کیا... رستم کی ٹانگ کا یہ حصہ دوبارہ اس کے جسم سے جدا ہو رہا ہے؟ یہ سوال ایک زہریلے تیر کی طرح شانی کے دل میں پیوست ہو گیا۔

تفصیلی معائنے کے بعد ڈاکٹر بایزید خان نے مایوسی سے سر ہلایا اور شانی کو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ شانی باہر آئی تو بایزید خان نے کہا۔ ''آپ کے شوہر کی حالت ٹھیک نہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ انہیں فوری طور پر اسپتال لے جائیں۔''

''لل... لیکن۔'' شانی ہکلا کر رہ گئی۔

''دیکھیں، آپ اس معاملے کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کریں۔'' ڈاکٹر بایزید خان نے ڈانٹنے والے انداز میں کہا۔ ''مجھے شک ہے کہ ٹانگ کا زہر جسم میں پھیلنا شروع ہو گیا ہے اگر یہ واقعی پھیل گیا تو... کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ جان بھی جا سکتی ہے۔''

شانی کا سینہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''یہاں کوئی پرائیویٹ اسپتال نہیں ہے؟ میرا مطلب ہے...''

''آپ اسپتال سے اتنا گھبرا کیوں رہی ہیں؟'' ڈاکٹر نے شانی کو تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر کوئی بات ہے تو بتا دیں۔ ہمیں دھوکے میں نہ رکھیں۔''

''کوئی بات نہیں ڈاکٹر! بس ان لوگوں سے ڈر آ رہا ہے جنہوں نے ہمیں پکڑا تھا۔''

اس جواب سے ڈاکٹر بایزید خان پوری طرح مطمئن نہیں ہوا۔ رستم کی ٹانگ کے حوالے سے بھی اس کے چہرے پر شدید الجھن نظر آ رہی تھی۔ وہ کہنے لگا۔ ''آپ کے شوہر کی زخمی ٹانگ میری سمجھ سے باہر ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ یہ ٹانگ مکمل طور پر اس کے جسم سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ جسم کے ایسے حصے دوبارہ جوڑے نہیں جا سکتے۔ اگر یہ جڑ بھی جائیں تو زندہ نہیں رہتے۔ مگر یہ جڑا ہوا ہے۔ کیا یہ ٹانگ بالکل علیحدہ ہو گئی تھی؟''

''نہیں جی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ کچھ رگیں جڑی رہ گئی تھیں۔''

''مجھے ایسا نہیں لگتا۔ ویسے، یہ آپریشن ہوا کہاں تھا؟''

ڈاکٹر بایزید خان نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

اس سے پہلے کہ شانی جواب میں کچھ کہتی، غلام محمد تیز قدموں سے اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ متغیر تھا اور آنکھوں میں تشویش دکھائی دیتی تھی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم کون ہو بی ...''

''میں نے آپ کو بتایا تھا۔''

''تم نے غلط بتایا تھا۔ تم وہ نہیں ہو۔ پولیس اور ... بستیوں میں تم دونوں کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ وہ جو کہہ رہے ہیں، وہ بہت حیران کرنے والا ہے۔''

شانی سمجھ گئی کہ ان کے میزبان پر بہت کچھ ظاہر ہو ... ہے۔ اب کچھ چھپانا بے سود تھا۔ وہ ایک آہ بھر کر بولی۔ ''... آپ سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہوں گی۔ جو کچھ مجھ پر اور میرے ساتھی پر بیتی ہے، سب کچھ آپ کو بتا دیتی ہوں۔ اس کے بعد آپ جو فیصلہ بھی کریں، مجھے قبول ہے۔ ہمیں چھوڑ دیں، ... دیں... یا پولیس کے حوالے کر دیں۔ جو آپ کا جی چاہے۔''

''تم کیا بتانا چاہتی ہو؟'' غلام محمد نے پوچھا۔

''سب کچھ... اگر کہتے ہیں تو بالکل شروع سے بتا دیتی ہوں۔''

''ہو سکتا ہے کہ جو کچھ تم بتاؤ، مجھے اس سے زیادہ ... ہو۔'' غلام محمد نے عجیب آہنگ میں کہا۔

''میں سمجھی نہیں۔''

''رستم سیال کا نام ہمارے لیے نیا نہیں ہے اور خاص طور سے میرے لیے۔ اور رستم کے ساتھ ساتھ میں تمہارے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔ تم شانی بی بی ہو نا... رنگ والی کی چودھرانی؟'' غلام محمد نے لرزتے لہجے میں کہا۔ شانی حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ غلام محمد کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ ''ہاں شانی بی بی! یہاں بہت سے لوگ تمہارے اور رستم کے بارے میں جانتے ہیں۔ سچ پوچھو تو لالا فرید، رستم سیال اور حسنے گجراتی نے ہم لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی ہوئی ہے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے کچھ عرصہ پہلے سیکسر میں اجرالی سرداروں کے ہاتھ توڑے اور ہم جیسے بے سہارا لوگوں کو ان کی زور دستیوں سے بچایا... لالے فرید کے ننھیالی ہمارے علاقے کے تھے۔ وہ اکثر یہاں آتا جاتا رہتا تھا۔ میں نے... میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن مجھ جیسے نمانے، ناچیز کے گھر میں لالے کا ساتھی رستم سیال آئے گا۔ میں بڑا چھوٹا بندہ ہوں۔ اتنا بڑا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ پھر بھی جو کچھ مجھ سے اور میرے گھر آنے سے ہو سکا، میں تم لوگوں کے لیے ضرور کروں گا۔''

''مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا۔'' شانی نے کہا۔

''ہاں بی بی! میں نے اس سے پہلے کبھی رستم سیال کو یا آپ کو نہیں دیکھا۔ نہ کبھی کسی سے ملا ہوں۔ بس ایک دو دفعہ لا...

فرید کو دور سے دیکھا تھا... صرف ایک دو دفعہ۔ لیکن ہمارے گراں کے بہت سے لوگ آپ کو نہ جانتے ہوئے بھی جانتے ہیں۔ آپ ہمارے اپنے ہیں۔'' غلام محمد کا گلا رندھ گیا۔

''مگر ہم آپ پر بوجھ بننا نہیں چاہتے۔ جلد سے جلد یہاں سے چلے جانا چاہتے ہیں۔ بس ان کی ٹانگ...''

''سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا بی بی۔ آپ کوئی بوجھ دل پر نہ رکھیں۔ ہم تو وہ لوگ ہیں بی بی جو کسی کو بھی پناہ دے دیں پھر پیچھے نہیں ہٹتے۔ آپ تو رستم سیال اور شانی بی بی ہو۔''

ڈاکٹر بایزید خان خاموش کھڑا تھا۔ ابھی تک اس نے گفتگو میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ ہی نظر آتا تھا۔ غلام محمد نے شانی کو تو رستم کے پاس بھیجا اور خود بایزید کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ رستم ٹرنکولائزر کے زیر اثر نیم بے ہوش پڑا تھا۔ اس حالت میں بھی اس کی ہلکی کراہیں سنائی دیتی تھیں۔ اس کی پنڈلی کا رنگ اور جلد کی کیفیت دیکھ کر شانی کا دل خون ہونے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ پنڈلی تا دیر اس کے جسم کا حصہ نہیں رہ سکتی۔

پندرہ بیس منٹ بعد غلام محمد نے شانی کو پھر پہلے والے کمرے میں بلایا۔ ڈاکٹر بایزید خان جا چکا تھا۔ غلام محمد نے افسردہ لہجے میں شانی کو بتایا کہ رستم کی ٹانگ کے بارے میں بایزید کی رپورٹ اچھی نہیں ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس ٹانگ کے ٹھیک ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ رستم کے جسم کے ساتھ رہی تو اس کی زندگی سخت خطرے میں پڑ جائے گی۔

شانی کا دل گواہی دینے لگا تھا کہ ڈاکٹر بایزید خان جو کہہ رہا ہے وہ درست ہے لیکن اس بات کو قبول کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا... اگلے ایک گھنٹے کے اندر شانی کے دل و دماغ میں ایک جاں گسل کشمکش جاری رہی۔ اسے فیصلہ کرنا تھا اور اکیلے کرنا تھا... وہ ایک طوفان کی زد میں تھی۔ غلام محمد نے شانی کو بتا دیا تھا کہ اگر ٹانگ کو علیحدہ کرنا ہوا تو اسپتال کی ضرورت پڑے گی۔ تاہم وہ پوری کوشش کر رہا ہے کہ بایزید خان یہیں پر یہ کام کرنے کو تیار ہو جائے۔

سہ پہر تک رستم کی حالت مزید بگڑ گئی۔ اسے تیز بخار بھی ہو گیا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بولا۔ ''شانی! یہ ٹانگ میری جان لے لے گی۔ اس میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس کو کاٹ کر پھینک دیں۔''

شانی نے اس کے رخسار سہلاتے ہوئے کہا۔ ''کچھ بھی آپ کی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا۔ ہم جو فیصلہ کریں گے، سوچ سمجھ کر کریں گے... اور آپ کا مشورہ لیں گے۔''

''میرا کوئی مشورہ نہیں ہے شانی۔ میں نے سب کچھ آپ پر چھوڑ دیا ہے... سب کچھ آپ پر۔'' وہ جیسے کہیں دور سے بول رہا تھا۔

اسی دوران میں ڈاکٹر بایزید خان آ گیا۔ وہ بڑی [illegible] وہ شام تھی۔ یہ نامہرباں شام... جیسے شانی کو روندتی اور [illegible] ہوئی گزر گئی۔ اسے ایک بہت بڑا فیصلہ کرنا پڑا۔ ڈاکٹر بایزید خان بالکل تیار نہیں تھا لیکن وہ ماموں کے اصرار کے سامنے ٹھہر سکا۔ ناکافی سامان اور غیر موزوں ماحول کے باوجود [illegible] نے تین لالٹینوں کی روشنی میں ایک گھنٹے کا آپریشن کیا اور [illegible] کی نیم مردہ ٹانگ اس کے جسم سے علیحدہ کر دی۔ اس کے [illegible] ان کے پاس کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔ رستم کے جسم کا وہ حصہ [illegible] کچھ عرصہ پہلے ایک غیر فطری عمل کے تحت اس کے جسم سے جوڑا گیا تھا پھر علیحدہ ہو گیا تھا۔ وہ شاید کبھی اس کے جسم کا حصہ بنا ہی نہیں تھا۔ وہ بس ایک ''تجربہ'' تھا... جو کچھ دیر چلنے کے بعد ناکام ہو گیا تھا یا پھر ایک حیران کن پودے کی طلسم کاری تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ اپنا اثر کھو بیٹھی تھی...

☆☆☆

اگلے 72 گھنٹے میں شانی نے مہمان نوازی اور بے لوث قربانی کی ایسی مثال دیکھی جسے آخری سانس تک بھلانا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ غلام محمد شاید ان فرشتوں میں سے تھا جو اب بھی کہیں کہیں اس زمین پر بسیرا رکھتے ہیں۔ شانی اور رستم کو پناہ دے کر وہ اپنے چھوٹے سے ہنستے کھیلتے گھرانے کے لیے ایک شدید ترین خطرہ مول لے رہا تھا مگر اسے پروا نہیں تھی۔ شانی کی ہر بات کے جواب میں وہ بڑی خوش دلی سے پوٹھوہاری کا ایک شعر بولتا تھا جس کا مطلب تھا... بندہ پانی میں غوطہ لگا کر سوکھا رہ سکتا ہے مگر اس مصیبت سے نہیں بچ سکتا جو اس کے مقدر میں ہو اور نہ اس راحت سے محروم رہ سکتا ہے جو اس کے نصیب میں ہو۔ وہ لالے فرید کا پرستار تھا اور اس حوالے سے رستم کا بھی۔ اس کا رویہ دیکھ کر شانی کو ڈھوک شاہاں کی وہ ایثار پیشہ لڑکی مہراں یاد آ گئی جس کے بارے میں رستم نے اسے بتایا تھا۔ مہراں نے رستم کو ایک مشکل صورتِ حال سے نکالنے کے لیے اپنا کومل جسم ایک نہایت مکروہ اور کرخت شخص کے حوالے کر دیا تھا۔ غلام محمد کا ایثار بھی مہراں سے کم نہیں تھا... اپنی حاملہ بیوی اور دو پھول جیسے بچوں کی زندگی کی پروا کیے بغیر تن من دھن سے شانی اور رستم کا سہارا بنا ہوا تھا۔ شانی نے سوچا... جب تک ظلم رہے گا، تب تک ظلم سے ٹکرانے والے اور لہولہو ہونے والے بھی رہیں گے۔ اور جب تک لہولہو ہونے والے رہیں گے، گمنام بستیوں [illegible] سہارا بننے والے مہراں... اجمل خان اور غلام محمد [illegible]

حیرت انگیز طور پر رستم کی طبیعت اب قدرے بہتر تھی۔ [illegible] کی کمی کے سبب اس کا رنگ گہرا زرد تھا۔ بخار اور شدید [illegible] تھا۔ آج وہ لاٹھی کے سہارے دو چار قدم چلا بھی تھا۔ ڈاکٹر بایزید خان روزانہ آ کر رستم کے زخموں کی بینڈیج کر رہا تھا... خاص طور سے اس کی ٹانگ کی۔ تاہم شانی صاف محسوس کر رہی تھی کہ ڈاکٹر بایزید خان اس ساری صورتِ حال سے خوش نہیں ہے۔ وہ شانی اور رستم سے بس بہت ضروری بات ہی کرتا تھا۔ شانی دل سے سمجھتی تھی کہ بایزید خان کا رویہ بے جا نہیں ہے۔ اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا تو ایسا ہی سوچتا۔ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ جلد از جلد رستم کو لے کر یہاں سے نکل جائے۔ مگر غلام محمد جو اطلاعات پہنچا رہا تھا، ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ تلاش کرنے والے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ ابھی تک یہی غنیمت تھا کہ وہ نور خیل نامی اس چھوٹی سی الگ تھلگ بستی میں نہیں پہنچے تھے۔ اگر وہ پہنچ جاتے تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ شانی پچھلے دو دن میں گاہے بگاہے رستم کے موبائل فون پر بھی کوشش کرتی رہی تھی۔ اس کے دل میں یہ موہوم آس موجود تھی کہ شاید کسی طرح ناصر اور جہانگیر وغیرہ سے رابطہ ہو سکے لیکن یہاں سگنلز ہی نہیں مل رہے تھے۔

تیسرے روز رات کو شانی اور غلام محمد میں دیر تک بحث ہوئی۔ آخر شانی نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ''بھائی! اگر آپ ہمارے جانے کا انتظام نہیں کریں گے تو ہم از خود نکل جائیں گے۔ اگر پیدل چلنا پڑا تو پیدل چل پڑیں گے... اور ایسا کرنے سے جو کچھ بھی ہمارے ساتھ ہوگا، اس کے ذمے دار آپ لوگ ہوں گے۔''

شانی کے فیصلہ کن رویے نے غلام محمد کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنی بیوی سے تا دیر مشورہ کیا۔ بیوی، غلام محمد کی چچازاد تھی۔ وہ بھی اسی کی طرح کھلے دل اور حیران کن اخلاق کی مالک تھی۔ شانی نے دیکھا تھا، ہر معاملے میں میاں بیوی کی رائے ایک ہوتی ہے۔ یہ بڑا پیارا سا گھرانہ تھا... ایک ایسا ہی گھرانہ جو کہیں شانی کے ذہن میں بھی بسا ہوا تھا... مگر اب شانی کی پہنچ سے بہت دور جا چکا تھا۔ گھر والی سے مشورہ کرنے کے بعد غلام محمد نے شانی کو بتایا کہ وہ آٹھ دس گھنٹے میں ان کے جانے کا انتظام کر دے گا۔

رات کو لالٹین کی روشنی میں شانی اور رستم کے درمیان پھر مکالمہ ہوا۔ رستم نے بے حد افسردہ لہجے میں کہا۔ ''شانی! اب تو میں اور بھی بے کار ہو گیا ہوں۔ ہمیں حقیقت کو مان لینا چاہیے۔ یہ لوگ ہمیں پارہ چنار کی طرف نکلنے نہیں دیں گے۔ آپ کے پاس اب بھی موقع ہے، آپ...''

شانی نے رستم کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''اگر آپ نے ایسی باتیں کرنی ہیں تو پھر مجھے اپنے ہاتھ سے ختم کر دیں۔''

رستم چپ ہو گیا۔ گردن ایک بار پھر جھک گئی۔ شانی نے کہا۔ ''آپ اندھیرا دیکھ رہے ہیں مگر مجھے امید کی کرن نظر آ رہی ہے۔ ہم اپنی منزل سے زیادہ دور نہیں۔ آپ نے خود بتایا ہے کہ خرلاچی گاؤں تک تقریباً ایک دن کا سفر ہے۔ ہم لوکل بس پر یہ سفر کر سکتے ہیں۔''

''لیکن سڑک تک کیسے پہنچیں گے؟'' رستم نے پوچھا۔

''اس کا انتظام غلام محمد کر رہا ہے۔ وہ گندم اور تمباکو وغیرہ لے کر ایک قریبی قصبے کی طرف جاتا ہے۔ وہ ہمیں اپنی بیل گاڑی میں چھپا کر لے جائے گا۔''

رستم کسی دل سوز سوچ میں گم رہا۔ آخر گہری سانس لے کر بولا۔ ''شانی! کہیں آپ کے ذہن میں یہ خیال تو نہیں کہ آپ نے... آپ نے بالکل آخری لمحوں میں ریاض کی جان بچائی ہے۔ اس کے بدلے میں وہ بھی ہم سے کسی طرح کی رعایت کرے گا۔''

''رستم! ہم نے جو کچھ کیا کسی بدلے کے لیے نہیں کیا۔ ہم نے اپنا کام کیا۔ اس نے کیا کرنا ہے، یہ سوچنا اس کا کام ہے۔''

''شانی! اگر آپ کے ذہن کے کسی دور دراز کونے میں بھی یہ بات موجود ہے تو اسے نکال دیں۔ ریاض کو میں اس کی پیدا کرنے والی ماں سے بھی بڑھ کر جانتا ہوں۔ وہ بدذات... کتے کی اس دُم جیسا ہے جو سو سال حقے کی نلی میں رہ کر بھی ٹیڑھی رہتی ہے۔''

''میں اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی رستم۔ ہمیں تو بس اپنے بارے میں سوچنا ہے، یہاں سے نکلنے کے بارے میں۔''

رات دو بجے کے لگ بھگ غلام محمد کہیں سے ایک پرانی بیساکھی لے آیا۔ یہ لاٹھی کی نسبت بہت بہتر تھی... اور یہ رستم کے لیے نئی شے نہیں تھی۔ روکیٹ بستی میں وہ کئی ماہ اس کے سہارے چلتا رہا تھا... اور وہ دن اس کی زندگی کے سہانے دنوں میں سے تھے۔ وہ مر کر بھی انہیں نہیں بھول سکتا تھا۔ غلام محمد نے ایک بڑی سی خستہ حال چادر کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ اس میں ایک پیوند لگا ہوا تھا۔ اٹیچی کیس میں سے کلاشنکوف، گولیاں اور دستی بم نکال کر ایک بستر میں گول گول لپیٹ دیے گئے۔ اس بستر کو سوت کی رسّی سے باندھ دیا گیا۔ شانی نے رستم کے لمبے بال سمیٹ کر اور پن کر کے ایک کام دار ٹوپی

میں چھپا دیے۔ غلام محمد کی بیوی آسیہ نے دیسی گھی کے پراٹھے اور تلے ہوئے انڈے... راستے میں ناشتا کرنے کے لیے ایک بڑے رومال میں لپیٹ دیے۔ رات آخری پہر تین بجے کے لگ بھگ رستم اور شانی جانے کے لیے تیار تھے۔ ڈاکٹر بایزید خان موقع پر موجود تھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ تھا... وہ جیسے جلد از جلد رستم اور شانی کو اس گھر سے باہر دیکھنا چاہتا تھا۔

وقتِ رخصت شانی نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ نے جو کچھ ہمارے لیے کیا، وہ ہم بھول نہیں سکتے۔ اس موقع پر شکریے کے سارے لفظ چھوٹے محسوس ہو رہے ہیں۔''

بایزید کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا۔ اس نے ذرا سا مسکرانے کی زحمت بھی نہیں کی۔ شانی دل کی گہرائی سے بولی۔ ''میں جانتی ہوں ڈاکٹر! آپ پریشان ہیں۔ آپ کو اندیشہ ہے کہ ہم نے جلد یا بدیر پکڑے جانا ہے۔ میں آپ کے اندیشے کو غلط نہیں کہہ سکتی مگر ایک بات کا آپ کو یقین دلاتی ہوں۔ ہم پکڑے گئے اور بدترین تکلیف سے بھی گزرے تو آپ کا اور آپ کے ماموں کا نام ہماری زبانوں پر نہیں آئے گا... مرتے دم تک بھی نہیں۔''

اس بار بایزید خان نے صرف شکریہ کہا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ مزاجاً ضرورت سے زیادہ حقیقت پسند شخص لگتا تھا۔

گھر کے کشادہ صحن میں گندم کی چھوٹی بوریوں سے لدی ہوئی بیل گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اس میں بڑی سمجھ داری سے رستم کے لیے اور شانی کے بیٹھنے کی جگہ بنائی گئی تھی۔ بستر بند کو غلام محمد نے اپنے پاس رکھنا تھا۔ رستم کو بیل گاڑی پر چڑھنے میں تھوڑی سی دشواری ہوئی۔ جب رستم اور شانی اوپر پہنچ گئے تو غلام محمد نے تمباکو کے چند گٹھے اور تین چار گندم کی بوریاں مزید رکھ کر ان دونوں کو بالکل چھپا دیا۔

بیل گاڑی کا سفر طویل اور بے حد تناؤ والا تھا۔ اندیشوں کے دیو... ان کے اردگرد چنگھاڑ رہے تھے۔ باہر سے آنے والی ہر آواز پر انہیں کسی پولیس اہلکار یا اجرائی ہرکارے کا شبہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی شانی کے ذہن میں ڈاکٹر بایزید خان کے حوالے سے بھی ہلکا سا شک گزرتا تھا کہ کہیں وہ کسی طرح کی مخبری نہ کر دے مگر اس نسبت سے آخر تک خیریت ہی گزری۔ صبح تین بجے کے چلے ہوئے وہ دوپہر کو منزل تک پہنچے۔ غلام محمد نے ان کو باہر نکالا۔ یہ جھاڑیوں سے گھری ہوئی ایک جگہ تھی۔ سامنے بلند اور خشک پہاڑ دکھائی دے رہے تھے۔ ''وہ سامنے سڑک ہے برادر! ٹل جانے والی بس یہاں سے مل جائے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پارہ چنار کی مل جائے۔''

''اب آپ جائیں۔'' شانی نے آنکھوں [illegible] سے کہا۔

''نہیں نہیں، جب تک آپ سوار نہ ہوں گے، میں رہوں گا۔''

رستم یکسر خاموش تھا۔ اپنی جسمانی تکلیف اور [illegible] الم سے لڑتا ہوا... اس نے جیسے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ شانی کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ ریاض سے ہونے والے ٹکراؤ کے بعد سے اس پر عجیب بے حسی طاری تھی۔

اپنے محسن غلام محمد سے رخصت ہونے کے بعد [illegible] رستم پروگرام کے مطابق علیحدہ علیحدہ پختہ سڑک کی طرف بڑھے۔ میلی کچیلی چادر میں لپٹا ہوا اور بیساکھی کے سہارے بہ مشکل چلتا ہوا رستم ایک قابلِ رحم شخص لگ رہا تھا۔ گول بستر کے دائیں ہاتھ میں تھا۔ شانی اس سے کافی پیچھے تھی۔ وہ سڑک کے کنارے ایک سنگِ میل پر پہنچے۔ یہاں دیسی برقعوں میں لپٹی ہوئی دو عورتیں اور تین خان صاحبان کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ دو تین بچے بھی تھے۔ شانی اور رستم ایک دوجے سے دور اور لاتعلق کھڑے رہے۔ شانی نے اپنا جسم اور چہرہ مقامی طرز کی چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کس عمر کی عورت ہے۔

بس نے تھوڑا سا انتظار تو کرایا لیکن خوشی کی بات یہ کہ یہ سیدھی پارہ چنار جانے والی بس تھی۔ رستم کے سوار ہونے کے بعد شانی بھی سوار ہوگئی۔ وہ دونوں بس کے علیحدہ علیحدہ حصوں میں بیٹھے۔ رستم بستر بھی بس کے اندر لے جانے میں کامیاب رہا۔ شانی اگلے حصے میں تھی اور گاہے بہ گاہے انکھیوں سے اسے دیکھ لیتی تھی۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے جیسے بہت دور تھا۔ کسی اور ہی دنیا میں کھویا ہوا... غمزدہ رنجور! جسمانی تکلیف اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

☆☆☆

ٹل میں بس صرف آدھ گھنٹا رکی اور پارہ چنار کی طرف روانہ ہوگئی۔ خشک پہاڑوں اور مفلس کھیتوں کے درمیان ایک طویل تھکا دینے والا سفر تھا۔ شانی اور رستم کے لیے اعصابی طور پر بھی تھکا دینے والا تھا۔ راستے میں انہیں کئی لیویز کے ناکے نظر آئے۔ ایک دو جگہ رکی ہوئی بس کے لیویز کے اہلکاروں نے تاکا جھانکی بھی کی۔ شانی کے دل کی دھڑکنوں میں ہر آن اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں شانی کو پشتو کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دیتی تھی اور ہر شخص کے کندھے پر رائفل نظر آتی تھی۔ یہاں تک کہ لڑکوں کے کندھوں پر بھی ہلکی پھلکی رائفلیں موجود تھیں۔

یہاں پاکستانی اور افغانی دونوں طرح کی کرنسی نظر آ رہی تھی۔ جب شام کی سیاہی پھیل چکی تو شانی کو دور شمال مغربی افق پر پہاڑی سلسلے کی بالائی لکیر نظر آئی۔ شانی نے اپنے قریب بیٹھی برقع پوش عورت سے پوچھا۔ ''وہ سامنے والے پہاڑ پارہ چنار کے ہیں؟''

''نہیں بہن! وہ افغانستان کا پہاڑ ہے۔''

''اور پارہ چنار؟''

''ام کو ٹھیک سے پتا نہیں۔ پارہ چنار بائیں طرف ہے۔ ام بس آدھ گھنٹے کے اندر پہنچ جائے گا۔''

شانی کو اپنی رگوں میں خون کی گردش بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بالآخر وہ منزل کے قرب و جوار میں تھے۔ اسے افق پر وہ پہاڑ دکھائی دے رہے تھے جن کے پار انہیں پناہ مل سکتی تھی۔ ایک نئی زندگی، ایک نیا موقع۔ اس نے چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ سوچا۔ 'کیا وہ وہاں تک پہنچ پائیں گے؟ کیا آنے والا ایک ڈیڑھ گھنٹا بہ خیریت گزر جائے گا؟' اس کا دل گواہی دینے لگا کہ ایسا ہوگا۔ قدرت انہیں نئی سرزمین پر نئی زندگی شروع کرنے کا ایک موقع دے گی۔ مگر اس کی چھٹی حس دوسرے انداز کی پکار بلند کرنے لگی... جب وہ بس سے اتریں گے، انہیں چپے چپے پر نگراں آنکھیں نظر آئیں گی۔ وہ اس ماحول میں بالکل اجنبی اور جدا دکھائی دیں گے۔ خاص طور سے رستم... وہ فوراً نگاہوں میں آ جائے گا۔

وہ یقین اور بے یقینی کے درمیان ڈولتی رہی اور بس پاک افغان سرحد کی طرف بڑھتی رہی۔ ایک چیک پوسٹ پر انہیں روکا گیا۔ یہاں سڑک پر باقاعدہ پھاٹک سا بنایا گیا تھا۔ حسبِ سابق شلوار قمیص والے دو رائفل بردار اہلکاروں نے بس میں نگاہ دوڑائی۔ وہ نیچے اترنے لگے مگر ایک اہلکار مڑا۔ اس کی نگاہ پچھلی نشستوں کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ رستم بھی انہی نشستوں پر موجود تھا۔ شانی کا دل اچھل کر گلے میں آ گیا۔ اہلکار پچھلی نشستوں کے پاس گئے... اور رستم کے سامنے رک گئے۔ پہلے انہوں نے پشتو میں کچھ پوچھا پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولے۔ ''ہاں بھئی! کہاں سے آیا ہے؟''

''بنوں سے۔'' رستم کا چہرہ پتھر کی طرح بے تاثر تھا۔

''کہاں جا رہا ہے؟''

''پارہ چنار... حاجی اکرم علی کے پاس۔''

اہلکاروں نے دو تین مزید سوال پوچھے۔ وہ مطمئن نہیں ہوئے۔ پچھلے اہلکار نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے کھولو۔''

رستم چند سیکنڈ ساکت رہا۔ شانی جانتی تھی۔ یہ موت سے پہلے کا سکوت ہے... یہ طوفان سے پہلے کی خاموشی ہے۔ رستم ایک گہری سانس لے کر نیچے جھکا۔ اس نے بستر کھولا۔ شانی کی دھڑکنیں اس کی پسلیاں توڑنے لگیں۔ بستر کے اندر کلاشنکوف ایک بیڈ شیٹ میں لپٹی ہوئی تھی۔ رستم نے بیڈ شیٹ کے اندر سے ہی فائر کیا۔ دھماکے سے گولی اہلکار کے سینے میں گھسی اور وہ پشت کے بل ایک طرف کی نشستوں پر گرا۔ پوری بس میں تہلکہ مچ گیا۔ لوگ دیوانہ وار چلّائے اور نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسرے اہلکار نے رائفل سیدھی کرنا چاہی۔ کلاشنکوف سے دو مزید فائر ہوئے اور یہ اہلکار بھی زخمی ہو کر گر گیا۔ رستم بس کے عقبی دروازے کے بالکل پاس تھا۔ اسے بیساکھی سنبھالنے اور بس سے نکلنے میں پانچ سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ میں تھی اور کینوس کا تھیلا اس کے کندھے پر تھا۔

رستم کے ساتھ ہی شانی بھی اگلے دروازے سے نکل آئی۔ اس سے پہلے کہ اردگرد موجود خضدار، لیویز اہلکار یا دیگر لوگ کچھ سمجھتے یا کرتے، رستم قریب کھڑے ایک سوزوکی لوڈر میں داخل ہو گیا اور کلاشنکوف کی نال ڈرائیور کی گردن سے لگا دی۔ نوجوان ڈرائیور کی آنکھیں دہشت سے کھلی رہ گئیں۔ یہ سواریاں ڈھونے والا لوڈر تھا اور اس کے پچھلے حصے میں نشستیں تھیں۔ جونہی شانی ایک نشست پر بیٹھی، رستم ڈرائیور سے مخاطب ہو کر پھنکارا۔ ''تمہاری بھی جان جائے گی۔ جان بچانی ہے تو گاڑی بھگا دو۔''

معلوم نہیں کہ قبائلی ڈرائیور رستم کا فقرہ سمجھا یا نہیں مگر اس کا مفہوم ضرور سمجھ گیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ چاروں طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ دو مسلح اہلکار لوڈر کی طرف جھپٹے، انہوں نے فائر کیے۔ ایک گولی شانی کو چھو کر گزری اور سائیڈ ونڈ کا شیشہ توڑتی ہوئی نکل گئی۔ رستم نے اہلکاروں کی ٹانگوں پر گولیاں چلائیں اور انہیں زمین بوس کر دیا۔

''تیز چلو۔'' وہ لرزہ خیز آواز میں دہاڑا۔

ہیبت زدہ ڈرائیور ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔

''بائیں موڑو۔'' رستم نے کلاشنکوف کی نال اس کی گردن میں گھسیڑتے ہوئے کہا۔

ڈرائیور نے گاڑی سڑک سے اتاری اور پہاڑیوں کے درمیان کچے راستے پر ڈال دی۔ شانی نے کانپ کر دیکھا۔

رستم کی کٹی ہوئی ٹانگ کی پٹی خون سے تر ہوتی جارہی تھی۔ اس کے پہلو کے زخم کا منہ بھی شاید کھل گیا تھا۔ ہلکی پھلکی گاڑی زوردار ہچکولے کھا رہی تھی اور شانی کا سر بار بار چھت کے پائپوں سے ٹکرا رہا تھا۔ بڑھتی ہوئی تاریکی میں اسے چند تیز رفتار ہچکولے کھاتی روشنیاں نظر آئیں۔ وہ کراہ کر بولی۔

''رستم! وہ پیچھے آرہے ہیں۔''

درمیانی فاصلہ کافی تھا۔ ویسے بھی راستہ پُرپیچ ہونے کی وجہ سے عقب میں آنے والے فائر نہیں کرسکتے تھے۔ سوزوکی لوڈر اچھلتی کودتی بھاگتی چلی جارہی تھی۔ رستم نے کلاشنکوف کی نال ڈرائیور کی گردن میں ٹھسیڑ رکھی تھی۔ غالباً اسے یہ ڈر بھی تھا کہ ڈرائیور کہیں گھبرا کر چھلانگ ہی نہ لگا دے۔

''شانی! آپ سیٹ پر لیٹ جائیں۔'' رستم نے کہا۔ شانی نے ہدایت پر عمل کیا۔ ''تیز چلو خان!'' رستم گاہے بہ گاہے ڈرائیور پر گرج رہا تھا۔

''اور تیز چلے گا تو گاڑی الٹے گا۔'' ڈرائیور نے کراہتے ہوئے کہا۔

''الٹ کر کسی دریا میں نہیں گر جائے گا۔'' رستم نے اس کے سر پر کلاشنکوف کا بیرل رسید کیا۔ وہ تقریباً دو میل تک اسی طرح چلتے رہے۔ وہ اوپر کی طرف جارہے تھے۔ قرب و جوار بالکل تاریک تھے۔ گاہے بہ گاہے عقب میں آنے والی گاڑیوں کی روشنیاں چمک جاتی تھیں پھر چند فائر سنائی دیے۔ یہ دھماکا خیز فائر ہیوی ری پیٹر کے تھے۔ راستہ دشوار ہوتا جارہا تھا۔ ایک جگہ لوڈر کو شدید جھٹکا لگا اور وہ زوردار آواز سے بائیں طرف جھک گیا۔ نیچے سے کسی نکیلے پتھر نے اس کا انجر پنجر پھاڑ دیا تھا۔ ''اوہ خدایا!'' ڈرائیور نے بے بسی سے اپنا سر پکڑ لیا۔

''شانی! آپ اتر آئیں۔'' رستم پکارا۔

شانی اتر آئی۔ رستم نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ واپس بھاگ جائے۔ رستم نے جیسے ہی یہ بات کہی، ڈرائیور نے ڈھلوان پر دوڑ لگا دی۔ رستم اور شانی آگے بڑھنے لگے۔ تاروں کی روشنی ان کی مدد کررہی تھی۔ ''شاید وہ پیچھے آرہے ہیں۔'' شانی نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔

رستم نے مڑ کر دیکھا۔ اسے بھی نشیب میں ٹارچوں کی روشنیاں چمکتی نظر آئیں۔ اندازہ ہوتا تھا کہ پیچھے آنے والوں نے بھی گاڑیاں چھوڑ دی ہیں۔ رستم نے ایک جگہ رک کر کینوس کے بیگ سے نیا میگزین نکالا۔ اسے کلاشنکوف سے اٹیچ کیا اور چھوٹے چھوٹے تین برسٹ چلائے۔ کلاشنکوف کی دہلا دینے والی آواز سناٹے میں دور تک گونجی اور کئی سیکنڈ تک پہاڑیوں میں اس کی بازگشت سنائی دی۔ روشنیاں پہلے دھیمی ہوگئیں پھر بکھری بکھری دکھائی دیں۔ پیش قدمی کرنے والوں کے قدم رک گئے تھے۔

رستم اور شانی پھر اوپر چڑھنے لگے۔ بیساکھی سے سہارا رستم کو خاصی دشواری پیش آرہی تھی۔ شانی گاہے بہ گاہے اسے سہارا دیتی تھی۔

''رستم! ہم کہاں تک جائیں گے؟'' وہ دل فگار آواز میں بولی۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ... جیسا کہیں گی میں ویسا کروں گا۔'' وہ درد سے کراہا۔ وہ اب تک اسی کیفیت میں تھا جس میں، ریاض سے ٹکراؤ کے بعد مبتلا ہوا تھا۔ اس نے جیسے اپنا سر تسلیم خم کرلیا تھا اور سب کچھ... سب کچھ شانی کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔

''یہ کون سے پہاڑ ہیں رستم؟'' شانی نے ہانپی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ناصر نے انہی تین پہاڑوں کے بارے میں بتایا تھا۔ ان کے پار افغان سرحد شروع ہوجاتی ہے۔ خرلاچی کا گاؤں ہماری دائیں طرف ہے۔''

''ناصر اور جہانگیر کہاں ہوں گے؟''

''اگر ہم اس پہاڑ کو ذرا بائیں طرف سے پار کرلیں تو ہم اس گاؤں کی طرف اتریں گے جہاں وہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔''

''کیا ہم ان تک کبھی نہیں پہنچ سکیں گے رستم؟'' شانی نے عجیب حسرت آمیز آہنگ میں کہا۔

''اس موقع پر کیا کہا جاسکتا ہے شانی؟''

ایک بار پھر عقب سے فائرنگ ہوئی۔ یہ تین چار رائفلیں تھیں جو ایک ساتھ چلائی گئی تھیں۔ رستم اور شانی ڈھلوان کے ساتھ لگ گئے۔ فائرنگ کے انداز سے ظاہر ہو کہ یہ اندھی فائرنگ ہے۔ پیچھے آنے والوں کو کچھ پتا نہیں تھا کہ رستم اور شانی کا رخ کس طرف ہے۔

''شاید یہ چاہتے ہیں کہ آپ بھی فائر کریں اور انہیں ہمارے رخ کا ٹھیک سے پتا چلے۔'' شانی نے کہا۔ رستم نے اثبات میں سر ہلایا اور شانی کے ساتھ اوپر چڑھنا جاری رکھا۔ ایک موڑ مڑتے ہی وہ عقب کے نشیب میں دور تک دیکھنے کے قابل ہوگئے۔ یہ نظارہ ہرگز خوش کن نہیں تھا۔ نشیب میں چمکتی روشنیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کافی لوگ ان کے پیچھے آرہے ہیں۔ وہ پھیل کر بڑھ رہے تھے۔ کسی وقت ان کی دور افتادہ آوازیں ہوا پر تیر کر ان تک پہنچ جاتی تھیں۔ ان آوازوں میں طیش تھا اور آگ کی لپک تھی۔

یہ تکلیف دہ سفر جاری رہا۔ پیچھے آنے والے ایک بار پھر قریب آتے جارہے تھے۔ شانی نے کہا۔ ''رستم! مجھے لگتا ہے، ہم چوٹی پر پہنچنے والے ہیں۔'' رستم نے اثبات میں سر ہلایا۔ شانی بولی۔ ''اس چوٹی پر پہنچ کر شاید ہم وہ گاؤں دیکھ سکیں جہاں ناصر، جہانگیر اور دوسرے ساتھی ہیں۔''

''شاید۔'' رستم نے مختصر جواب دیا۔

''آپ نے کہا تھا کہ گاؤں سے سرحد زیادہ دور نہیں ہے... کیا پتا ہم سرحد پار کرہی جائیں۔'' شانی نے امید ظاہر کی۔

''اصل مسئلہ تو گاؤں تک پہنچنے کا ہے۔'' رستم نے کہا۔

اچانک رستم کا پاؤں پھسلا اور وہ لڑھکتا ہوا کئی میٹر نیچے چلا گیا۔ ''رستم... رستم!'' شانی چلّائی اور رستم کی طرف بڑھی۔ وہ اوندھے منہ گرا تھا۔ کلاشنکوف ابھی تک اس کے گلے میں تھی، تاہم کینوس کا تھیلا کندھے سے نکل کر دور جا گرا تھا۔ بیساکھی بھی دور تک پھسل گئی تھی۔ شانی نے پہلے بیساکھی پکڑی پھر رستم کی طرف لپکی۔ اس کا دل دہل گیا۔ رستم کے کئی زخموں سے خون رِسنے لگا تھا۔ ٹانگ سے لپٹی ہوئی پٹی خون سے تر ہوتی جارہی تھی۔ شاید پہلو کے کچھ ٹانکے بھی ٹوٹ گئے تھے۔ گرنے سے کلاشنکوف کا میگزین علیحدہ ہوگیا اور کچھ گولیاں بکھر گئیں۔

''رستم... رستم!'' شانی نے اسے کسی بچے کی طرح اپنی بانہوں میں سمیٹا اور اٹھنے میں مدد دی۔ وہ اٹھ تو بیٹھا... مگر اس کی حالت ابتر تھی۔ ٹانگ کے زخم سے باقاعدہ لہو ٹپکنے لگا تھا۔ شانی نے اضطرابی حالت میں ٹارچ جلانا چاہی مگر رستم نے اسے روک دیا۔ یہی وقت تھا جب پھر فائرنگ بھی ہونے لگی۔ دھماکوں سے قرب و جوار گونجے اور گولیاں سنسناتی ہوئی ان کے سروں پر سے گزرنے لگیں۔ اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ کوئی گولی کینوس بیگ میں ہی نہ جا لگے... ''شانی! ہمیں کسی آڑ میں ہونا ہوگا۔'' رستم نے تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔

وہ انتہائی برداشت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اٹھا اور شانی کے سہارے سے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ ہی فاصلے پر انہیں دو پتھروں کے درمیان ایک خلا سا نظر آیا۔ رستم اور شانی کسی نہ کسی طرح اس خلا تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ ایک قدرتی کھوہ تھی۔ پہاڑوں میں ایسی پناہ گاہیں عام ہوتی ہیں۔ اس کھوہ کے اندر ایک چھوٹی سی عمارت بنی ہوئی تھی۔ پتھر کی دیواریں اور لکڑی کے وزنی تختوں کی چھت۔ ماضی میں شاید یہاں کوئی چیک پوسٹ بنائی گئی تھی مگر اب یہ خالی پڑی تھی۔ ایک طرف کی دیوار بھی گری ہوئی تھی۔ سنگلاخ چھت کی کسی اندرونی آب جو کا پانی قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ رستم اور شانی اندر چلے گئے۔ ایک چوبی کھڑکی میں سے جنوب کے نشیب کو دور تک دیکھا جاسکتا تھا یہاں تک کہ پارہ چنار کی دور افتادہ روشنیاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔

تعاقب کرنے والے قریب آتے جارہے تھے۔ شانی اور رستم کے کانوں تک ان کی طیش بھری آوازیں پہنچنے لگیں۔ اس موقع پر رستم نے پھر کلاشنکوف سے چند فائر کیے۔ اس وارننگ دیتی ہوئی فائرنگ سے قریب آنے والوں کے قدم رک گئے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ انہیں یہ پتا بھی چل گیا کہ رستم اور شانی کہاں ہیں۔

یہ نازک ترین صورتِ حال تھی۔ شانی روئی اور پٹیوں کی مدد سے رستم کی ٹانگ سے بہتا خون روکنے کی کوشش کررہی تھی اور وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے لگا فائر کررہا تھا۔

''رستم! خون نہیں رک رہا۔'' شانی کراہی۔

''آپ چھوڑ دیں۔ خود ہی رک جائے گا۔'' وہ نحیف آواز میں بولا۔

''رستم! کیا ہم... خود کو ان کے حوالے کردیں؟''

''میں نے کہا ہے نا... میں وہی کروں گا... جو آپ کہیں گی۔''

کچھ دیر بعد وہ خود ہی بولی۔ ''لیکن یہ لوگ ہمیں چھوڑیں گے نہیں۔ شاید اسی جگہ ہمیں...'' وہ فقرہ مکمل نہ کرسکی۔

رستم نے چھ سات گولیوں کا ایک برسٹ چلایا۔ کسی کے چلّانے اور نشیب میں لڑھکنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ جواب میں چیک پوسٹ کی پتھریلی دیوار پر تابڑ توڑ گولیاں برسائی گئیں۔ ہر طرف چنگاریاں سی چھوٹتی محسوس ہوئیں۔

یہ خطرناک لمحے تھے۔ پیچھے آنے والے جوش میں آکر چیک پوسٹ پر چارج کرسکتے تھے۔ اس موقع پر رستم نے ایک دستی بم کی سیفٹی پن کھینچ کر اسے پوری طاقت سے ڈھلوان پر پھینک دیا... روشنی کے ساتھ ساعت شکن دھماکا ہوا اور جیسے چاروں طرف سراسیمگی پھیل گئی۔ رستم اور شانی کو اندازہ ہوا کہ گھیرا ڈالنے والے ہراساں ہوکر تھوڑے فاصلے پر چلے گئے ہیں۔ کلاشنکوف کے ساتھ ساتھ دستی بموں کی موجودگی یقیناً انہیں بہت محتاط رہنے پر مجبور کررہی تھی۔

''آپ کے پاس کتنی گولیاں ہیں رستم؟''

''ہم صبح تک انہیں روک سکتے ہیں۔''

''اس کے بعد؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں شانی۔''

شانی چند لمحے چپ رہی پھر اس نے فرش پر بیٹھے بیٹھے اپنا سر رستم کے کندھے سے ٹکا دیا۔ ''رستم! لگتا ہے ہم نہیں پہنچ

سکیں گے۔''

''شاید... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' وہ کچھ فاصلے پر دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ شانی نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا اور اسے اپنا دل بالکل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ نیچے ڈھلوان سے کافی آگے تاریک نشیب میں بہت سی مزید روشنیاں چمک رہی تھیں۔ یہ روشنیاں ان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

''یہ کیا ہے رستم؟''

''شاید گاڑیاں ہیں۔ مگر اتنی دور سے بس اندازہ ہی لگایا جاسکتا ہے۔''

''یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟'' وہ اشک بار آواز میں بولی۔ ''بس ہم دو کے لیے اتنے زیادہ لوگ؟''

''یہ ڈرے ہوئے لوگوں کی نشانی ہوتی ہے شانی۔''

نشیب میں رینگنے والی روشنیاں قریب آتی جارہی تھیں۔ پھر ان میں پولیس کاروں کی ریوالونگ بلیو لائٹس بھی دکھائی دینے لگیں۔ رستم اور شانی کے اردگرد فائرنگ رک گئی تھی۔ شاید فائرنگ کرنے والے کمک اور اعلیٰ افسران کی ہدایات کا انتظار کررہے تھے۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹا اسی طرح گزر گیا۔ گاہے بہ گاہے ہلکی فائرنگ کے سوا کوئی کارروائی نہیں ہوئی تاہم یہ بات تھی کہ مسلح افراد نے انہیں مکمل طور پر گھیرا ہوا تھا۔ خون کے مسلسل اخراج سے رستم کے لب ولہجے میں غیر معمولی نقاہت اتر آئی تھی۔ شانی جانتی تھی کہ وہ نیم جان ہے اور اس کے ساتھ کسی بھی وقت کچھ ہوسکتا ہے۔ شانی نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اس کے بازو کے ساتھ لگ کر اس کے جسم کا حصہ بنی ہوئی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر کھڑکی میں سے جھانکا اور کراہی۔

''رستم! وہ قریب آتے جارہے ہیں... وہ کافی زیادہ ہیں۔''

''میں دیکھ رہا ہوں شانی! ہم آخری دم تک لڑیں گے۔''

اچانک میگافون پر ایک گرج دار آواز ابھری۔ یہ لیویز کے کسی پڑھے لکھے افسر کی آواز تھی۔ اس نے رستم کا نام لے کر اسے ہتھیار پھینکنے کا حکم دیا۔ رستم نے جواب میں خاموشی اختیار کیے رکھی۔ اب یہ بات بالکل صاف ہوچکی تھی کہ رستم اور شانی کو شناخت کیا جاچکا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میگافون پر ایک اور آواز ابھری اور یہ وہی منحوس آواز تھی جسے وہ پہلے بھی بہت مرتبہ سن چکے تھے۔ یہ آواز پہچاننے میں انہیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ یہ ریاض کی آواز تھی۔ وہ قہرناک انداز میں گرجا۔ ''رستمے! ذلیل موت مرنے سے بہتر ہے کہ خود کو ہمارے حوالے کردے۔ یہ تیرے لیے آخری موقع ہے۔ ہاتھ اٹھا کر باہر نکل آ...''

شانی اور رستم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ [illegible] ان کی توقع سے زیادہ تیزی کے ساتھ یہاں پہنچ گیا تھا۔ پتا نہیں کہ وہ حالات کا اندازہ لگا کر پہلے سے [illegible] موجود تھا یا پھر کسی برق رفتار سواری پر آیا تھا۔

اگلے پانچ منٹ میں ریاض نے میگافون پر دو [illegible] رستم اور شانی کو مخاطب کیا۔ وہ اپنی ڈکشنری کے بدترین [illegible] بول رہا تھا۔ یہ الفاظ ایسے زہریلے تیروں کی طرح تھے جو [illegible] سے آرپار ہوجاتے تھے۔

رستم نے کلاشنکوف سے دو تین طویل برسٹ چلائے۔ قریب آنے والے مسلح افراد پھر فاصلے پر جاتے [illegible] ہوئے۔ یہ مزاحمت انہیں سمجھا رہی تھی کہ رستم سیال، [illegible] ہونے کے باوجود تر نوالہ نہیں ہے۔ وہ آسانی سے جان [illegible] ہارے گا۔

ایک بار پھر چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ مگر [illegible] جانتی تھی کہ اس خاموش تاریکی میں موت کے بے [illegible] ہرکارے موجود ہیں۔ اس نے ایک بار پھر اپنا سر رستم [illegible] شانے سے ٹکا دیا۔ رستم نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ [illegible] کی مدھم روشنی اب کھوہ کے اندر پہنچنے لگی تھی۔ سامنے کھوہ [illegible] چھت سے قطرہ قطرہ ٹپکنے والا پانی ایک ملائم سیاہ پتھر پر گر رہا تھا۔ یہ قطرہ دو چار دن سے نہیں گر رہا تھا، نہ ہی دو چار سالوں سے... یہ شاید دو چار صدیوں سے گر رہا تھا یا پھر ان گنت زمانوں سے۔ نیچے سیاہ پتھر میں ایک سوراخ نمودار ہوگیا تھا۔ رستم نے کھوئے کھوئے نحیف لہجے میں کہا۔ ''شانی! آپ [illegible] رہی ہیں... پتھر پر پانی بھی مسلسل گرتا رہے تو آرپار ہو [illegible] ہے... لیکن... کچھ لوگ سنگلاخ پتھروں سے بڑھ کر [illegible] ہوتے ہیں۔ ان پر ان گنت زمانوں کی محبت اور مہربانی بھی کوئی اثر نہیں چھوڑتی۔ یہ شخص جو ابھی اسپیکر پر اپنے منہ سے شعلے نکال رہا تھا، یہ بھی انہی لوگوں میں سے ہے۔''

شانی سمجھ گئی کہ رستم کا اشارہ ریاض کی طرف ہے۔ ر[illegible] بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''شانی! آپ کے سینے میں بڑا نرم اور محبت کرنے والا دل ہے۔ آپ ہر چیز میں اچھائی تلاش کرتی ہیں لیکن کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں سے آپ جیسے لوگ بھی اچھائی نہیں ڈھونڈ سکتے۔ مجھے پتا ہے شانی آپ ہر ہر موڑ پر ریاض پر احسان کرتی رہی ہیں۔ آپ نے اس کی فطرت کو بدلنے کی اپنی طرف سے ہر کوشش کی ہے۔ مجھے پتا ہے شانی! آپ نے ریاض کو بدلنے کی اچھی نیت سے ساتھ مجھ سے بھی بہت کچھ چھپایا ہے۔''

''آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟''

[illegible] آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں۔'' اس نے کہا [illegible] سے بولا۔ ''جب میں ریاض کے بھتیجے طفیل کو [illegible] تھا... اسے چھوڑنے سے پہلے ہی آپ [illegible] کے پاس واپس آچکی تھیں۔ مگر آپ نے مجھ [illegible] چھپایا۔ آپ نہیں چاہتی تھیں کہ طفیل قید رہے اور [illegible] رجتا ہوا بھا بھڑ اور اونچا ہوجائے۔''

[illegible] چپ رہی، وہ کہہ بھی کیا سکتی تھی۔

رستم نے اپنے شدید زخمی پہلو کو دباتے ہوئے کہا۔ ''اور شانی مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کی قریبی سہیلی سکینہ مر چکی ہے۔ اسے تکلیف دے کر مارنے والا یہی ریاض حرامی تھا۔ آپ نے یہ بات بھی مجھ سے چھپائی۔ صرف اس لیے کہ شاید اس طرح ریاض کے دل میں کسی طرح کی کوئی نرمی پیدا ہو جائے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں رستم!'' شانی گردن جھکائے جھکائے سسکی۔

''اور مجھے یہ بھی پتا ہے شانی کہ آپ نے ڈیفنس میں ریاض کی بیوی اور بچے کو بچانے کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا دی۔ آپ نے شدید خطرہ مول لیا اور زخمی بھی ہوئیں... آپ کی ہتھیلیوں سے ابھی تک خون رستا ہے... آپ نے ہر موڑ پر ریاض کو دعائیں دی ہیں شانی! اس کے کرتوتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ صرف اس لیے کہ شاید وہ بدل جائے... مجھ سے وہ، جیپ والا واقعہ بھی چھپا ہوا نہیں ہے...''

شانی اشک بار سوالیہ نظروں سے رستم کو دیکھنے لگی۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''جب یہ حرامزادہ آپ کو گوجرانوالہ سے وڈے ڈیرے کی طرف لارہا تھا اور تایا معصوم بھی ساتھ تھے۔ اس نے جیپ میں آپ کے کپڑے پھاڑ دیے تھے، سب کے سامنے...''

شانی چپ رہی... رستم کی معلومات پر اسے حیرانی ہورہی تھی۔ اس نے نہ جانے کون کون سی باتیں پیٹ میں ڈال رکھی تھیں۔ اس کی بے پناہ برداشت کا شانی کو اعتراف تھا۔ وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ''شانی! یہ دو چار واقعے نہیں، درجنوں ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے بہت سے موقعوں پر ریاض سے مہربانی اور درگزر کا سلوک کیا... لیکن میں نے کہا ہے نا، کچھ پتھر ایسے ہوتے ہیں جن پر کچھ بھی اثر نہیں کرتا۔ ان لوگوں کے تکبر کا علاج مہربانی اور محبت سے کیا ہی نہیں جاسکتا۔ ان کی بیماری کی ایک ہی دوا ہوتی ہے۔ اینٹ کے بدلے میں ان کے کھوپڑے پر پتھر مار کر ان کا بھیجا نکال دیا جائے۔''

''مگر رستم... پتھر مارنے سے بھی تو سارے مسئلے حل نہیں ہوتے...''

''مجھے معاف کرنا شانی! میں آپ کی بات کاٹ رہا ہوں۔ جس طرح پتھر مارنے سے سارے مسئلے حل نہیں ہوتے، اسی طرح محبت اور مہربانی سے بھی ہر مرض کا علاج نہیں ہوسکتا۔ ہاں شانی... میں سوچتا ہوں... دنیا میں اربوں کھربوں روپے کا اسلحہ کیوں بنایا جاتا ہے۔ صرف اس لیے کہ دماغوں والے لوگ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ بندے کی خصلت میں اچھائی کم اور برائی زیادہ ہے... اور یہ برائی صرف اسلحے کے زور پر ہی کنٹرول میں رہتی ہے۔''

شانی نے چونک کر رستم کا زخم زخم چہرہ دیکھا۔ رستم خود کو ان پڑھ اور گنوار کہتا تھا۔ مگر اکثر وہ اپنی ترنگ میں ایسی بات کہہ جاتا تھا جو کسی فلسفی کے قول سے کم نہیں ہوتی تھی۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں رستم!'' شانی بھی کھوئی کھوئی آواز میں بولی۔ ''مگر داناؤں نے یہ بھی تو کہا ہے کہ شہر طاقت سے فتح ہوسکتے ہیں لیکن دلوں کو صرف محبت سے جیتا جاسکتا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے رستم... کہ دلوں کو جیتنے کے لیے بہت سا وقت چاہیے ہوتا ہے جو شاید ہمارے پاس نہیں ہے... اور بہت ساری برداشت کی ضرورت ہوتی ہے اور شاید وہ بھی ہمارے پاس نہیں تھی... کم از کم میرے پاس تو نہیں تھی۔''

''اگر آپ کے پاس برداشت نہیں تو پھر کس کے پاس ہوگی؟'' رستم نے عجیب آہنگ میں کہا۔

اچانک ایک برسٹ چلا۔ پتھریلی دیوار لرز اٹھی اور پتھر کی بہت سی کرچیاں ان کے اردگرد بکھر گئیں۔ رستم نے بھی جوابی طور پر دو سنگل شاٹ چلائے۔ چونکہ وہ بلندی پر تھا اس لیے اس کی فائرنگ خطرناک ثابت ہوتی تھی۔

موبائل فون اب تک رستم کی جیب میں تھا۔ شانی نے اسے نکال کر دیکھا۔ وہ مردہ ہوچکا تھا اور اگر اس کی بیٹری موجود بھی ہوتی تو یہاں سگنلز کا ملنا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ سوچنے لگی، ان کے ساتھی ان سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں اور نہ ہی سرحد زیادہ دور ہے۔ مگر یہ تھوڑا سا فاصلہ بھی اب شاید صدیوں پر محیط تھا... ایک بار پھر اس کا دھیان ڈپٹی ریاض کی طرف چلا گیا۔ رستم کے الفاظ شانی کے کانوں میں گونجنے لگے۔ یہ وہ پتھر ہے جس پر کچھ بھی اثر نہیں کرتا... اثر کرہی نہیں سکتا۔ وہ سوچنے لگی۔ 'کیا واقعی کچھ لوگ بدترین مٹی سے بنے ہوتے ہیں۔' رستم کی یہ بات حقیقت تھی کہ شانی نے ہر ہر موڑ پر ریاض کی بے پناہ نفرتوں کا جواب بے پناہ برداشت اور صلح جوئی سے دینے کی کوشش کی تھی اور اپنے دل میں یہ امید پالی تھی کہ شاید یہ شخص کبھی اتنا برا نہ رہے، جتنا ہے... بلکہ شانی

کے دل کے کسی گوشے میں اب سے چند گھنٹے پہلے تک بھی یہ آس موجود تھی۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا کھوہ سے فقط چالیس پچاس میٹر کی دوری پر ہوا تھا۔ ''اوہ خدایا! مجھے لگتا ہے یہ بارودی سرنگ ہے۔'' رستم نے کہا۔

''مگر بارودی سرنگ کہاں سے آئی؟''

''کیا کہا جاسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے، یہ کسی نے یہاں پہلے سے دبا رکھی ہو۔'' رستم کراہتے ہوئے بولا۔

سرنگ پھٹنے کے کچھ ہی دیر بعد مسلح افراد کا وہ گھیرا پھیلتا ہوا محسوس ہوا جو بہ تدریج تنگ ہوتا جارہا تھا۔ شانی نے واضح طور پر محسوس کیا کہ وہ آوازیں جو پہلے قریب سے آرہی تھیں، اب فاصلے پر چلی گئی ہیں۔ اس واقعے کو کیا کہا جاسکتا تھا؟ شاید قدرت کی طرف سے ان کو تھوڑی سی مزید مہلت دی گئی تھی... لیکن کب تک... آخر کب تک؟ شانی نے بے حد دکھ سے سوچا۔

''رستم! اس کھوہ میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں؟ ہو سکتا ہے کوئی راستہ نکل آئے۔''

شانی اور رستم میں اس موضوع پر چند فقروں کا تبادلہ ہوا اور پھر وہ بڑی خاموشی سے آگے بڑھنے کے لیے تیار ہوگئے۔ پوسٹ چھوڑنے سے پہلے رستم نے چند آخری فائر کیے اور شانی کے ساتھ کھوہ میں آگے بڑھنے لگا۔ اسے چلنے میں سخت دشواری پیش آرہی تھی۔ ہر تیس چالیس قدم پر شانی اسے کہتی۔ ''رک جائیں۔ ذرا سانس لیں۔'' وہ کسی معمول کی طرح رک جاتا اور شانی کے سہارے بیٹھ جاتا۔ ان کے دل میں یہ آس موجود تھی کہ شاید یہ کھوہ انہیں کسی طرف سے راستہ دے دے۔ مگر یہ آس تادیر قائم نہیں رہی۔ قریباً نصف فرلانگ چلنے کے بعد کھوہ بند ہوگئی۔ کھوہ کے آخری سرے پر بھی ایک ویسی ہی شکستہ پوسٹ موجود تھی جیسی وہ چھوڑ کر آئے تھے۔ دیواروں سے جالے لگے ہوئے تھے۔ دو چار چمگادڑوں کی موجودگی بھی ثابت ہوئی۔ خبر نہیں، یہ کیسی جگہیں تھیں اور کن لوگوں نے کس مقصد کے لیے استعمال کی تھیں۔ ٹارچ کی روشنی ایک دیوار پر پڑی تو یہاں روغن سے چند نعرے لکھے نظر آئے۔ یہ روسی فوجیوں کے خلاف تھے۔

رستم کے سارے ہی زخموں کے منہ جیسے کھل گئے تھے۔ اس کی نقاہت بڑھتی جارہی تھی۔ شانی نے ایک بار پھر اپنی چادر پھاڑی۔ ''یہ کیا کررہی ہیں؟'' وہ کمزور آواز میں کراہا۔

''آپ کی ٹانگ پر اور پٹی باندھ دوں۔''

''یہ بھی دو منٹ میں بھیگ جائے گی۔'' رستم نے اسے روک دیا۔ اس کی آواز اٹک رہی تھی۔

''رستم! مجھ سے یہ دیکھا نہیں جاتا... کیا... کیا ایسا ہوسکتا کہ آپ مجھے اپنے ہاتھ سے ختم کردیں؟''

''اور یہی بات میں کہوں تو؟''

وہ اس سے لپٹ گئی... اور ہچکیوں سے رونے لگی۔ دہانے پر پھر زوردار فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔ یقیناً ابھی لوگ دہانے سے دور تھے اور انہیں غالباً دو چار گھنٹوں تک ہی رہنا تھا۔ دستی بموں کے خوف کے ساتھ اب نادیدہ مائن کا خوف بھی شامل ہوگیا تھا۔

رستم نے اپنے خون آلود ہونٹوں سے کئی بار شانی کا چہرہ چوما اور رک رک کر بولا۔ ''شانی... آپ اب بھی باہر جاسکتی ہیں۔''

''آپ کے ساتھ مرنا میرے لیے ہزار درجے آسان ہے۔'' اس کا لہجہ پہاڑوں کی طرح اٹل تھا۔

''لیکن شانی! آپ کے جسم میں ایک اور زندگی بھی تو ہے۔''

''وہ ایسے مرحلے میں کہاں ہے کہ اسے زندگی کہا جاسکے... اور وہ جو کچھ بھی ہے، مجھے آپ کے بغیر قبول نہیں۔ میں آپ کو چھوڑنے کا گناہ نہیں کرسکتی رستم... پلیز! اب اس بارے میں آپ نے کچھ نہیں کہنا۔'' اس نے اتنے کرب سے کہا کہ رستم کے ہونٹ سل گئے۔

دور دہانے کی طرف سے اب بوگیر کتوں کا مدھم شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ یقیناً گھیرا ڈالنے والوں کی نفری اور طاقت بڑھتی جارہی تھی۔

''رستم! میں آپ کی ٹانگ کا کیا کروں؟ مجھے لگتا ہے کہ آپ کا سارا خون اس زخم کے رستے نکل جائے گا۔'' وہ دل دوز آواز میں بولی۔

''اس خون نے اب ویسے بھی تو نکل ہی جانا ہے شانی۔''

''ایسا مت کہیں آپ۔'' اس نے رستم کا خونچکاں شانہ چوما۔

''حقیقت کو مان لینا چاہیے شانی!'' اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آرہی تھی۔

شانی نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا غنودگی بھرا ذہن بند آنکھوں کے ساتھ ایک تصوراتی منظر دیکھنے لگا۔ اسے لگا جیسے یہاں سے کچھ فاصلے پر ان پہاڑوں کے پار ایک گھر میں ناصر، جہانگیر، زری، نذیر اور پہلوان موجود ہیں۔ وہ رستم اور شانی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ ان راہ دیکھنے والوں میں اس کا منا بھی شامل ہے۔ پہلوان اسے رنگ والی سے یہاں لے آ

ہے۔ وہ اپنی توتلی زبان میں پہلوان سے پوچھ رہا ہے۔ ''انکل! شانی تائی جلدی آجائیں گی نا؟''

شانی نے تصور ہی تصور میں اس کا ماتھا چوما اور دل ہی دل میں بولی۔ ''موت اور زندگی کے درمیان ہوں میرے منے۔ کچھ کہہ نہیں سکتی... نہ آسکی تو معاف کر دینا۔''

رستم کے پاس اب آخری دستی بم تھا۔ یہ شاید اس نے کسی خاص وقت کے لیے سنبھال رکھا تھا۔ گولیوں کی تعداد بھی بہت تھوڑی رہ گئی تھی۔ چوبیس گولیوں والا ایک لوڈڈ میگزین تھا۔ اس کے علاوہ دس پندرہ گولیاں تھیلے میں تھیں۔ رستم ان کو بڑی کفایت سے استعمال کر رہا تھا۔ پسٹل میں بھی صرف دو یا تین گولیاں باقی تھیں۔ جس جگہ رستم بیٹھا تھا، وہاں کافی خون جمع ہو گیا تھا۔ یہ رستم ہی کا خون تھا اور اس کے جسم کے مختلف زخموں سے نکلا تھا۔

اچانک شانی نے دیکھا کہ رستم اپنی کلاشنکوف کو زور زور سے جھٹکے دے رہا ہے۔ پھر اس نے کلاشنکوف کے بیرل کو دو تین بار زمین پر مارا۔ ''کیا ہوا رستم؟''

''یہ کام نہیں کر رہی... لگتا ہے... یہ بھی ساتھ چھوڑ گئی ہے۔'' وہ بڑے کرب سے بولا۔

اس نے بیرل کا رخ چھت کی طرف کر کے تین چار بار ٹرائیگر دبایا مگر ٹرائیگر بلٹ کو ہیمر کرنے کے بجائے آزادانہ حرکت کر رہا تھا۔ رستم نے میگزین ہٹا کر دو تین بار دوبارہ اٹیچ کیا۔ مختلف کل پرزوں کو حرکت دی مگر کلاشنکوف خاموش ہو چکی تھی۔ جب رستم کھوہ کی طرف آتے ہوئے بلندی سے لڑکھڑایا تھا تو کلاشنکوف بری طرح پتھروں سے ٹکرائی تھی۔ شاید اسی وقت اس میں نقص پیدا ہوا تھا جو اب نمایاں ہو کر ظاہر ہو گیا تھا۔

رستم کے لیے یہ ایک اور شدید دھچکا تھا۔ وہ ایک دم گم صم سا ہو گیا۔ وہ گولیاں جواب تک وہ بچا بچا کر رکھ رہا تھا، ایک دم بے کار ہو گئی تھیں۔ ان کی حقیقت کھوہ کے کنکروں سے زیادہ نہیں رہی تھی۔ رستم کچھ دیر مزید کلاشنکوف سے الجھتا رہا پھر اس نے عجیب بے پروائی سے اسے ایک طرف رکھ دیا... اور اب اس کے پاس پسٹل تھا جس میں فقط تین گولیاں تھیں اور ایک دستی بم تھا... اور یہ بم بھی ایسا ہتھیار نہیں تھا جو موت کے بڑھتے ہوئے ہرکاروں کو تادیر ان سے دور رکھ سکتا... اور موت کے ہرکارے نظر نہیں آرہے تھے لیکن موجود تھے۔ یہاں سے تقریباً نصف فرلانگ کی دوری پر دہانے سے آگے پہاڑیوں میں، جھاڑیوں میں اور پتھروں کے پیچھے... ہر جگہ وہ تاریکی کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ ان کی سرچ لائٹس، جاسوس کتے اور آتشیں ہتھیار اس جگہ کو مکمل طور پر گھیرے ہوئے تھے۔ ڈپٹی ریاض شاید ایک بار پھر میگافون پر کچھ بول رہا تھا کی بہت مدھم آواز دہانے تک تو یقیناً پہنچ رہی تھی مگر شانی کی اس تنگ پناہ گاہ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ اناؤنسمنٹ سے پتا چلتا تھا کہ وہ رستم اور شانی کو بھی دہانے والی پناہ گاہ میں ہی سمجھ رہا ہے۔

خون کی کمی کے سبب رستم کا گلا خشک ہونے لگا۔ اسے پانی کی شدید طلب تھی مگر پانی یہاں نہیں تھا۔ شانی بھی پیاس محسوس کر رہی تھی تاہم رستم کی تکلیفوں نے اور حالات کی سنگینی نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ وہ ایک بند کھوہ کی تنگ پناہ گاہ میں تھے اور اپنی طرف رینگتی ہوئی موت کی پرچھائیاں دیکھ رہے تھے۔

''رستم! مجھ سے بہت ناراض ہیں نا آپ؟'' وہ سوئی سوئی آواز میں بولی۔ ''میں نے آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری نہیں ہونے دی۔ ریاض آپ سے بچ کر نکل گیا۔''

''بے شک، یہ خواہش پوری نہیں ہوئی مگر یہ اطمینان تو ہے کہ آپ میرے ساتھ ہیں۔ آخر وقت تک میرا ہاتھ آپ کے ہاتھ میں رہے گا۔''

''ہاتھ میں ہاتھ ہی نہیں رہے گا۔ اگر مرنا پڑا تو جان بھی جان کے ساتھ جائے گی۔''

''ہم ہار گئے ہیں نا شانی؟''

''نہیں رستم! ہماری ہار ہزار جیتوں پر بھاری ہے۔ ہم لڑنے والوں کے خلاف آخری وقت تک لڑے ہیں اور ہمیں یہ فخر ہے کہ ہم نے اپنے بدترین دشمن کو بھی زیر کرنے کے بعد معاف کیا ہے۔ ریاض بچ گیا رستم! مگر ہم نے اپنے ظرف سے اسے ایسے زخم لگائے ہیں جن کی جلن اسے زندگی بھر... بے قرار رکھے گی۔''

وہ کتنی ہی دیر ایک دوسرے سے لگے خاموش بیٹھے رہے۔ بھنبھناہٹ جیسی ان آوازوں کو سنتے رہے جو ہوا کی لہروں پر تیر کر ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ یہ دہانے کا گھیراؤ کرنے والوں کی آوازیں تھیں۔ ان آوازوں میں بلا کی وحشت اور غضب ناکی تھی۔

شانی نے رستم کے ہاتھ میں پکڑے پسٹل پر اپنا زخمی ہاتھ پھیرا اور بولی۔ ''رستم! وہ پتا نہیں ہمارے ساتھ کیا کریں گے۔ ان کے ہاتھ آنے کے بجائے مرنا آسان لگ رہا ہے۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں شانی! آپ اس بات کو ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں۔ ابھی پستول میں تین گولیاں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک گولی میری مشکل آسان کر سکتی ہے۔ شانی! آپ کے ہاتھ کی چلی ہوئی گولی مجھے کوئی تکلیف نہیں دے گی۔ بس آپ میرا سر اپنی گود میں رکھ لیں۔ پستول کی نال کو یہاں رکھیں۔ میرے کان سے ذرا اوپر اور ٹریگر دبا دیں۔ مجھے پورا بھروسا ہے شانی! مجھے بالکل تکلیف نہیں ہوگی۔ میں حرام موت مرنے سے بھی بچ جاؤں گا۔'' وہ بولنے کے ساتھ ساتھ کراہ رہا تھا۔

''میں آپ کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔''

''تو کیا آپ مجھے اذیت سے مرتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہیں... وہ مجھے یہاں... زندہ پکڑنا چاہیں گے... اور اس کے بعد وہ میرے ساتھ جو کچھ کریں گے، وہ آپ کے تصور میں نہیں آسکتا۔''

''لیکن... لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے رستم۔ ابھی زندگی کا امکان باقی ہے۔ ابھی ہم ایسا نہیں کر سکتے۔''

''اب یہ خود کو دھوکا دینے والی بات ہے شانی! جو کچھ ہونے والا ہے، وہ آپ بھی دیکھ رہی ہیں۔''

''آپ ہی تو کہتے تھے، موت سے پہلے مرنا گناہ ہے۔'' وہ سسکی۔

''تو پھر وعدہ کریں شانی! جب وقت آجائے گا اور آپ دیکھ لیں گی کہ وہ مجھے زندہ پکڑنا چاہتے ہیں تو آپ مجھے اپنے ہاتھ سے گولی مار دیں گی۔''

''جو وقت ہم دیکھنا نہیں چاہتے، اس کے بارے میں کیوں سوچیں۔ ہم ایسا نہیں کریں گے۔'' وہ اپنا رخسار رستم کے شانے سے رگڑتے ہوئے بولی۔

وہ کہہ تو رہی تھی لیکن ان دونوں کے ذہن جیسے بہ تدریج موت کو قبول کرتے جا رہے تھے... اور ایک دوسرے کی قربت انہیں مرنے کا حوصلہ بخش رہی تھی۔ موت جواب اٹل تھی... جس سے مفر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

رستم کی نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ شانی نے اس کا سر گود میں رکھ لیا اور اس کی زخمی پیشانی پر اپنے ہونٹوں کو مستقل ٹھہرا دیا۔

اچانک ایک لرزہ خیز آواز نے انہیں سرتاپا دہلا دیا۔ شانی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ وہ ڈپٹی ریاض کی قہرناک آواز اتنی جلدی سنے گی اور اتنی قریب سے۔ یہ آواز بہ مشکل بیس پچیس فٹ کے فاصلے سے ابھری تھی۔ اس کے ساتھ ہی ٹارچ کی نہایت تیز روشنی نے ان کی آنکھیں چندھیا دیں۔ یہ دراصل سرچ فوکس لائٹ تھی۔ یہ اپنے دائرے میں آنے والی ہر شے کو روشن تر کر رہی تھی۔ وہ دونوں اپنی جگہ پتھروں کی طرح ساکت بیٹھے رہ گئے۔ ڈپٹی ریاض کے پیچھے دو اور سائے بھی تھے۔ ان میں سے ایک دراز قد تھا۔ یہ دونوں افراد بھی مسلح تھے۔ ڈپٹی ریاض کے اپنے ہاتھ میں جدید خودکار رائفل تھی۔ ڈپٹی کی آنکھیں آتش فشاں کے دو دہانوں کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ عہدِ قدیم کے کسی منگول حملہ آور کی طرح غیر متوقع طور پر اچانک یلغار کر کے ان کے سر پر آن کھڑا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دفعتاً اس سنگلاخ زمین سے اگ آیا ہے۔

رستم کا ہاتھ پستول کی طرف بڑھا۔ ڈپٹی ریاض گرجا۔ ''خبردار... ہاتھ پیچھے رکھ۔'' رستم رک گیا۔

ریاض کا قبائلی ساتھی جو درمیانے قد کا تھا، آگے بڑھا اور اس نے پستول کو رستم کے قریب سے اٹھا لیا۔ کلاشنکوف پہلے ہی دور پڑی تھی۔ ریاض دانت نکوس کر پھنکارا۔ ''لگتا ہے، تیری یہ ماں خالی ہو چکی ہے۔ اسی لیے دور پڑی ہے۔'' اس نے قبائلی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہزارہ خان! اٹھا لے اس کلاشنکوفری کو بھی۔'' ہزارہ خان نے حکم کی تعمیل کی۔ دستی بم والا تھیلا رستم کے عقب میں تھا مگر اس پر بھی ریاض کی عقابی نظر پڑ گئی۔ ''اس تھیلے کو بھی اٹھا لو جس میں یہ اپنی بہن کا جہیز ڈال کر پھر رہا ہے۔''

قبائلی ہزارہ خان بندوق تان کر آگے بڑھا۔ رستم مزاحمت کے قابل نہیں تھا۔ وہ دیکھتا رہا اور ہزارہ خان کینوس کا تھیلا بھی اٹھا کر لے گیا۔ ہزارہ خان کے ہاتھ میں بھی سرچ فوکس لائٹ تھی۔ اس کی روشنی ریاض پر پڑی۔ شانی نے دیکھا کہ ریاض کے ورم زدہ چہرے پر پٹیاں تھیں۔ اس کی ایک کلائی پر سفید پلاستر چڑھا ہوا تھا۔ وہ خوں خوار لہجے میں دہاڑا۔ ''کھڑے ہو جاؤ دونوں بہن بھائی۔''

دونوں بیٹھے رہے۔ ڈپٹی نے دونوں کو غلیظ ترین گالیاں دیں اور شانی کی پسلیوں میں رائفل کی نال گھسیڑتے ہوئے اسے اٹھنے کا حکم دیا۔ شانی لڑکھڑاتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ لیکن رستم میں اتنی سکت بھی باقی نہیں بچی تھی۔ اس کی سانس رک رہی تھی... اور آنکھیں جیسے خود بہ خود بند ہو رہی تھیں۔ ریاض کے اشارے پر قبائلی ہزارہ خان نے آگے بڑھ کر رستم پر ٹھوکروں کی بارش کر دی۔ نیم جان رستم زیادہ مزاحمت نہیں کر سکا۔ ہزارہ خان نے رستم کو اس کے لمبے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا۔ رستم کا زیریں لباس خون سے نچڑا ہوا تھا۔ کٹی ہوئی ٹانگ والا خون آلود پائنچا حسرت آمیز انداز میں جھول رہا تھا۔ بیساکھی پاس ہی پڑی تھی مگر ہزارہ خان نے رستم کو بیساکھی دینے کی زحمت نہیں کی۔

ریاض کے حکم پر اس نے بیساکھی کو دیوار سے ٹکرا کر توڑا اور دور پھینک دیا۔

نارچوں کی روشنی میں شانی سر جھکائے کھڑی تھی۔ رستم بھی کھڑا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے سوچنے سمجھنے اور بولنے کی ذمے داری شانی پر ڈال دی ہے۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہا تھا۔ ''شانی! یہی شخص تھا نا، چار دن پہلے جس کی موت کا رستہ آپ نے روکا تھا۔ لیکن کچھ بھی ہے... میرا عشق، میرا ایمان ہے اور میرے عشق میں اختلاف اور انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ جو آپ کا رستہ... وہی میرا رستہ... جو آپ کی چاہ وہی میری۔'' شانی نے درد بھری نظروں سے رستم کو دیکھا۔

ریاض سرسراتی آواز میں بولا۔ ''کیا دیکھ رہی ہے بی بی جان! تیرے اس منہ بولے خصم میں اب کوئی تڑشڑ نہیں ہے۔ اس کے سامنے تیرے ٹوٹے بھی کر دوں تو یہ اب سلطان راہی نہیں بن سکتا۔ ردے میں سے بارہ آنے مُردار ہو چکا ہے یہ حرامزادہ۔''

اور ریاض شاید غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ رستم نیم جان تھا۔ سخت سے سخت انسان کی برداشت کی بھی آخر ایک حد ہوتی ہے۔ اور رستم پر یہ حد آ چکی تھی۔

ریاض نے اے کے 56 رائفل سیدھی کی۔ ''دل تو نہیں چاہتا چن ملکھنی... کہ تم دونوں کو اتنی آسان موت دوں... پر میں ایک غریب مسکین پُلسیا ہوں۔ تم دونوں حرامزادوں کے کلے بڑے پکے ہیں۔ کیا پتا کل کلاں پھر چھوٹ جاؤ اور میرے سینے پر چڑھ کر دھمالیں ڈالنے لگو۔ اس لیے تم دونوں کی عاشقی معشوقی کا دی اینڈ اسی جگہ کر دینا بہتر ہے۔'' پھر وہ ہزارہ خان سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''کیوں بھئی ہزارہ خان! کر دوں نادی اینڈ... بجا دوں ناقوی ترانہ؟''

''بالکل ریاض صیب! اب دیر کس بات کا ہے۔ مارو فائر اور لمبا کر دو کنجری کو اور اس کے کنجر یار کو۔ اور بہتر ہے کہ ان کے پیٹ میں گولیاں مارو، دس پندرہ منٹ تڑپ پھڑک تو دکھائیں گے۔''

ریاض پھنکارا۔ ''کیا خیال ہے ہیر سیال! پہلے اپنے ڈِھڈ میں تو گولی کھائے گی یا تیرا یہ بہن خور یار؟''

''ریاض! تو نے جو بھی کرنا ہے جلدی کر دے۔'' شانی سسکی۔ ''اور اچھا ہے کہ پہلے مجھے مار دے۔''

''ہائے اوئے محبتاں ... قربان جانواں اس بھونڈی عاشقی کے۔'' ریاض نے زہر اگلا اور رائفل کی گولی اس طرح چلائی کہ رستم اور شانی کے درمیان سے گزر کر دیوار میں لگی۔

وہ دونوں محفوظ اور ساکت کھڑے رہے۔ ریاض ایک دم طیش سے بے قابو ہو کر رستم پر پل پڑا۔ وہ رائفل کے کندے سے رستم کو اندھا دھند مارنے لگا۔ نیم جان رستم نے مزاحمت کی یہ مزاحمت چڑھے ہوئے دریا میں تنکے کی طرح بہہ گئی۔ مزید زخمی ہو کر گر گیا۔ شانی تڑپ کر رستم اور ریاض کے درمیان آ گئی۔ ریاض شانی کو دھکیلتا ہوا ایک بار پھر دور کھڑا ہوا۔ وہ ایک دم آتش فشاں ہو گیا تھا۔ وہ خوفناک آواز میں گرجا۔ ''کھڑے ہو جاؤ... کھڑے ہو جاؤ دونوں۔''

کھڑی ہو گئی مگر رستم دوبارہ نہیں اٹھ سکا۔

وہ وہیں خاک و خون میں لتھڑا پڑا رہا۔ اسے زمین بوس دیکھ کر شانی بھی بیٹھ گئی۔ اس نے رستم کو بانہوں میں بھر لیا۔

ریاض چنگھاڑا۔ ''حرامزادی! کیا سمجھتی تھی تو؟ میں تیرے نیک پروینی اور تیری میٹھی چھری سے حلال ہو جاؤں گا؟ ففے کٹنی ماں کی ففے کٹنی دھی ہے۔ تیری عاجزی مسکینی، تیری لولو پوپو باتیں، یہ سب کچھ گندا ناٹک ہے۔ تیری جیسی گندی نالی کی کیڑیاں اونچی کرسیوں پر چڑھنے کے لیے ایسے مومن مولویانیاں بنتی ہیں۔ یہ کوئی نئی سائنس ایجاد نہیں کی تو نے، یہ بڑا پرانا ٹوٹا ٹوٹکا ہے اور... اور میں نے کہا تھا نا، میں تجھ جیسی کچی جادوگرنیوں کو اپنے پیشاب کی دھار میں بہا دیتا ہوں۔ کہا تھا نا میں نے؟''

شانی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ آنسو بھی ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ اس نے اے کے 56 رائفل کی نال شانی کی طرف سیدھی کی اور چنگھاڑا۔ ''مرنے سے پہلے اپنی زبان سے اقرار کر کہ تو ففے کٹنی ہے... بہروپن ہے۔ تیری نظر اے این اے کی کرسی پر اور اس سے بھی آگے تھی۔ تو اس ڈاکو کے ساتھ بغیر نکاح کے سوتی تھی۔ تیرے پیٹ میں اس کے گناہ کی نشانی ہے۔ اقرار کر اپنے منہ سے... نہیں تو تجھے زندگی اور موت کے درمیان لٹکا دوں گا۔ اگر نہ لٹکاؤں تو اپنے باپ کا تخم نہیں ہوں۔ اقرار کر...''

شانی بس سسکتی رہی۔ ریاض جیسے دیوانگی کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا لہجہ ہذیانی تھا اور آنکھوں سے چنگاریاں چھوٹ رہی تھیں۔ اس نے جیبیں ٹٹول کر ایک فل اسکیپ سادہ کاغذ نکالا۔ یہ کاغذ اس نے شانی کی طرف پھینکا اور فاؤنٹین پین شانی کے منہ پر دے مارا۔ ''پکڑ یہ پین... پکڑ'' وہ گرجا۔

شانی نے پین بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ''لکھ اس کاغذ پر جو باتیں میں نے تجھ سے کہی ہیں۔ لکھ... نہیں تو تیرے اس یار کو نیچے سے کاٹ دوں گا اور تجھے اوپر سے برابر کر دوں گا۔

''حرامزادی! تاکہ سندر رہے تیرے اوپر۔''

شانی سسکی۔ ''میں نہیں لکھ سکتی۔''

''کیوں؟''

شانی نے اشک بار آنکھیں اٹھا کر ریاض کو دیکھا اور بولی۔ ''میری انگلیاں زخمی ہیں۔''

ریاض کو جیسے جھٹکا سا لگا۔ یقیناً اسے یاد آیا ہوگا کہ یہ انگلیاں کیسے زخمی ہوئی تھیں اور یہ بھی یاد آیا ہوگا کہ کیوں ہوئی تھیں۔ مگر وہ غیظ و غضب کا چڑھا ہوا دریا تھا۔ چھوٹی موٹی رکاوٹیں اس کا رستہ کہاں روک سکتی تھیں۔ وہ اسی آتش فشاں لہجے میں بولا۔ ''کسی کتے کے بی کا کوئی احسان نہیں ہے مجھ پر۔ سن رہی ہے تو، کوئی احسان نہیں ہے۔ میں نے انار پھینکے ہیں بہت سے احسان۔ وہاں تیری رنگ والی حویلی میں تیرا وہ ٹُکر کی بڈھا معصوم علی زندہ ہے اور تیری وہ بدکار پھوپھی بھی اپنے حصے کی دودھ جلیبیاں کھا رہی ہے۔ میں نے تیرا کافی سارا احسان برابر کر دیا ہے۔ صرف ایک جنازہ نکالا ہے۔ دو جنازے تجھے معاف کیے ہیں۔ چل لکھ... چل لکھ... نہیں تو پہلی گولی تیرے اس ہاتھ پر ہی ماروں گا۔''

شانی نے کوشش کی مگر انگلیوں سے خون رسنے لگا۔ ''مجھ سے نہیں لکھا جاتا۔'' وہ بے بسی کی انتہا کو چھو کر بولی۔

اس نے شانی کو بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا اور للکارا۔ ''اچھا، اپنے منہ سے بول... بول جو میں نے کہا تھا۔ بول تو ففے کٹنی ہے، بہروپن ہے۔ جادوٹونے کرتی ہے۔ بول میں کہتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں ہذیان تھا۔

رستم کے جسم میں جنبش جاگی مگر وہ گوشت پوست کا انسان تھا۔ ناتوانی کی حد سے گزر چکا تھا۔ اب وہ دل و جان سے چاہتا بھی تو قابلِ ذکر مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔

ریاض کے بے پناہ جبر سے مجبور ہو کر شانی ریاض کے پیچھے پیچھے بولنے لگی۔

بول۔ ''میں ففے کٹنی ہوں۔''

''میں ففے کٹنی ہوں۔''

''بول میں بہروپن ہوں۔''

''میں بہروپن ہوں۔''

''میں نے سب کو دھوکا دیا۔''

''ہاں، میں نے سب کو دھوکا دیا۔''

''میں نے اپنے لوگوں کو دھوکا دیا۔''

''ہاں، میں نے دیا۔''

''پورا فقرہ بول حرامزادی! میں نے اپنے لوگوں کو دھوکا دیا۔ میں نے ان کا پیسا کھایا۔''

''میں نے اپنے لوگوں کو دھوکا دیا۔ میں نے ان کا پیسا کھایا۔''

''میری نظر ایم این اے کی کرسی پر تھی۔''

''میری نظر کرسی پر تھی۔''

''میں اپنے لالچ اور حرص کے لیے اپنے لوگوں سے معافی مانگتی ہوں۔''

''میں اپنے لالچ اور حرص کے لیے اپنے لوگوں سے معافی مانگتی ہوں... ہاں، میں معافی مانگتی ہوں۔ مجھے سب معاف کر دیں۔ میں نے جن کو دھوکا دیا اور جن کو دھوکے دینے کے ارادے رکھتی تھی۔ میں نے جن کو لوٹا اور جن کو لوٹنے کے ارادے رکھتی تھی۔ مجھے سب معاف کر دیں۔ اور ریاض! تم بھی معاف کر دو۔'' وہ روتی گئی اور بولتی چلی گئی۔ ''میں ہاتھ جوڑ کر سب سے معافی مانگتی ہوں اور تم سے بھی۔ بس، اب اتنا احسان مجھ پر کرو۔ مجھے موت دے دو... مجھے جلدی سے فارغ کر دو۔'' اس کا سر جھک گیا۔ بالوں نے بکھر کر اس کا چہرہ چھپا لیا۔ ہزارہ خان کے ہاتھوں میں چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا جو اس نے بند کر دیا۔

ریاض کی آنکھیں بدستور شعلے اگل رہی تھیں۔ وہ دو تین قدم پیچھے ہٹا۔ اس نے رائفل شانی اور رستم کی طرف سیدھی کی۔ سیفٹی کیچ ہٹایا اور انگلی ٹرائیگر پر رکھ دی۔ اس کی انگلی کی ایک حرکت رنگ والی کی چھوٹی چودھرانی اور وسطی پنجاب کے ڈکیت رستم سیال کو عدم آباد روانہ کر سکتی تھی۔ انگلی ٹرائیگر پر تھی اور ٹرائیگر منتظر تھا۔ اور ٹرائیگر سے آگے رائفل کا بیرل تھا... اور بیرل سے آگے دو لٹے پٹے جسم تھے... اور انگلی ٹرائیگر پر حرکت نہیں کر رہی تھی۔ انگلی کیوں حرکت نہیں کر رہی تھی؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ یہ صدیوں کی بساط پر فیصلے کا لمحہ تھا... اور روزِ ازل سے ایسے حیران کن لمحے آتے ہی رہتے ہیں۔ جب وقت کے طوفانوں میں قلم اور برداشت ٹکراتے ہیں۔ جفا اور وفا میں رن پڑتا ہے، خنجر اور گردن کا تصادم ٹھہرتا ہے تو پھر ایسی ساعتیں آتی ہیں۔ ان ساعتوں میں کچھ ہو جاتا ہے۔ شیشے کی ضرب سے پتھر ٹوٹ جاتے ہیں۔ پھول کی پتیوں سے ہیروں کے جگر کٹ جاتے ہیں اور نازک گردنیں، خنجروں کو کند کر دیتی ہیں... ہاں، ایسا ہوتا ہے اور پتھروں کو اور ہیروں کے جگر کو اور تیز دھار خنجروں کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ یہ انقلاب آفریں تبدیلی کب آئی۔ ریاض جیسے پھنکارتے، شعلے برساتے انسان بھی کبھی کبھی ایسی تبدیلیوں کی زد میں آتے ہیں۔ ان کو بھی پتا نہیں چلتا کہ ان کے اندر کب تبدیلیوں کا آغاز ہوا۔ ان کے اندر کے لات منات کب ٹوٹنا

شروع ہوئے۔ اور ان کے سینے کے نیلے شعلوں کو کب پیہم برسنے والی بارشوں نے دھواں کر دیا۔

بے شک یہ حیران کن لمحے تھے۔ ریاض کی اے کے 56 رائفل تنی ہوئی تھی۔ چہرہ انگارہ تھا اور سانس چڑھی ہوئی تھی مگر رائفل خاموش تھی۔ شانی نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھایا۔ ٹارچ کی تیز روشنی میں ریاض کی پیشانی پر پسینے کی بوندیں دکھائی دیں۔ وہ کھڑا کھڑا جیسے پتھر ہو چکا تھا۔ وہ لمحے تھے یا صدیاں تھیں۔ لیکن وہ جو کچھ بھی تھا بالآخر گزر گیا۔ ایک وحشی چنگھاڑ کے ساتھ ریاض نے گولیاں چلائیں۔ اس نے کل چار فائر کیے۔ یہ چاروں فائر رستم اور شانی کے سروں کے کافی اوپر سے گزرے اور سنگلاخ دیوار پر لگے۔ ہر طرف پتھریلی کرچیاں بکھر گئیں۔

قبائلی ہزارہ خان حیرت سے گنگ تھا اور ریاض کا چہرہ تک رہا تھا۔ ریاض نے رائفل گھما کر دیوار پر دے ماری۔ وہ لڑھکتی ہوئی دور جا گری۔ ریاض، شانی پر جھپٹا... دیوانگی کے عالم میں اسے کئی دو ہتڑ رسید کیے اور دہاڑا۔ ”تو کس مٹی کی بنی ہوئی ہے... تو کیا ہے... تو کیا ہے؟“

پھر وہ بے دم سا ہو کر کئی قدم پیچھے ہٹا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اس نے اپنے اٹھے ہوئے گھٹنوں پر کہنیاں رکھیں اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کہ کیا کرے۔

اچانک اس کا واکی ٹاکی جاگا۔ کافی دیر بپ ہوتی رہی۔ آخر اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”ہیلو... ہیلو ریاض صیب... ہیلو! خو آپ کہاں پر ہے؟“

ریاض نے چند لمحے توقف کیا اور بے حد بوجھل آواز میں بولا۔ ”میں یہاں آگے آیا ہوا ہوں... اوور!“

”ابھی اندر سے تین چار گولیاں چلنے کا مدھم آواز آیا ہے۔ خیریت تو ہے؟ اوور!“

”ہاں خیریت ہے۔ یہاں اندھیرے میں کچھ شک ہوا تھا۔ اس لیے گولیاں چلائیں... اوور!“

”مفرور کا پتا چلا؟ اوور!“

”نہیں، ابھی نہیں۔ اوور اینڈ آل!“ ریاض نے کہا اور واکی ٹاکی بند کر دیا۔

شانی کو لگ رہا تھا کہ وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ کیا واقعی ہو رہا تھا یا وہ مر چکی تھی؟ اسے اپنے اردگرد کی ہر شے چکراتی دکھائی دی۔ اسے اب بھی کچھ پتا نہیں تھا کہ اگلے لمحے کیا ہونا ہے۔

ریاض نے عالمِ وحشت میں اپنی رائفل... تھی۔ یہ پوسٹ کے پیچھے ایک تاریک گوشے میں تھی۔ دراز قد پنجابی ہیڈ کانسٹیبل اسے اٹھانے... بڑھا۔ شانی کی چھٹی حس نے پکار کر کسی ... اطلاع دی۔ اچانک سماعت شکن دھماکا ہوا اور ... قد شخص کو اڑ کر دور گرتے دیکھا۔ یہ خیال شانی کے ... برق کی طرح کوندا کہ یہ زمین میں چھپی کسی مائن کا ... مگر شاید یہ ایک مائن نہیں تھی۔ اکٹھی کئی مائنز کا بلاسٹ ... رستم اور خود شانی بھی ہوا میں اچھل کر گرے۔ اس کے ... ہی شانی کو احساس ہوا کہ اس کے دونوں پاؤں کسی ... وزنی شے کے نیچے دب گئے ہیں۔ پھر اسے اندازہ ہوا ... پوسٹ کی چھت بھی دھماکے سے گر گئی ہے اور اس کا ایک ... کسی وزنی شے کے نیچے دبا ہوا ہے۔ اسے اپنی آنکھوں ... سامنے شعلے بھڑکتے دکھائی دیے۔ ”رستم... رستم!“ وہ چلائی مگر جہاں رستم گرا تھا، وہاں اب ملبے کا ایک بڑا ڈھیر نظر آ رہا تھا۔ اس ڈھیر پر ایک زخمی چمگادڑ پھڑپھڑا رہی تھی۔

ہر طرف دھول اور دھواں تھا۔ دونوں ٹارچوں کی روشنی بھی اس دھوئیں میں کہیں چھپ گئی تھی۔ اب صرف آگ کی روشنی تھی اور آگ چاروں طرف سے بڑھ رہی تھی۔ شانی کو ریاض اور ہزارہ خان بھی کہیں دکھائی نہیں دیے۔ چند ساعتوں بعد شانی کو لگا کہ اردگرد کا ٹمپریچر ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے۔ اس نے اپنے پاؤں وزنی شے کے نیچے سے کھینچنا چاہے مگر یکسر ناکام رہی۔ ”بچاؤ... بچاؤ۔“ وہ اضطراری کیفیت کے تحت چلائی۔

اس کے نتھنوں میں بارود کی مہلک بو تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ اس کے بال جھلس رہے ہیں۔ تو کیا یہ آخری لمحے تھے؟ اس کی قسمت میں آگ میں جل کر مرنا تھا؟ رستم کہاں تھا؟ رستم کہاں تھا؟ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر اس کی نگاہ ڈپٹی ریاض پر پڑی۔ وہ قریباً تیس فٹ کی دوری پر کھڑا تھا۔ اس آگ کو دیکھ رہا تھا جو شانی کو نگلنے کے لیے آگے بڑھ رہی تھی۔

ریاض کا چہرہ یکسر سپاٹ تھا۔ یقیناً وہ بھی جان چکا تھا کہ شانی کے پاؤں آزاد نہیں ہیں۔ آگ کی لپٹوں اور دھوئیں سے شانی کا دم گھٹنے لگا۔ اس کی اوڑھنی جلنا شروع ہو گئی۔ اس نے آخری بار پاؤں آزاد کرانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ پھر اس نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا... اس نے ڈپٹی ریاض کو دیکھا۔ وہ جو دہشت، بربریت اور درندگی کی علامت تھا۔ جو صرف زندہ درگور کرنا اور مارنا جانتا تھا... ہاں، وہی

... شانی کی طرف لپک رہا تھا... اسے آگ کی لپٹوں سے ... لیے۔ اس کی آنکھوں میں ان لمحوں میں، انسانی ... اور کچھ دکھائی نہیں دیا۔ یہ ناقابلِ یقین نظارہ ... نے اسے دوڑتے اور آگ میں داخل ہوتے ... شانی کے پاس آیا۔ اسے ملبے کے بوجھ کے نیچے ... کی کوشش کرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ریاض کے ... لگے۔ اس کے چہرے کے گرد لپٹی ہوئی سفید ... نے آگ پکڑ لی۔

”الو کی پٹھی! خود بھی زور لگا۔“ وہ شانی کو کھینچتے ہوئے دہاڑا۔

شانی نے اپنی سی کوشش کی مگر دونوں پاؤں مفلوج ہو چکے تھے۔

ریاض نے ملبے کو، آگ کو اور اس ساری صورتِ حال کو کئی گندی گالیاں دیں اور ایک جلتی ہوئی شہتیر کو شانی کے پاؤں پر سے ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے اپنے ہاتھ جل گئے۔ باہر سے ہزارہ خان چلایا۔ ”چھوڑ دو ریاض صیب! دوسرا چھت بھی گرنے والا ہے... باہر آ جاؤ۔“

ریاض نے کوئی جواب نہیں دیا اور شانی کو کھینچنے کی کوشش کرتا رہا۔

”چھوڑ دو۔“ شانی کراہی۔ ”تم خود کو بچاؤ۔“

”بکواس بند کرو۔“ ریاض نے کہا اور پورا زور لگا کر شانی کو کھینچا۔ وہ تھوڑا سا کھسکی مگر مکمل طور پر باہر نہ آ سکی۔ ریاض کے کپڑوں نے پہلو کی طرف سے آگ پکڑ لی۔ شانی کے اپنے کپڑے بھی جل رہے تھے۔ اسے لگا، وہ انگاروں پر لیٹی ہے۔

”ریاض صیب! کیا ہو گیا تم کو... چھوڑ دو اس خبیث کو۔“ ہزارہ خان پھر چلایا۔

اسی دوران میں شانی کے پاؤں ایک جھٹکے سے آزاد ہو گئے۔ جھٹکے سے ریاض بھی گرا... اس کے ہاتھ میں ایک چٹائی آ گئی۔ یہ چٹائی اس نے شانی کے گرد لپیٹی، اسے اپنے بازوؤں میں لیا اور دوڑتا ہوا آگ کے گھیرے سے باہر آ گرا۔ ہزارہ خان نے جلدی سے ایک بھاری کپڑا ریاض کے جسم پر ڈال کر اس کی آگ بجھائی۔ وہ تینوں بری طرح کھانس رہے تھے۔

”رستم... رستم! کہاں ہو تم؟“ شانی دھوئیں کے اندر سے ملبے کے ڈھیر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ سلگتے ہوئے ملبے کو ننگے ہاتھوں سے ہٹانے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ ریاض نے اسے کھینچ کر ملبے سے دور کیا۔ چند سیکنڈ بعد ایک زوردار کڑاکا ہوا۔ باقی چھت بھی دھماکے سے ملبے کے ڈھیر پر گر گئی۔ اور یہی نہیں ہوا، کھوہ کی چھت کا بے شمار ملبہ بھی ساتھ ہی گرا۔ ہزاروں ٹن پتھر نے اردگرد کی ہر شے کو ڈھانپ لیا۔

”رستم... رستم!“ شانی دیوانہ وار چلاتی چلی گئی... پکارتی چلی گئی۔

ریاض نے اسے بانہوں میں لے رکھا تھا۔ وہ اسے آگ اور قاتل دھوئیں میں کودنے سے بہ مشکل روکے ہوئے تھا۔ ہزارہ خان دیکھ رہا تھا اور حیرت سے گنگ تھا۔ واکی ٹاکی پر مسلسل سگنل موصول ہو رہے تھے۔ ریاض نے کال ریسیو نہیں کی۔ تپش اور دھواں بڑھتا جا رہا تھا۔

”ہزارہ خان! اسے یہاں سے نکالنا ہے۔“ ریاض نے عجیب لہجے میں کہا۔ اس کا اشارہ شانی کی طرف تھا جو اس کے بازوؤں میں تھی۔

”ام سمجھا نہیں ریاض صیب!“

”میں نے فارسی نہیں بولی۔ اسے پہاڑ سے پار کرنا ہے۔ تم آگے چلو... تمہیں راستے کا پتا ہے۔“ وہ تینوں بے طرح کھانس رہے تھے۔ سب سے برا حال شانی کا تھا۔ وہ بہت کھینچ کر سانس لے رہی تھی۔ لگتا ہے کہ لگتا ہے اس کی سانس بالکل گم ہو جاتی تھی۔ وہ اب جو کچھ بھی بول رہی تھی، وہ اس کے گلے کے اندر ہی گونج رہا تھا۔

ہزارہ خان نے ٹارچ اٹھائی اور گہرے دھوئیں میں راستہ بناتا ہوا چل دیا۔ ریاض نے شانی کو بانہوں میں لے رکھا تھا اور اپنے ساتھ کھینچ رہا تھا۔ شانی نے ڈوبتے ذہن کے ساتھ سوچا۔ وہ رستم کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا رہی ہے۔ اس گہرے سیاہ دھوئیں میں، بے گور و کفن، اب وہ اسے کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ اس نے چاہا، وہ بھی اسی سیاہ دھوئیں میں ختم ہو جائے مگر ریاض کی بانہیں اس کے نیم جان جسم کو کھینچتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ کھوہ کے اندر سے پھوٹنے والے ایک نہایت تنگ راستے سے گزر رہے تھے۔ یہاں سے بہ مشکل ایک آدمی گزر سکتا تھا۔ شانی نے دھندلائی نظروں سے دیکھا، اس راستے کے اوپر شاید کھلا آسمان تھا... مگر دھواں یہاں بھی بھرا ہوا تھا۔

اچانک شانی کو محسوس ہوا کہ وہ بھی مر رہی ہے۔ اس کی ٹانگوں سے جان نکل رہی تھی۔ اس کی سانس اس کے سینے سے بچھڑ رہی تھی۔ وہ گر گئی۔ اسے لگا کہ ہزارہ خان اسے کندھے پر اٹھانے کی کوشش کر رہا ہے پھر اس کا ذہن گہری تاریکی میں ڈوبتا چلا گیا۔

وہ نہ جانے کب تک اس تاریکی میں رہی۔ اس تاریکی

میں گا ہے بہ گا ہے کچھ دور افتادہ آوازیں اس کے کانوں سے ٹکراتی رہیں۔ کچھ لمس، کچھ بالکل تاریک مناظر... جیسے یہ سب کچھ کسی اور دنیا میں ہو رہا ہے۔ اس بے ہوشی کے عالم میں اسے احساس ہوا کہ وہ رستم کے ساتھ ہے۔ ایک نہایت چمکیلی شام میں۔ رو کیٹ بستی کا خوب صورت گھر ہے اور ٹیلے ہیں۔ وہ رستم کا مضبوط ہاتھ پکڑے اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی ہے... ہنستی جا رہی ہے، بولتی جا رہی ہے۔

لیکن پھر یہ سب کچھ ایک اتھاہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ اسے لگا کہ وہ کسی گہرے، بہت گہرے کنوئیں میں اترتی جا رہی ہے... رستم اس کے ساتھ نہیں۔ وہ یکسر تنہا ہے۔

نہ جانے بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے یہ دورانیے کب تک آتے جاتے رہے پھر شانی کو محسوس ہوا کہ رات کا وقت ہے اور وہ کسی گاڑی میں ہچکولے کھا رہی ہے... اس کے اردگرد کچھ لوگ موجود تھے۔ اسے ناصر کی آواز سنائی دی۔ پھر جہانگیر کی... پھر کوئی پشتو میں زور سے بولا۔

شانی نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔ اس کے گرد چھائی ہوئی تاریکی کا پردہ رفتہ رفتہ چاک ہونے لگا۔ وہ کسی جیپ نما گاڑی میں تھی۔ گاڑی کے اندر ہلکی روشنی تھی۔ اس کے جلے ہوئے ہاتھ پر بہت سی کریم لگی ہوئی تھی۔ اسے سامنے ہی ایک برقع پوش عورت نظر آئی... رستم کہاں ہے؟ یہ سوال دہکتے ہوئے تیر کی طرح اس کے سینے میں اتر گیا۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی وہ چلائی۔ ''رستم... رستم!''

کسی نے اسے بانہوں میں بھر لیا۔ یہ ناصر تھا... ہاں، یہ ناصر تھا۔ اس کے سر پر ایک بڑی پگڑی نظر آ رہی تھی۔ ''رستم کہاں ہے ناصر؟'' شانی نے اسے جھنجھوڑ کر پوچھا۔

ناصر نے نرمی سے کہا۔ ''آپ لیٹ جائیں بھابی! آپ زخمی ہیں۔''

''مجھے رستم کے بارے میں بتاؤ۔ خدا کے لیے بتاؤ۔ وہ زندہ ہیں نا؟''

''ہاں، وہ زندہ ہیں... آپ لیٹ جائیں۔ میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔'' ناصر نے عجیب لہجے میں کہا۔

''دیکھو ناصر! مجھ سے کچھ مت چھپاؤ۔ وہ کہاں ہیں؟ وہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں؟''

اچانک شانی کے نتھنوں میں اسپرٹ کی بو گھسی۔ اسے بازو پر سوئی چبھنے کا احساس ہوا۔ وہ کچھ دیر آہ و بکا کرتی رہی۔ ''دیکھو ناصر... دیکھو جہانگیر... ان کو مردہ نہ سمجھنا۔ وہ زندہ ہیں۔ ان کو ڈھونڈو۔ وہ ملبے کے نیچے ہیں... وہ مل جائیں گے...'' وہ بولتی رہی اور ایک بار پھر بہ تدریج تاریکی کے سمندر میں ڈوب گئی۔

دوبارہ اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک گھر میں تھی۔ چھت والا چھوٹا سا کمرا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ شانی نے پہچان لیا، یہ زری تھی۔ شانی کو اندازہ ہوا کہ گاڑی میں اس نے جس برقع پوش کو دیکھا تھا وہ زری ہی تھی۔ شانی کو ہوش میں آتے دیکھ کر زری تیزی سے اس کے قریب آئی۔ اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور اس کے ساتھ ہی کسی کو آوازیں دینے لگی۔ ناصر بھاگا ہوا اندر آیا۔ وہ شلوار قمیص میں تھا لیکن اب سر پر پگڑی نہیں تھی۔

شانی پر ایک بار پھر ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ اٹھ بیٹھی اور مسلسل رستم کے بارے میں سوال کرنے لگی۔ ناصر نے زری کو باہر بھیجا اور شانی کو بڑی محبت سے بستر پر لٹا دیا۔ ''بھابی! میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا لیکن آپ کو حوصلے اور ہمت سے سننا ہوگا۔''

''میں سنوں گی۔ تم بتاؤ۔'' وہ کراہی۔

وہ ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ ''رستم بھائی لاپتا ہیں لیکن ہم ان کی طرف سے ابھی مایوس نہیں ہیں۔ وہاں کھوہ میں بہت سا ملبہ گرا ہے۔ پہاڑی کا ایک حصہ ڈھے گیا ہے۔ بہت سے پاکستانی اور افغانی لوگ تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔''

''لیکن... ہمیں کیسے پتا چلے گا... وہ کیسے ہیں؟''

''آپ بے فکر رہیں۔ اس کا بھی انتظام ہے۔ پہلوان اور نذیر خان کے رابطے سرحد کی دونوں طرف ہیں۔''

ناصر کافی دیر تک شانی کو سمجھانے اور سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے شانی کو بتایا کہ وہ چیک پوسٹیں دراصل ان لشکریوں کے ٹھکانے تھے جو کچھ عرصہ پہلے روسی فوجوں سے لڑتے رہے۔ اس علاقے میں اکثر جگہوں پر اب بھی بارودی سرنگیں موجود ہیں۔ یہ ایک ساتھ پھٹ جانے والی چار پانچ سرنگیں ہی تھیں جنہوں نے اتنا بڑا دھماکا کیا۔

شانی نے روتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے کون لایا تم لوگوں کے پاس؟''

''ہم بارڈر کے پاس بور کی گاؤں میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ کل رات آخری پہر ایک قبائلی ہمارے پاس آیا۔ اس نے اپنا نام ہزارہ خان بتایا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ اور اس کے دو ساتھی پچھلے کئی گھنٹے سے ہمیں اردگرد کی بستیوں اور ڈیروں پر تلاش کر رہے ہیں۔ اس نے مجھے اور ہمارے میزبان کو ساتھ لیا اور گاؤں سے باہر ایک درّے میں لے آیا۔ وہاں آپ ایک چٹائی پر بے ہوش پڑی تھیں۔ آپ کو اپنے ساتھ لانے والا

ڈپٹی ریاض تھا۔ ڈپٹی ریاض کا بایاں پہلو بری طرح جلا ہوا تھا۔ چھاتی کی طرف سے کھال اتر گئی تھی اور چربی نظر آ رہی تھی۔ اسی نے آپ کو ہمارے حوالے کر دیا۔''

''اس نے کچھ کہا؟''

''ہاں۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بڑے طیش میں تھا۔ بہت کچھ بول رہا تھا... جلن کی وجہ سے بھی اس کا برا حال تھا۔ پھر وہ ہزارہ خان کے ساتھ واپس چلا گیا۔''

''اس نے کچھ کہا ناصر! مجھے بتاؤ... اس کے لفظوں میں بتاؤ۔'' شانی نے اصرار کیا۔

ناصر کچھ دیر تذبذب میں رہا پھر کہنے لگا۔ ''اس نے آپ کو... گالی دی اور بولا، اس کو بتا دینا کہ ڈپٹی ریاض نے کبھی کسی کا احسان اپنے سر پر نہیں رکھا۔ میں نے اس کی اور اس کے خصم کی جان بخشی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس کا خصم سرنگ میں سے نکل نہیں سکا۔ اگر وہ ملا تو اسے بھی پارسل کر دوں گا تم حرامیوں کے پاس۔''

''جب وہ یہ کہہ رہا تھا ناصر... اس کے چہرے پر کیا تھا؟''

ناصر پُرسوچ انداز میں سامنے دیوار کو تکتا رہا۔ آخر کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔ ''بھابی! کبھی آپ نے کسی پتھر کو روتے دیکھا ہے؟''

''میں سمجھی نہیں۔''

''جب ریاض یہ باتیں کر رہا تھا... میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ مجھے اپنی نظر پر یقین نہیں آیا۔ مجھے... بالکل یہی لگا جیسے کوئی پتھر رو رہا ہے... ریاض اور آنسو... سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے نا؟''

شانی کی آنکھوں میں بھی تازہ آنسو امڈ آئے۔ ''اس نے کچھ اور کہا؟''

''نہیں بھابی... بس جاتے جاتے اس نے کوئی شے پتھر پر مار کر توڑ دی۔ وہ پرزے پرزے ہو گئی۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر تھا۔ اس کی کیسٹ بھی ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ اس کے بعد وہ رکا نہیں۔ ہزارہ خان کے ساتھ واپس بارڈر کی طرف چلا گیا۔''

شانی نے گھٹنوں میں منہ چھپایا اور سسکتی رہی۔ اس کے دونوں پاؤں زخمی تھے اور ان پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ناصر کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''آپ کے لیے ایک اچھی خبر بھی ہے۔''

''کیا؟'' وہ گھٹنوں میں سر دیے دیے بولی۔

''آنکھیں کھول کر دیکھ لیں۔''

شانی نے آنکھیں کھولیں۔ سامنے دروازے میں منا کھڑا تھا۔ اس نے زری کی انگلی تھام رکھی تھی۔ اس کے عقب میں پہلوان تھا۔ ''منے!'' شانی نے پکارا۔ وہ جیسے صدیوں کا بچھڑا ہوا تھا۔ بھاگ کر آیا اور شانی سے لپٹ گیا۔

☆☆☆

اگلا ایک مہینا انتہائی کرب، اضطراب اور انتظار کا مہینا تھا۔ شانی کے کان ہر لحظہ کسی اچھی خبر پر لگے ہوئے تھے... اور وہ اچھی خبر کہیں نہیں تھی۔ یہاں وہ پہلوان کے ایک قبائلی دوست تبریز علی خان کے آبائی ڈیرے پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ پہاڑوں کے درمیان یہ ایک الگ تھلگ بستی تھی۔ بہ مشکل پندرہ بیس گھر اور یہ سب لوگ آپس میں رشتے دار تھے۔ نزدیکی شہر خوست تھا اور وہ جنوب مشرق میں قریباً چالیس کلومیٹر کی دوری پر تھا۔

تبریز خان اپنی تین اونٹنیوں پر عمارتی لکڑی خرلاچی منڈی میں لے کر جاتا تھا۔ وہ ہر پانچویں چھٹے روز پاکستانی علاقے سے ہو کر آتا تھا اور ناصر، جہانگیر وغیرہ کو صورتِ حال سے آگاہ کرتا تھا۔ سرنگ جس جگہ سے بیٹھی تھی، وہاں پہاڑی میں کئی دراڑیں نمودار ہو گئی تھیں۔ وہاں سے ملبہ ہٹانا اور کسی کو تلاش کرنا خاصا دشوار گزار کام تھا۔ اس کے علاوہ مزید بارودی سرنگوں کا اندیشہ بھی موجود تھا۔ سترہویں اٹھارہویں دن تبریز خان کی زبانی، شانی تک ایک اچھی خبر پہنچی تھی... اور وہ یہ کہ پورے اٹھارہ روز بعد ملبے کے نیچے سے ایک شخص زندہ نکلا تھا۔ یہ وہی دراز قد پنجابی ہیڈ کانسٹیبل تھا جو رستم کے ساتھ ہی ملبے کے نیچے دب گیا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ اور بازو شدید زخمی تھے۔ زخموں میں کیڑے پڑے ہوئے تھے پھر بھی وہ اپنی سانس کی ڈور کسی نہ کسی طرح بحال رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ وہ عمارت کے ملبے کے نیچے بن جانے والے ایک خلا میں موجود رہا تھا۔ اس خبر کے بعد شانی اور اس کے ساتھیوں کی امید بندھی۔ وہ رستم کے بارے میں پھر سے تھوڑے پُرامید ہو گئے۔

اب اس واقعے کو بھی نو دس دن گزر چکے تھے۔ آس امید کے چراغوں کی لو پھر مدھم پڑنے لگی۔ شانی کے لیے دنیا اندھیر تھی... اور تو اور وہ منے کی طرف سے بھی بالکل بے پروا ہو چکی تھی۔ منے کی دیکھ بھال زری ہی کر رہی تھی۔ شانی زیادہ تر گھر کی چھت پر جا کر چارپائی پر لیٹی رہتی۔ وہ جنوب کے ان پہاڑوں کی طرف دیکھتی رہتی جن کے پار اس کا جیون ساتھی رہ گیا تھا۔ اس کا چہرہ اس کی نگاہوں میں گھومتا رہتا، اس کی آواز کانوں میں گونجتی رہتی۔

وہ جیسے ہوا کے ہاتھ پیغام بھیجتا تھا۔ میری شریکِ

حیات اور میرے دوستو! میرا انتظار کرنا۔ مجھے بھول نہ جانا۔ میری واپسی کے امکان اپنے دل میں زندہ رکھنا۔ اور امکان تو بہت سے ہیں... ممکن ہے کہ میں ملبے کے نیچے زندہ موجود ہوں۔ ممکن ہے کہ مجھے گرفتار کرلیا گیا ہو اور کسی نامعلوم جگہ پر رکھا گیا ہو اور یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ میں کھوہ سے نکلنے میں کامیاب رہا ہوں۔ کسی جگہ رکا، کسی جگہ چھپا اچھے وقت کا انتظار کررہا ہوں۔

ہوا پیغام دیتی رہی اور وقت گزرتا رہا... وہ آس سب کے دلوں میں زندہ رہی جو ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتی۔ اور سب سے زیادہ شانی کے دل میں اس آس کا بسیرا تھا۔ اسے شب و روز کی ہر ہر ساعت میں کسی کی آمد کا انتظار رہتا تھا۔

ایک دن زری نے اس کے بال سنوارتے ہوئے اسے عقب سے اپنی بانہوں میں لے لیا اور اس کا رخسار چوم کر بولی۔ ''دیکھو! تم نے اپنا کیا حالت بنالیا۔ تم کو دیکھ کر میرا دل روتا... تم ایسا مت کرو۔''

وہ بولی۔ ''زری! کچھ بھی میرے بس میں نہیں۔ زندگی نہ موت۔ میں مجبور ہوں۔ مجھے معاف کردیا کرو۔''

''دیکھو، ناصر ہر وقت مجھ کو تنگ کرتا۔ اگر تم بھی کرتا تو پھر میں واپس چلا جاؤں گا۔'' اس نے پرانی دھمکی دی۔

دروازے پر آہٹ ہوئی۔ شانی نے تڑپ کر دیکھا۔ ناصر اندر داخل ہوا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی خبر ہے۔ لیکن یہ کوئی اچھی خبر نہیں تھی شاید۔

شانی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ پتھر کی طرح ساکت۔

''کک... کیا ہوا... ناصر؟'' وہ ہکلائی۔

ناصر نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے گہری سانس لی اور بولا۔ ''ڈپٹی ریاض مرگیا بھابی۔''

''کیا... کیسے؟ یہ کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ بھونچکی رہ گئی۔

''ہاں بھابی! یہ کنفرم اطلاع ہے۔ پہلوان اخبار بھی ساتھ لایا ہے۔'' ناصر نے کہا۔ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ''وہ اسپتال میں تھا۔ اس کا ایک تہائی جسم جل چکا تھا۔ خاص طور سے سینہ۔ پچھلے دس بارہ روز سے اس کی حالت زیادہ خراب تھی۔ پرسوں جمعے کی دوپہر کو اس کی سانس اکھڑ گئی۔ اسے لاہور سے اسلام آباد لایا جارہا تھا مگر وہ راستے میں ہی دم توڑ گیا۔''

آج کل شانی کی آنکھوں کو آنسوؤں کی قلت تھی۔ مگر اس دل دوز خبر نے اس کی آنکھوں کے سوتے پھر کھول دیے۔ وہ سسکیوں سے رونے لگی۔ اس کی نگاہوں میں وہ آخری مناظر گھومنے لگے جب ریاض... ریاض نہیں رہا تھا۔ چند انقلابی لمحوں نے اس کی اندرونی اچھائی کو اس کی ساری ظاہری باطنی برائیوں پر غالب کردیا تھا۔ وہ جان کی پروا بغیر نہایت دلیری سے آگ میں جھپٹا تھا اور شانی کو باہر نکالنے کی دیوانہ وار کوشش کی تھی۔

شانی کا دل چاہا کہ آج دنیا کے بڑے بڑے دانشور اس کے سامنے ہوں۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ ان کے روبرو کھڑی ہوجائے۔ وہ ان سے کہے... ابھی انسان سے ماورا ہونے کا وقت نہیں آیا۔ ابھی بُرے سے بُرے انسان کے اندر بھی اچھائی موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اچھائی تہ در تہ غلاظتوں اور خرابیوں میں چھپی ہوئی ہو لیکن وہ موجود ہے۔ اسے تدبیر، برداشت اور پیہم محبت کے زور سے نکالا جاسکتا ہے اور جب وہ نکل آئے گی اور ہمیں اسے نکالنے کا ڈھنگ آجائے گا تو پھر دیکھنا... اس دنیا کا چہرہ اور ہو جائے گا۔

☆☆☆

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں بدلنے لگے... شانی کی آنکھیں کھلے کواڑوں اور سنسان راستوں پر لگی رہیں لیکن جس کا انتظار تھا، وہ نہیں آیا... وہ نہیں آیا۔ وہ شاید کہیں تھا ہی نہیں۔ مگر وہ اس آس کا کیا کرتی جو ہر روز اس کے اندر مر مر کر جاگتی تھی۔ یہ آس کہتی تھی، وہ تیرے بغیر کیسے جاسکتا ہے۔ وہ کہیں موجود ہوگا، زندہ ہوگا، تیرے عشق نے اسے زندہ رکھا ہوگا۔

یہ آسیں ایسی ہی دیوانی ہوتی ہیں۔ یہ ٹوٹ کر بھی نہیں ٹوٹتیں۔ فنا کے گھاٹ اتر کر پھر زندہ ہوجاتی ہیں۔ کسی نہ کسی بہانے، کسی نہ کسی سہارے!

کہتے ہیں جو مرجاتے ہیں ان کے لیے چین آجاتا ہے۔ لیکن جو کھو جاتے ہیں، وہ آخری سانس تک تڑپاتے رہتے ہیں... اور شانی تڑپ رہی تھی۔

سورج ڈوبتا رہا اور ابھرتا رہا۔ ہوائیں اپنا لمس بدلتی رہیں۔ دھوپ اپنے زاویے تبدیل کرتی رہی۔ شامیں، صبحیں... اور دوپہریں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی رہیں... اسی طرح پورے سات ماہ گزر گئے۔ شانی کے پاس رستم تو نہیں آیا لیکن اس کی آخری نشانی آگئی۔ یہ ایک ہمکتا، مسکراتا بچہ تھا۔ ایک چھوٹا رستم۔ وہ اپنی ماں کے بالوں میں اپنی ننھی انگلیاں پھنساتا اور اسے کھینچ کر اپنی طرف متوجہ کرتا تھا... جیسے اس کا دھیان اس کے بے پناہ دکھ سے ہٹانا چاہتا ہو۔ اور وہ چند لمحوں کے لیے کامیاب بھی ہوجاتا تھا... مگر صرف چند لمحوں کے لیے!

ناصر اور جہانگیر مستقل طور پر اس بور کی نامی گاؤں میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔ انہوں نے یہاں خود کو فرضی ناموں

عباس خان اور عبدالعزیز کے نام سے متعارف کرایا تھا۔ عبدالعزیز یعنی جہانگیر کے پاس کافی کرنسی موجود تھی۔ روسی جنگ کے بعد افغانستان میں پاکستانی کرنسی کا ریٹ آسمان کو چھورہا تھا۔ اس روپے سے جہانگیر اور ناصر نے ایک باغ اور دو کھیت خرید لیے۔ کھیت تو انہوں نے ٹھیکے پر دے دیے مگر باغ کی نگہداشت اپنے ذمے رکھی۔ وہ سب اپنے اپنے ماضی کو تقریباً فراموش کر چکے تھے۔ شانی کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کے بعد اس کے پیچھے کیا ہوا ہے اور اب وہ معلوم کرنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اپنے وجود کے ساتھ ساتھ اپنی سوچ کو بھی ان پہاڑوں تک محدود کرلیا تھا... اور اسی میں عافیت تھی۔ باغ خریدنے کے دو تین مہینے بعد شانی کے بے حد اصرار پر ناصر اور زری نے شادی کرلی۔ یہ شادی رستم کی آخری خواہش کی حیثیت بھی رکھتی تھی۔ شانی اور جہانگیر نے گھر کا ایک حصہ ناصر اور زری کے لیے مخصوص کرنا چاہا مگر انہوں نے ہر صورت اکٹھے رہنے کو ترجیح دی۔ ناصر کو شانی کی ذہنی کیفیت کا پتا تھا۔ وہ شانی کو ہر دم مصروف اور رونق میں رکھنا چاہتا تھا... لیکن جب دل میں رونق نہ ہو تو باہر کی گہما گہمیاں یکسر بے اثر رہتی ہیں۔

جنگ ختم ہونے کے بعد علاقے کے حالات اچھے نہیں تھے۔ شانی منے کو باہر بھیجنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے گھر ہی میں اس کی تعلیم شروع کردی تھی۔ منے کے ساتھ زری بھی اکثر اس کے پاس پڑھنے بیٹھ جاتی تھی۔ چند ماہ کا بچہ ان کے آس پاس کھیلتا رہتا تھا۔ شانی نے اس کا نام راسب رکھا تھا... راسب کا مطلب تھا باتحمل، بردبار!

زندگی کے شب و روز اسی عجیب دھوپ چھاؤں میں گزرتے چلے جارہے تھے۔ کسی اداس شام میں جب وہ تنہا ہوتی، سنسان گلی میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی... اسے لگتا وہ کچھ دیر پہلے یہاں تھا۔ کسی کونے کھدرے سے اسے اور اپنے بچے کو دیکھتا ہوا گزر گیا ہے۔ وہ گلی میں نکل کر دور تک دیکھتی لیکن کوئی نہ ہوتا۔ وہ پلٹ آتی۔ پھر ویرانی میں سے ایک بھولی بسری آواز ابھرتی اور اس کے کانوں میں گونجنے لگتی... میریاں گلاں یاد کریں گی، رو رو کے فریاد کریں گی، فیر میں تینوں یاد آواں گا۔

...اور پھر پورے تین سال گزر گئے۔ گہرے زخم مندمل ہونا شروع ہوگئے۔ رونے دھونے اور تلاش کرنے والوں کو یقین ہونے لگا کہ رستم اب نہیں ملے گا... زندگی رواں رہی۔ اب ہوائیں اسی طرح چلتی تھیں، موسم اسی طرح بدلتے تھے، کھیتوں میں مزدور کام کرتے تھے... چشموں سے پانی نکلتا تھا، باغوں میں پھول کھلتے تھے، چاندنی چٹکتی تھی راتوں میں آسمان سے برف کے گالے گرتے تھے۔

پھر بھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ آسمان سے جنگی [illegible] چنگھاڑتے ہوئے گزر جاتے، افق پر دھوئیں کے [illegible] دکھائی دیتے... اور کبھی کبھی رات بھر دور کے پہاڑوں [illegible] فائرنگ کی آوازیں آتی رہتیں... ہاں، سب کچھ ویسا [illegible] لیکن شانی کے لیے سب کچھ ویسا نہیں تھا۔ اس کا [illegible] مندمل نہیں ہوا تھا۔ اس کا ہر گھاؤ خونچکاں تھا۔ زمانہ [illegible] ہے اور بھول کر زندہ رہ سکتا ہے... مگر خوشبو اپنے پھول سے بچھڑ کر کیسے زندہ رہ سکتی ہے۔ چاندنی کا وجود چاند سے، ندی کا وجود پانی سے مشروط ہے۔

سرما کی ایک زرد دوپہر میں شانی اپنے دونوں [illegible] کے ساتھ باغ کے کنارے کھڑی تھی۔ اسے دور پہاڑ [illegible] ہجوم نظر آیا۔ ”یہ کیا ہے جہانگیر؟“ اس نے پوچھا۔

”شاید جنگی سردار کسی نئی لڑائی کا منصوبہ بنارہے ہیں۔ ایک دوسرے کو مارنے کے سوا ان کا کام ہی کیا ہے۔“

اسی دوران میں ناصر آگیا۔ اس نے کہا۔ ”یہ لڑائی نہیں، صلح کی منصوبہ بندی ہے۔ دو جنگی گروپ ایک دوسرے کے قیدی رہا کررہے ہیں۔ ہماری بستی کے کئی لوگ بھی واپس آرہے ہیں۔“

ناصر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ظہر کی نماز کے فوراً بعد بستی کے چوراہے میں دیگیں کھڑکھڑائی جانے لگیں پھر شانی نے بستی کے رہا ہونے والے چند نوجوانوں کو بستی میں آتے دیکھا۔ ایسے منظر بڑے اچھے لگتے تھے۔ جب کوئی بچھڑا ہوا ملتا، جب بانہیں ایک دوسرے کو لپٹاتی تھیں، جب رخسار چومے جاتے تھے اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلکتے تھے۔

اور وہ باغ کے کنارے کھڑی چپ چاپ دیکھتی رہی۔ بوڑھی مائیں، جوان بہنیں اور شرماتی لجاتی بیویاں بچھڑے ہوؤں کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ ایک دوسرے کے منہ میں مٹھائی ڈالی جارہی تھی۔ ہار پہنائے جارہے تھے نفیریاں بج رہی تھیں۔ پھر یہ ہنگامہ ختم ہوگیا، جیسے سب ہنگامے ختم ہوجاتے ہیں۔

شانی پھر سے اپنے کام میں لگ گئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی قینچی تھی۔ وہ انگوروں کی بیل سے سرخی مائل انگوروں کے گچھے بڑے سلیقے سے علیحدہ کررہی تھی اور ٹوکری میں ڈال رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کام میں منا بھی اس کی مدد کرنے لگتا تھا۔ چھوٹا راسب ایک چٹائی نما کپڑے پر سو رہا تھا۔ اچانک شانی کو لگا، اس کے پیچھے کوئی موجود ہے۔ ایک نادیدہ [illegible]

[illegible] سے نرمی، اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اس کے سامنے [illegible] شانی نے آنکھیں سکوڑیں۔ اس کی سانس جیسے [illegible] دل کی دھڑکن تھم گئی اور کائنات کی گردش [illegible] چلی گئی۔ وہ وہم تھا یا حقیقت؟ نہیں وہم اتنا [illegible] تو نہیں ہوتا... وہ اب پختہ عمر کا شخص نظر آتا [illegible] کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر بے جھاڑ جھنکار بال تھے۔ اس کے نقوش پر ماہ و سال کی دبیز گرد تھی۔ مگر اس کی آنکھیں... اس کی آنکھیں [illegible] تھیں۔ اسی پہلے دن کی طرح جب وہ اسی طرح اجڑا [illegible] لٹا لٹایا چودھری فاخر کی حویلی میں نظر آیا تھا۔ ان کئی برسوں میں ان آنکھوں میں ذرا سی تبدیلی بھی تو نہیں آئی تھی۔ شانی کو لگا کہ وہ بے ہوش ہوکر گر جائے گی لیکن پھر اس نے سوچا، اگر اسے گرنا ہی ہے تو وہ اپنے محبوب کی بانہوں میں گرے، یا پھر اس کے پاؤں میں... ”رستم!“ وہ عجیب آواز میں سسکی۔ وہ بھاگی، اس کے بازو پھیلے، اس کی اوڑھنی ہوا میں لہرائی۔ اس کا سینہ پُرنور محبت کی ”تجلی“ سے ٹکرایا... اور وہ لپٹ گئی۔ اپنے شوہر سے، اپنے محبوب سے!

☆☆☆

اور یہ رات تھی۔ سرما کی رات... جب گھروں سے باہر سردی دندناتی ہے اور گھروں کے اندر آتش دان دہکتے ہیں۔ وہ سب بھی ایک انگیٹھی کے گرد بیٹھے تھے۔ رستم، ناصر، جہانگیر، شانی اور زری... رستم کی لکڑی اور پلاسٹک کی ٹانگ اس کے جسم کا حصہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی چھاتی اور گردن پر بھی جلنے کے پرانے نشان موجود تھے۔ منا اس کی گود میں سر رکھے بے خبر سو رہا تھا۔ رستم کا آنا ایک ایسے سپنے جیسا تھا جس پر یقین کرتے بنتی تھی نہ جس کو جھٹلاتے۔ وہ اپنی طویل روداد ختم کرچکا تھا۔ وہ سب کچھ بتاچکا تھا... سب کچھ۔ وہ اس قاتل رات میں کیسے رینگتا ہوا گرم ملبے کے ڈھیر سے نکلا، کیسے ایک دراڑ میں سے رینگ کر کھلی فضا میں پہنچا اور پھر کیسے وہ کئی دن تک ایک یوسف زئی بیوہ عورت کے گھر میں چھپا رہا... وہ بتاچکا تھا کہ کس طرح اس نے بعد کے کئی ماہ تک شانی اور ساتھیوں کی تلاش چپکے چپکے جاری رکھی اور پھر کس طرح وہ خوست کے ایک وزیرستانی راہ زن کو قتل کرنے کے بعد ایک جنگی گروپ کا حصہ بن گیا۔ دریائے کرم کے ساتھ کوہ سفید کی ویران گھاٹیوں میں ایک ”وار لارڈ“ کے ساتھ اپنی آوارہ گردی کے بارے میں بھی رستم نے سب کچھ بتایا اور یہ بھی بتایا کہ کیسے وہ مخالف گروپ کے ہاتھوں قید ہوکر پورا ایک سال قید میں پڑا رہا ہے۔ قید کے دوران میں ہی اسے اپنے ایک ساتھی سے معلوم ہوگیا تھا کہ دو پاکستانی اپنی دو عورتوں کے ساتھ اس ”بورکی“ نامی بستی میں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک پاکستانی تھوڑی بہت ڈاکٹری بھی جانتا ہے۔ یہ اشارے رستم کے لیے کافی ثابت ہوئے تھے۔

رستم کی روداد ختم ہوئی تو شانی، ناصر اور جہانگیر نے خود پر بیتنے والے حالات سے آگاہ کیا۔ آپو زاہدہ اور بچوں کے بارے میں رستم پہلے ہی جان چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ڈیرہ غازی خان کے ایک دور دراز گاؤں میں بہ خیریت موجود ہیں۔ اس نے جنگی گروپ کے ہاتھوں پکڑے جانے سے پہلے آپو کے گھرانے کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرلی تھیں۔ انگیٹھی میں سلگتی آگ کے گرد ان کی گفتگو جاری رہی۔ ان سب کی آنکھیں بار بار نم ہوتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں یادوں کے سائے لہراتے رہے۔ پھر وہ اپنے بچھڑے ہوؤں کو یاد کرنے لگے۔ چھوٹے قد کا بڑا انسان ڈولا... جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ہمہ وقت مسکراہٹ رہتی تھی۔ چوڑی چھاتی والا سردار دراج جو ہر مشکل کے سامنے دیوار بننے کی خُو رکھتا تھا... اور اجمل خان، یاروں کا یار، پیاروں کا پیارا۔ اپنے گاؤں سے بچھڑا ہوا وہ پردیسی جو پورے ملک کو اپنا گاؤں سمجھنے لگا تھا۔ جس کی باتوں سے مسکراہٹوں کے شگوفے پھوٹتے تھے۔ وہ سب کہاں گئے... وہ سب چلے گئے... اپنے اپنے وقت پر... اپنی اپنی آن بان کے ساتھ!

اور پھر ڈپٹی ریاض کا ذکر چھڑ گیا... وہ جو سب سے برا تھا... اور جو سب سے بازی لے گیا۔ وہ بدلا تو ایسے بدلا کہ دیکھنے والوں کی انگلیاں دانتوں میں دبی رہ گئیں۔ اس نے ایک ہی کایا پلٹ شب میں اپنی سفاکی اور بے حسی کے سارے داغ اپنے خون سے دھو دیے۔

جو رکے تو کوہِ گراں تھے ہم
جو چلے تو جاں سے گزر گئے

وہ جاتے جاتے ان سب کوتاہ نظروں کی آنکھیں کھول گیا جو انسان کو صرف اچھے یا صرف برے روپ میں دیکھتے ہیں... اور جس کو برے روپ میں دیکھتے ہیں اس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہتے ہیں۔

فضا جب زیادہ گمبھیر ہونے لگی تو رستم نے منے کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ سب کے لیے ایک تحفہ بھی لایا ہوں اپنے ساتھ!“

”کیا ہے؟“ شانی نے پوچھا۔

”میرا ایک ساتھی جو میرے ساتھ ہی رہا ہوا ہے۔ پتا

ہے، وہ کون ہے؟''

''کون؟'' شانی اور زری نے ایک ساتھ پوچھا۔

''اجمل خان!''

''اجمل؟ کس اجمل کی بات کر رہے ہیں؟'' ناصر نے کہا۔ وہ سب حیرت سے رستم کو دیکھنے لگے۔

''اجمل خان جو شاید ایک نئے روپ میں ہمارے پاس آگیا ہے۔ یہ قندھار کا رہنے والا ہے۔ اس کا قد اجمل سے تھوڑا چھوٹا ہے لیکن اجمل ہی کی طرح ہنس مکھ اور دل والا ہے۔ اس کا پورا نام اجمل خان اچکزئی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں آئے گا۔ اس کے سامنے تم مجھے جلال کے نام سے پکارو گے۔ اسے یہی نام معلوم ہے۔''

ابھی اجمل خان اچکزئی کی بات ہو ہی رہی تھی کہ بیرونی دروازے پر دستک ہوگئی۔ ناصر اٹھا اور پھر تھوڑی دیر بعد اجمل خان ان کے درمیان تھا۔ اس کے کندھے پر وزنی رائفل اور گولیوں والی دو بیلٹس تھیں۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ان سب میں گھل مل گیا۔ کچھ ہی دیر بعد یوں لگنے لگا کہ وہ سب اسے عرصے سے جانتے ہیں۔ اس کے چہرے اور گردن پر زخموں کے نشان اس کی جنگجو طبع کے غماز تھے۔ وہ رستم کو بے تکلفی سے جلال اور جلالم کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ شانی کو بھی بڑے خلوص سے بہن جی کہنے لگا۔ گرم قہوے کی بڑی سی چسکی لیتے ہوئے اس نے کہا۔ ''بھائیو! آپ سے مل کر ام کو بہت خوشی ہوا۔ آپ کو بھی ہوا ہوگا۔ ام چاہتا ہے، یہ خوشی برقرار رہے۔ اس لیے اپنے بارے میں ام آپ سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔''

''آپ کہیں جی۔'' ناصر نے کہا۔

وہ صاف گوئی سے بولا۔ ''برادر! ام دل کا برا نہیں۔ پر ام کو غصہ بہت زیادہ آتا ہے۔ اور جب آتا ہے، ام بہت سخت دل ہو جاتا ہے۔ ایک دم پتھر کے مابق (مافق)۔ مرنے مارنے پر اتر آتا ہے۔ اپنی اس خامی پر ام خود بھی بہت شرمندہ ہے۔''

رستم نے دیوار سے ٹیک لگائی۔ ایک محبت بھری نظر اپنے سوتے ہوئے دو ڈھائی سالہ بچے پر ڈالی پھر کن انکھیوں سے شانی کو دیکھا۔ شانی کا آدھا چہرہ اوڑھنی کے پیچھے تھا اور باقی آدھے پر انگیٹھی کی روشنی رنگ بکھیر رہی تھی۔ وہ عجیب لہجے میں بولا۔ ''اجمل! تمہاری اس سخت دلی کا علاج ہے ہمارے پاس... ایک دیوی ہے... جس کا جادو، سخت سے سخت لوہے کو موم کر دیتا ہے۔''

''کیا مطلب؟... کون سا دیوی؟''

''دیوی... یعنی دیوی!''

''ام اب بھی نہیں سمجھا جلالم؟''

''تم دیویوں کے بارے میں نہیں جانتے...'' اجمل خان نے معصوم انداز میں نفی میں جواب دیا۔ رستم کھڑکی سے باہر دور کوہ سفید کی تاریک چوٹیوں کو دیکھنے لگا۔ ''اجمل خان! دیویاں وہ نرم و نازک عورتیں ہوتی ہیں جو اپنے سینے میں بے حد مضبوط دل رکھتی ہیں۔ ان کے حوصلے پہاڑوں سے اونچے ہوتے ہیں۔ یہ بڑی نرمی اور خاموشی سے آہستہ آہستہ منہ زور پانیوں کے راستے بدل دیتی ہیں اور پانیوں کو پتا بھی نہیں چلتا۔ ہاں اجمل خان! یہ دیویاں کہانیوں کو نیا رنگ دے دیتی ہیں... تاریخ کا چہرہ بدل دیتی ہیں۔''

''جلالم! تمہارا یہ باتیں بالکل امارا سمجھ میں نہیں آرہا۔'' اجمل خان نے سر کھجایا۔

رستم گہری سانس لے کر بولا۔ ''تم نے پنجاب کے ایک بڑے سخت پولیس افسر ریاض بٹلر کا نام تو سنا ہے نا؟''

''بالکل... جب ام راولپنڈی میں تھا، ام نے سنا تھا۔ لیکن آپ اس کو کیوں یاد کر رہا ہے؟''

''اس پولیس افسر کو بھی ایک دیوی کے جادو نے موم سے موم کر دیا تھا... سوچو اجمل خان! اگر ایسا شخص موم ہو سکتا ہے تو تم تو کوئی چیز نہیں ہو...'' رستم کا لہجہ جذباتی تھا اور تحسین آمیز بھی۔

''آپ کا بات اب بھی امارا سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید ام نے زیادہ نسوار کھا لیا ہے۔''

ناصر اور جہانگیر خاموشی سے سن رہے تھے... اور سمجھ بھی رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جہانگیر، ناصر اور زری سونے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اجمل خان اچکزئی بھی اٹھ گیا... وہ اپنے جیل کے ساتھی کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''جلالم! ام جانتا ہے تم بڑے لمبے عرصے بعد اپنے بچے اور اپنی بیوی صاحبہ سے ملا ہے۔ رات بہت ہو گیا ہے۔ ام زیادہ دیر تمہارے اور بیوی صاحبہ کے درمیان روڑا اٹکانا نہیں چاہتا۔ اب کل ملاقات ہوگا۔'' اجمل خان لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔

ناصر، زری اور جہانگیر بھی چلے گئے۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا رہا۔ اپنی دیوی کو دیکھتا رہا۔ انگیٹھی میں آگ سلگ رہی تھی۔ کھڑکیوں سے باہر برفیلی چوٹیوں اور تاریک نشیب و فراز پر سرد ہواؤں کے قافلے اتر رہے تھے... یہ شروعات تھی ایک نئی کہانی کی...!

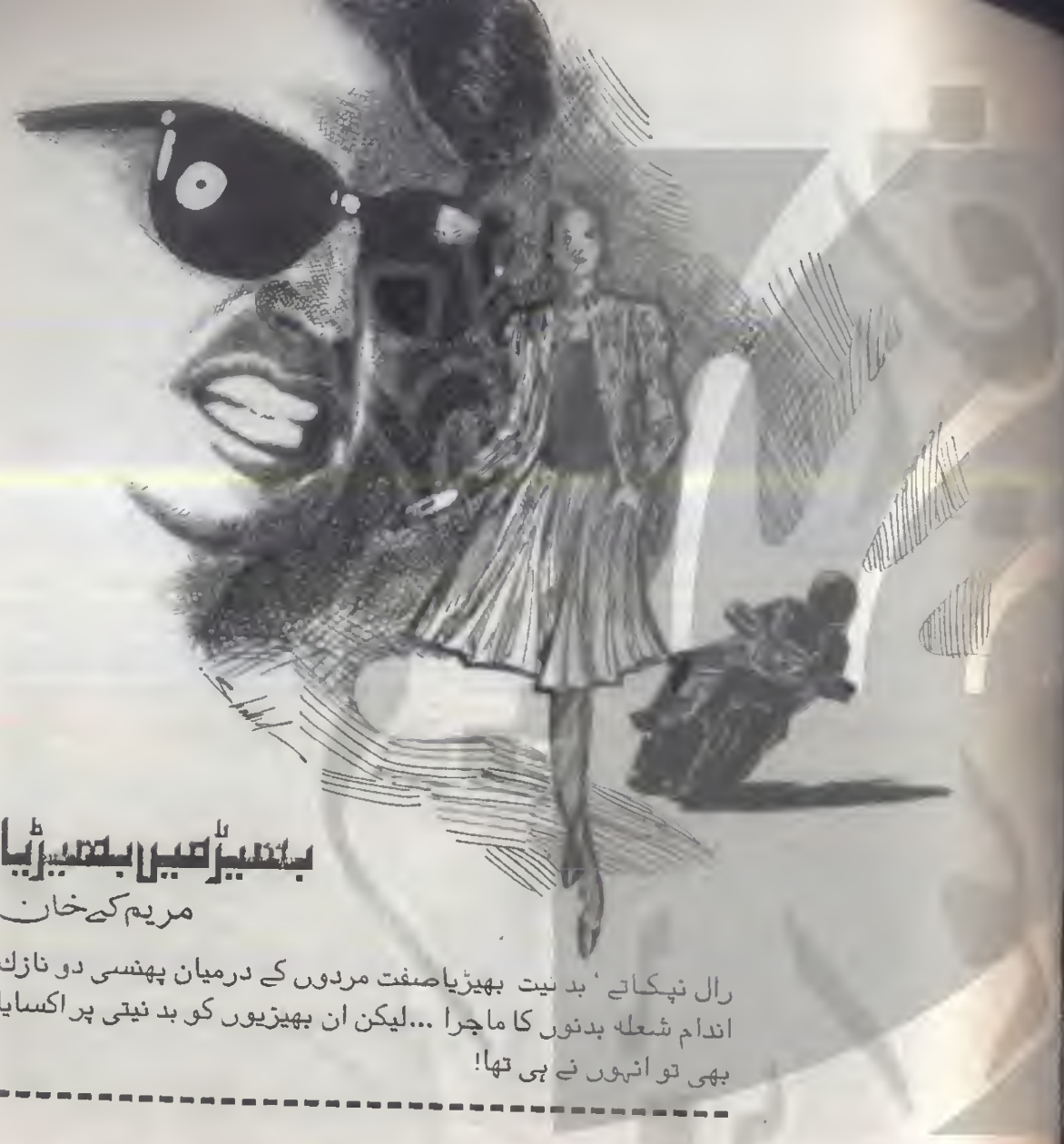

بھیڑ میں بھیڑیا

مریم کے خان

رال ٹپکاتے، بد نیت بھیڑیا صفت مردوں کے درمیان پھنسی دو نازک اندام شعلہ بدنوں کا ماجرا ...لیکن ان بھیڑیوں کو بد نیتی پر اکسایا بھی تو انہوں نے ہی تھا!

رون اسمتھ چل چل کر تھک گیا تھا۔ اسے شدت سے پیاس بھی لگ رہی تھی۔ سورج نصف سر پر تھا اور اس کی تمازت سر کے اندر بھیجے کو فرائی کر رہی تھی۔ یہ جنوبی کیلی فورنیا کا نیم صحرائی علاقہ تھا۔ وہ پہاڑ پر چڑھ رہا تھا۔ ساری رات وہ ایسے ہی صحرائی علاقے میں سفر کرتا رہا تھا۔ اپنے پاس موجود پانی وہ تین گھنٹے پہلے استعمال کر چکا تھا۔ اب اس کے پاس ایک بوند پانی نہیں بچا تھا۔ اور اب اس کا حلق کسی گرم پتھر کی طرح خشک اور کھردرا ہو رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس پہاڑ کی بلندی سے اسے کوئی نہ کوئی سڑک نظر آجائے گی۔ اسے لگ رہا تھا اگر اسے جلد کوئی انسان یا سڑک نہ ملی تو وہ ہلاک ہو جائے گا۔

پہاڑ پر چڑھ کر اس نے دوسری طرف دیکھا۔ اسے دور میدان میں ایک موبائل ٹریلر نظر آیا۔ اس سے آگے ایک کچا راستہ جا رہا تھا۔ رون کی جان میں جان آگئی۔ وہ تقریباً چالیس برس کا اور چہرے سے نرم خو نظر آنے والا شخص تھا۔ گول شیشوں کی عینک کی وجہ سے وہ پروفیسر لگتا تھا۔ درمیانی جسامت تھی اور اس کے نازک ہاتھ بتاتے تھے کہ اس نے زندگی میں کوئی سخت کام نہیں کیا۔ وہ خوشی خوشی پہاڑ سے اترنے لگا۔ اچانک اسے کسی کے چلّانے کی آواز آئی۔ یہ کوئی لڑکی تھی۔ کم سے کم آواز سے تو ایسا ہی لگ رہا تھا۔ وہ اس طرف بڑھا جس طرف سے آواز آرہی تھی۔

''کون ہے؟'' رون نے چلّا کر پوچھا۔

''پلیز... میری مدد کرو... میں یہاں پھنسی ہوں۔''

رون دو چٹانوں کے درمیان میں پہنچا۔ اس نے اندر جھانکا۔ جہاں دونوں چٹانیں آپس میں مل رہی تھیں، وہاں ایک نوعمر لڑکی کھڑی تھی۔ رون کو دیکھ کر اس نے کہا۔ ''میرا

پاؤں پھنس گیا ہے۔"

رون کھسک کر آگے آیا۔ اس نے دیکھا، لڑکی نے ایک مختصر سی نیکر اور اس سے بھی مختصر بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس کی سنہری رنگت ٹانگوں، کمر، پیٹ اور بازوؤں سے جھلک رہی تھی۔ لڑکی کے سنہری بال اس کے شانوں پر بکھرے تھے۔ لڑکی سولہ سال کی تھی مگر اس کا جسم بھرا بھرا تھا۔ اس کا پاؤں ٹخنے والی جگہ سے چٹان میں بری طرح پھنسا تھا۔

"یہ تم نے کس طرح پھنسایا ہے؟" رون نے ذرا جھک کر دیکھا۔ اسے لڑکی کے جسم سے دل فریب مہک آئی۔ اس نے ہاتھ لڑکی کے پاؤں پر رکھا تو اس کے لمس سے رون کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ ہٹالیا۔ لڑکی کا جسم چٹانوں کے درمیان پھنسا تھا مگر وہ نکل سکتا تھا۔ اصل مسئلہ پاؤں کا تھا۔

"میں اوپر سے اس خلا میں گری تھی اور میرا پاؤں اس کھانچے میں پھنس گیا۔" لڑکی نے کراہ کر کہا۔ "میں اوپر چٹان پر تھی۔"

"یہ جو ٹریلر ہے... یہ تمہارا ہے؟"

"ہاں... میں اپنی ممی، ڈیڈی اور بھائی کے ساتھ رہتی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ جوتا پاؤں سے نکالنا ہوگا۔" اس نے معائنہ کر کے کہا۔ "تبھی پاؤں نکل سکتا ہے۔"

"تم ہی جوتا اتار دو۔" لڑکی کراہی۔ "میں تو جھک بھی نہیں سکتی۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" رون نیچے جھک کر بولا۔ یہ کام اس کے لیے بھی آسان نہیں تھا مگر وہ جس جگہ تھا وہاں کسی قدر گنجائش تھی۔

"نینسی!" اس نے جواب دیا۔ "اور تمہارا کیا نام ہے؟"

"رون!" اس نے مختصر جواب دیا۔ "تم لوگ اس ویرانے میں کیا کر رہے ہو؟"

"ہم یہیں رہتے ہیں... اور یہ ویرانہ نہیں ہے، صرف چوتھائی میل دور ہائی وے ہے۔ مگر تم یہاں کیا کر رہے تھے؟"

"میں راستہ بھٹک گیا تھا۔" رون نے اس کی ران پر ہاتھ رکھا اور اس کا سہارا لے کر اس کے جوتے کے تسمے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا ہاتھ لرز رہا تھا اور پیٹ میں مروڑ سی اٹھ رہی تھی۔

"پلیز! میرے پاؤں میں تکلیف ہو رہی ہے۔ تم چٹان کا سہارا بھی لے سکتے ہو۔" نینسی نے التجا کی۔

"نہیں، اس طرح مجھے بہت مشکل ہوگی۔ تمہیں برداشت کرنا ہی ہوگا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں ... پر اپنی گرفت برقرار رکھی۔ اس کا دوسرا ہاتھ ... تسمے کھول رہا تھا۔ نینسی نے اپنے پھنسے پاؤں کو بچانے کے لیے ہاتھوں سے چٹانوں کا سہارا لے لیا۔ ... سست روی سے مجبور ہو کر اس نے پھر کہا۔ "خدا کے ... جلدی کرو۔"

"ایسا کرو، تم خود کوشش کر لو۔" رون سیدھا ہو گیا۔ ... کے انداز میں خفگی تھی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" نینسی جلدی سے ... "پلیز... میں گزشتہ چار گھنٹے سے یہاں پھنسی ہوں۔ ناراض مت ہو۔"

"او کے... او کے!" رون نے اس کے عریاں ... پر ہاتھ رکھا اور اسے سہلانے لگا۔ اس وقت وہ بھول گیا ... کہ اسے پیاس لگی ہے۔ ویسے بھی چٹانوں کے سائے میں خنکی تھی۔

"تم ناراض تو نہیں ہو؟" نینسی نے کسمسا کر کہا۔ ... خوف تھا کہ یہ شخص ناراض ہو کر چلا گیا تو وہ اس جگہ پھنسی ... جائے گی۔

"تمہاری ماں اور بھائی کہاں ہیں؟"

"وہ شاید ٹریلر میں ہیں۔ ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی ... واٹسن کو جاب پر جانا تھا۔"

"یعنی اب یہاں پر سوائے تمہاری ماں کے اور کوئی ... ہے۔" رون نے غور کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں... اور پلیز، مجھے یہاں سے نکالو۔"

رون نے اس کے جوتے کے تسمے کھول دیے تھے۔ ... پھر جھکا اور جوتے کو پاؤں سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ رون نے اس بار نینسی کی ران کا سہارا نہیں لیا تھا۔ جوتا پاؤں سے نکل گیا اور اب وہ پاؤں نکالنے کے لیے زور لگا رہا تھا۔ اس بار رون کے انداز میں سستی کے بجائے عجلت تھی۔ ... خیال نہیں تھا کہ نینسی کے نازک سے پاؤں پر اس زور زبردستی سے کیا گزر رہی تھی۔ وہ تکلیف برداشت کر رہی تھی مگر جب رون نے پاؤں نکالنے کے لیے زوردار جھٹکا دیا تو نینسی ... چیخ ماری۔ "اف... میں مر گئی۔"

"بس... پاؤں نکل گیا۔"

"مجھے تو لگ رہا ہے میرا ٹخنہ ٹوٹ گیا ہے۔"

نینسی کے پاؤں سے خون بہہ رہا تھا۔ رون نے ... بے رحمی سے اس کا پاؤں کھینچا تھا۔ "باہر آؤ۔ اسے د..."

...تی۔" اس نے بے تابی سے کہا۔

نینسی نے کراہتے ہوئے چٹانوں کے درمیان سے نکلنے ... کے لیے زمین پر پاؤں رکھنا بھی دشوار ... پیچھے ہٹ گیا تھا۔ نینسی باہر نکلتے ہی زمین پر ... نے اپنے زخمی پاؤں کا معائنہ کیا۔ وہ سوجنا ... نینسی روتے ہوئے خون روک رہی تھی۔

... مت۔" رون اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "معمولی سا زخم ہے۔"

"تمہیں لگے تو پتا چلے... پلیز! مجھے ٹریلر تک پہنچا دو۔"

رون نے اس کی کمر کے گرد بازو حمائل کیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ نینسی کے شانے پر گیا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے اٹھاتا اسے عقب سے غراہٹ سنائی دی۔ اس نے بوکھلا کر پیچھے دیکھا۔ ایک خوفناک سا بل ٹیریر کھڑا تھا۔ اس کے بھاری جبڑوں سے دانت جھانک رہے تھے۔ نینسی خوشی سے چلائی۔ "جیگر... کم آن... یہ دوست ہے۔"

"یہ تمہارا کتا ہے؟" رون نے بوکھلا کر کہا۔

"ہاں، اس ویرانے میں ہم بغیر تحفظ کے کیسے رہ سکتے ہیں۔ یہ ہمارا محافظ ہے۔ پاپا تو صبح کے گئے شام کو آتے ہیں۔ واٹسن بھی پڑھنے چلا جاتا ہے۔"

نینسی کے کہنے پر کتے نے غرانا بند کر دیا تھا مگر اس کی معاندانہ نظریں رون پر مرکوز تھیں۔ رون کو لگا جیسے وہ اسے دھمکا رہا ہو کہ کوئی غلط حرکت مت کرنا۔ اس نے ایک بار پھر نینسی کی کمر تلے ہاتھ ڈالا اور اسے اٹھالیا۔ اس کا وزن بہت کم تھا مگر اس وقت رون کو بوجھ لگ رہا تھا۔ اس کی پیاس ابھر آئی تھی۔ وہ نینسی کو لے کر ٹریلر کی طرف بڑھا۔ کتا اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"جب تم پھنسی ہوئی تھیں تو یہ کہاں تھا؟"

"یہ ٹریلر کے آس پاس رہتا ہے پھر اس کی سماعت کچھ کمزور ہے اس لیے میری آواز نہیں سن سکا تھا۔" نینسی بولی۔

ٹریلر اس کے اندازے سے زیادہ دور ثابت ہوا تھا۔ وہاں تک پہنچنے میں اس کا حشر ہو گیا تھا۔ اس نے نینسی کو کرسی پر بٹھا دیا اور خود گدھے کی طرح ہانپنے لگا۔ جیگر نے بھونکنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی آواز سن کر اندر سے ایک عورت نکل آئی۔ اس کی سرخ آنکھیں اور بکھرے ہوئے سنہری بال بتا رہے تھے کہ وہ سو رہی تھی۔ اس نے بھی نینسی جیسا مختصر سا لباس پہن رکھا تھا۔ اس میں اور نینسی میں فرق صرف عمر کا تھا۔ نینسی حسن کا چڑھتا سورج تھی تو اس عورت کا شباب نصف النہار پر تھا۔ صورت کی مشابہت بتاتی تھی کہ وہ ماں بیٹی ہیں۔

"نینسی!" وہ اس کو زخمی دیکھ کر بے قرار ہو گئی تھی۔ "یہ کیا ہوا ہے؟"

"میں چٹان سے گر کر پھنس گئی تھی۔" نینسی نے بتایا۔ "یہ رون ہے۔ یہ میری مدد نہ کرتا تو میں اب تک وہیں پھنسی ہوتی۔"

"شکریہ مسٹر رون!" نینسی کی ماں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ کسی قدر گرم تھا اور اس سے لپٹیں سی اٹھ رہی تھیں۔ رون کو جھرجھری سی آگئی۔ "مجھے مسز نارسن کہتے ہیں۔"

"مسز نارسن! میں پیاسا ہوں۔" اس نے کہا۔

"اوہ... آؤ میں تمہیں پانی دوں۔" وہ بولی اور ٹریلر پر

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ، ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ ڈائجسٹ، ماہنامہ سرگزشت ڈائجسٹ

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایات ہیں اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو اس کوپن کو پر کر کے روانہ کریں یا فیکس کریں

(جس پرچے کے بارے میں شکایات ہوں اس پر دائرہ بنادیں)

1 نام..........

2 پتہ..........

3 ٹیلی فون نمبر..........

4 بک اسٹال کا نام / ٹیلی فون نمبر..........

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

ثمر عباس 0301-2454188

بدرالدین سرکولیشن منیجر 5802552-5386783-5804200

فیکس نمبر 5802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 5895313 فیکس: 5802551

چڑھی۔ رون عقب سے اس کے بل کھاتے بدن کو دیکھ کر کچھ سحر زدہ سا رہ گیا تھا۔ وہ بھی اندر آیا۔ مسز نارسن نے اسے فریج سے ایک بوتل نکال کر دی اور خود ڈریسنگ کا سامان نکالنے لگی۔ رون نے پانی پیا تو اس کے حواس بحال ہونے لگے۔ اس نے اردگرد کا جائزہ لیا۔

''یہاں فون نہیں ہے؟''

''نہیں... موبائل فون یہاں کام نہیں کرتا۔ نارسن وائرلیس فون کے لیے کوشش کررہا ہے۔ ممکن ہے، وہ مل جائے۔'' مسز نارسن ڈریسنگ بکس لے کر اس کے پاس سے گزری تو رون کو اس کے پاس سے بھی مہک آتی محسوس ہوئی۔ اس نے بے ساختہ سوچا۔ 'دونوں ماں بیٹی خوب ہیں۔'

وہ بوتل سے پانی پیتا باہر آیا۔ مسز نارسن بیٹی کے پاؤں کی ڈریسنگ کررہی تھی۔ رون نے اس سے کہا۔ ''اسے اسپتال لے جانا چاہیے۔''

''ہاں مگر میں یہ بھاری پک اپ نہیں چلا سکتی... شام کو نارسن آئے گا، وہی لے کر جائے گا۔ ویسے معمولی سا زخم ہے۔ ایمرجنسی نہیں ہے۔''

جیگر کچھ فاصلے پر بیٹھا بہ دستور رون کو گھور رہا تھا۔ مسز نارسن نے مہارت سے نینسی کے پاؤں کی ڈریسنگ کی پھر اسے پین کلر گولیاں دیں۔ ''پلیز! کیا تم اسے لے کر اندر آسکتے ہو؟'' مسز نارسن نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیوں نہیں۔'' رون نے خوش دلی سے کہا اور نینسی کو اٹھالیا۔ وہ اسے ٹریلر کے اندر لایا۔ ٹریلر خاصا بڑا تھا... کوئی بارہ ضرب پچیس فٹ کا۔ اس میں دو عدد بیڈ روم تھے، ایک باتھ اور ایک کچن تھا۔ ٹریلر کو کھینچنے کے لیے آگے ڈاج کا پک اَپ ٹرک تھا۔ رون نے نینسی کو بستر پر لٹادیا اور مسز نارسن نے اسے چادر اوڑھادی۔ ''تم آرام کرو ڈیئر!''

''او کے ممی!'' نینسی بولی۔

''تم کچھ کھاؤ گے مسٹر رون؟'' مسز نارسن اس سے مخاطب ہوئی۔

''ہاں، میں بھوکا ہوں... دراصل میری گاڑی صحرا میں خراب ہوگئی تھی تب سے میں بھٹک رہا تھا۔ اگر تم لوگ نہ ملے ہوتے تو اب تک پیاس سے مر چکا ہوتا۔''

اس بار مسز نارسن نے اسے ٹھنڈی بیئر کی بوتل دی۔ ''جب تک اس سے دل بہلاؤ تب تک میں تمہارے لیے سینڈوچز بناتی ہوں۔''

''یہاں سے ہائی وے کتنی دور ہے؟''

''شمال کی طرف نصف کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔'' نارسن نے سامان نکالا۔

''او کے... میں کھانے کے بعد روانہ ہوجاؤں گا۔''

''تم نے کہاں جانا ہے؟''

''مجھے... مجھے سان سیڈیگو جانا ہے۔'' رون نے جھجک کر کہا۔

''وہ تو یہاں سے خاصا دور ہے۔'' مسز نارسن کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں... وہ تو ہے۔'' رون نے چاروں طرف دیکھا۔ ''تم دونوں کو یہاں رہتے ہوئے ڈر نہیں لگتا؟ یہاں تو دور تک کوئی نہیں ہے۔''

''ہاں... یہ تو ہے مگر ہمارے پاس جیگر ہے... ہمارے پاس اسلحہ بھی ہے۔'' اس نے بتایا۔ اس نے روٹی کے سلائس لے کر سینڈوچز بنانے شروع کردیے۔ ''اسی وجہ سے ہمیں اتنا خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ مجھے رائفل چلانی آتی ہے۔''

''پھر بھی تمہیں محتاط رہنا چاہیے۔''

مسز نارسن نے اس کے سامنے سینڈوچز کی پلیٹ ٹماٹو کیچپ کی بوتل رکھ دی۔ ''کافی پیو گے؟''

''کیوں نہیں۔'' رون نے سینڈوچز پر حملہ کرتے ہوئے کہا۔ اسے شدت سے بھوک لگ رہی تھی۔ مسز نارسن نے کافی کا پانی رکھا اور نینسی کو دیکھنے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی رون نے اٹھ کر دوسرے بیڈ روم میں جھانکا اور رائفل دیوار پر لٹکی دکھائی دی۔ یہ ونچسٹر کا ذرا پرانا ماڈل تھا مگر اس کی حالت بتاتی تھی کہ اس کی باقاعدگی سے دیکھ بھال ہوتی ہے۔ رائفل کے ساتھ اس کی گولیوں کا چمڑے کا بیگ بھی لٹک رہا تھا۔ اسے مسز نارسن کی آہٹ سنائی دی تو وہ جلدی سے اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

''اوہ، پانی کھول گیا۔'' مسز نارسن نے پانی میں انسٹنٹ کافی ملاتے ہوئے کہا۔ ''سوری! میں نینسی کو دیکھنے لگی تھی۔''

''معذرت کی ضرورت نہیں ہے۔'' رون نے میز پر رکھی گوشت کاٹنے والی چھری اٹھائی اور بہ غور مسز نارسن کا جائزہ لیا۔ ''تم بے حد حسین خاتون ہو مسز نارسن!''

مسز نارسن کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ ''شکریہ!'' اس نے جھینپ کر کہا۔

''خاص طور سے تمہارا بدن... بہت ہوش ربا ہے۔'' رون نے ایک قدم اور آگے بڑھایا تو مسز نارسن چونک

مسز نارسن نے شکریہ ادا نہیں کیا اور کافی نکال کر رون کے سامنے رکھ دی۔

''تم کیا کرتے ہو؟''

''میں تحقیق کرتا ہوں۔'' رون نے گول مول سے انداز میں کہا اور کافی کا کپ اٹھالیا۔

''کیسی تحقیق؟'' مسز نارسن کے لہجے میں دلچسپی تھی۔

''انسانی رویوں پر۔'' رون بولا۔ ''مثلاً... میں اجنبی لوگوں اور میں تمہارا بوسہ لینا چاہوں تو تمہارا ردعمل کیا ہوگا۔''

''یہ کس قسم کی تحقیق ہے؟'' مسز نارسن نے غصے سے کہا۔

''میں اسی قسم کے رویوں کی تحقیق کرتا ہوں۔'' رون بولا اور چاقو کی دھار کا معائنہ کرنے لگا۔ ''یہ بہت تیز لگ رہی ہے۔''

مسز نارسن پہلی بار خوف زدہ نظر آنے لگی۔ ''اسے رکھ دو۔'' اس نے ہمت کر کے کہا۔ ''میں اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ کوئی میرے اوزاروں کو ہاتھ لگائے۔''

رون مسکرایا۔ ''اکثر لوگ اسے پسند نہیں کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے، یہ گوشت کاٹنے والی چھری ہے۔''

''ہاں... پلیز! اسے رکھ دو، تمہیں کٹ نہ لگ جائے۔''

رون پھر مسکرایا۔ ''جب میں کوئی تیز دھار آلہ ہاتھ میں لیتا ہوں تو اس بات کا پورا خیال رکھتا ہوں کہ کٹ مجھے نہ لگے۔''

''مسٹر رون! اب تم روانہ ہوجاؤ... ویسے بھی تم نے خاصا دور جانا ہے۔''

''ہاں... جانا تو ہے... مگر مجھے اتنی جلدی بھی نہیں ہے... میں ذرا رک کر بھی جاسکتا ہوں۔ ویسے تم نے کیا سوچا؟''

''کس بارے میں؟''

''ایک بوسے کے...''

''مسٹر رون!'' اس بار مسز نارسن نے بگڑ کر کہا۔

''او کے... او کے... میں بھی یہی ردعمل دیکھنا چاہ رہا تھا۔'' رون نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''میں نے کہا نا، میں ایک محقق ہوں۔''

مسز نارسن نے کچھ کہنا چاہا پھر رک گئی۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تم چلے جاؤ۔ تم نے نینسی کی مدد کی اس کا شکریہ... مگر اب وائسن آنے والا ہے اور وہ اجنبیوں کو پسند نہیں کرتا۔''

''واقعی وائسن آنے والا ہے؟'' رون نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''وہ جس بل میں کام کرتا ہے، اس میں ورکرز کی چھٹی شام چھ بجے ہوتی ہے۔ یعنی وہ ساڑھے چھ بجے سے پہلے نہیں آسکتا اور اس وقت صرف ساڑھے تین بجے ہیں۔''

''تت... تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''وہ سامنے وائسن کی کیپ رکھی ہے۔ اس پر بل کا نام ہے۔'' رون نے اشارہ کیا۔ ''اور اس تصویر میں اس نے یہی کیپ لگا رکھی ہے۔''

''تمہارا مشاہدہ بہت تیز ہے۔'' مسز نارسن نے اعتراف کیا۔ وہ ذرا پیچھے ہوگئی تھی۔

''ایک منٹ!'' رون اچانک اٹھ کر اس کے پاس چلا آیا اور بہ ظاہر بے دھیانی میں چاقو مسز نارسن کے سینے کے قریب لے آیا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم کچھ دیر میرے پاس رہو۔''

''کک... کیوں؟'' مسز نارسن خوف زدہ ہوگئی۔

''بس... میں نہیں چاہتا... تم کسی غلط حرکت کا سوچو... جس سے مجھے غصہ آئے۔'' وہ چاقو اس کے اور قریب لے آیا تھا۔ ''پلیز! میرے ساتھ آؤ۔''

مسز نارسن نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا اور واپس کچن میں آگئی۔ جیگر ٹریلر کے باہر تھا اور جب تک دروازہ نہیں کھولا جاتا، وہ اندر نہیں آسکتا تھا۔ مسز نارسن نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔ ''اب بتاؤ... تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں... کچھ نہیں۔'' رون نے چاقو کی نوک اس کے سینے کے پاس رکھی تھی۔ اس نے چاقو کی نوک سے بلاؤز کے بٹن کو چھیڑا۔ وہ کھل گیا تھا۔ مسز نارسن نے ڈر کر اسے دیکھا۔

''یہ کیا کررہے ہو؟''

''نینسی کیا کررہی ہے؟'' اس نے چاقو کی نوک سے دوسرا بٹن بھی کھول دیا۔ اب بلاؤز صرف ایک بٹن کے سہارے ٹکا تھا۔ مسز نارسن کی شفاف گلابی رنگت نمایاں ہونے لگی تھی۔

''نینسی سو رہی ہے۔''

''گڈ! نینسی سو رہی ہے۔ ابھی وائسن کے آنے میں وقت ہے اور مسٹر نارسن تو شاید اور بھی دیر سے آئیں گے۔ کیا خیال ہے... ہم کچھ اچھا وقت نہ گزار لیں؟''

مسز نارسن کے لب لرزنے لگے تھے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ اس سے کچھ بولا نہیں جارہا تھا۔ رون مسکرایا۔ اس نے چاقو کی نوک تیسرے بٹن کی طرف بڑھائی تھی مگر اسی لمحے باہر جیگر نے بھونکنا شروع کردیا۔ مسز نارسن نے جلدی سے کہا۔ ''کوئی اس طرف آرہا ہے... جیگر اس طرح بھونکتا ہے تو کسی کے آنے کی خبر دیتا ہے۔''

رون نے جلدی سے کچن کی کھڑکی کا پردہ سرکایا۔ مسز

نارسن نے اپنے بلاؤز کے بٹن بند کیے۔ اس نے بھی کھڑکی سے جھانکا۔ چٹانوں کے عقب سے تین عدد بھاری موٹر سائیکلیں برآمد ہوئی تھیں۔ ان پر تین بدمعاش قسم کے افراد سوار تھے۔ ان کو دیکھتے ہی مسز نارسن کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔

''بکنر!'' اس نے زیرلب کہا۔

''کون بکنر؟''

''یہ درمیان والا... باقی دو اس کے ساتھی ہیں... یہ بے حد خطرناک بدمعاش ہے۔''

''اچھا!'' رون نے تشویش سے کہا۔ ''یہ یہاں کیوں آیا ہے؟''

موٹر سائیکل سوار مسلح تھے۔ ان کی کمروں پر لگی شاٹ گنز صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ مسز نارسن اندر لپکی اور اس نے رائفل اتار لی۔ ''ان کو روکنا ہوگا... ان کے ارادے اچھے نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب ہے؟''

''وہ دراصل، یہ نارسن کے دشمن ہیں اور ایک بار انہوں نے راستے میں مجھے تنگ کیا تھا۔ میں کچھ شاپنگ کرنے گئی تھی۔ بکنر نے مجھے دھمکی دی تھی کہ کسی روز وہ نارسن کی غیر موجودگی میں آئے گا اور مجھے... میرا مطلب ہے...''

''میں سمجھ گیا۔'' رون نے جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آج یہ اسی ارادے سے آیا ہے۔''

مسز نارسن کا چہرہ سفید ہوگیا تھا۔ ''پلیز! اسے روکو... یہ بہت درندہ صفت آدمی ہے۔ اسے کئی بار ریپ کرنے کے جرم میں گرفتار کیا جاچکا ہے مگر ہر بار ثبوت نہ ہونے کے باعث اسے رہا کردیا جاتا تھا۔''

رون بھی پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے مسز نارسن سے رائفل مانگی۔ ''یہ مجھے دو اور تم باہر جاکر ان سے بات کرو۔''

''میں... بالکل بھی نہیں۔'' اس نے جلدی سے جواب دیا۔

''اگر تم باہر نہیں جاؤ گی تو وہ اندر آجائیں گے۔'' رون نے اسے خبردار کیا۔

اسی لمحے باہر سے بکنر نے اپنی بھاری آواز میں کہا۔

''مسز نارسن! باہر آجاؤ ورنہ ہمیں اندر آنا ہوگا۔''

''تم باہر جاؤ مگر ان کے قریب مت جانا۔'' رون نے سرگوشی کی۔ ''اگر یہ زبردستی کرنا چاہیں تو بھاگ کر اندر آجانا۔''

''تت... تم کیا کرو گے؟''

''میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کے عزائم کیا ہیں۔''

''ممی! کیا بات ہے؟'' خوف زدہ نینسی اپنے کے دروازے پر نمودار ہوئی۔ ''یہ کون بول رہا ہے؟''

''بکنر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آیا ہے۔'' مسز نارسن نے اس سے کہا۔ ''تم اندر جاؤ اور دروازہ بند کرلو۔''

جیگر باہر آنے والوں پر بھونک رہا تھا۔ ان میں ایک نے اپنی شاٹ گن نکال لی تھی۔ ''میں آرہی ہوں مت چلانا۔'' مسز نارسن جلدی سے چلائی۔ اسے خوف تھا وہ جیگر کو گولی نہ ماردیں۔ وہ دروازہ کھول کر باہر آئی۔ ''چپ کرو... اندر جاؤ۔''

خوں خوار جیگر خاموشی سے ٹریلر کے اندر چلا گیا۔ مسز نارسن ان تینوں سے ذرا فاصلے پر رکی۔ بکنر بھاری جسامت کا شخص تھا۔ اس کا سر صاف تھا اور دونوں طرف لٹکتی مونچھیں تھیں۔ اس نے اپنی ننھی سی آنکھوں سے مسز نارسن کا جائزہ لیا اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''تم پہلے سے زیادہ حسین ہوتی جارہی ہو مسز نارسن۔''

''سنو... یہ نارسن اور تمہارا معاملہ ہے، اس میں مجھے کیوں گھسیٹ رہے ہو؟'' مسز نارسن نے کہا۔ ''نارسن میرا شوہر ہے مگر وہ باہر کیا کرتا ہے...''

''کیا کرتا ہے... کل اس نے میرے بھائی کے ساتھ کیا۔'' بکنر نے زمین پر تھوکا۔ ''میں نے سوچا ہے کچھ حساب بے باق کردیا جائے۔ کیا خیال ہے، تم شرافت سے مانو گی یا ہمیں زبردستی کرنا ہوگی۔ دوسری صورت میں اس کا امکان ہے کہ تم ماں بیٹی زندہ بچو... ورنہ ہم کچھ اچھا وقت گزار کر واپس چلے جائیں گے۔''

'ایک نہ شد دو شد' مسز نارسن کو خیال آیا۔ اندر رون اس کے ساتھ اچھا وقت گزارنے کا خواہش مند تھا اور یہاں بکنر اور اس کے ساتھی تھے۔ وہ آہستہ سے پیچھے ہٹی۔ ''تم لوگ اس کا انجام جانتے ہو؟''

''ہمیں انجام کی پروا ہوتی تو یہاں کیوں آتے۔'' بکنر نے قہقہہ مار کر کہا اور بانک سے اترا تھا کہ مسز نارسن بھی اور اس نے ٹریلر میں گھس کر دروازہ بند کردیا۔ نینسی کے روم کا دروازہ بند تھا اور جیگر بھی اسی کے پاس تھا۔ رون کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔

''تم نے ان کے عزائم سن لیے ہیں؟''

رون نے سر ہلایا اور دل میں سوچا۔ 'تم دونوں ماں بیٹی چیز ہی ایسی ہو۔' پھر منہ سے بولا۔ ''فکر مت کرو... میں سے دوسری زبان میں بات کرتا ہوں۔'' اس نے رائفل کی اور ٹریلر کے دروازے کے سامنے آیا۔ اس وقت تک

دروازے کے نزدیک آچکا تھا۔ رون اسے جھری سے دیکھتا رہا پھر اس نے اچانک دروازہ کھول کر بکنر کے سر میں گولی مار دی۔ دھماکے کے ساتھ اس کا سر اڑ گیا تھا۔ اسے کچھ کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ اس کا لاشہ نیچے گرا۔ مسز نارسن نے ہذیانی چیخ ماری۔ پھر نہ جانے اس میں کہاں سے اتنی جرأت آ گئی کہ اس نے یک دم عقب سے رون کو دھکا دیا اور وہ بکنر کی سر بریدہ لاش پر جا گرا۔ مسز نارسن نے چھت پر لگا لیور کھینچ لیا جو دروازے کو ہائیڈرولک پریشر سے بند کر دیتا تھا۔ جب تک رون اٹھتا، دروازہ بند ہو گیا تھا۔ اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان نکلا اور فوراً ہی اسے جان بچانے کے لیے ٹریلر کے نیچے گھسنا پڑا... کیونکہ بکنر کے دونوں ساتھی اندھا دھند گولیاں برسانے لگے تھے اور جب انہوں نے اپنے باس کی بنا سر کی لاش دیکھی تو ان کے منہ سے بھی گالیاں ابلنے لگیں۔ ان میں سے ایک رون کو تلاش کرنے کے لیے نیچے جھکا تو رون نے اسے بھی گولی مار دی۔ گولی اس کے گلے کے آر پار ہو گئی تھی اور وہ نیچے گر کر تڑپنے لگا تھا۔ تیسرا بدحواس ہو کر اپنی بائیک کی طرف بھاگا۔ ایک منٹ میں اپنے دو ساتھیوں کے مارے جانے سے اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

رون پر خون سوار تھا۔ اس نے ٹریلر کے نیچے سے لیٹے لیٹے بھاگتے شخص پر دو فائر کیے۔ دونوں گولیاں اس کی پشت میں پیوست ہو گئیں۔ اس نے ہاتھ بلند کر کے بھیانک چیخ ماری اور منہ کے بل زمین پر گر کر ساکت ہو گیا۔ رون ٹریلر کے نیچے سے نکلا۔ اس نے پاؤں سے چھیڑ کر منہ کے بل گرے شخص کو دیکھا، وہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ رون مطمئن ہو کر ٹریلر کے سامنے والے رخ پر آیا۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر ہائیڈرولک پریشر نے اسے سختی سے بند کر دیا تھا۔ جب تک اسے نہ ریلیز کیا جاتا، کوئی ہرکولیس بھی یہ دروازہ نہیں کھول سکتا تھا۔

"مسز نارسن... تم میری آواز سن رہی ہو؟" رون نے چلّا کر کہا۔ "دروازہ کھول دو ورنہ میں اسے گولی مار کر کھول لوں گا۔"

"تم اسے گولی مار کر بھی نہیں کھول سکتے۔" مسز نارسن نے اندر سے کہا۔ "یہ بے حد مضبوط ہے۔ باقی تم کسی کھڑکی کے راستے بھی اندر نہیں آ سکتے۔ تمام کھڑکیاں بہت اونچی ہیں اور ان سب پر فولادی گرلز ہیں۔"

رون نے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ اس نے غصے میں دروازے پر فائر کیے۔ گولیاں اس میں سے سوراخ کرتی گزر گئی تھیں مگر وہ کھلا نہیں تھا۔ باقی ٹریلر کی باڈی مضبوط تھی۔ اس میں سے گولی بھی نہیں گزر سکتی تھی۔

"مسز نارسن! اگر تم باہر آ جاؤ تو میرا وعدہ [illegible] تمہارے ساتھ [illegible] کچھ وقت گزار کر میں واپس چلا جاؤں [illegible] تمہیں خراش بھی نہیں آئے گی۔"

"اگر میں باہر نہ آؤں تو تم کیا کر لو گے؟"

"میں... کیا کروں گا؟" رون نے مکاری سے کہا۔ "[illegible] ابھی بتاتا ہوں۔"

اس نے پک اپ کے ڈیزل ٹینک کا ڈھکن کھولا [illegible] حصے میں رکھا کین اور ہوز پائپ نکال کر اس کی مدد [illegible] ڈیزل، کین میں منتقل کرنے لگا۔ ٹنکی فل تھی اور اس میں کم سے کم دس گیلن ڈیزل تھا۔ اس نے دو گیلن ڈیزل نکال [illegible] اس کے بعد اس نے یہ ڈیزل ٹریلر کے ٹائروں پر چھڑکا۔ [illegible] میں آگے پیچھے آٹھ عدد ٹائر تھے۔ مسز نارسن شاید اندر سے [illegible] کی یہ کارروائی دیکھ رہی تھی۔ اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"تم تینوں کو زندہ روسٹ کرنے کا انتظام۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ اس کا اشارہ مسز نارسن، نینسی اور جیگر کی طرف تھا۔ "تم سوچ سکتی ہو جب اس فولادی ٹریلر کے نیچے اس کے ٹائر جلیں گے تو یہ ٹریلر اندر سے اوون بن جائے گا اور تم سب اس میں روسٹ ہو جاؤ گے۔"

"نہیں، خدا کے لیے۔" مسز نارسن دہشت زدہ اند[illegible] میں چلائی۔ "ایسا مت کرنا۔"

"او کے! میں ایسا نہیں کروں گا۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم [illegible] آ جاؤ۔"

"میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" مسز نارسن رونے لگی۔

"کچھ بھی نہیں..." رون نے اعتراف کیا۔ "سارا قصور تمہارے حسن کا ہے۔ اسے دیکھ کر کسی بھی مرد کا دل مچل سکتا ہے... اور آئندہ کے لیے میں ایک مخلصانہ مشورہ دوں گا۔ اس ویرانے میں اس طرح جامے سے باہر مت رہنا۔ یہ مشورہ نینسی کے لیے بھی ہے۔ ممکن ہے تم معقول لباس میں ہوتیں، میرا ذہن اس طرف نہ جاتا اور میں شرافت سے کھا پی کر رخصت ہو جاتا اور تم آرام سے رہتیں... لیکن نہیں، میں چلا جاتا تو ان بدمعاشوں سے تمہیں کون بچاتا؟"

"یہ تم بچا رہے ہو؟" مسز نارسن روہانسی ہو کر بولی۔ "تم میں اور ان میں کیا فرق ہے؟"

"تم بھول رہی ہو، وہ تمہیں قتل کرنے آئے تھے اور میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"ممی... میں باہر جا رہی ہوں۔" نینسی کی آواز آئی

"میں آنے کے لیے تیار ہوں۔"

رون نے سرد آہ بھری۔ "اگرچہ تم بھی خوب ہو... مگر کیا کروں جو تمہاری ممی پر [illegible] گیا ہے۔ اور ویسے بھی [illegible] سے کچھ حساب برابر کرنا ہے۔"

"کیسا حساب؟" مسز نارسن نے اندیشے سے کہا۔

"[illegible] نے دھوکے سے مجھے ٹریلر سے باہر دھکیل دیا تھا اور میں مرتے مرتے بچا... میری قسمت کہ مجھے کوئی گولی نہیں لگی تھی۔"

"تم مجھے مار دو گے؟"

"نہیں، میں عورتوں کو قتل کرنے کا قائل نہیں ہوں... یہ صرف پیار کرنے کے قابل ہوتی ہیں۔ اب تم باہر آ رہی ہو یا میں ٹائروں کو آگ لگاؤں؟" رون کا لہجہ درشت ہو گیا تھا۔

"نہیں، میں آ رہی ہوں۔" مسز نارسن نے جلدی سے کہا۔ اس نے ہائیڈرولک پریشر ختم کیا تو سنسناتی آواز کے ساتھ ٹریلر کا دروازہ کھل گیا۔ جیسے ہی مسز نارسن نیچے آئی، دروازہ خود بہ خود بند ہو گیا۔ یقیناً اندر نینسی نے لیور کھینچ لیا تھا۔ رون نے رائفل کا رخ مسز نارسن کی طرف کر رکھا تھا۔ اس نے اشارے سے مسز نارسن کو آگے آنے کو کہا۔

"تم بھی بچ نہیں سکتے۔" اس نے نفرت سے کہا۔

"تم میری فکر مت کرو۔ ایسا کرو ادھر پک اپ کی طرف آؤ۔ اس کا عقبی حصہ مناسب رہے گا۔" رون نے شیطانی لہجے میں کہا۔

وہ دونوں اس طرف آئے۔ رون اب بھی محتاط تھا مگر مسز نارسن کو نزدیک پا کر اس کے اندر کا مرد بے پروا ہو گیا۔ اس نے رائفل پک اپ کی چھت پر رکھ دی اور مسز نارسن کو دبوچ لیا۔ وہ بے بسی سے چلائی۔ "چھوڑو مجھے۔"

رون اس کی فریاد پر توجہ دینے کے بجائے اپنے حیوانی عزائم کے حصول کی فکر میں تھا مگر اس وقت بھی وہ ٹریلر کے دروازے کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "کتیا! آرام سے رہ... ورنہ تیری بیٹی کو زندہ جلا دوں گا۔"

اس دھمکی نے مسز نارسن کو مزاحمت ترک کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ خاموشی سے رون کی درندگی برداشت کرنے لگی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ حد سے گزرتا، اچانک پک اپ کے دوسری جانب سے کلک کی آواز آئی۔ رون نے چونک کر اپنا سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں کے عین سامنے شاٹ گن کی نال تھی اور یہ شاٹ گن بکنر کے اس ساتھی کے ہاتھ میں تھی جو پشت پر دو گولیاں کھانے کے باوجود زندہ تھا۔ اس نے نہ جانے کس طرح اٹھ کر اپنی شاٹ گن نکال لی تھی۔

"تت... تم..."

"جہنم میں جاؤ۔" اس نے نفرت سے کہا اور گولی چلا دی۔ شاٹ گن کے خوفناک بلٹ نے رون کا سر اڑا دیا تھا اور وہ ہوا میں اچھل کر پک اپ سے نیچے جا گرا۔ اس نے اچھلتے ہوئے مسز نارسن کو بھگو دیا تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھی۔ اس نے جلدی سے اپنا چیتھڑے ہو جانے والا بلاؤز اٹھا کر پہنا اور ٹریلر کے دروازے کی طرف بھاگی۔ رون کو گولی مارنے والا کچھ دیر حیرت سے اسے دیکھتا رہا پھر دھڑام سے نیچے گر گیا۔ ٹریلر کا دروازہ کھلا اور نینسی باہر نکل کر ماں سے لپٹ گئی۔

"ممی! تم ٹھیک ہو نا؟" اس نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں..." مسز نارسن نے اسے تسلی دی۔ "تم تو ٹھیک ہو نا؟"

"جی ممی!" نینسی نے کہا۔ اسی لمحے ہائی وے کی طرف سے ایک پولیس کار اس طرف آئی۔ وہ رکی اور اس سے شیرف جیمس نارسن اترا۔ اس نے تشویش سے وہاں پڑی لاشوں کو دیکھا اور ٹریلر کی طرف آیا۔ اس نے بیوی اور بیٹی کو زندہ سلامت دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔ وہ دونوں دوڑ کر اس سے لپٹ گئی تھیں۔ مسز نارسن جلدی جلدی شوہر کو سب بتانے لگی۔ ساری بات سننے کے بعد شیرف نارسن لاشوں کی طرف آیا۔ "میں نے کل بکنر کے بھائی کو گرفتار کیا تھا۔ کچھ دیر پہلے مجھے اطلاع ملی تھی کہ بکنر دو ساتھیوں کے ہمراہ اس طرف دکھائی دیا ہے۔ میں اسی وجہ سے آیا ہوں۔"

"ہم اس شخص کی وجہ سے بچے۔" مسز نارسن نے رون کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ "لیکن ان تینوں کو مارنے کے بعد اس نے مجھ پر دست درازی کی کوشش کی تھی اور پھر اس شخص نے اسے گولی مار دی۔" مسز نارسن نے بکنر کے آخری ساتھی کی طرف اشارہ کیا، وہ بھی مر چکا تھا۔

شیرف نارسن نے جھک کر سر بریدہ رون کو دیکھا پھر اس کے بائیں ہاتھ کا معائنہ کیا اور گہری سانس لے کر بیوی کی طرف دیکھا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ اس سے بچ گئیں۔ یہ پولیس کی حراست سے فرار ہوا تھا۔ اس پر کم سے کم نصف درجن عورتوں کی آبرو ریزی کا جرم ثابت ہو چکا تھا اور اسے بارہ برس کی سزا ہوئی تھی۔"

"شکر ہے۔" مسز نارسن نے خوف سے جھرجھری لی۔ "انہوں نے خود ہی ایک دوسرے کو ختم کر دیا۔"

www.urdutech.com

شناخت

راؤ رشید خان

جاسوسی ڈائجسٹ کا نیا ہنگامہ خیز سلسلہ

اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں ، ایک بے شناخت کا احوال
ثبات اس کی تعمیر میں مضمر ، خرابی کی ایک صورت اسے یہاں
وہاں لیے پھر رہی تھی کبھی اس ڈگر ،کبھی اس ڈگر ...بادلوں سا
اڑتا ، ہواؤں سے لڑتا وہ اپنی اصل کو کھوجتا پھر رہا تھا دنیا کی
بھیڑ میں اسے اپنے بھی ملے اور بیگانے بھی ،دوست بھی اور دشمن
بھی ...حتی کہ اپنا عکس بھی ! بس وہی مل کے نہیں دے رہا تھا جس
کی اسے تلاش تھی اپنے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان معلق اپنے
وجود میں بے وجودی کا شکار تھا اور آباد ہو کر بھی برباد !

آئینہ خانۂ دہر میں چہرہ چہرہ خود کو کھوجتے ،ایک بے شناخت کی روداد

دھما کے صرف توپ کے گولوں سے نہیں کیے جاتے۔ کبھی کبھی انسان کی زبان بھی ایسا بارود اگلتی ہے کہ سننے والوں کے دل و دماغ سن ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان لمحات میں میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ وکی کی دائی ماں دانیا نے بات نہیں کی تھی' دھما کا کیا تھا۔ گہری رازدارانہ سرگوشی میں کہا تھا۔ ''تمہارے منہ سے میرے دودھ کی مہک نہیں آرہی ہے وجی...!''

میں ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ شدید حیرانی اور بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے میرا نام لیا تھا۔ درست نام لیا تھا... مجھے وجی کہہ کر مخاطب کیا تھا... یا اللہ! یہ تو میں نے سوچا بھی نہ تھا کہ اتنی جلدی میرا بھید کھل جائے گا۔

وہ بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ گہری سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ پھر بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

ان لمحات میں ایسا لگ رہا تھا جیسے بگ باس کے تمام مسلح محافظوں کے ہتھیاروں کا رخ اچانک ہی میری طرف ہو گیا ہو۔ میں وکی بن کر وہاں پہنچا ہوا تھا اور بڑی کامیابی کے ساتھ سب ہی کو دھوکا دے رہا تھا۔ یہ نہیں جانتا تھا کہ کوئی دائی ماں وہاں آکر پہلے ہی روز میری چوری بھانپ لے گی۔

چوری پکڑی جا رہی تھی۔ میرے سر پر خطرہ منڈلا رہا تھا۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسی صورتِ حال میں کیا کروں؟ بگڑتے ہوئے حالات کو کیسے سنبھالوں؟

اس محل کے اندر اور باہر دور دور تک پھیلے ہوئے وسیع و عریض علاقے پر بگ باس کا راج تھا اور مجھے اس کی راج دھانی میں کہیں کوئی جائے پناہ ملنے والی نہیں تھی۔ میں بستر کے سرے پر بیٹھ کر سوچ رہا تھا اور سوچتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس دوران دانیا بڑی خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ ایسے وقت میرے دماغ میں اس کی آواز گونجنے لگی۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے بگ باس اور اس کے مسلح کارندوں کے بارے میں کہا تھا۔ ''وہ نادان ہیں۔ جو ان کی سمجھ میں آرہا ہے وہی سمجھ رہے ہیں۔ مگر یہ دائی ماں نادان نہیں ہے...''

یعنی وہ صرف ایک ایسی ہے جو میری اصلیت تک پہنچ رہی ہے۔ میرے دماغ نے کہا۔ ''اگر اپنی سلامتی چاہتے ہو تو اس ایک خاتون کو اس بات پر قائل کرو کہ تم وکی ہو۔''

فی الحال بچاؤ کا یہی ایک راستہ تھا لیکن اس کا انداز اور مستحکم لب و لہجہ سمجھا رہا تھا کہ اس نے جو کہا ہے' پورے یقین کے ساتھ کہا ہے... اور اس کے یقین کو بے یقینی میں بدلنا آسان نہ ہوگا۔ پھر بھی کوشش تو کرنی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''تم نے ابھی کیا نام لیا تھا؟''
وہ بولی۔ ''تمہارا نام لیا تھا۔ تعجب ہے اپنے ہی نام سے ان جان بن رہے ہو؟''
میں ایک ہاتھ سے پیشانی کو سہلانے لگا۔ یوں ظاہر کرنے لگا' جیسے کسی الجھن میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ پھر بولا۔ ''کیسی بے بسی ہے؟ قدرتی حالات نے مجھے اپنی ہی ذات سے اَن جان بنا دیا ہے۔ میں کون ہوں؟ اب تک ہر ایک کی زبان سے یہی سنتا رہا کہ وکی ہوں۔ لیکن اب تم کہہ رہی ہو کہ میں وکی نہیں ہوں۔''
''کیونکہ یہ دودھ پلانے والی دھوکا نہیں کھا سکتی۔''
میں نے میز پر رکھی ہوئی وکی کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تو پھر یہ کون ہے؟ کیا یہ میں نہیں ہوں؟''
میں نے دیوار گیر تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا وہ میں نہیں ہوں؟''
وہ ان تصویروں کو بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ میرا بیٹا وکی ہے۔''
میں نے ذرا جھنجھلاہٹ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے الجھا رہی ہو۔ میری صورت دیکھو... دیکھو...!''
میں اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی بڑی سی تصویر کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا پھر بولا۔ ''کیا یہ ہو بہو میں نہیں ہوں؟ یہی ناک نقشہ یہی رنگ روپ۔ اور... اور یہ دیکھو...!''
میں بولتے بولتے دیوار کی طرف گھوم گیا۔ اب میری پشت اس کی طرف تھی۔ میں نے شرٹ کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اس نشان کو دیکھو...! اسے دیکھنے اور تصدیق کرنے کے بعد ہی مجھے یہاں لایا گیا ہے۔ تم بھی دیکھو اور بتاؤ کہ کیا یہ وکی کی یعنی میری نشانی نہیں ہے؟''
اس نشان کو دیکھ کر اسے چپ سی لگ گئی۔ وہ مجھے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ میں شرٹ نیچے کرتا ہوا واپس اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ وہ بولی۔ ''ذرا پھر سے دکھانا۔''
مجھے ڈاکٹر کی کاری گری پر پورا بھروسا تھا۔ لیکن جب اس نے دوبارہ دکھانے کا مطالبہ کیا تو میں تھوڑا گڑبڑا گیا۔ دل میں اندیشہ پیدا ہوا۔ ''کیا اسے نشان کی مماثلت میں کوئی فرق دکھائی دے رہا ہے؟''
میں نے ہچکچا کر اسے دیکھا۔ پھر گھوم کر شرٹ دوبارہ اوپر اٹھا دی۔ اگرچہ وہ میری اصلیت پہچان رہی تھی۔ پورے یقین کے ساتھ مجھے وجی کہہ کر مخاطب کر چکی تھی لیکن میں اپنے طور پر اسے الجھانے کی کوششیں کر رہا تھا۔ وہ میری طرف جھک کر اس نشان کو غور سے دیکھتی رہی۔ پھر پیچھے ہٹ گئی۔
میں نے شرٹ نیچے کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا یہ نشان کیا کہہ رہا ہے؟''
میری ڈرامے بازی شاید رنگ لا رہی تھی۔ اس کے ہونے کے انداز میں بولی۔ ''بلاشبہ یہ نشان وہی ہے۔ یہ وہ نہیں ہو۔''
میں نے جواباً کچھ نہ کہا۔ خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے کہا۔ ''میرا وکی ایسا نہیں تھا' جیسے تم ہو۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی عادت کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ تم نے کے بعد قیلولہ کے لیے یہاں چلے آئے جبکہ اس نے اپنی زندگی میں کبھی قیلولہ نہیں کیا۔''
میں اپنی ایسی نادانی پر سر تھام کر رہ گیا۔ وہ بولی۔ ''جب تم نے مجھ سے مصافحہ کیا تھا' تب ہی میں چونک گئی تھی۔ تمہارے ہاتھ سے مجھے اپنے بیٹے کا لمس نہیں مل رہا تھا... اور ملتا بھی کیسے جب وہ ہاتھ وکی کا تھا ہی نہیں...''
وہ درست کہہ رہی تھی۔ مصافحہ کرتے وقت اس نے جو ردعمل ظاہر کیا تھا، اس سے میں بھی ایک ذرا گڑبڑا گیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''اگر ایسی ہی بات تھی، تمہاری چھٹی حس الارم بجا رہی تھی تو تم نے کسی سے کچھ کہا کیوں نہیں؟ اس وقت خاموش کیوں رہیں؟''
''میں پہلے تمہیں پرکھنا چاہتی تھی۔ دیکھنا چاہتی تھی کہ میری چھٹی حس نے جو الارم بجایا ہے' وہ کس حد تک درست ہے؟''
میں نے کہا۔ ''اگر میں وکی نہ ہوتا تو کوئی اور بھی مجھے پہچانتا۔ جب سے یہاں آیا ہوں' لیلیٰ ہمہ وقت میرے ساتھ رہتی ہے۔ کسی شبے کے بغیر مجھے وکی کی حیثیت سے پہچان رہی ہے اور ایک وہی کیا... بگ باس سمیت یہاں سب ہی مجھے یعنی اپنے وکی کو پہچان رہے ہیں۔''
وہ بولی۔ ''میں نے کہا نا' یہ سب نادان ہیں۔ ان کے پاس دیکھنے کے لیے ماں کی آنکھیں نہیں ہیں۔ بیٹے کی آواز اور لب و لہجہ سننے کے لیے ماں کے کان نہیں ہیں۔ وہ حس نہیں ہے جو اپنے دودھ سے پل بڑھ کر جوان ہونے والے کو چھوتے ہی ایک ماں کے دل پر دستک دینے لگتی ہے۔ یہاں سب ہی اپنی آنکھوں سے جو دیکھ رہے ہیں' اسے قبول کر رہے ہیں۔ دماغ جو سمجھا رہا ہے' اسے سمجھ رہے ہیں۔ لیکن میں...''
وہ بولتے بولتے چپ ہوگئی۔ پھر اپنا دایاں بازو میرے سامنے کر کے پانچوں انگلیوں کو نوالہ بنانے کے انداز میں جوڑتے ہوئے بولی۔ ''میرے ان ہاتھوں نے اسے پہلا نوالہ کھلایا۔ میری انگلی تھام کر پاؤں پاؤں چلنا سیکھا۔ وہ کہیں بھی جائے، کسی بھی حال میں رہے' میری تربیت اس کے

ساتھ رہتی ہے۔ میں ابھی تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ تمہارے اٹھنے بیٹھنے' چلنے پھرنے اور کھانے پینے میں کہیں بھی میری وکی کی جھلک دکھائی نہیں دے رہی ہے۔''
میں نے بات بناتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنی سابقہ زندگی کی ایک ایک بات کو بھولا ہوا ہوں۔ تم میری دائی ماں ہو۔ الجھے ہوئے کو مزید بھٹکانے کے بجائے پلیز... راستہ دکھاؤ۔ میری راہنمائی کرو۔''
وہ زیرلب مسکرانے لگی پھر بولی۔ ''تم واقعی وکی کے بھائی ہو۔ اسی کی طرح ضدی اور اپنی بات پر قائم رہنے والے...''
''تم کیا سمجھ رہی ہو... میں خوامخواہ ضد کر رہا ہوں؟''
وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''خوامخواہ نہیں، تم اپنی سلامتی کے لیے ضد پر اڑے ہو۔''
میں نے ایک دم سے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بولی۔ ''کیونکہ یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ یہاں تمہارا بھید کھل گیا اور بگ باس کو تمہاری اصلیت معلوم ہوگئی تو کیا ہوگا۔''
میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ وہ بولی۔ ''سب ہی کو اپنی سلامتی عزیز ہوتی ہے۔''
اس کی باتوں سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ میں اس کے آگے سر پھوڑوں گا، تب بھی وہ مجھے وکی کی حیثیت سے قبول نہیں کرے گی۔ میرے دل نے کہا۔ ''جب یہ مجھے پہچان چکی ہے تو اب جان بوجھ کر دھوکا کیوں کھائے گی؟''
میں وہاں بے دست و پا تھا۔ مکمل طور پر بگ باس کی پناہ میں تھا۔ اس کی فولادی پناہ گاہ سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اس نے یادداشت کی بحالی کے لیے دائی ماں کو میرے پاس پہنچایا تھا اور اب وہ اس کے کانوں تک یہ ناقابلِ یقین خبر پہنچانے والی تھی کہ میں وکی نہیں وجی ہوں۔ بگ باس سمیت سب ہی کو الو بناتا ہوا اس کے کسی خفیہ اڈے میں پہنچا ہوا ہوں۔ یعنی اس کے سائے میں رہ کر اسی کی جڑیں کاٹنے آیا ہوں۔
اور یہ بات یقیناً بگ باس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی۔ وہ غصے اور جنون میں میرے خلاف بہت کچھ کر سکتا تھا۔ ممکن ہے' مجھے ایک کے بعد دوسری سانس نہ لینے دیتا اور یہ بھی ممکن ہے کہ میرے ذریعے نانا جان کو بلیک میل کرتا۔ ان سے اپنے وہ مطالبات تسلیم کروالیتا جن کے سلسلے میں نانا جان ہمیشہ انکار کرتے آرہے ہیں۔
پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟ ویسے یہ سیدھی اور صاف سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ دشمنوں کے چنگل میں رہتے ہوئے کچھ اچھا نہ ہوتا۔ میرے ساتھ بھی بہت برا ہونے والا تھا۔ مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ میں نے پاپا کو دیکھنے' ان سے ملنے اور ان کے بارے میں جاننے کے لیے جس خطرناک ماحول میں قدم رکھا تھا، وہاں اپنے مقصد کی شروعات میں ہی ناکامی سامنے آرہی تھی۔ اس وقت میں دائی ماں کے رحم و کرم پر تھا اور یہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ اسے قائل نہیں کر سکوں گا۔
میں نے گویا اس کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تم نے درست کہا۔ سب ہی کو اپنی سلامتی عزیز ہوتی ہے۔ لیکن میری سلامتی اب میرے ہاتھ میں نہیں' تمہارے بتیس دانتوں کے درمیان ہے۔ تم جب بھی زبان کھولو گی، میری کم بختی آجائے گی۔''
وہ زیرلب مسکرانے لگی۔ میں اس کی مسکراہٹ کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اس نے کہا۔ ''بھید تو دشمن کھولتے ہیں۔''
میں نے ذرا چونک کر اسے دیکھا۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''مجھے سمجھاؤ۔ میں تمہیں دشمن سمجھوں یا دوست...؟''
وہ بڑے میٹھے لہجے میں بولی۔ ''تمہیں سمجھانے کے لیے اتنا کافی ہوگا کہ کوئی ماں اپنے بیٹے کی دشمن نہیں ہو سکتی۔''
میں نے ایک بار پھر چونک کر اسے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''
اس کے چہرے پر افسردگی سی پھیل گئی۔ وہ شکستہ لہجے میں بولی۔ ''میں اپنے ایک بیٹے کو کھو چکی ہوں۔ اب دوسرے کو کھونا نہیں چاہوں گی۔''
وہ بولتے بولتے چپ ہوگئی۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ میں بھی بھائی کی یاد میں افسردہ سا ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد دانیا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بوڑھی ماں جوان بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت کر رہی تھی۔ یہ سوچ کر دکھ ہوتا تھا کہ میں کیسی بدقسمت ہوں۔ مجھے اس کا آخری دیدار بھی نصیب نہ ہوا۔ پھر جب آج بگ باس کی طرف سے یہ خوشیوں بھرا پیغام موصول ہوا کہ میرا وکی زندہ ہے اور اس کی یادداشت کی بحالی کے لیے مجھے یہاں بلایا جا رہا ہے تو میں خوشی سے باؤلی ہوگئی۔ بیٹے کو دیکھنے' چھونے اور دھڑکنوں سے لگانے کے لیے دیوانوں کی طرح یہاں پہنچی تو تم سے مل کر شدید مایوسی ہوئی۔''
وہ ذرا دیر کے لیے چپ ہوئی۔ پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''اور یہ صدمہ پھر سے تازہ ہوگیا کہ میرا بیٹا اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔ میں اسے ایک بار کھونے کے بعد دوبارہ کبھی نہیں پا سکوں گی۔ میں صبح سے اب تک تمہیں

دیکھتی رہی۔ سوچتی رہی۔ تمہاری صورت میں مجھے اپنا وکی دکھائی دیتا رہا۔ تب میرے دماغ میں یہ بات آئی کہ ایک بیٹا ہی دوسرے بیٹے کا نعم البدل ہوسکتا ہے۔ اوپر والا مجھ سے راضی ہے۔ اس نے ایک کا غم بھلانے کے لیے دوسرے کو میرے پاس پہنچادیا ہے۔''

وہ بول رہی تھی اور میں اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہاں کوئی مجھ پر ذرا سا بھی شبہ نہیں کرسکا ہے۔ لیکن تم پہلے ہی روز آکر میری اصل شناخت تک پہنچ گئی ہو اور یہی بات میرے لیے خطرناک ہے۔''

''خطرناک تو تب ہوگی جب میں تمہارا بھید کھولوں گی۔ ہم ایک دوسرے کے راز دار بن کر رہیں گے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ وہ میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے۔ میں تمہارے بہت کام آسکتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''دائی ماں ہونے کے ناتے وکی سے تمہارا گہرا رشتہ تھا۔ تم اس کے بہت سے معاملات سے واقف ہوگی۔ یقیناً ہمارے پاپا کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتی ہوگی؟''

''صرف اتنا ہی جانتی ہوں کہ ان کا نام قربان علی واسطی ہے اور انہوں نے وکی کو بگ باس کی سرپرستی میں دے کر خود روپوشی اختیار کی ہوئی ہے۔''

میں نے پہلو بدل کر پوچھا۔ ''تم نے انہیں دیکھا ہے؟''

''وکی چند ماہ کا تھا، تب وہ اس سے ملنے کے لیے میرے پاس آئے تھے۔ اس کے بعد میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔''

اس نے ذرا ٹھہر کر پوچھا۔ ''ویسے تمہارا یہ سوال مجھے کچھ عجیب سا لگا ہے۔ تم اپنے پاپا کے بارے میں ایسے پوچھ رہے ہو جیسے انہیں جانتے نہیں ہو؟''

میں نے سر جھٹک کر کہا۔ ''جان پہچان تو بہت دور کی بات ہے، میں نے تو ان کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔''

وہ میری بات سن کر چونک گئی۔ بے یقینی سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ ''آخر یہ تمہارے پاپا ہیں کیا؟ اِدھر وکی کو بگ باس کے حوالے کیا ہوا تھا، اُدھر تم سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھا۔ حتیٰ کہ تمہیں اپنی صورت تک نہیں دکھائی۔ آخر ان کا مسئلہ کیا ہے؟''

میں اسے سرسری طور پر اپنے تمام حالات سے آگاہ کرنے لگا۔ وہ میری باتیں سننے کے بعد بولی۔ ''مجھے تمہاری ماما سے ہمدردی ہے۔ یہ سن کر افسوس ہو رہا ہے کہ ایک حیا والی عورت کو کس طرح ذہنی طور پر ٹارچر کیا گیا؟''

''میں اس ظلم کا حساب لینے کے لیے ہی یہاں آیا ہوں۔''

''اور جہاں تک ممکن ہوگا' میں تمہارا ساتھ دیتی رہوں گی۔''

میں نے کچھ سوچ کر دروازے کی طرف دیکھا پھر اس سے کہا۔ ''میں لیلیٰ کی وجہ سے کچھ اپ سیٹ ہوں۔''

''میں اسے جانتی ہوں۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ تمہیں اس کی طرف سے کوئی خطرہ ہے؟''

میں نے ایک ذرا ہچکچا کر اسے دیکھا پھر دل ہی دل میں کہا۔ ''کیا بتاؤں؟ میری عزت کو خطرہ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''دراصل... وہ مجھے وکی سمجھ رہی ہے۔''

میں بولتے بولتے رک گیا۔ وہ بولی۔ ''اسے سمجھنا بھی چاہیے۔''

''نہیں۔ میرا مطلب ہے... اس کے اور وکی کے درمیان اچھے خاصے گہرے تعلقات رہے ہیں اور جبکہ وہ مجھے وکی سمجھتی ہے...''

وہ زمانہ شناس تھی۔ میری ادھوری بات کو فوراً ہی سمجھ گئی۔ زیرِلب مسکرانے لگی پھر بولی۔ ''تم تو بہت ہی شرمیلے ہو مگر وکی تو پکا شیطان تھا۔ تم اپنے بھائی کی زندگی جیتے رہو گے تو دیکھو گے... ایک لیلیٰ ہی کیا، نہ جانے کتنی تتلیاں تمہارے پیچھے پڑی رہیں گی۔ یہ تو شروعات ہے۔''

میں نے کہا۔ ''دور رہنے والیوں کو بڑے مؤثر انداز میں ٹالا جاسکتا ہے۔ لیکن لیلیٰ کی بات الگ ہے۔ وہ سارا سارا دن میرے ساتھ رہتی ہے۔ صرف سونے کے وقت مجھے تنہا چھوڑتی ہے۔ میں بگ باس کے قریب رہ کر اس کے اور پاپا کے معاملات کو سمجھنے یہاں آیا ہوں۔ فی الحال میرا زیادہ وقت لیلیٰ کو خود سے دور رکھنے کی کوششوں میں گزر رہا ہے۔ وہ میری پریشانیوں کو سمجھ نہیں سکتی اور میں سمجھا بھی نہیں سکتا۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ ''وکی جب بھی یہاں آتا تھا تو وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ اب جبکہ وہ تمہیں وکی سمجھ رہی ہے' اس لیے تمہارے ساتھ بھی وہی رویہ اختیار کیے ہوئے ہے۔''

''میں کسی نہ کسی طرح اس معاملے کو تو سنبھال رہا ہوں لیکن اب ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوگیا ہے۔''

''کیسا مسئلہ ہے...؟''

''بگ باس نے اسے الٹی میٹم دیا ہے کہ میرے اور لیلیٰ کے درمیان فاصلے ختم نہ ہوئے اور میں چند دنوں کے اندر اسے اپنے مصرف میں نہ لایا تو بگ باس اسے اپنی داشتہ بنا لے گا۔ جبکہ لیلیٰ ایسا ہرگز نہیں چاہتی۔ وہ کہہ رہی تھی' اگر میں اس کی طرف مائل نہ ہوا تو بگ باس کی خواب گاہ میں جانے کے بجائے وہ اپنی جان دے دے گی۔''

''یہ تو واقعی پریشانی میں مبتلا کرنے والی بات ہے۔''

''تم سمجھ نہیں سکتیں' میں کس قدر الجھا ہوا ہوں۔ ایک وہ لڑکی جو میرے بھائی کی چاہت ہے، اس حد تک باحیا ہے کہ اس کے سوا کسی دوسرے شخص کی تنہائی میں جانا نہیں چاہتی۔ میں اس کے لیے کیا کروں؟ کیسے اس کی حیا کا بھرم رکھوں؟ اسے کیسے بتاؤں کہ میں وہ نہیں ہوں' جو وہ سمجھ رہی ہے۔''

دانیا نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''پھر تو اس پریشانی کا ایک ہی حل ہے۔''

''اور وہ حل کیا ہے؟''

''اُسے اپنا راز دار بنالو۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ''گویا اپنے پیروں پر خود ہی کلہاڑی مار لوں؟''

''میں نے تمہیں اپنا بیٹا مانا ہے اور ماں کبھی اپنے بچوں کو غلط مشورہ نہیں دیتی۔''

میں اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ ''میں خوامخواہ کسی کی تعریف نہیں کرتی۔ لیکن ابھی شاید تیسری بار کہہ رہی ہوں، وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ اسے راز دار بنا کر تم عقل مندی کا کام کرو گے۔''

میں ایک ذرا الجھ گیا تھا۔ الجھن یہ تھی کہ جس معاملے میں اپنے سائے کو بھی ہم راز بنانا نہیں چاہتا تھا، وہ قدرتی طور پر دانیا کے سامنے کھل چکا تھا اور اب وہ مزید لیلیٰ کو راز دار بنانے کا مشورہ دے رہی تھی۔ دماغ میں یہ سوال بھی پیدا ہو رہا تھا کہ میں کب تک ٹال مٹول سے کام لیتا رہوں گا؟ اسے کب تک خود سے دور رکھنے کے جتن کرتا رہوں گا؟ وہ آج ہی جھنجھلا کر پھٹ پڑی تھی۔ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ میں وکی ہی ہوں نا؟ میری ایسی سرد مہری آئندہ اس کے اندر مزید شکوک و شبہات کو جنم دے سکتی تھی۔ میں دانیا کے مشورے پر غور کرنے لگا۔

ایسے ہی وقت میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دانیا بھی چونک کر ادھر دیکھ رہی تھی۔ پھر مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم نے بھی آہٹ سنی ہے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم دونوں ہی تشویش میں مبتلا ہوگئے تھے۔ وہ گہری راز دارانہ سرگوشی میں بولی۔ ''لگتا ہے' باہر کوئی ہے۔''

میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ محتاط انداز میں چلتا ہوا دروازے پر آیا۔ وہاں سے جھانک کر دیکھا تو دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ لیلیٰ ایک دیوار سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے ایسے کھڑی

کون کہتا ہے کہ؟

اولاد نہیں ہوسکتی

آج بھی لاکھوں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ مایوسی گناہ ہے۔ انشاءاللہ اولاد ہوگی۔ خاتون میں کوئی اندرونی پرابلم ہو یا مردانہ جراثیم کا مسئلہ۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کیا ہے۔ جو آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھلا سکتا ہے۔ آپکے گھر میں بھی خوبصورت بیٹا پیدا ہوسکتا ہے۔ آج ہی گھر بیٹھے فون پر تمام حالات سے آگاہ کر کے بذریعہ ڈاک وی پی VP بے اولادی کورس منگوائیں۔

المسلم دارالحکمت رجسٹرڈ (دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد۔ پاکستان

0300-6526061

0547-521787

فون اوقات

صبح 9 بجے سے رات 11 بجے تک

آپ ہمیں صرف فون کریں دوائی آپ تک ہم پہنچائیں گے

ہوئی تھی، جیسے دیوار کا سہارا نہ ملتا تو کھڑے کھڑے گر پڑتی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر بہ تر تھا۔ وہ بہت ہی شکستہ سی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس نے ہماری تمام باتیں سن لی ہیں۔ میں نے سر گھما کر دانیا کو دیکھا۔ اس نے اشارے سے پوچھا۔ ''باہر کون ہے؟''

میں نے لیلیٰ کو مخاطب کیا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ مجھے نظر بھر کر دیکھا پھر یکا یک نگاہیں چرانے لگی۔ میں نے پوچھا۔ ''یہاں کیا کر رہی ہو؟''

وہ ذرا دیر چپ رہی۔ پھر بڑے ہی ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اپنے حالات کا ماتم کر رہی ہوں۔ سوچ رہی ہوں، قدرت کسی کے ساتھ اتنا بڑا مذاق بھی کر سکتی ہے۔''

میں اس کی بات کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ پھر بھی میں نے اسے کریدنے کے لیے پوچھا۔ ''کیسا مذاق...؟''

اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا پھر آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میں یہاں اپنے وکی کے پاس آئی تھی۔ لیکن اب وجی سے ملاقات ہو رہی ہے۔''

میں نے محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دور تک نظریں دوڑائیں پھر ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دیتے ہوئے کہا۔ ''کمرے میں چلو۔''

وہ تھکے ہوئے انداز میں چلتی ہوئی اندر آ گئی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ دانیا نے اپنے قریب ہی ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ''یہاں آ کر بیٹھو...!''

وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ میں کچھ تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اب سے تھوڑی دیر پہلے لیلیٰ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ابھی یہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اسے اپنا راز دار بنانا چاہیے یا نہیں؟ لیکن اس سے پہلے کہ میں کسی فیصلے تک پہنچتا، ساری حقیقت اس پر کھل چکی تھی۔ دیکھنا یہ تھا کہ وہ میرے راز کو کب تک اپنے سینے میں چھپا کر رکھ سکے گی؟ ویسے دانیا نے بڑی حد تک اس کے سلسلے میں اطمینان دلایا تھا۔

وہ سر جھکائے آنسو بہا رہی تھی۔ دانیا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت ہم دونوں ہی ایک جیسے صدمات سے گزر رہے ہیں۔ اور یہ صدمہ نیا نہیں ہے۔ چند دنوں پہلے بھی ہم پر یہی قیامت ٹوٹی تھی۔''

لیلیٰ نے کہا۔ ''تب میں اور اب میں بہت فرق ہے۔ ابھی تو ایسا لگ رہا ہے، جیسے قدرت نے بہلنے کے لیے ہمیں ایک کھلونا دیا ہے۔ اب یہ ہم دونوں کو سوچنا ہے کہ ہمارے بہلنے کے لیے یہ ضروری ہے یا نہیں...؟ جو کھلونا ضروری نہ ہو، بچے اسے توڑ ڈالتے ہیں۔ ضروری ہو تو جوڑ کر رکھتے ہیں۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''میں تو ماں ہوں۔ وہ تو اپنے بچے کی ٹوٹی پھوٹی چیزوں کو بھی سمیٹ کر رکھتی ہے... تم بولو...؟''

لیلیٰ نے مجھے دیکھا پھر دانیا کو دیکھا۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ''یہ وکی کی تصویر ہے۔ بے شک، تصویریں دل بہلاتی ہیں اگر وہ خاموش ہوں۔ اپنی جگہ سے متحرک نہ ہوں مگر یہ چلتا پھرتا وکی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا، اپنے آپ کو کیسے سنبھالوں؟ کیسے سمیٹوں؟ دانیا...! تم ہی میری کچھ مدد کرو۔ مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟''

دانیا نے اس کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ''ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا بھی ملے تو سنبھلنا آ جاتا ہے اور تمہیں وکی کا جیتا جاگتا سہارا مل رہا ہے۔ اب حقیقت معلوم ہوئی ہے تو تمہیں رفتہ رفتہ سنبھلنا اور خود کو سمیٹنا بھی آ جائے گا۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''تم خوش قسمت ہو۔ قدرت نے تمہارا ایک بیٹا چھینا تو دوسرا دے دیا۔ لیکن میں... میری زندگی میں اب کوئی وکی نہیں آئے گا۔''

اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ دانیا نے مجھے دیکھا۔ میں نے بستر کے سرے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی فرد کسی دوسرے کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ اگر ہو سکتا تو کیا دانیا مجھے یوں آسانی سے پہچان پاتی؟''

میں نے ذرا ٹھہر کر انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''قدرت نے صرف تم سے نہیں، ہم سب سے وکی کو چھین لیا ہے۔ ایک ماں اپنے بیٹے سے محروم ہو گئی۔ ایک بھائی نے اپنے بھائی کو کھو دیا اور تم اپنے محبوب کی جدائی کا صدمہ سہہ رہی ہو۔ ہم سب کا غم یکساں ہے اور ہم سب کے لیے اپنا اپنا غم بھاری ہے۔''

وہ بولی۔ ''میرے سر پر بگ باس کی تلوار لٹک رہی ہے۔ اب تک تمہیں وکی سمجھ رہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ جلد ہی تمہیں اپنی طرف مائل کر کے بگ باس جیسے خطرے کو ٹال سکوں گی۔ مگر اب کیا ہو گا؟''

میں اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بولی۔ ''بگ باس سے پیچھا چھڑانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ میں اپنی جان پر کھیل جاؤں۔''

میں نے کہا۔ ''اپنے اندر حالات سے لڑنے کا حوصلہ پیدا کرو۔ ایسی مایوسی کی باتیں تب کی جاتی ہیں، جب دشمن سے نمٹنے کے لیے کوئی راستہ نہ بچا ہو۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا ان حالات میں تمہیں کوئی راستہ سجھائی دے رہا ہے؟''

میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر لیلیٰ سے کہا

حالات نے ہم تینوں کو مثلث کی طرح ایک دوسرے سے [illegible] ہے۔ ہم آپس میں تعاون کرتے رہیں گے تو ہر مسئلے کا [illegible] جا سکے گا۔''

[illegible] نیا نے لیلیٰ کو دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''تم فکر نہ [illegible] ہمارے اندر کی بات کبھی کسی کو معلوم نہیں ہو گی۔ لیلیٰ [illegible] میری [illegible] طرح اس راز کو راز ہی رکھے گی۔''

لیلیٰ نے مجھ سے کہا۔ ''تم میری طرف سے مطمئن رہو۔ میں تمہارے اور دانیا کے اعتماد کو دھوکا نہیں دوں گی۔ اب یہ بتاؤ، بگ باس کے سلسلے میں کیا کر سکتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''کچھ خاص نہیں کرنا ہو گا۔ ایک ڈراما میں پلے کر رہا ہوں، دوسرا تم کرو گی۔ اسے یقین دلاؤ گی کہ میں تمہاری طرف مائل ہو چکا ہوں۔ ہم دونوں ہی اپنے رویے سے اسے دھوکا دیں گے۔ تم کبھی کبھی یہاں میری خواب گاہ میں راتیں گزارا کرو گی۔ بند کمرے میں کوئی یہ دیکھنے نہیں آئے گا کہ ہم کیسے ایک چھت کے نیچے ندی کے دو کنارے بنے رہتے ہیں؟''

میں بول رہا تھا اور وہ مجھے پلکیں جھپکائے بغیر یوں تک رہی تھی، جیسے کسی نادان بچے کی باتیں سن رہی ہو۔ پھر اس نے کہا۔ ''پتا نہیں، تم کس مٹی کے بنے ہوئے ہو کہ آگ کے قریب رہو گے اور تمہیں آنچ نہیں لگے گی۔ یا لبِ دریا بیٹھے ہو اور تمہیں پیاس نہیں لگے گی۔ میں تو انسان ہوں۔ آگ کے قریب جاؤں گی تو آنچ لگے گی۔''

اس نے دانیا کو دیکھا پھر کہا۔ ''میرا خیال ہے، وجی نے اب تک وہ شراب نہیں پی جو پیاس بجھاتی نہیں، بھڑکاتی ہے۔ وہ دسترخوان نہیں چنا، جہاں بھوک بڑھتی چلی جاتی ہے۔''

وہ ذرا ٹھہر کر بولی۔ ''دانیا! کیا اتنی سی بات وجی کی سمجھ نہیں آ رہی کہ میری بھوک بڑھائی جا چکی ہے۔ وہ جانے والا مجھے پیاسا مار رہا ہے۔ میں تو لبِ دریا پہنچتے ہی ایک چلو کیا پیوں گی، اس میں ڈوب ہی جاؤں گی۔''

میں نے کہا۔ ''میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں اور تمہاری ہی بات تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ تم نے کہا تھا، وکی کے سوا کسی کا منہ نہیں دیکھو گی اور بگ باس کی خلوت میں جانے کی مجبوری ہوئی تو اپنی جان پر کھیل جاؤ گی۔ ایسا اس لیے کہا کہ مجھے پا کر وکی کو پا لینے کا یقین ہو رہا تھا۔''

میں ذرا چپ ہوا۔ وہ خاموشی سے میری باتیں سن رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''اور اب یہ بھید کھل چکا ہے کہ میں تمہارا وکی نہیں ہوں تو پھر اس کے لیے جو جذبات ہیں، ان کے پیشِ نظر تمہیں مجھے بھی قبول نہیں کرنا چاہیے۔''

''میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں۔ بے شک، مجھے اب تمہاری تمنا نہیں کرنا چاہیے۔ تم یہی چاہتے ہو نا...؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے کہا۔ ''پھر تم کس رشتے سے، کس حوالے سے ایک کمرے میں سونے کی بات کر رہے ہو؟ تم وکی کی پرچھائیں ہو۔ کیا ایک کمرے میں تمہاری پرچھائیں مجھ پر نہیں پڑے گی؟ کیا میری آنکھوں کے سامنے وکی کی صورت اور اس کا سراپا مجھے اپنی طرف نہیں کھینچے گا؟ یہ کیسی نادانی کی باتیں ہیں کہ بند کمرے میں آگ کی طرح تپش دیتے رہو گے اور مجھے جلنے سے منع کرتے رہو گے؟''

میں اور دانیا ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ اس نے ایسی بات کی تھی جس کا جواب ہمارے پاس نہیں تھا۔ دانیا نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''یہ درست کہہ رہی ہے۔ تم اسے بہت بڑی آزمائش میں مبتلا کرنا چاہتے ہو۔ دنیا کی کوئی نوجوان عورت خلوت میں ایسی راتیں نہیں گزارے گی۔''

میں نے کہا۔ ''میں نے بھی ایسی راتیں نہ گزاری ہیں، نہ گزارنا چاہتا ہوں۔ میری زندگی میں صرف ایک ہی چاہنے والی ہے جو میری شریکِ حیات بن کر رہے گی۔''

دانیا نے کہا۔ ''مجھے تمہاری شرافت اور پارسائی پر پیار آ رہا ہے۔ تم وکی سے بالکل مختلف ہو۔ دنیا کی ہر ماں تم پر فخر کرے گی۔ مگر موجودہ حالات تمہارے لیے چیلنج بن گئے ہیں۔ تمہیں فیصلہ کرنا ہے کہ یہاں جس مقصد کے لیے آئے ہو، وہ مقصد پورا کرو گے... کامیاب و کامران ہو کر جاؤ گے یا اپنی پارسائی قائم رکھنے کے لیے اپنے مقصد سے منہ پھیر کر جاؤ گے؟''

یہ واقعی میرے لیے ایک چیلنج تھا۔ میں پاپا کے متعلق بہت کچھ معلوم کرنے وہاں آیا تھا اور ہمیں بلیک میل کرنے والے بگ باس کی جڑوں تک بھی پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے بڑے پاپڑ بیلتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ وکی کی داشتہ ماں اچانک ہی رکاوٹ بننے والی تھی، اس سے سمجھوتا ہو گیا تھا۔ یہ مسئلہ انتہائی سنگین تھا کہ لیلیٰ سے کس طرح سمجھوتا ہو گا؟ وہ اپنی جگہ درست تھی۔ اس کے مطالبات بھی درست تھے... لیکن میرے مزاج کے خلاف تھے۔

لیلیٰ مجھے دیکھ رہی تھی۔ بڑی سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ''تمہاری جو بھی چاہنے والی ہے، وہ بڑی خوش نصیب ہے۔ تم کسی اور کے ساتھ گناہ گار نہیں ہونا چاہتے۔ اگر تمہارا یہ فیصلہ اٹل ہے کہ ایک کے سوا کوئی دوسری تمہاری زندگی میں نہیں آئے گی تو جتنی جلدی ہو سکے، یہاں سے نکل جانے کی کوشش کرو۔ کیونکہ میں کسی سمجھوتے کے بغیر تمہارے

ساتھ بند کمرے میں رات نہیں گزاروں گی... اور یہ بات باس سے چھپی نہیں رہے گی۔''

دانیا نے کہا۔ ''وجی! عقل سے کام لو اور سمجھو... تم اہم مقاصد حاصل کرنے آئے ہو۔ تمہاری کامیابی کا انحصار صرف لیلیٰ سے سمجھوتا کرنے پر ہے۔''

میں اپنی جگہ سے اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ لیلیٰ نے کہا۔ ''میں تمہیں پریشان دیکھنا نہیں چاہتی۔ وکی کی موت کا یقین ہونے کے بعد تمہیں صرف اس لیے قبول کروں گی کہ خدا نے شاید میری کسی نیکی سے خوش ہو کر وکی کو ایک نئے نام سے میری زندگی میں بھیجا ہے۔''

میں ٹہلتے ٹہلتے رک گیا۔ وہ بولی۔ ''تم واقعی بہت اچھے ہو۔ کسی کے ساتھ گناہ گار بننا نہیں چاہتے۔ میں بھی گناہ آلود زندگی سے تنگ آگئی ہوں۔ اب وکی سمجھ کر تمہیں قبول کروں گی تو وہ قبولیت شریعت کے مطابق ہوگی۔ ہمارے دین میں مردوں کو ایک سے زیادہ شادی کی اجازت ہے۔ تمہارے سامنے یہی ایک راستہ ہے کہ دینی احکامات کے مطابق مجھے قبول کرلو۔''

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسے وقت مجھے کیا کرنا چاہیے؟ لیلیٰ نے کہا۔ ''میں سمجھ رہی ہوں۔ تم کسی کے دیوانے ہو۔ اس کی جگہ کسی اور کو دینا نہیں چاہو گے۔ موجودہ حالات میں پتا نہیں کیا کر گزرو گے۔''

دانیا نے کہا۔ ''جو بھی کرو گے، جو بھی قدم اٹھاؤ گے، وہ تمہیں نادانی اور تباہی کی طرف لے جائے گا۔ نہ جانے تمہیں کیسے کیسے خطرات سے دوچار ہونا پڑے گا۔''

لیلیٰ نے کہا۔ ''میں حالات سے مجبور ہو کر جیسی زندگی گزارتی آئی ہوں، اس پر مجھے افسوس ہے۔ میں خدا کو راضی کرنے کے لیے بہت بڑی نیکی کروں گی۔ مجھے اپنی منکوحہ بنا لو۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتی ہوں، یہاں سے کامیاب ہو کر نکلو گے تو میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گی۔ تمہاری پہلی محبت کے آگے کبھی دیوار نہیں بنوں گی۔''

میں نے بہت ہی متاثر ہو کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ''تمہاری یہ نیکی مجھے شرمندہ کرتی رہے گی۔ میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرے گا کہ تمہاری جیسی محسنہ کو اپنی زندگی سے نکال پھینکوں۔''

وہ بولی۔ ''جذباتی باتیں نہ کرو۔ اپنے مقاصد حاصل کرو۔''

''اور تم مجھے شرمندہ کرنے والی باتیں نہ کرو۔ میں خود غرض نہیں ہوں۔ میرا ضمیر یہ کبھی گوارا نہیں کرے گا۔''

دانیا نے مجھے گھور کر کہا۔ ''تم کسی بات پر راضی نہیں ہو رہے ہو۔ کبھی اپنی پارسائی کو مسئلہ بنا رہے ہو، کبھی [illegible] کی آوازیں سنا رہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے، یہاں [illegible] و نامراد ہو کر ہی جاؤ گے۔''

میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا پھر کہا۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ پلیز! مجھے کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع دو۔''

دانیا آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے قریب آئی۔ وہ شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''تمہیں فیصلہ کرنے کے لیے چار... چھ دن مل سکتے ہیں۔ بگ باس کے کان میں یہ بات ڈالی جائے گی کہ تم لیلیٰ کو قبول کر رہے ہو۔ آج اس کے ساتھ تنہائی میں رات گزارنے والے تھے مگر لیلیٰ کی مجبوری ہے۔ چار یا چھ دنوں کے بعد لیلیٰ پھر سے جادو جگائے گی اور تمہیں بہت کچھ یاد دلائے گی۔''

میں نے اطمینان کی ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''شکریہ دانیا! میرے لیے اتنی مہلت بہت ہے۔ میں کوئی اچھا فیصلہ کرسکوں گا اور کچھ نہ کچھ کر گزروں گا۔''

دانیا نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ ہم تینوں یوں سر جوڑ کر نہ رہا کریں۔ اس طرح وہ کبھی نہ کبھی کسی شبے میں مبتلا ہو سکتا ہے۔''

ابھی قدرتی حالات میرا ساتھ دے رہے تھے۔ وہ ہمہ وقت میرے ساتھ رہنے والیاں میری رازدار بن گئی تھیں۔ بات بگڑتے بگڑتے بن گئی تھی۔ اب کامیابی اور ناکامی کا سارا دارومدار مجھ پر تھا۔ مجھے چار چھ دنوں میں کسی اہم فیصلے تک پہنچنا تھا۔

☆☆☆

برائی کا انجام بُرا ہی ہوتا ہے۔ شہناز، شاہنواز اور زرینہ بانو کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ ہمارا بُرا چاہنے والے وہ دشمن رشتے دار ان دنوں بڑے بُرے حالات سے گزر رہے تھے۔ شہناز کی جان تو جیسے سولی پر لٹکی ہوئی تھی۔ وکی نے ان تصویروں کے ذریعے جو دھماکا کیا تھا، اس کے بعد سے وہ بُری طرح سہمی ہوئی تھی۔ یہ اندیشہ دل و دماغ میں گھنٹیاں بجاتا رہتا تھا کہ دشمن اپنی دشمنی سے باز نہیں آئے گا۔ ان تصویروں کو آج نہیں تو کل خان علی تک پہنچا دے گا اور اس کا راستہ روکنے کے صرف دو ہی طریقے تھے یا تو اسے کسی طرح بھی ڈھونڈ کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا یا پھر اس کا مطالبہ تسلیم کرتے ہوئے اپنی جائیداد کا ستر فیصد حصہ اس کے نام لکھ دیا جاتا۔

اور یہ دوسرا راستہ مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔ وہ ہر

معاملے میں اپنا مفاد دیکھنے والے... کسی بھی صورت گھاٹے کے ایسے سودے کو قبول نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے سامنے بس ایک ہی راستہ رہ گیا تھا۔ وکی کی موت ہی ان کے لیے راہِ نجات ہو سکتی تھی۔ لیکن اس راہِ نجات تک پہنچنے کے لیے کوئی راہ سجھائی نہیں دے رہی تھی۔ وکی کو ڈھونڈنا آسان نہ تھا۔ وہ نہ جانے کہاں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا؟ نہ خود سامنے آرہا تھا، نہ فون پر اپنی آواز سنا رہا تھا۔ اور اس کی ایسی خاموشی شہناز کے اندر دھماکے کر رہی تھی۔

ویسے وہ سامنے آ بھی جاتا تو وہ تینوں بدلی ہوئی شناخت کے ساتھ اسے کبھی پہچان نہ پاتے اور اس وقت ان کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ وہ آنکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھے بنے ہوئے تھے۔ وہ ایک ریسٹورنٹ میں لنچ کر رہے تھے۔ وکی انہیں دیکھتا ہوا، ان کی ٹیبل کے قریب سے گزرتا ہوا ایک کارنر ٹیبل پر آکر بیٹھ گیا۔

اس کے ایک کان میں موبائل فون کا ہینڈ فری لگا ہوا تھا۔ اس نے زیرِ لب مسکرا کر ماں اور بھائی کے درمیان بیٹھی ہوئی شہناز کو دیکھا پھر موبائل فون نکال کر نمبر پنچ کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی شہناز کے موبائل کی رنگ ٹون سنائی دینے لگی۔ اس نے فون کو اٹھا کر دیکھا۔ ننھی سی اسکرین پر اَن جانے نمبر دکھائی دے رہے تھے۔ شاہنواز نے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

وہ شانے اچکا کر بولی۔ ''پتا نہیں۔ کوئی نیا نمبر ہے۔''

اس نے ایک بٹن دبا کر فون کو کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''ہیلو... کون؟''

دوسری طرف سے ایک گہری سانس سنائی دی۔ اس نے ذرا چونک کر ماں اور بھائی کو دیکھا۔ پھر فون پر پوچھا۔ ''کون ہو بھئی...؟''

اس بار بھی وہی سرد آہ سنائی دی۔ شاہنواز نے پوچھا۔ ''کون ہے...؟''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''پتا نہیں۔ شاید کوئی دمے کا مریض ہے۔ بولتی ہوں تو جواباً گہری گہری سانسیں لے رہا ہے۔ کسی ڈاکٹر کو کال کرنے کے بجائے شاید غلطی سے میرا نمبر ملا بیٹھا ہے۔''

وہ فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''لاؤ... ذرا مجھے دو۔''

اس نے فون بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ اسے کان سے لگا کر سننے لگا۔ اس نے کہا۔ ''ہیلو...!''

دوسری طرف بہ دستور خاموشی چھائی رہی۔ ماں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ کوئی بول رہا ہے؟''

اس نے رابطہ ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''مردانہ آواز سن کر شاید اس کی سانس ہی رک گئی ہے۔''

شہناز نے سر جھٹک کر کہا۔ ''یہ رانگ کالرز ایسی ہی الٹی سیدھی حرکتیں کرتے ہیں۔''

چند لمحوں بعد ہی رنگ ٹون دوبارہ سنائی دی۔ شاہنواز نے اسکرین پر نمبر دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''لگتا ہے، مریض کی سانسیں بحال ہو گئی ہیں۔''

پھر اس نے کال ریسیو کر کے فون کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''کیا بات ہے بھائی صاحب! سانس کی پرابلم ہے تو اِن ہیلر استعمال کرو۔ کیا فون کو آکسیجن ماسک سمجھ رہے ہو؟''

دور بیٹھے ہوئے وکی نے مسکرا کر ان تینوں کو دیکھا پھر ایک ہائے کے ساتھ کہا۔ ''مجھے اِن ہیلر کی نہیں، تیری بہن کی ضرورت ہے۔''

شاہنواز کے ایک ہاتھ میں بھرا ہوا جام تھا۔ وہ ایک دم سے چھلک گیا اور گرتے گرتے رہ گیا۔ وکی اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ بولتی کیوں بند ہو گئی؟''

ماں بیٹی نے سوالیہ نظروں سے چھلکتے ہوئے جام کو دیکھا۔ شاہنواز کی حالت دیکھ کر یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ فون کے ذریعے کوئی زبردست لات پڑی ہے۔ زرینہ بانو نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ کون بول رہا ہے؟''

اس نے فون کو کان سے ہٹایا پھر اس پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ''وجی ہے...''

شہناز پچھلے کئی دنوں سے اس سے بات کرنے کے لیے بے چین تھی۔ اس کا نام سنتے ہی اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لاؤ... فون مجھے دو۔ میں بات کروں گی۔''

وہ اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے بولا۔ ''ٹھہرو... پہلے مجھے بات کرنے دو۔''

اس نے دوبارہ فون کو کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے وکی نے کہا۔ ''کیوں خوامخواہ کباب میں ہڈی بن رہے ہو؟ فون بہن کو دے دو۔''

''پہلے مجھ سے بات کرو۔''

''کیا بات کروں؟ چند دنوں پہلے میں نے تحفے کے طور پر جو تصویریں بھجوائی ہیں کیا ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتے ہو؟''

شاہنواز نے کہا۔ ''تم نے شکریہ ادا کرنے کا موقع ہی کہاں دیا ہے؟ نہ جانے کہاں منہ چھپا کر بیٹھے ہوئے ہو؟''

''فکر نہ کرو۔ شکریے کا موقع بھی دوں گا اور سامنے بھی آؤں گا۔ پہلے تم وصیت تو تیار کرلو۔''

اس نے تیور بدل کر پوچھا۔ ''کیسی وصیت...؟''

وہ بولا۔ ''وہی وصیت جس میں تم لوگ اپنی جائیداد کا ستر فیصد حصہ میرے نام لکھنے والے ہو۔''

''دنیا میں اب تک نہ تو کوئی ایسا قلم دریافت ہوا ہے اور نہ ہی ایسا کوئی کاغذ بنایا گیا ہے جس پر تمہارے مطالبے کے مطابق کوئی وصیت لکھی جاسکے۔''

وہ بولا۔ ''انہونی کو ہونی بنانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

شاہنواز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ایسی خوش فہمی میں مبتلا رہ کر خود کو کھلاڑی سمجھنے والے ہی سب سے بڑے اناڑی ثابت ہوتے ہیں۔ کان کھول کر سن لو...! تمہارا یہ احمقانہ مطالبہ کبھی تسلیم نہیں کیا جائے گا۔''

''یعنی میں یہ سمجھ لوں کہ تمہیں اپنی بہن کی سلامتی عزیز نہیں ہے؟''

وکی دیکھ رہا تھا۔ شہناز بھائی کے ہاتھ سے فون لے کر خود بات کرنا چاہتی تھی لیکن وہ فون اس کے حوالے نہیں کررہا تھا۔ شہناز نے جھنجلا کر ماں کی طرف جھک کر سرگوشی میں کہا۔ ''یہ بگڑی ہوئی بات سنبھالنے کے بجائے مسلسل وجی کو طیش دلا رہا ہے۔ جبکہ میں اس سے ملاقات کرنے کے راستے ہموار کرنا چاہتی ہوں۔ وہ جس بل میں گھسا بیٹھا ہے، وہاں سے باہر نکالنے کے لیے اسے بڑے پیار سے پچکارنا ہوگا۔ اس سے کہیں کہ فون مجھے دے دے۔''

ماں نے بیٹے کو اشاروں میں سمجھایا کہ وہ شہناز کو وکی سے بات کرنے دے۔

ادھر وکی ان کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ شہناز کی آواز فون کے ذریعے اس کے کانوں تک نہیں پہنچی تھی پھر بھی وہ اس کی بے چینی کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری بہن مجھ سے بات کرنے کے لیے مچل رہی ہے۔ ماں بھی اشاروں کی زبان میں تمہیں سمجھا رہی ہے۔ چلو، اب اچھے بچوں کی طرح فون شہناز کو دے دو۔''

وہ اس کی بات سن کر ایک دم سے چونک گیا تھا۔ اس نے جو منظر کشی کی تھی، اس سے یہی ظاہر ہورہا تھا کہ وہ وہیں کہیں ہے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ فون کو کان سے لگائے اِدھر اُدھر دور تک دیکھنے لگا۔ مختلف میزوں پر لوگ کھانے پینے میں مصروف دکھائی دے رہے تھے۔

وکی ایک میز پر کان میں ہینڈ فری لگائے اطمینان سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کان کا رخ دوسری طرف تھا اور شاہنواز کی نظروں میں نہیں آسکتا تھا۔ شہناز اور زرینہ بانو اسے نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ یہ سمجھ نہیں سکتی تھیں کہ وہ ایک دم ہی اٹھ کر کھڑا کیوں ہوگیا ہے۔

اس نے فون پر پوچھا۔ ''کیا تم یہاں موجود ہو؟''

ماں بیٹی نے چونک کر شاہنواز کو دیکھا۔ دوسری طرف سے وکی نے کہا۔ ''یہ بھی خوب رہی۔ میں نے یوں ہی اپنے اندازے کے مطابق ایک بات کہی اور تم سمجھ رہے ہو کہ میں وہاں موجود ہوں... اس کا مطلب ہے، وہاں یہی ہورہا ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''بے شک! تمہارا اندازہ درست ہے۔''

''پکے کھلاڑی ایسے ہی درست نشانے لگاتے ہیں اور تم جیسے اناڑیوں کو اچھل کر اپنی جگہ سے کھڑا ہونے پر مجبور کردیتے ہیں۔''

شاہنواز مطمئن ہوکر بیٹھنا چاہتا تھا مگر اس کی بات سن کر بیٹھتے بیٹھتے ایک بار پھر کھڑا ہوگیا۔ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ماں نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ''یہ تم بار بار اٹھ کر کھڑے کیوں ہورہے ہو؟ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ اگر یہاں ہے تو اس سے کہو کہ سامنے آکر بات کرے۔''

شہناز دور تک نظریں دوڑاتے ہوئے اس ریسٹورنٹ کا جائزہ لے رہی تھی لیکن وکی کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاہنواز نے فون پر کہا۔ ''مجھے الجھانے کی کوششیں نہ کرو۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں، تم دور کہیں بیٹھ کر اندازے نہیں لگا رہے ہو۔ یہیں کہیں چھپے ہوئے ہو۔''

وکی نے کہا۔ ''اگر تمہیں شبہ ہے تو اس وقت جہاں ہو وہاں کا کونہ کونہ چھان کر اپنی تسلی کرلو۔ پھر مجھ سے بات کرو۔''

اس نے رابطہ ختم کردیا۔ شاہنواز نے چونک کر فون کو دیکھا۔ شہناز نے پوچھا۔ ''کیا ہوا...؟''

وہ اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔ ''وہ خوامخواہ ہمیں الجھا رہا ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں، وہ یہیں کہیں چھپا ہوا ہے۔''

ماں نے پوچھا۔ ''تمہیں کیسے اندازہ ہوا کہ وہ یہاں ہے؟''

وہ فون پر ہونے والی گفتگو کے بارے میں انہیں تفصیل سے بتانے لگا۔ شہناز نے جھنجلا کر کہا۔ ''میں کتنی دیر سے کہہ رہی تھی، فون مجھے دے دو۔ یہ میرا معاملہ ہے، مجھے بات کرنے دو۔ مگر تم تو لیڈر بن جاتے ہو۔ اپنے سامنے کسی کی نہیں سنتے۔''

ماں نے کہا۔ ''شانی! تم بنتا ہوا کھیل بگاڑ رہے ہو۔ شہناز وجی سے ملنے، اس سے بات کرنے اور اسے کسی طرح گرفت میں لینے کے لیے کب سے پریشان ہے۔''

شہناز نے کہا۔ ''اتنے جان لیوا انتظار کے بعد اب یہ موقع مل رہا تھا مگر بھائی صاحب نے آنے والے کو بھگا دیا۔''

وکی دور بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا اور زیرلب مسکرا رہا تھا۔ وہ تینوں پریشان دکھائی دے رہے تھے۔ ایک دوسرے سے بول رہے تھے اور بولنے کا انداز بتا رہا تھا کہ آپس میں الجھ رہے ہیں۔ وہ باتوں کے دوران اِدھر اُدھر سر گھما کر اس ریسٹورنٹ کا جائزہ بھی لے رہے تھے۔ لیکن وہ ان کی نظروں میں آنے والا نہیں تھا۔ زرینہ بانو نے ناگواری سے کہا۔ ''پتا نہیں وہ کم بخت کہاں چھپ کر ہماری پریشانی کا تماشہ دیکھ رہا ہوگا۔''

شہناز نے فون جھپٹتے ہوئے کہا۔ ''اس کا نمبر ہمارے پاس آچکا ہے۔ ابھی کال کی جائے گی تو کہیں نہ کہیں بیل ضرور بجے گی۔''

پھر اس نے نمبر پنچ کرنے سے پہلے تنبیہ کے انداز میں بھائی کو انگلی دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر اس نے فون اٹینڈ نہیں کیا تو میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گی اور نہ ہی اپنے کسی معاملے میں مداخلت کرنے دوں گی۔''

اس نے وکی کے نمبر ری ڈائل کیے۔ پھر اسے کان سے لگا کر رابطے کا انتظار کرنے لگی اور متجسس نظروں سے دائیں بائیں ایسے دیکھنے لگی، جیسے قریب ہی کہیں وکی کے فون کی گھنٹی بجنے والی ہو۔

شاہنواز اور زرینہ بانو بھی الرٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد رابطہ ہوگیا۔ دوسری طرف بیل جانے لگی۔ شہناز نے بے چین ہوکر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دور و نزدیک بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کسی کا فون نہیں بول رہا تھا۔ وہاں موجود تمام افراد اپنے آپ میں مگن تھے۔

شاہنواز نے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ رابطہ نہیں ہورہا ہے؟''

وہ ڈپٹ کر اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''تم پھر بولے...؟''

پھر وہ ماں سے بولی۔ ''رابطہ تو ہوگیا ہے۔ دوسری طرف بیل بھی جارہی ہے۔ مگر لگتا ہے، اس نے اپنے فون کو وائبریشن پر رکھا ہوا ہے۔''

زرینہ نے کہا۔ ''چلو، تم اس سے بات کرو۔ اسے کسی بھی طرح سامنے آنے پر یا آئندہ کسی اور جگہ ملاقات کرنے پر راضی کرو۔''

دوسری طرف مسلسل بیل جارہی تھی۔ لیکن وہ فون اٹینڈ نہیں کررہا تھا۔ اس کے سامنے کئی طرح کی ڈشیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ان تینوں کی بھوک اڑا کر خود بڑے مزے سے کھانے میں مصروف ہوگیا تھا۔ اس دوران ان پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔ ان کی پریشانی اور بے چینی کھانے کا مزہ دوبالا کررہی تھی۔

شاہنواز نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم اس سے باتیں کرو۔ میں ذرا ریسٹورنٹ کا جائزہ لے لوں۔ ممکن ہے، وہ کہیں چھپ کر بیٹھا ہو اور میں اسے دیکھ نہ سکوں لیکن اس کی آواز تو میرے کانوں تک پہنچ سکتی ہے۔''

شہناز نے جھنجلا کر فون کو دیکھا پھر بے زار ہوکر کہا۔ ''وہ کال ریسیو کرے گا تو بات ہوگی نا... مسلسل بیل جاتی رہی ہے۔ اب کال ڈراپ ہوگئی ہے۔''

ماں نے کہا۔ ''کال ڈراپ ہوگئی ہے تو پھر سے رابطے کی کوشش کرو۔ وہ کب تک کترائے گا؟ آخر کو اسے کال اٹینڈ کرکے تم سے بات کرنی ہی پڑے گی۔''

شاہنواز نے ماں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں... تم ٹرائی کرتی رہو۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

وہ چلا گیا۔ شہناز، وکی کے نمبر پنچ کرکے فون کو کان سے لگا کر رابطے کا انتظار کرنے لگی۔ زرینہ بے چینی سے بیٹی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد اس نے اشارے سے پوچھا۔ وہ ایک بٹن دبا کر مایوسی سے بولی۔ ''وہ اٹینڈ نہیں کررہا ہے۔''

ماں نے ناگواری سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ نامراد تو دردِسر بن گیا ہے۔ کسی بھوت کی طرح ہمیں ہولا رہا ہے۔''

پھر وہ میز پر رکھی ہوئی مختلف ڈشوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کھانا بھی مٹی ہوگیا ہے۔ کم بخت نے سارا مزہ کرکرا کردیا۔''

وہ جھنجلا کر بڑبڑا رہی تھی اور شہناز فون کو دیکھتے ہوئے گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وکی سر دکھانے والے انداز میں دشمنی کررہا تھا۔ زرینہ بانو نے بیٹی کو دیکھا پھر کہا۔ ''تم کس سوچ میں پڑگئیں؟ پھر سے نمبر ملاؤ۔ دیکھو، وہ فون اٹھاتا ہے یا نہیں۔''

وہ بولی۔ ''مسئلہ اس کے کال ریسیو کرنے کا نہیں ہے۔ اصل پرابلم تو یہ ہے کہ وجی کب تک ہمارے گلے کی ہڈی بنا رہے گا؟ اس سے ٹکر لے کر تو خصوصاً میری سلامتی اور میرا فیوچر داؤ پر لگ گیا ہے۔ آپ اور میں، دونوں ہی آزما چکی ہیں، شاہنواز ان معاملات میں بالکل ناکارہ ثابت ہورہا ہے۔ بڑے دعوؤں کے ساتھ دشمن کے پیچھے پڑتا ہے مگر نتیجتاً

کھودا پہاڑ نکلا چوہا والی بات سامنے آتی ہے۔"
وہ بولی۔ "تم اپنے پاپا کی زبان بول رہی ہو۔"
"تمام حالات آپ کے سامنے ہیں اور یہ تو ابھی کی بات ہے۔ شانی اس لڑکی تک... کیا نام تھا اس کا...؟ ہاں، ایشلے... اس کے اپارٹمنٹ تک پہنچا۔ وہاں فون پر وجی سے بات کی مگر اس کا نمبر نوٹ کرنا بھول گیا۔"
ماں نے موبائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اب تو اس کا نمبر تمہارے فون پر آ گیا ہے۔ کوشش کرتی رہو۔ کسی وقت تو کال ریسیو کرے گا۔ ذرا لبھانے والے انداز میں باتیں کروگی تو ملاقات کے لیے بھی راضی ہو جائے گا۔"
وہ فون کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "لگتا تو نہیں ہے کہ وہ میرے دام میں آئے گا۔ پھر بھی کوشش تو کرنی پڑے گی۔"
"ارے، یہ مرد تو ہاتھی کے دانت ہوتے ہیں۔ بہت زیادہ دشمنی اور اکڑفوں دکھانے کے باوجود عورت کی ایک پیار بھری پچکار انہیں پتھر سے موم بنا دیتی ہے۔ تم اسے پگھلا کر ذرا اپنے شیشے میں تو اتارو۔ پھر دیکھو... میں کیسے اس کا پتا صاف کرواتی ہوں۔ اس بار تو تہیہ کرلیا ہے' وہ جب بھی تمہاری خلوت کی جنت میں آئے گا... اسے وہاں سے سیدھا جہنم رسید کردیا جائے گا۔"
"یعنی مجھے اپنی جنگ خود لڑنی پڑے گی؟ جبکہ میں ابتدا سے ایسی محاذ آرائی کے خلاف تھی۔"
ماں نے چونک کر اسے دیکھا پھر کہا۔ "یہ تم نے کیا بات کہی کہ اکیلی لڑو گی؟ یہ جنگ صرف تمہاری نہیں' ہم سب کی ہے اور ہم سب مل کر لڑ رہے ہیں۔"
"مگر اس لڑائی میں نقصان سراسر میرا ہو رہا ہے۔ میں ہی اکیلی پسی جا رہی ہوں۔ ان خاندانی جھمیلوں سے نہ صرف خان علی جیسا سرمایہ دار میرے ہاتھوں سے نکلنے والا ہے بلکہ میری سلامتی کو بھی شدید خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔"
"یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کیا ہمیں تمہاری سلامتی کی فکر نہیں ہے؟"
"فکر ہے تو مجھے بتائیں... اگر وجی کسی ہیرا پھیری سے ہاتھ نہ آیا تو کیا کیا جائے گا؟ کیا میرے فیوچر اور میری سلامتی کی خاطر اس کا مطالبہ تسلیم کرلیا جائے گا؟"
وہ سر جھٹک کر بولی۔ "کیا ہمیں بے وقوف سمجھتی ہو؟ اس کے مطالبے کا مطلب جانتی ہو؟ ستر فیصد اس کے نام لکھنے کے بعد ہم تقریباً کنگال ہو جائیں گے اور کوئی بھی عقل مند اپنے پیروں پر کلہاڑی نہیں مارتا۔"

وہ جھنجھلا کر بولی۔ "تو پھر میرا کیا بنے گا! ... کام کا نہیں ہے اور ادھر پاپا بھی وجی کا کھوج لگانے میں ناکام ہو رہے ہیں۔"
ماں نے فون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ... اس سے بات تو کرو۔ اسے اپنے دام میں تو لاؤ ... ہم کیسے اس کا دم نکالتے ہیں۔"
اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اپنے فون ... نمبر پنچ کر کے اسے کان سے لگا کر رابطے کا انتظار کر...
دوسری طرف شاہنواز ریسٹورنٹ کے مختلف حصوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ وکی کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا مگر وہ کہیں ... نہیں دے رہا تھا... بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس نے آنکھ ... اندھا بنا دیا تھا۔ وہ اسے تلاش کرتا ہوا دو بار اس کی ... قریب سے گزرا تھا۔ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ چہرے کے نقش و نگار بنوا کر اور آنکھوں پر کلرڈ چشمہ لگا کر کیسے نظروں کے سامنے رہتے ہوئے انہیں دھوکا دے رہا ہے؟
وہ کھانے سے فارغ ہو کر نیپکن سے منہ پونچھنے لگا۔ ایسے وقت فون کی وائبریشن نے سمجھایا کہ وہ تیسری بار ... مخاطب کر رہی ہے۔ شاہنواز ادھر اُدھر ٹہلتا ہوا آخر کو تھک ہار کر اپنی میز کی طرف چلا گیا تھا۔
وکی نے ایک نظر ان تینوں پر ڈالی۔ اس کا فون ... میز کے نیچے گھٹنوں پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے ایک بٹن دبا کر ... ریسیو کی۔ کان سے لگے ہوئے ہیڈ فون سے شہناز کی ... سنائی دی۔ "ہیلو وجی...! ام... میں بول رہی ہوں۔ شہناز ..." رابطہ ہوگیا تھا۔ وکی نے کال ریسیو کرلی تھی۔ زرینہ ... دوسری طرف کی باتیں سننے کے لیے کرسی کھسکا کر بیٹی ... بالکل لگ کر بیٹھ گئی۔ شاہنواز کی توجہ بھی بہن کی طرف تھی ... اس کی نگاہیں اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھیں۔
وکی نے انہیں دیکھتے ہوئے فون پر کہا۔ "بد... پہرے داری ختم ہوگئی ہے کیا؟"
"تم کہاں ہو وجی...؟"
"یہ پوچھ کر کیا کرو گی؟"
"میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔"
اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ "وہ کس لیے...؟"
وہ اس کے سوال پر پہلو بدل کر رہ گئی۔ ماں اور بھائی کو دیکھتے ہوئے فون پر بولی۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ کیا میں تم سے مل بھی نہیں سکتی؟"
"ملنے کی کوئی وجہ تو ہوگی؟"
وہ ذرا دیر چپ رہی پھر بولی۔ "دراصل... میں تم ...

... سمجھنا چاہتی ہوں' آخر تم مجھ سے دشمنی کیوں کر رہے ہو؟ میں نے ... بگاڑا ہے؟"
"... کسی کو اتنی مہلت ہی نہیں دیتا کہ وہ میرا کچھ ... سکے۔"
"پھر اس دشمنی کی وجہ کیا ہے؟ کیا مجھے دل لگانے کی سزا ... رہے ہو...؟"
وکی نے کہا۔ "اگر تم سے دشمنی کرنی ہوتی' تمہیں سزا دینی ہوتی تو وہ شاہکار تصویریں تمہارے پاس پہنچنے کے بجائے سیدھی خان علی کے پاس پہنچتیں۔"
"یہ مجھ پر تمہارا احسان ہے۔"
"مگر یہ احسان زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہے گا۔"
اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "آخر تم چاہتے کیا ہو؟"
"میری چاہت' میرا مطالبہ ہے۔"
"مگر تم اتنا بڑا مطالبہ کیوں کر رہے ہو؟ کیوں میری کمزوری سے کھیل رہے ہو؟ جبکہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔"
"ابھی نہیں ہے لیکن میرا مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو میں وہ تصویریں خان علی تک پہنچا کر دشمنی کی ابتدا کردوں گا۔"
اس نے پریشان ہو کر ماں اور بھائی کو دیکھا۔ ماں نے اشارے سے بیٹی کو سمجھایا کہ وہ اس سے ملنے کی بات کرے۔ کسی بھی طرح قائل کر کے اسے کہیں بلائے۔ وہ اس کی ہدایت کے مطابق فون پر کچھ کہنا چاہتی تھی۔ دوسری طرف سے وکی نے کہا۔ "تمہاری ماں بڑی اشارے باز ہے۔"
وہ اس کی بات سنتے ہی ایک دم سے چونک گئی۔ دور دور تک نظریں دوڑاتے ہوئے فون پر بولی۔ "تمہیں کیسے پتا چلا کہ ممی مجھے اشارے کر رہی ہیں؟"
ماں بیٹے نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ شانی نے دھیرے سے کہا۔ "دیکھا...! میں نے کہا تھا نا' وہ یہیں کہیں ہے۔"
زرینہ بانو نے بیٹے کی طرف جھک کر اس کے کان میں کہا۔ "اگر ایسی بات ہے تو اٹھو اور جا کر اسے تلاش کرو۔ شہناز اس سے باتیں کر رہی ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں بولتا ہوا سنائی ضرور دے گا۔"
ادھر وکی فون پر کہہ رہا تھا۔ "اندازہ بھی کوئی چیز ہے ڈارلنگ! کچھ باتیں دور رہ کر بھی سمجھ میں آتی رہتی ہیں۔"
شاہنواز اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلتا ہوا ذرا دور چلا گیا تھا۔ شہناز نے فون پر کہا۔ "جھوٹ مت بولو۔ میں سمجھ گئی ہوں۔ تم یہیں کہیں ہو۔"

"اگر سمجھ دار ہو تو چھوٹی چھوٹی باتوں کو سمجھنے کے بجائے اپنے حالات پر غور کرو اور انہیں سمجھنے کی کوشش کرو۔"
"اسی لیے تو تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ پلیز! اگر یہاں ہو تو ہماری ٹیبل پر چلے آؤ۔"
"تمہارا مسئلہ میرے ملنے سے نہیں' تم سب کے آپس میں مل کر فیصلہ کرنے سے حل ہوگا۔"
اس نے ماں کو دیکھا پھر پہلو بدل کر فون پر کہا۔ "تمہارا مطالبہ ہمارے لیے ناقابلِ قبول ہے۔ خود ہی سوچو... کیا کوئی بھی عقل مند اپنی جائیداد کا اتنا بڑا حصہ کسی دوسرے کی جھولی میں ڈال سکتا ہے؟"
وہ بولا۔ "انسان اپنی سلامتی کے لیے زندگی کے سب سے قیمتی سرمایے کو بھی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ لیکن میں محسوس کر رہا ہوں' تمہارے گھر والوں کے لیے تمہاری سلامتی سے زیادہ جائیداد کا وہ حصہ اہم ہے۔"
اس نے جلدی سے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"
"ایسی بات نہیں ہے تو انہیں راضی کرو۔ ورنہ اچھی طرح سوچ لو... یہ تصویریں خان علی کے ہاتھوں تک پہنچیں گی تو اس کے قہر و غضب سے نہ تو تمہارا باپ تمہیں بچا سکے گا اور نہ ہی تمہارا یہ نکھٹو بھائی کچھ کر پائے گا۔ اپنے حالات پر غور کروگی تو سمجھ میں آئے گا۔ تمہارے گھر والے اپنی جائیداد بچانے کے چکر میں تمہیں قربانی کی بکری بنا رہے ہیں۔"
اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے ماں کو دیکھا۔ ادھر سے وکی نے جیسے اسے اُکسانے کے انداز میں کہا۔ "ذرا عقل سے سوچو اور ان معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ابھی میرا مطالبہ تسلیم کرنے میں تمہارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ تم تو خان علی جیسے سرمایہ دار کی زندگی میں جا کر دولت سے کھیلتی رہوگی۔"
شاہنواز واپس آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ وکی ذرا دیر چپ رہا پھر بولا۔ "میں تو اُس جائیداد میں سے حصہ مانگ رہا ہوں جس کے کچھ حصے پر تمہارا حق ہے۔ باقی تو بیٹا لے جاتا ہے۔ تمہیں اس جائیداد کی نہیں' اپنے مستقبل کی فکر کرنی چاہیے۔ اگر میرا مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو تمہارے گھر والوں کا کچھ نہیں بگڑے گا بلکہ سراسر تمہیں نقصان پہنچے گا۔ تم اپنے روشن مستقبل سے بھی جاؤ گی اور جان سے بھی..."
وہ بول رہا تھا اور وہ چپ چاپ ایسے سن رہی تھی جیسے وکی کی باتیں اس کی سمجھ میں آ رہی ہوں۔ ماں نے بے چین ہو کر اشاروں میں پوچھا۔ "وہ کیا کہہ رہا ہے؟"
اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

دوسری طرف سے وکی نے کہا۔ ''ان تمام پہلوؤں پر غور کیا جائے تو اس وقت تمہاری سلامتی میرے نہیں، تمہارے اپنے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ ان کی ہاں میں تمہارا فائدہ ہے اور انکار میں تمہارا نقصان ہے۔''

فون پر خاموشی چھا گئی۔ اس نے رابطہ ختم کردیا۔ پھر بھی وہ اسے کان سے لگائے بیٹھی ہوئی تھی۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ چند لمحوں بعد ماں نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ ہلاتے ہوئے اشارے میں پوچھا۔ ''کیا ہوا؟ وہ کیا کہہ رہا ہے؟''

اس نے چونک کر ماں کو دیکھا۔ فون کو کان سے ہٹاتے ہوئے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اس نے رابطہ ختم کردیا ہے۔''

''ہائیں... ایسے کیسے ختم کردیا؟''

شاہنواز نے کہا۔ ''تم بڑی دیر سے چپ تھیں۔ کیا کہہ رہا تھا وہ...؟''

وہ بولی۔ ''اس کی ایک ہی بات ہے۔ جو مطالبہ کرچکا ہے، اس سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔''

شاہنواز نے سر جھٹک کر کہا۔ ''وہ کیا سمجھتا ہے؟ وہ پیچھے نہیں ہٹے گا تو کیا ہم آگے بڑھ کر اپنی جائیداد تھال میں سجا کر اس کے سامنے پیش کردیں گے؟''

شہناز نے پوچھا۔ ''اس سے پیچھا چھڑانے کا کوئی دوسرا راستہ تمہارے دماغ میں ہے؟''

''ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ اسے جلد از جلد ٹھکانے لگادیا جائے۔''

''ڈھونڈو گے تو ٹھکانے لگا سکو گے۔ وہ ابھی اسی ہوٹل میں کہیں چھپا ہوا ہے۔ ہماری گرفت میں آنا تو دور کی بات ہے، ہماری نظروں میں بھی نہیں آرہا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو، ایسے شاطر دشمن کو تلاش کرکے ہلاک کرنا آسان ہوگا؟''

''مشکل کو آسان بنانے کے لیے ایک ملاقات ضروری ہے۔''

ماں نے کہا۔ ''بے شک! وہ ابھی ہمارے سامنے نہ آئے لیکن آئندہ تم سے کہیں ملنے پر راضی ہوجائے تو...''

شہناز نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''وہ راضی نہیں ہوگا۔ اس کی دلچسپی، اس کی توجہ کا مرکز اب میں نہیں ہوں، ہماری جائیداد ہے۔''

شاہنواز نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''اور جس کے وہ خواب ہی دیکھتا رہ جائے گا۔''

''وہ میرے مستقبل کو بھی خواب بنادے گا۔''

پھر اس نے ماں کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا جائیداد کا ستر فیصد حصہ میری سلا[illegible] کر ہے؟''

''یہ کیا بات کہی تم نے؟ ہمارے لیے تم [illegible] بھی اہم ہے اور جائیداد بھی...''

شہناز نے کہا۔ ''لیکن وہ جس انداز میں [illegible] رہا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کسی ایک چیز کو [illegible] پائیں گے۔ یا تو مجھے بچانے کے لیے جائیداد کی [illegible] پڑے گی یا پھر جائیداد کی خاطر مجھے بلی چڑھایا جائے گا۔''

شاہنواز نے سر جھٹک کر کہا۔ ''وہ کتنا ہی بڑا [illegible] خان کیوں نہ ہو... ہمارا معاملہ اس کے لیے تر نوالہ ثابت نہیں ہوگا۔''

وہ جھنجلا کر بولی۔ ''میری جان، میری سلامتی اس [illegible] میں ہے۔ پھر بھی تم یہ سمجھ رہے ہو کہ وہ ہمارے خلاف [illegible] کر نہیں پائے گا... یہ کیسی احمقانہ سوچ ہے تمہاری...؟''

پھر وہ ماں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں ایک سیدھی، بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ اگر وہ دشمن اسی طرح ناقابل شکست بنا رہا، ہماری گرفت میں نہ آیا تو اس مسئلے کا آخری [illegible] کیا ہوگا؟ کیا آپ لوگ اس کا مطالبہ تسلیم کرلیں گے؟''

ماں بیٹے نے چونک کر اسے دیکھا۔ زرینہ بانو نے کہا۔ ''یہ تم کیسی نادانی کی باتیں کررہی ہو؟ وہ کوئی معمولی مطالبہ نہیں کررہا ہے۔ ہم ایک ہی جھٹکے میں کنگال ہوجائیں گے۔''

وہ ذرا طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''یعنی بیٹی کی جان جائے کوئی بات نہیں مگر جائیداد ہاتھوں سے نہ جائے؟''

شاہنواز نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم کس [illegible] میں بات کررہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''میرے لہجے کو نہ دیکھو۔ اس حقیقت کو سمجھو کہ ہم بری طرح ہار چکے ہیں۔ جو گڑھا وجی کے لیے کھود رہے تھے، اس میں خود ہی گر پڑے ہیں۔ اب اس گڑھے سے خود بھی نکلو اور مجھے بھی نکالو۔''

ماں نے کہا۔ ''اسی کوشش میں تو لگے ہوئے ہیں۔''

وہ سر جھٹک کر بولی۔ ''میں سب سمجھ رہی ہوں۔ آپ کی ساری کوششیں، ساری توجہ جائیداد کو بچانے کی طرف ہے۔ جبکہ یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آرہی ہے کہ اس کا مطالبہ پورا کرنے کے سوا میری سلامتی کا اور کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔''

شاہنواز نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''یعنی تم چاہتی ہو کہ ہم اپنی جائیداد اس کے حوالے کردیں؟''

''میں صرف اپنی خیریت چاہتی ہوں اور یہ اچھی [illegible]

[illegible] رہی ہوں کہ تم بھی وجی پر غالب نہیں آسکو گے۔''

وہ [illegible] سے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''کیا [illegible] بول رہی ہو؟''

''[illegible] جو سمجھا رہے ہیں، اسی کے مطابق اپنی سلامتی [illegible] بول رہی ہوں۔''

[illegible] چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا پھر بولا۔ ''[illegible] لگتا ہے، وہ کوئی نئی چال چل رہا ہے۔ تمہیں ہمارے خلاف [illegible] کر ہمارے درمیان پھوٹ ڈالنا چاہتا ہے۔''

ماں نے اس کی تائید میں کہا۔ ''درست کہہ رہے ہو۔ جب سے فون پر باتیں ہوئی ہیں، اس کے تیور ہی بدل گئے ہیں۔''

وکی دور بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے درمیان ہلکی پھلکی نوک جھونک شروع ہوگئی تھی۔ پھر شہناز اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ سخت لہجے میں بھائی سے بولی۔ ''تم کبھی وجی پر قابو نہیں پاسکو گے اور تمہاری یہ خوش فہمی مجھے لے ڈوبے گی۔ میں اس سلسلے میں پاپا سے بات کروں گی۔ انہیں بھی یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے جس جنجال میں پھنسایا گیا ہے، اس سے نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔ آپ دونوں تو مجھے نکال نہیں پارہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پاپا میرے لیے کیا کرسکتے ہیں؟''

شاہنواز اسے خاموش نظروں سے گھور رہا تھا۔ زرینہ بانو بھی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ بیٹی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے کچھ سمجھانا چاہتی تھی لیکن وہ پلٹ کر پاؤں پٹختی ہوئی بیرونی دروازے کی طرف چلی گئی۔ ماں نے بیٹے کو دیکھا پھر وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں سے جانے لگی۔ شاہنواز خاموش تھا۔ ان کے جانے کے بعد گہری نظروں سے ریسٹورنٹ کا جائزہ لیتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

ایک ویٹر بل لے آیا تھا۔ وہ اس کی ادائیگی کرنے کے بعد وہاں سے جانا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت موبائل فون کے بزر نے اسے مخاطب کیا۔ اس نے اسکرین پر نمبر پڑھے۔ وکی کال کررہا تھا۔ شاہنواز نے اسے آن کرکے کان سے لگایا۔

دوسری طرف سے اس کا شوخ لب ولہجہ سنائی دیا۔ ''میری آنکھیں یہ کیسا تماشہ دیکھ رہی ہیں؟ لگتا ہے، تم ماں بیٹے اور بیٹی کی تکون ٹوٹ رہی ہے؟''

وہ اس کے لب ولہجے پر تلملا کر رہ گیا۔ اپنی اس بے بسی پر غصہ بھی آرہا تھا کہ وہ اس ہوٹل میں کہیں موجود ہے۔ چھپ چھپ کر انہیں دیکھ رہا ہے مگر اس کی نظروں میں نہیں آرہا ہے۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دانت پیس کر کہا۔ ''کس بل میں چھپ کر بیٹھے ہو؟ مردوں کی طرح سامنے آکر بات کرو۔''

''میں سامنے آؤں گا تو تم لوگ کسی کا سامنا کرنے کے قابل نہیں رہو گے۔''

وہ مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنے لہجے کو ذرا نرم کرتے ہوئے بولا۔ ''دراصل... میں چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان یہ جو گمبھیر مسئلہ ہے، اسے روبرو بیٹھ کر حل کیا جائے۔''

وکی نے کہا۔ ''کوئی مشکل ہو تو اسے حل کیا جاتا ہے۔ کوئی الجھن ہو تو اسے دور کیا جاتا ہے لیکن میرا معاملہ تو صاف اور سیدھا سا ہے۔ فی الحال مجھے روبرو آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ہاں... جب وصیت نامہ تیار ہوجائے گا تو تمہاری ملاقات کی یہ حسرت بھی ضرور پوری کردوں گا۔''

وصیت نامے کی بات سنتے ہی شاہنواز کے تیور بدل گئے۔ اس نے فون پر کہا۔ ''تمہارے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تم چند تصویروں کے عوض بہت بڑا مطالبہ کررہے ہو۔''

''تم سمجھ دار ہو، یہ اچھی طرح سمجھ رہے ہو کہ وہ محض تصویریں نہیں ہیں۔ تمہاری بہن کے لیے قیامت کا سامان ہیں اور اس قیامت کو ٹالنے کے لیے میرا مطالبہ بالکل جائز ہے۔''

''جائز ہوتا تو فوراً قبول کرلیا جاتا۔''

''قبول تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔ نہیں کرو گے تو شہناز کی شامت آجائے گی۔''

''اس کے باوجود تمہارا مطالبہ ہمارے لیے ناقابلِ قبول ہے۔''

''یعنی تمہیں بہن کی سلامتی عزیز نہیں ہے؟''

''ایک بات کان کھول کر سن لو۔ ہم تمہاری گیدڑ بھبکیوں سے ڈرنے والے نہیں ہیں اور نہ ہی اتنے نادان ہیں کہ تم ان تصویروں کے ذریعے ہمیں لوٹنا چاہو گے اور ہم لٹ جائیں گے۔''

وکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''تم ان تصویروں کو خان علی تک پہنچانا چاہتے ہو تو جاؤ، اپنا یہ شوق بھی پورا کرلو۔ پھر تم دیکھو گے کہ شہناز کی سلامتی نہ تو تمہارے ہاتھوں میں ہے اور نہ ہی خان علی کے ہاتھوں میں... یہ تو اچھی طرح جانتا ہوں کہ وہ ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد میری بہن کی جان کا دشمن بن جائے گا۔ اس سے تو ہم نمٹ لیں گے لیکن تم یہ خوش فہمی

اپنے دل و دماغ سے نکال دو کہ تمہارا مطالبہ تسلیم کیا جائے گا۔ جائیداد کے سلسلے میں ہم کوئی سمجھوتا نہیں کریں گے۔''

وہ وکی کی توقع کے خلاف بول رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''اگر یہی بات ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ اپنی بہن کو آج ہی سے تحفظ دینا شروع کردو... بلکہ اسے کسی تہ خانے میں چھپا دو۔ میں بھی دیکھوں گا' تم کب تک اس کے پہرے دار بن کر رہ سکو گے؟''

اس نے رابطہ ختم کردیا۔ پھر شہناز کے نمبر پنچ کر کے انتظار کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد اس کی آواز سنائی دی۔ وہ بولا۔ ''کسی نے سچ کہا ہے' زندگی میں آنے والے آزمائشی حالات بڑے بڑوں کی قلعی کھول دیتے ہیں۔ تمہارے بھائی کی بھی قلعی کھل گئی ہے۔''

اس نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا مطلب...؟''

''اس کا کہنا ہے کہ میں یہ تصویریں خان علی تک پہنچا دوں۔''

وہ گاڑی کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایک دم سے اچھل کر بولی۔ ''کیا...؟''

''وہ بہن کی سلامتی کے لیے جائیداد کو قربان کرنا نہیں چاہتا۔''

اس نے ماں کو دیکھتے ہوئے فون پر کہا۔ ''مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ شانی نے تم سے یہ بات کہی ہوگی۔''

''وہ ابھی تمہارے پاس آنے والا ہے۔ تم تصدیق کرسکتی ہو۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''اگر اس نے ایسا کہا ہے تو سراسر بکواس کی ہے۔ تم... تم اس کی باتوں میں آکر ان تصویروں کو خان علی تک نہ پہنچانا۔''

''میں اپنے معاملات میں کسی کی انگلی تھام کر نہیں چلتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ ایک ہفتے کے اندر اندر میرا مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو وہ تصویریں اشتہار بن کر خان علی تک پہنچ جائیں گی۔''

دوسری طرف سے رابطہ ختم کردیا گیا۔ اس نے ایک ذرا ٹھٹک کر اپنے موبائل فون کو دیکھا۔ زرینہ بانو نے پوچھا۔ ''کیا ہوا...؟ اب یہ کیا کہہ رہا ہے؟ تم شانی کا نام کیوں لے رہی تھیں؟''

وہ غصے سے دانت پیس کر بولی۔ ''دشمن تو میرے خلاف محاذ آرائی کر ہی رہا ہے لیکن مجھے اپنے ہی بھائی سے یہ امید نہیں تھی۔''

''آخر بات کیا ہے؟ کیا کردیا شانی نے...؟''

''ہم جس شامت کو کسی طرح ٹالنا چاہتے ہیں... دعوت دے رہا ہے۔ اس نے وجی سے کہا ہے... تصویروں کو خان علی تک پہنچانا چاہتا ہے تو پہنچا دے۔''

ماں نے ایک دم سے چونک کر اسے دیکھا پھر... میں سر ہلا کر کہا۔ ''میں نہیں مانتی۔ شانی ایسی حماقت نہیں کرسکتا۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔''

''یہ جھوٹ کیوں بولے گا؟ ابھی شانی یہاں آئے گا... ساری بات کھل کر سامنے آجائے گی۔''

زرینہ بانو نے بے چین ہوکر ریسٹورنٹ کے... دروازے کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ''پتا نہیں یہ لڑکا کہاں رہ گیا ہے؟''

شہناز کے اندر کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ وہ جھنجھلا کر گاڑی سے باہر آتے ہوئے بولی۔ ''سمجھ میں نہیں آتا، اس نے کیا سوچ کر وجی کو یہ مشورہ دیا ہے؟ اس سے تو صاف ظاہر ہورہا ہے کہ اسے میری سلامتی سے زیادہ جائیداد کی فکر ہے۔''

زرینہ بانو بھی گاڑی سے اترتے ہوئے بولی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ ہمارے لیے دونوں باتیں اہم ہیں۔ جائیداد بھی اور تم بھی...''

''لیکن شانی مجھے داؤ پر لگا کر جائیداد کو اہمیت دے رہا ہے۔''

''دشمن نے بہکایا اور تم بہک گئیں۔ بھائی کو الزام دینے سے پہلے یہ تو دیکھ لو کہ اس نے ایسی بات کہی بھی ہے یا نہیں اور اگر کہی ہے تو کیا سوچ کر کہی ہے؟''

ان دونوں کی نظریں ریسٹورنٹ کے بیرونی دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ باہر آتا دکھائی دیا۔ شہناز اسے گھور کر دیکھنے لگی۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ وکی نے اس کے متعلق جھوٹ نہیں بولا ہوگا۔ یقیناً اس نے ایسی ہی باتیں کی ہوں گی۔

اور وہ کیسے نہ سمجھتی؟ وہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ دولت اور جائیداد کا لالچ ان کی گھٹی میں پڑا تھا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کا مال سمیٹنے کی فکر میں رہنے والے بھلا اپنی دولت وکی کی جھولی میں کیسے ڈال سکتے تھے؟ اور نہ ڈالنے کے دو ہی راستے تھے۔ ایک تو یہ کہ کسی بھی طرح اسے ڈھونڈ کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا یا پھر اس کے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے خان علی سے دشمنی مول لے لی جاتی۔ پھر ایسا خطرناک رسک لینے کے بعد جو ہوتا دیکھا جاتا مگر یہ بات واضح تھی کہ اس ہونے نہ ہونے میں شہناز کے ساتھ بہت برا ہونے والا تھا۔ ویسے اب بھی کچھ اچھا نہیں ہورہا تھا۔

...ادھر وہ سیڑھیاں اترتا ہوا گاڑی کی طرف آرہا تھا۔ ... سوچ رہی تھی۔ دل و دماغ میں وکی کی باتیں گونج رہی تھیں۔ ...تمہاری خیریت تمہارے اپنوں کے ہاتھوں میں... یہ لوگ تمہیں قربانی کی بکری بنانا چاہتے ہیں...''

شہناز نے پاؤں پٹخ کر دل ہی دل میں سوچا۔ 'بکری ...نہیں بنوں گی... جس دولت اور جائیداد پر ممی اور پاپا کے بعد شاہنواز راج کرنے والا ہے، اسے بچانے کی خاطر میں اپنی جان، اپنا مستقبل داؤ پر کیوں لگاؤں؟ جبکہ میری جائیداد تو خان علی ہے۔'

شاہنواز قریب آگیا تھا۔ ماں نے پوچھا۔ ''کہاں رہ گئے تھے تم...؟''

وہ بولا۔ ''وجی کا فون آگیا تھا... اس سے باتیں کررہا تھا۔''

شہناز نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''باتیں کررہے تھے یا میرے خلاف اسے مشورے دے رہے تھے؟''

اس نے بہن کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ماں نے بیٹی سے کہا۔ ''تم ذرا چپ رہو۔ مجھے بات کرنے دو۔''

شاہنواز نے پوچھا۔ ''مسئلہ کیا ہے؟ یہ کیا کہنا چاہتی ہے؟''

زرینہ بانو نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''اندر بیٹھو پھر بتاتی ہوں۔''

وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بیٹے نے اسٹیئرنگ سیٹ سنبھال لی۔ شہناز نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے متلاشی نظروں سے ریسٹورنٹ کی عمارت کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں وکی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ لیکن نہ تو وہ پہلے ریسٹورنٹ کے اندر دکھائی دیا تھا اور نہ اب باہر کہیں نظر آرہا تھا۔ شاہنواز نے ہارن بجا کر اسے متوجہ کیا۔ اس نے چونک کر گاڑی کی طرف دیکھا پھر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

زرینہ بانو نے کہا۔ ''شہناز کے پاس اس خبیث کا فون آیا تھا۔''

شاہنواز نے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہا تھا وہ...؟''

شہناز نے کہا۔ ''پہلے تم بتاؤ' تم نے اس سے کیا کہا ہے؟''

وہ ماں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمارا شبہ درست ثابت ہورہا ہے۔ وہ ہم تینوں کے درمیان پھوٹ ڈالنا چاہتا ہے۔ جب آپ دونوں وہاں سے اٹھ کر باہر آگئیں تو اس نے یہی سمجھا کہ ہماری تکون ٹوٹ رہی ہے۔''

شہناز نے کہا۔ ''وہ تو دشمن ہے۔ ہمارے خلاف جو سوچے جو کرے، وہ کم ہے۔ لیکن تم نے کیا کیا؟ اسے بڑے مزے سے کہہ کر آگئے کہ وہ ان تصویروں کو خان علی تک پہنچانا چاہتا ہے تو پہنچا دے...؟''

اس نے سر گھما کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ''وہ جو مطالبہ کررہا ہے، ہم اسے کسی صورت تسلیم نہیں کرسکتے۔ اس لیے...''

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''اس لیے تم نے اس سے کہہ دیا کہ وہ جو چاہے کرتا پھرے؟''

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''پہلے پوری بات سن لیا کرو پھر بولا کرو۔ میں اسے اس مطالبے سے ہٹا کر کسی دوسرے سمجھوتے پر راضی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ تو جیسے مرغے کی ایک ٹانگ پر اڑا ہوا ہے۔ ان تصویروں کے ذریعے بھرپور فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تب میں نے اپنے نقصان اور اس کے فائدے کے بارے میں سوچا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ وہ تصویریں ہماری اتنی بڑی کمزوری نہیں ہیں جتنا بڑا وہ فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔''

شہناز کچھ کہنا چاہتی تھی، ماں نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ شاہنواز نے کہا۔ ''پھر میں نے سوچا کہ وہ تصویریں خان علی تک پہنچ جائیں گی تو کیا ہوگا؟ وہ ہم سے تعلقات ختم کردے گا۔ شہناز کی جان کا دشمن بن جائے گا۔ یہ بھی یہی سوچ رہی تھی۔ آپ بھی یہی سوچ رہی تھیں اور میں بھی یہی سمجھ رہا تھا۔ لیکن ایسا سوچتے ہوئے ہمارے دماغوں سے یہ بات نکل گئی کہ شہناز، خان علی کو وجی کے بارے میں بہت کچھ بتا چکی ہے۔ وہ اسے ایک مجرم کی حیثیت سے جانتا ہے۔''

ماں بیٹی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ شاہنواز نے کہا۔ ''اب خود ہی سوچو، وہ ان تصویروں کو خان علی تک پہنچائے گا یا اس کے سامنے شہناز کے خلاف زہر اگلے گا تو کیا خان علی ایک مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے شخص کی باتوں پر کان دھرے گا؟''

شہناز نے کہا۔ ''ہاں۔ میں نے اس کی برائی تو خوب کی تھی۔ اسے ضدی اور سر پھرا نوجوان بھی کہا تھا لیکن... یہ مرد بڑے شکی ہوتے ہیں۔ رائی کو پربت سمجھنے لگتے ہیں۔ پھر وجی تو میری اور اپنی تصویریں اس کے سامنے پیش کرنے والا ہے۔''

وہ بولا۔ ''ہم خان علی کو یہ باور کرائیں گے کہ وہ تمام فوٹو کمپیوٹر اور جدید ٹیکنالوجی کی کارستانی ہیں۔ وجی نے تمہاری اور اپنی تصویروں کی مکسنگ کی ہے اور اب انہیں تمہارے خلاف استعمال کررہا ہے۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ماں نے بیٹے سے پوچھا۔ ''یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ ایسا کیوں کررہا ہے؟''

وہ بولا۔ ''اس سوال کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ وہ شہناز سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ہم اپنی لڑکی کا ہاتھ کسی مجرم کے ہاتھوں میں تھما نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا انکار کا نتیجہ اب سامنے آرہا ہے اور وہ خان علی کو ہمارے خلاف بھڑکانے کے لیے ایسے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کررہا ہے۔''

ماں نے سر گھما کر بیٹی کو دیکھا۔ شاہنواز نے چہک کر پوچھا: ''کیوں...؟ کیسا آئیڈیا ہے؟''

ماں نے کہا۔ ''آئیڈیا تو ایسا ہے کہ سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی... بشرطیکہ ہم خان علی کو قائل کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔''

پھر اس نے بیٹی کو ٹہوکا دیتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کس سوچ میں پڑگئیں؟ کیا کوئی بات کھٹک رہی ہے؟''

اس نے ذرا چونک کر ان دونوں کو دیکھا۔ پھر انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ خان علی ہماری باتوں سے قائل ہوجائے گا۔ وجی کا معاملہ بہت سنگین ہے۔''

وہ بولا۔ ''اس معاملے کو اسی طرح نمٹایا جاسکے گا۔ ورنہ تم اسے ملاقات کرنے پر راضی کرلو۔ میں وہ تصویریں اس کے ساتھ ہی قبر میں دفن کردوں گا۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئی۔ یہ تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی میں ایسی الجھنیں بھی آئیں گی۔ وہ عجیب حالات سے گزر رہی تھی۔ خان علی جیسے محبوب کو دھوکا دینے اور خود کو پوری طرح داؤ پر لگانے کے باوجود کچھ بھی تو ہاتھ نہیں آرہا تھا۔

وکی نے انہیں ایسا الجھایا تھا' ایسا چکر چلایا تھا کہ لینے کے دینے پڑ گئے تھے۔ وہ نانا جان کی دولت اور جائیداد پر قبضہ جمانے کے خواب دیکھنے والے اب اپنی جائیداد بچانے کی فکر میں لگ گئے تھے۔

مگر شہناز کے اندر یہ بات پک رہی تھی کہ جائیداد بچائی جائے گی تو وہ نہیں بچے گی۔ شاہنواز خوامخواہ باتیں بنارہا ہے کہ اسے قائل کرلیا جائے گا جبکہ وہ خان علی کے مزاج کو خوب جانتی تھی۔ دور تک سوچنے اور غور کرنے کے بعد یہ حقیقت واضح طور پر سمجھ میں آرہی تھی کہ وہ کسی طرح ان کی باتوں میں آبھی گیا تو وجی کا معاملہ اس کے دل و دماغ میں پھانس کی طرح چبھتا رہے گا اور اس کی چبھن ان کی ازدواجی زندگی میں زہر گھولتی رہے گی۔

اس کے اندر خان علی کی آواز گونجنے لگی۔ اس نے کہا تھا۔ ''اگر کبھی تم نے مجھ سے بے وفائی کی' کسی اور سے دل لگایا تو پہلے اس رقیب کو جان سے ماروں گا پھر تمہیں بھی گولی سے اڑا دوں گا۔ ہم محبت کرتے ہیں تو ٹوٹ [illegible] لیکن جب انتقاماً نفرت کرتے ہیں تو جان سے [illegible] خاک میں ملا دیتے ہیں۔''

وہ یک دم سے چونک گئی۔ جھرجھری [illegible] بھائی کو دیکھنے لگی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوچکی تھی۔ [illegible] احاطے سے نکلنے کے بعد مختلف راستوں سے گز[illegible] شاہنواز ڈرائیونگ کے دوران وکی اور خان علی کے [illegible] ماں سے باتیں کررہا تھا۔

وہ کھڑکی سے باہر گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھتے سوچنے لگی۔ 'میری خیریت اسی میں ہے کہ وہ تصویر[illegible] خان علی تک نہ پہنچیں۔ لیکن میں کیا کروں؟ کیسے [illegible] روکوں؟ اسے کسی طرح ملاقات کرنے پر راضی کر بھی [illegible] تو یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس جیسا شاطر دشمن کبھی [illegible] کی گرفت میں نہیں آئے گا۔ اس سلسلے میں بھائی کا [illegible] بے کار ہوگا۔ یہ صرف بولتا ہے۔ کبھی کچھ کرکے نہیں دکھا[illegible] اس کی ایسی نااہلی مجھے لے ڈوبے گی۔ اپنے بچاؤ کے [illegible] ہی کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔ مگر کیا کرنا ہوگا...؟'

یہ بات تو صاف سمجھ میں آرہی تھی کہ ماں باپ اور بھ[illegible] کسی صورت وکی کا مطالبہ تسلیم کرکے کنگال نہیں ہونا چاہ[illegible] گے۔ وہ روئے گی' گڑگڑائے گی یا احتجاج کرے گی... تب بھی ایک خان علی سے تعلقات استوار رکھنے کے لیے وہ [illegible] اپنی جائیداد کا سودا نہیں کریں گے۔ یہی کہیں گے کہ ج[illegible] ہے، وہ ہونے دو۔ تمہاری سلامتی ہماری ذمے داری ہے۔ اس پہلو پر غور کرتے ہوئے بھی سوچ رہی تھی کہ باپ بھائی کب تک اسے تحفظ دیتے رہیں گے؟

اس نے سوچتے سوچتے ایک گہری سانس لی۔ پھر تما[illegible] خیالات کو ذہن سے جھٹک کر صرف اس پہلو پر غور کر[illegible] کہ اصل مسئلہ وکی ہے۔ ابھی وہ تصویروں کے ذریعے بلیک میل کررہا ہے۔ اگر اس کا مطالبہ تسلیم کر بھی لیا جائے' ت[illegible] اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ وہ آئندہ اس کی او[illegible] علی کی زندگی میں زہر گھولنے نہیں آئے گا۔ یہ بات صاف [illegible] میں آرہی تھی کہ وہ ہمیشہ ننگی تلوار کی طرح اس کے سر پ[illegible] رہے گا۔ لہٰذا اپنی خیریت کے لیے اس کا خاتمہ ضروری آرہا تھا۔

وہ سوچ رہی تھی اور الجھ رہی تھی۔ اس کے پاس صر[illegible] ایک ہفتے کا وقت تھا اور اس دوران اسے بہت کچھ کر [illegible] تھا۔ مگر فوری طور پر یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس [illegible] شکست دشمن کو کس طرح شکست دے سکے گی؟

☆☆☆

[illegible]ت بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ انسان کے چاہنے نہ [illegible] باوجود اسے اپنی ہی ڈگر پر چلاتے رہتے ہیں۔ [illegible] سے ماں کی ممتا اور اس کی محبتوں کے لیے ترستا [illegible] تھا۔ اس کے باوجود یہ حالات ہی تھے جو مجھے [illegible] سکھاتے آرہے تھے۔ پھر مجھے ماما مل گئیں۔ جیسے دنیا جہان کی مسرتیں سمٹ کر میری جھولی میں آگئیں۔ ایک عرصے تک ماں کی ممتا سے محروم رہنے کے بعد اب میں ان سے دور ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن پھر وہی بات... کسی کے چاہنے نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے...

قدرتی حالات نے ایک بار پھر ہمارے درمیان جدائی ڈال دی۔ میں حالات کی انگلی تھامے وجی سے وکی بن کر ماما سے دور ہوگیا اور یہ دوری ہم دونوں کو اپنی اپنی جگہ تڑپا رہی تھی۔

وکی بننے کے بعد سے اب تک مجھے طرح طرح کے معاملات سے نمٹنا پڑ رہا تھا۔ اس اَن جانے ماحول میں نئے نئے لوگ مل رہے تھے۔ وہاں میں کسی پر اپنا بھید کھولنا نہیں چاہتا تھا۔ محتاط رہتا تھا۔ اس کے باوجود دو خواتین میری راز دار بن چکی تھیں۔ یہ اوپر والے کا کرم تھا اور میری ماما کی دعائیں تھیں کہ میں گرتے گرتے سنبھل رہا تھا اور سنبھل سنبھل کر آگے بڑھ رہا تھا۔

دشمنوں کے قریب رہتے ہوئے ایسے خطرناک اور الجھا دینے والے معاملات سے گزرنے کے دوران ماما کے بارے میں زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ مگر جب بھی تنہائی نصیب ہوتی تھی تو ان کی یاد دل کو تڑپانے لگتی تھی۔

میں اِدھر بہت سے لوگوں کے درمیان تھا لیکن وہ اُدھر میرے بعد بالکل ہی تنہا ہوگئی تھیں۔ ایسے میں شیبا آنٹی ان کی دل جوئی کے لیے وہاں آتی جاتی رہتی تھیں۔ اس روز بھی وہ ان کے پاس پہنچی ہوئی تھیں۔

ماما نے کہا۔ ''اب سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ میں ایک طویل عرصے تک کسی رشتے کی محبت کے بغیر کیسے زندہ رہی؟ کیسے اس اسائیلم کی چھت تلے دن رات گزارتی رہی؟ بیس برس...''

انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر ذرا توقف سے کہا۔ ''بیس برس گزار دیے۔ کچھ پتا نہ چلا اور اب بیٹے کے بغیر ایک ایک پل بھاری لگ رہا ہے۔''

شیبا آنٹی نے مسکرا کر کہا۔ ''رشتوں کی محبت اور کشش ایسی ہی ہوتی ہے۔''

ماما نے کہا۔ ''اور اب جبکہ میں پھر سے اس محبت اور کشش کو سمجھنے لگی ہوں تو تمام رشتے مجھ سے دور ہوگئے ہیں۔ فی الحال ڈیڈی سے ملاقات نہیں ہوسکتی۔ وہ اپنے کاروباری معاملات میں ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ ابھی مجھ سے ملنے یہاں نہیں آسکیں گے۔ یہاں میرے پاس دو بیٹے ہیں۔ ایک کی تو صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔ دوسرا قریب رہتا تھا لیکن وہ بھی اس ممتا کی ماری کو تنہا چھوڑ کر چلا گیا ہے۔''

وہ ماما کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے بولیں۔ ''وہ تمہاری خوشی کی خاطر ہی تم سے دور گیا ہے۔ وکی کو تلاش کرنا بھی تو ضروری ہے نا؟''

ماما نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''میں تو ایک بیٹے کی تلاش میں دوسرے بیٹے کی محبت سے محروم ہوگئی ہوں۔''

''یہ عارضی محرومی ہے۔ تمہیں دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔ دونوں بیٹوں کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہا کرو۔''

ماما کو جب یہ معلوم ہوا تھا کہ وکی ایک مجرمانہ زندگی گزار رہا ہے تو ان کے دل کو بہت صدمہ پہنچا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں کسی بھی طرح وکی کو ڈھونڈ کر ان کے پاس پہنچادوں۔ وہ بڑی محبت اور ممتا سے ایک مجرم بن جانے والے بیٹے کو شریفانہ زندگی کی طرف لے آئیں گی۔ ایسے وقت میں گڑبڑا گیا تھا۔ انہیں یہ کیسے بتاتا کہ وہ جس بیٹے کا مطالبہ کررہی ہیں، جسے شریفانہ زندگی کی طرف لانا چاہتی ہیں... وہ پوری دنیا سے منہ پھیر کر موت کے منہ میں پہنچ چکا ہے۔

جھوٹ بولنا ایک غلط فعل ہے۔ لیکن جب یہ کسی کی زندگی بچانے یا صدمات کو کسی حد تک کم کرنے کے لیے ضروری ہوجاتا ہے تو خود بخود درست لگنے لگتا ہے۔ میں ماما کے سامنے سچ نہیں بول سکتا تھا۔ اس لیے میں نے جھوٹ کہا۔ مُردہ وکی کو زندہ بتا کر یہ وعدہ کرلیا کہ اسے ان کے قدموں میں ضرور لاؤں گا۔

میں انہیں اپنے معاملات سمجھا نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا جب بگ باس کے پاس جانے کا پروگرام بنا تو میں نے ماما سے یہی کہا کہ وکی کو تلاش کرنے کے سلسلے میں کہیں جارہا ہوں۔ واپسی پر اس نالائق کو ساتھ لے کر لوٹوں گا۔ ماما نے ایک بیٹے کو رخصت کیا تھا اور اب دو بیٹوں کی واپسی کے انتظار میں دن گن رہی تھیں۔

شیبا آنٹی بڑی دیر تک ان کی دل جوئی کرتی رہیں پھر رخصت ہوگئیں۔ ان کے جانے کے بعد ماما نے ماسٹر فو سے

کہا۔ ''میں کچھ ضروری شاپنگ کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے کسی قریبی شاپنگ سینٹر میں لے چلو۔''

میرے اور نانا جان کے حکم کے مطابق ماما کو سخت سیکیورٹی فراہم کی جارہی تھی۔ ماسٹر فو اور امیر حمزہ تو سائے کی طرح ان کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ بگ باس کے علاوہ میلسن اور جینا کے معاملے سے نمٹنے کے دوران میرے کچھ نئے دشمن پیدا ہو گئے تھے۔

گیری کوپر نے مجھے بتایا تھا کہ میں اَن جانے میں انڈر ورلڈ کی سب سے خطرناک اور خفیہ تنظیم بلڈر برج کے لوگوں سے ٹکرا گیا ہوں۔ وہ لوگ اتنے خطرناک ہیں کہ اسکاٹ لینڈ یارڈ سمیت دنیا کے تمام چھوٹے بڑے جاسوس اداروں کے لیے ہمیشہ چیلنج بنے رہتے ہیں۔ ان کا چھوٹے سے چھوٹا آلۂ کار بھی کبھی کسی کی گرفت میں نہیں آتا۔

پہلے تو میرے، ماسٹر فو اور امیر حمزہ کے علاوہ گیری کوپر بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ جینا کو اسی تنظیم کے لوگوں نے اغوا کیا ہے لیکن بعد میں پاپا کا نمائندہ بن کر رہنے والے مارٹی نے مجھے بتایا کہ جینا کو نہ تو خفیہ تنظیم والے اغوا کر سکے ہیں اور نہ ہی وہ بگ باس کے ہاتھوں تک پہنچی ہے۔ اس وقت تک ہم نہیں جانتے تھے۔ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ ہم سب کی توقع کے برخلاف وکی کے پاس پہنچی ہوئی تھی۔

بلڈر برج ایک اسلام دشمن تنظیم ہے۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد کم کرنا اور اسلام کی تبلیغ کو روکنا ان کے اہم مقاصد میں شامل ہے اور یہ لوگ اپنے اس مقصد کے حصول کے لیے ابتدا سے ہی مسلمانوں کے خلاف بہت کچھ کرتے آرہے ہیں۔ اس کے باوجود مسلمانوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد ان کی ناکامی کا کھلا ثبوت ہے اور اس کے علاوہ انہی کے ہم مذہب دائرۂ اسلام میں داخل ہو کر اس تعداد کو مزید بڑھانے کا سبب بن رہے ہیں۔ ایسی صورتِ حال مذہبی تعصب رکھنے والوں کو جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی ہے اور ہمارے خلاف ان کی کارروائیاں شدید ہوتی چلی جارہی ہیں۔

میلسن اور جینا کا معاملہ بھی اسی جھنجھلاہٹ کا نتیجہ تھا۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ میں جینا کے بعد میلسن کو بھی اپنے دین کی طرف بلانے والا ہوں۔ لہٰذا انہوں نے میلسن سمیت مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کی ناکام کوشش کی۔ لیکن بعد میں یہ سن کر انہیں ذرا اطمینان ہوا کہ میں نہ سہی، میرا ایک مسلمان جڑواں بھائی مارا گیا ہے۔

لیکن یہ ان کی ایک ادھوری کامیابی تھی۔ وہ اپنے مقصد میں مکمل طور پر کامیابی حاصل کرنے کے لیے میرے پیچھے پڑ گئے تھے تاکہ میرے ذریعے ہونے والی اسلام کی تبلیغ روک سکیں۔

میں ان حقائق کو خوب سمجھ رہا تھا۔ وہ مجھے اور میرے اپنوں کو نقصان پہنچا سکتے تھے اور میری فیملی میں صرف ماما تھیں۔ نانا جان چونکہ پاکستان میں تھے اور ویسے بھی وہ اپنے دشمنوں سے نمٹنا خوب جانتے تھے۔ اس لیے ان کی طرف سے مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ لیکن ماما کی مکمل سیکیورٹی ضروری تھی اور ایسے وقت جبکہ میں بھی ان کے پاس نہیں رہا تھا۔ اس سلسلے میں ماسٹر فو اور امیر حمزہ کی ذمے داریاں بڑھ گئی تھیں۔

ماما ویسے تو گھر میں ہی وقت گزارتی تھیں لیکن جب ضرورت کے تحت گھر سے باہر جانا ہوتا تھا تو ماسٹر فو اور امیر حمزہ کے علاوہ دو مسلح سیکیورٹی گارڈز بھی دوسری گاڑی میں ان کے پیچھے چلتے تھے۔ اس روز ماسٹر فو اور امیر حمزہ ان سیکیورٹی گارڈز کو اپنی دونوں گاڑیوں کے پاس مستعد رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے ماما کے ساتھ ایک شاپنگ سینٹر کی عمارت میں آگئے۔

عام طور پر باڈی گارڈز اپنے آقاؤں کو کسی بھی دشمن کے حملے سے بچانے کے لیے چوکنا رہ کر دائیں بائیں ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ لیکن ماسٹر فو اور امیر حمزہ کے اپنے کچھ اصول تھے۔ وہ میری یا ماما کی نگرانی کرتے وقت ہمارے قریب نہیں رہتے تھے۔ ہم سے فاصلہ رکھ کر دور رہ کر عقابی نظروں سے دور و نزدیک کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔

ایسے طریقہ کار کا ایک بڑا اور اہم فائدہ یہ ہوتا تھا کہ اگر کوئی دشمن ہمارے تعاقب میں ہوتا تھا اور چھپ کر ہم پر نظریں جمائے رہتا تو وہ ہمیں نہتا اور تنہا دیکھ کر مطمئن ہو جاتا تھا۔ پھر اس کی یہی خوش فہمی اسے ہمارے قریب آنے کا حوصلہ دیتی تھی۔

ایسے وقت کوئی بھی دشمن یہ سمجھ نہیں پاتا تھا کہ اَن جانے میں ماسٹر فو اور امیر حمزہ جیسے زبردست جاں نثاروں کی نظروں میں آکر کیسے زیرِ دست ہونے والا ہے؟ دشمنوں کو دھوکا دینے کی یہ حکمتِ عملی ایسی تھی کہ شکاری بڑے مزے سے خود شکار ہو جایا کرتے تھے۔

بہت عرصہ پہلے شاہنواز نے بھی اسی طرح دھوکا کھایا تھا۔ اس وقت میں پاکستان میں تھا۔ شہناز جان بوجھ کر مجھ سے آ ٹکرائی تھی اور شاہنواز غیرت مند بھائی بن کر کرائے کے غنڈوں کے ساتھ مجھ سے ہاتھا پائی کرنے چلا آیا تھا۔ یہ

تھا کہ ماسٹر فو اور امیر حمزہ میری حفاظت کے لیے وہاں موجود ہیں اور ایسی لاعلمی اسے بھاری پڑی تھی۔

ان لمحات میں وہ مجھ سے الجھا ہوا تھا۔ شہناز کو میری گرفت سے نکالنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف ماسٹر فو اور امیر حمزہ نے اس کے چیلوں کی ہڈی پسلیاں توڑ کر رکھ دی تھیں۔ یہ دونوں محافظ میرے دشمنوں کو اسی طرح ڈاج دیا کرتے تھے۔

اس وقت بھی وہ گہری نظروں سے شاپنگ سینٹر کا جائزہ لے رہے تھے۔ کسی بھی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے چوکنا اور مستعد تھے۔ ماما مختلف دکانوں میں جا رہی تھیں اور ضرورت کا سامان خرید رہی تھیں۔ ایسے وقت وہ بھی یہی ظاہر کرتی تھیں، جیسے ان کے ساتھ کوئی نہیں ہے۔

ان کے حوالے سے ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ وہ عبا پہنتی تھیں اور نقاب میں رہتی تھیں۔ کوئی بھی دشمن انہیں آسانی سے پہچان نہیں سکتا تھا۔ پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔ وہ دونوں محافظ بڑے محتاط انداز میں ان کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔

یہ ماما کی عادت تھی۔ وہ ہمیشہ اپنی دائیں کلائی پر ایک تسبیح کو بریسلٹ کی طرح پہنے رکھتی تھیں۔ پھر جب ذرا فرصت ملتی تھی تو اسے اتار کر تسبیح خوانی میں مصروف ہو جاتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ تسبیح ان کی دائیں کلائی میں پڑی ہوئی تھی۔

وہ ایک دکان سے نکل کر سیڑھیاں چڑھتی ہوئی شاپنگ پلازا کے اوپری حصے میں جانا چاہتی تھیں۔ انہوں نے آہنی ریلنگ تھام کر پہلے پائے دان پر قدم رکھا لیکن پھر دوسرے پائے دان پر قدم رکھتے ہی ٹھٹک کر رک گئیں۔ سر گھما کر اپنے دائیں ہاتھ کو دیکھا۔ کلائی پر جھولتی ہوئی تسبیح کا ایک سرا ریلنگ کے جالی دار ڈیزائن میں الجھ گیا تھا۔

انہوں نے اسے نکالنے کے لیے ہاتھ کو اپنی طرف کھینچا تو کلائی کو ایک جھٹکا لگا اور اس جھٹکے کے باعث تسبیح ٹوٹ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہی مقدس دانے کلائی سے نکل کر دھاگے سے پھسل کر اِدھر سے اُدھر تک بکھرتے چلے گئے۔

ماما گرتے ہوئے دانوں کو فوراً ہی دوسرے ہاتھ سے تھامنا چاہتی تھیں مگر تھامنے اور سنبھالنے کے دوران فرش پر موتیوں کی چھما چھم ہوتی رہی۔ ٹوٹے ہوئے دھاگے میں اور بائیں ہتھیلی میں چند موتی رہ گئے تھے۔ ماما نے انہیں سنبھال کر پرس میں رکھ لیا۔ پھر پائے دان سے اتر کر جھک جھک کر ایک ایک موتی چننے لگیں۔

شاپنگ سینٹر کے اس حصے میں زیادہ بھیڑ نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اُدھر سے گزرنے والے راہ گیروں کو ذرا بچ کر چلنے کی ہدایت کرتی ہوئی جلدی جلدی موتی سمیٹ رہی تھیں۔

ماسٹر فو اور امیر حمزہ نے بھی تسبیح کو ٹوٹتے اور بکھرتے دیکھا تھا۔ امیر حمزہ ماما کی مدد کے لیے ادھر جانا چاہتا تھا۔ لیکن دو قدم آگے بڑھتے ہی ٹھٹک گیا۔ ماسٹر نے پیچھے آکر روکنے کے انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس نے پلٹ کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ماسٹر فو نے بھویں اُچکا کر ماما کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ادھر نہیں... اُدھر دیکھو...!''

حمزہ نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے اس طرف دیکھا۔ اُدھر ایک شخص ماما کے قریب آکر رک گیا تھا۔ اس کی عمر غالباً پچاس برس ہوگی۔ وہ جھک کر اُن سے پوچھ رہا تھا۔ ''کیا میں آپ کی مدد کروں؟''

ماما جھکی ہوئی تھیں۔ ایک دم سے چونک کر آنے والے کو دیکھا۔ یوں لگا، جیسے کوئی بھولی بھٹکی سی آواز اور لہجہ ان کے حافظے پر دستک دینے آگیا ہو۔ وہ ''نو تھینکس'' کہتی ہوئی سیدھی کھڑی ہوگئیں۔ اسے متجسس نظروں سے دیکھنے لگیں۔ پھر انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

ماما کو اپنے دونوں محافظوں کا انتظار تھا۔ یہ امید تھی کہ ان میں سے کوئی ان کی مدد کے لیے آئے گا لیکن ایک اجنبی مدد کرنے کے لیے وہاں پہنچ گیا تھا۔

اِدھر ماسٹر فو نے امیر حمزہ سے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے میں نے اس شخص کو سامنے والی دکان میں دیکھا تھا جہاں سے میڈم ابھی کچھ خرید کر باہر آئی تھیں۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا یہ اُن کا پیچھا کر رہا ہے؟''

''یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ مگر ایسا لگ رہا تھا۔ ہمیں دور رہ کر اس پر نظر رکھنی چاہیے۔''

اُدھر ماما فرش پر اکڑوں بیٹھ کر موتی چننے لگی تھیں۔ وہ اجنبی ان کے انکار کرنے کے باوجود وہاں سے ٹلا نہیں تھا۔ وہ بھی اکڑوں بیٹھ کر ایک موتی اٹھا کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''کسی کی مدد کرنا، کسی کے کام آنا عین عبادت ہے اور یہ سارے موتی تو عبادت کا ذریعہ ہیں۔ کیا آپ مجھے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے سے روکیں گی؟''

ماما نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا۔ اس کی چٹکی میں تسبیح کا ایک دانہ دبا ہوا تھا۔ اس موتی دینے والے نے موتی جیسی بات کہی تھی۔ ماما نے متاثر ہو کر اپنی دائیں ہتھیلی آگے بڑھائی۔ اس کا ہاتھ ماما

کے ہاتھ سے ذرا اوپر تھا۔ اس نے قطرہ ٹپکانے کے انداز میں وہ موتی کھلی ہوئی ہتھیلی پر گرا دیا۔ پھر ماما نے مٹھی بند کرلی۔ گویا سیپ میں موتی بند ہوگیا۔

اِدھر ماسٹر فو اور امیر حمزہ اس پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ اُدھر اس اجنبی نے ایک اور دانہ اٹھا کر ماما کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے پھر ہتھیلی پھیلائی۔ پھر ایک موتی سیپ میں بند ہوگیا۔

ماما نے ان دونوں موتیوں کو پرس میں رکھ کر فرش پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تسبیح بھی دنیاوی رشتوں کی طرح مضبوط نہیں تھی۔ ایک ہی جھٹکے میں ٹوٹ گئی۔''

وہ موتی چننے میں مصروف تھیں اور وہ اجنبی فرش پر ٹٹولنے کے انداز میں ہاتھ پھیرنے کے دوران نقاب سے جھانکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ ماما نے نظریں اٹھائیں تو وہ فوراً ہی کتراتے ہوئے بولا۔ ''قصور تسبیح کا نہیں ہے، دھاگے کا ہے... موتی تو مل جل کر تسبیح بن کر رہنا چاہتے تھے لیکن دھاگے نے ساتھ نہ دیا۔''

پھر اس نے دور پڑے ہوئے دو موتی اٹھا کر ماما کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے دنیاوی رشتوں کی بات کہی۔ یہ رشتے بھی مل جل کر اتحاد کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں لیکن جب قسمت ساتھ نہ دے تو لہو کے رشتے بھی ٹوٹ کر ایک دوسرے سے چھوٹ کر جدا ہوجاتے ہیں۔''

اس کا دایاں ہاتھ ماما کی طرف بڑھا ہوا تھا لیکن وہ موتی لینے کے بجائے کسی سوچ میں گم ہوگئی تھیں۔ وہ بول رہا تھا۔ اس کی آواز حافظے کے گنبد میں بھٹک رہی تھی۔ لہجہ کہہ رہا تھا۔ ''میں پہلے بھی تمہارے پاس آکر جاچکا ہوں۔''

وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔ انہوں نے پوچھا۔ ''کیا آپ سے بھی کوئی اپنا چھوٹ گیا ہے؟''

وہ اُن کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے کیسے جانا...؟''

وہ ہتھیلی پھیلاتے ہوئے بولیں۔ ''جانتی نہیں ہوں۔ صرف پوچھ رہی ہوں۔''

وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔ ''ہاں۔ میں اپنوں کی جدائی کا دکھ سہہ رہا ہوں۔''

اس نے مزید ایک موتی ان کی ہتھیلی پر ٹپکا دیا۔ ادھر ماسٹر فو نے کہا۔ ''اس شخص کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اور ٹوہ لیتی ہوئی آنکھیں بتا رہی ہیں جیسے یہ میڈم کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔''

امیر حمزہ نے اس کی تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''درست کہتے ہو۔ میڈم چونکہ نقاب میں ہیں اس لیے ہے کہ وہ انہیں پہچاننے کے بعد ٹریپ کرنا چاہتا ہو... ابھی معلوم ہوجائے گا کہ یہ کون ہے۔''

ماسٹر فو نے دور دور تک نظریں دوڑاتے ہوئے اندازہ نہیں ہو رہا ہے کہ یہ تنہا ہے یا اس کے کچھ ساتھی یہاں پہنچے ہوئے ہیں۔''

اُدھر ماما الجھ سی گئی تھیں۔ انہوں نے کریدنے میں پوچھا۔ ''قسمت کے دھاگے سے آپ کا کون ٹوٹ کر الگ ہوگیا ہے؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''ابھی آپ دیکھ ہیں، تسبیح کے تمام دانے فرش پر بکھرے پڑے ہیں۔ میرے ساتھ بھی کچھ یہی معاملہ ہے۔ قسمت کے دھاگے سے سب رشتے نکل کر مجھ سے بچھڑ گئے ہیں۔''

ماما نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر دور پڑے ہوئے ایک موتی کو اٹھا کر پرس میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یعنی بچھڑنے والوں نے آپ کو تنہا کر دیا ہے؟ بائی داوے، رشتے داروں میں کون کون ہے؟''

''میری بیوی اور دو بیٹے ہیں اور فی الحال وہ تینوں ہی میرے پاس نہیں ہیں۔''

ماما نے چونک کر اسے یوں دیکھا جیسے درد مشترک ہو رہا ہو۔ پھر وہ فرش پر سے موتی اٹھاتے ہوئے بولیں۔ ''میرے بھی دو بیٹے ہیں۔''

اس نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''اور آپ کے شوہر...؟''

ماما یہ سوال سن کر چونک گئیں۔ پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے بولیں۔ ''وہ اس دنیا میں ہیں مگر پتا نہیں کہاں ہیں؟''

اس نے مسکرا کر کہا۔ ''یعنی میری وائف کی طرح پاس نہیں ہیں مگر کہیں ہیں۔''

ماما نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ ''ہمارے حالات کچھ زیادہ ہی ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہیں ہیں؟''

وہ اثبات میں سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔''

ایسے وقت ماما کے موبائل فون کا بزر سنائی دیا۔ انہوں نے اسے پرس سے نکال کر دیکھا۔ پھر دائیں بائیں دور تک نظریں دوڑاتے ہوئے اسے کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ ''ہاں، بولو...!''

دوسری طرف ماسٹر فو اپنا موبائل فون کان سے لگائے

ہوئے تھا۔ اس نے کہا۔ ''میڈم! ہم آپ کے پاس ایک شخص کو بھیج رہے ہیں۔''

ماما نے اس اجنبی کو دیکھا۔ وہ دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک دانہ لڑھکتا ہوا بہت دور چلا گیا تھا۔ وہ اٹھ کر ادھر جائے گا۔ وہ فون پر بولیں۔ ''ہاں۔ یہ اخلاقاً میری مدد کرنے آرہا ہے۔''

''آپ اس کی باتوں سے کیا اندازہ کر رہی ہیں؟''

انہوں نے ایک نظر اجنبی پر ڈالی۔ وہ موتی چننے کے لیے ذرا دور ہوگیا تھا اور وہ اپنے اندر بکھرے ہوئے موتی چُن نہیں پا رہی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ ''یہ بے چارہ حالات کا مارا ایک تنہا شخص ہے۔''

''اُسے بے چارہ نہ کہیں۔ وہ دشمن کا کوئی آلۂ کار بھی ہوسکتا ہے۔ ہم تو نگرانی کر ہی رہے ہیں۔ آپ کو بھی محتاط رہنا چاہیے۔''

وہ بولیں۔ ''اچھی بات ہے، میں محتاط رہوں گی۔ اب یہ تم سمجھو کہ وہ ہمارا دشمن ہے یا کوئی بے ضرر سا شخص ہے۔''

''بعض دشمن ایسے ہی بے ضرر دکھائی دیتے ہیں۔ ویسے آپ فکر نہ کریں۔ ہم اس پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہیں۔''

تسبیح کے بہت سے دانے لڑھکتے ہوئے دور تک گئے تھے۔ وہ انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر چُن رہا تھا۔ ماما نے اسے دیکھتے ہوئے فون پر کہا۔ ''میں کسی فکر میں مبتلا نہیں ہوں اور نہ ہی اس شخص سے خوف محسوس کر رہی ہوں۔ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ جب میرے فون پر تمہاری کال موصول ہوئی تو یہ یہاں سے اٹھ کر دور چلا گیا۔ یعنی اسے یہ پروا نہیں ہے کہ میں اس وقت فون پر کس سے کیا بات کر رہی ہوں؟ اگر یہ کوئی دشمن ہوتا اور مجھے ٹریپ کرنے یہاں آیا ہوتا تو اس طرح سج اٹھ کر دور نہ جاتا... بلکہ سن گن لینے کے لیے یہیں میرے پاس ہی موجود رہتا۔''

ماسٹر فو نے امیر حمزہ کو دیکھا۔ پھر قائل ہوکر فون پر کہا۔ ''آپ کی اس بات میں وزن ہے۔ پھر بھی ہم محتاط ہیں۔ بعض اوقات دشمن کی ہیرا پھیری سمجھ میں نہیں آتی۔''

''بے شک! تم اپنے فرائض ادا کرو اور اس شخص کو سمجھنے کی کوششیں کرتے رہو۔''

انہوں نے رابطہ ختم کر کے فون کو پرس میں رکھا۔ پھر اس اجنبی کو دیکھنے لگیں۔ ''یہ کون ہے؟ کیا دانستہ میری طرف آیا ہے؟ یا حالات اپنا رخ بدل رہے ہیں اور مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں؟''

فی الوقت تو یہی سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ ماما کی مدد کرنے وہاں آیا ہے۔ ابھی شاید زیادہ وقت نہیں لگے گا اور معلوم ہو جائے گا کہ کیوں آیا ہے؟

فی الحال ماما کو اس کی آواز اور لب و لہجہ الجھا رہا تھا۔ صدائے بازگشت کی طرح ان کے اندر ہی اندر بھٹک رہا تھا اور ان کا حافظہ اس بازگشت کو اپنی گرفت میں لے نہیں پا رہا تھا۔ وہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ناکام ہو رہی تھیں۔

رابطہ ختم ہو چکا تھا۔ اُس نے سر گھما کر ماما کو دیکھا۔ پھر پلٹ کر ایک ایک قدم چلتا ہوا ان کے پاس چلا آیا۔ اس کے ہاتھ میں چند موتی دبے ہوئے تھے۔ وہ انہیں ماما کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''اب یہاں اور موتی دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سب ہی دانے چن لیے گئے ہیں۔''

وہ ان موتیوں کو لے کر پرس میں رکھتے ہوئے بولیں۔ ''بکھرنے والے اتنی جلدی سمٹتے نہیں ہیں۔ یہ تو گنتی کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ تمام دانے مل گئے ہیں یا کچھ گم ہوگئے ہیں۔''

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟''

''یقیناً آپ میرا نام پوچھنا چاہیں گے؟''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں۔ میں دراصل... وہ... آپ کے اِس تل کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔''

ماما نے اس کے اشارے کے مطابق اپنی دونوں بھوؤں کے درمیان انگلیاں پھیریں۔ وہاں ایک تل بندیا کی طرح سجا رہتا تھا اور دونوں بھوؤں کے درمیان اتنا واضح تھا کہ دیکھنے والے دھوکا کھا کر یہی سمجھتے تھے کہ وہ مصنوعی ہے۔ کاجل کے ذریعے بنایا گیا ہے۔ اس اجنبی نے پوچھا۔ ''کیا یہ پیدائشی ہے؟''

ماما نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ''جی ہاں...''

ان کا جواب سن کر اجنبی کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی۔ وہ جب سے ماما کے پاس آیا تھا، تب سے اس کی نظریں اُس تل پر بھٹک رہی تھیں۔ اُس نے کہا۔ ''میں نے ایسا ہی تل کسی کی پیشانی پر دیکھا تھا۔''

انہوں نے پوچھا۔ ''کس کی پیشانی پر...؟''

''کیا بتاؤں؟ وہ چہرہ تو ایک خواب ہو چکا ہے۔ نہ اس کی تعبیر مل رہی ہے، نہ ہی دوبارہ وہ خواب نظر آرہا ہے۔ بس یادیں رہ گئی ہیں۔''

ماما نے کہا۔ ''میرا اندازہ ہے، آپ پاکستانی ہیں۔''

اس نے مسکرا کر کہا۔ ''جی ہاں۔ آپ کا اندازہ درست

ہے۔ میں پاکستانی ہوں۔ مسلمان ہوں اور مجھے علی کہتے ہیں۔''

ماما نے زیرلب ذرا اپنائیت سے کہا۔ ''علی...''

وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ آپ میرا نام سن کر چپ کیوں ہوگئیں؟''

چونکہ میرے پاپا کا نام قربان علی واسطی تھا، اس لیے ماما کے 'وکی' کے اور میرے نام کے بعد علی لگایا جاتا تھا۔ شاید اس نام سے گہری وابستگی کے باعث وہ کچھ گم صم سی ہوگئی تھیں۔ انہوں نے پوچھا۔ ''کیا آپ یہاں لندن میں رہتے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''ہاں۔ مگر مستقل قیام نہیں ہے۔ ویسے آپ کے متعلق میرا بھی اندازہ ہے کہ پاکستانی ہیں۔''

''آپ کا بھی اندازہ درست ہے۔''

اس نے مسکرا کر کہا۔ ''اپنے ہم وطنوں کو پہچاننے میں دیر نہیں لگتی۔''

ماسٹر فو اور امیر حمزہ پہلے دور تھے۔ پھر ٹہلتے ہوئے اتنے قریب آگئے تھے کہ بہ آسانی ان دونوں کی باتیں سنائی دے رہی تھیں اور وہ توجہ سے سن رہے تھے۔

علی نے کہا۔ ''یہ میری بدنصیبی ہے۔ میں ایک عرصے سے تنہا بھٹک رہا ہوں۔ اپنے ملک سے دور ہوں۔ حالات کچھ ایسے پیش آرہے ہیں کہ عارضی طور پر ہی سہی' کسی مسلمان گھرانے سے کوئی تعلق پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ ابھی رمضان کا بابرکت مہینا چل رہا ہے۔ چونکہ میری فیملی نہیں ہے۔ اس لیے سحر و افطار تنہا کرتا ہوں۔''

پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''دل میں یہ ارمان ہے کہ اسلامی روایات کے مطابق فرش پر دسترخوان سجایا جائے۔ میرے ساتھ اور بھی مسلمان ہم نوا ہاتھ اٹھا کر روزہ افطار کرنے کی دعا پڑھیں اور بسم اللہ کہتے ہوئے پہلی کھجور منہ میں رکھیں۔''

یہ اس کی ایسی نیک اور معصوم سی خواہش تھی کہ ماما جیسی دین دار خاتون کا دل جذبۂ ایمان سے لبریز ہوگیا۔ انہوں نے بے چین ہو کر اُس طرف دیکھا جہاں ماسٹر فو اور امیر حمزہ کھڑے ہوئے تھے۔ مگر وہ اب وہاں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ انہوں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ وہ ان سے کچھ ہی فاصلے پر دائیں بائیں لوگوں کے ہجوم کے درمیان ایسے چھپے ہوئے تھے کہ کسی کی نظروں میں نہیں آسکتے تھے۔ ماما نے انہیں دیکھ لیا تھا۔

ایسے ہی وقت ان کا موبائل فون بولنے لگا۔ انہوں نے اسے پرس سے نکال کر دیکھا۔ پھر کان سے لگا کر کہا۔ ''ہاں بولو...!''

دوسری طرف سے حمزہ کی آواز سنائی دی۔ اس نے ''میں کیا بولوں؟ آپ بولیں، کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

ماما نے علی کو دیکھا۔ اس کی نگاہیں پیشانی سے بھٹک رہی تھیں۔ ماما کو متوجہ پاتے ہی وہ نظریں چرا لے انہوں نے کہا۔ ''ایکسکیوزمی...! ذرا ایک منٹ...''

وہ اس سے ذرا دور ہوتے ہوئے فون پر میں بولیں۔ ''اس شخص کا رویہ ظاہر کر رہا ہے اور میرا کہتا ہے' یہ کوئی دشمن نہیں ہے۔ اس کی ایک چھوٹی خواہش ہے۔ یہ کسی مسلم فیملی میں روزہ افطار کرنا چاہتا اور میرا دینی فرض ہے کہ میں اس کی یہ ایمان پرور خواہش پوری کروں۔''

''ہم آپ دونوں کی باتیں سنتے رہے ہیں۔''

''پھر تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے؟ میں مانتی ہوں کہ کسی بھی جگہ' کسی بھی موڑ پر کوئی دشمن ہم سے ٹکرا سکتا ہے۔ لیکن ضروری تو نہیں ہے کہ کوئی ٹکرانے والا دشمن ہی ہو۔ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ باتیں بھی سن رہے ہو۔ گویا اسے اچھی طرح پرکھ رہے ہو۔ مجھے بتاؤ' کیا اس کے کسی انداز یا لب و لہجے سے مکر و فریب جھلک رہا ہے؟''

امیر حمزہ نے سر گھما کر ذرا فاصلے پر کھڑے ہوئے ماسٹر فو کو دیکھا۔ ماما دھیمی آواز میں بول رہی تھیں۔ وہ ان کی باتوں کو واضح طور پر سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے ماسٹر فو کو اشارہ کیا کہ وہ فون پر اس سے بات کرے۔

امیر حمزہ نے ماما سے کہا۔ ''ذرا انتظار کریں۔ ہم تھوڑی دیر میں آپ کے پاس آرہے ہیں۔''

وہ رابطہ ختم کر کے وہاں سے چلتا ہوا ماسٹر فو کے پاس آگیا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ میڈم کیا کہہ رہی ہیں؟''

وہ بولا۔ ''تم نے بھی یقیناً اس شخص کی باتیں سنی ہوں گی؟''

ماسٹر فو نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے پوچھا۔ ''اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''بظاہر تو وہ ایک بے ضرر سا شخص دکھائی دے رہا ہے۔ اس سے آگے بھی اُسے سمجھا جاسکتا ہے۔''

''میڈم بھی یہی کہہ رہی ہیں اور اسے اپنے گھر میں روزہ افطار کرانا چاہتی ہیں۔''

ماسٹر فو نے دور کھڑے ہوئے علی کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ ''بے شک! ہم میڈم کی خواہش کا احترام کریں گے لیکن ہماری ڈیوٹی کے بھی کچھ اصول ہیں۔ ہم اس شخص کی جامہ تلاشی لیے بغیر اسے اپنے ساتھ نہیں

جائیں گے۔''

وہ دونوں اس بات پر متفق ہوکر ماما کے پاس آگئے۔ ماسٹر فو نے کہا۔ ''ہم اس شخص کو پہلے چیک کریں گے۔ اگر یہ نہتا ہوگا تو ساتھ لے چلیں گے۔''

وہ بولیں۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ سیکیورٹی کے طور پر تم جو کرنا چاہتے ہو کرو۔ میرے لیے ایک مسلمان شخص کی دینی خواہش قابلِ احترام ہے اور میں اسے ہر حال میں پورا کرنا چاہتی ہوں اور آج ہی کرنا چاہتی ہوں۔''

علی دور کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔ ماما نے ماسٹر فو اور امیر حمزہ کے ساتھ اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''یہ دونوں میرے باڈی گارڈز ہیں۔ دراصل ہماری فیملی کو کچھ جانے اَن جانے دشمنوں سے خطرہ لاحق رہتا ہے۔ یہ میری سیکیورٹی کے لیے ہمہ وقت میرے ساتھ رہتے ہیں۔''

علی نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ سے مل کر خوشی ہورہی ہے۔''

اس کے چہرے کے تاثرات بتارہے تھے کہ اسے واقعی ان دونوں سے مل کر خوشی ہورہی تھی۔ ماسٹر فو اور امیر حمزہ غضب کے تجربہ کار باڈی گارڈز تھے۔ کسی بھی شخص کی نہ صرف باتوں سے اور لب و لہجے سے بلکہ اس کی چال ڈھال اور جسمانی ساخت سے بھی اندازہ کرلیتے تھے کہ سامنے والا کتنا شاطر اور مکار ہے اور عام طور پر کیسی زندگی گزارتا ہوگا؟

علی نے پہلے ماسٹر فو سے مصافحہ کیا تھا۔ پہلے ہتھیلی سے ہتھیلی مس ہوئی۔ پھر پورا ہاتھ گرفت میں لیتے ہی ماسٹر فو نے امیر حمزہ کی طرف دیکھا۔ اکثر اوقات وہ زبان سے کچھ نہیں بولتے تھے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنا پیغام دوسرے تک پہنچادیتے تھے۔

حمزہ نے جواباً اسے یوں دیکھا جیسے اس کے دیکھنے کا مقصد سمجھ گیا ہو۔ ماما اور علی اس بات سے بے خبر تھے کہ ان دونوں کے درمیان کیا چل رہا ہے؟

اس نے ماسٹر فو سے مصافحہ کرنے کے بعد امیر حمزہ سے ہاتھ ملایا تو اس نے بھی اس کا ہاتھ گرفت میں لینے کے بعد ماسٹر کی طرف دیکھا۔ پھر چند لمحوں بعد اسے چھوڑ دیا۔

اس دوران ماسٹر فو گہری نظروں سے علی کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر بولا۔ ''ہم تو دن رات اپنے مالک کی حفاظت کے لیے ہتھیاروں سے کھیلتے ہیں۔ تم کس کی حفاظت کرتے ہو؟''

اس نے ذرا چونک کر اسے دیکھا۔ پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

امیر حمزہ نے کہا۔ ''جس طرح لوہا کاٹنے اور پھر ... والے ہاتھ کو ایک محنت کش ہی پہچان سکتا ہے ... ہتھیار اٹھانے والے ہاتھ کو ہتھیاروں سے کھیلنے ... پہچان سکتے ہیں۔''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اپنے دائیں ہاتھ کو دیکھا۔ پھر ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ میرے وہ محافظ ... کے پَر گننے والوں میں سے تھے۔ ان لمحات میں جیسے ... اندر کی بات جان رہے تھے۔

ماسٹر فو نے کہا۔ ''ہتھیار بُرا نہیں ہوتا۔ اس کا استعمال اسے اچھا یا بُرا بنادیتا ہے۔ تم اسے کیسے استعمال کرتے ہو؟''

اس نے ایک گہری سانس لے کر ان دونوں کو دیکھا اپنے لباس کے ایک اندرونی حصے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ... ''ہر انسان کو اپنی حفاظت کرنے کا حق ہے۔ جس طرح تمہاری میڈم اور ان کی فیملی کو خطرات ہیں اور یہ تم جیسے محافظوں کو اپنے ساتھ رکھتی ہیں اسی طرح میں...''

اس کا ہاتھ ایک ریوالور کے ساتھ باہر آیا۔ ماسٹر فو اور امیر حمزہ ایک دم سے چوکنا ہوگئے۔ وہ اسے ماسٹر فو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنی حفاظت آپ کے تحت اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھتا ہوں۔''

ماسٹر فو اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر ... ریوالور کو ایک رومال میں لپیٹ کر اس کے ہاتھ سے ... ہاتھوں میں لے لیا۔ علی نے کہا۔ ''میں میڈم کے پاس کسی ... ارادے سے نہیں آیا تھا۔ پھر بھی اپنے اطمینان کے لیے آ... یہ ہتھیار اپنے پاس رکھ لیں۔ اب میں نہتا ہوں' چاہیں تو تلا... لے لیں۔''

ماما نے فوراً ہی کہا۔ ''یہ مناسب نہیں ہے۔ یہاں لوگ ہمیں آتے جاتے دیکھ رہے ہیں۔''

پھر ماما نے ماسٹر فو سے پوچھا۔ ''تم کیا کہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''ہم مطمئن ہیں۔ تلاشی ضروری نہیں ہے۔''

ماما نے علی سے کہا۔ ''آپ اسلامی روایات کے مطابق کسی مسلمان گھرانے میں روزہ افطار کرنا چاہتے ہیں... میں آپ کو دعوت دے رہی ہوں۔ کیا آپ ابھی ہمارے ساتھ چلنا چاہیں گے؟''

وہ خوشی سے کھل گیا۔ ایک دم سے چہک کر بولا۔ ''یاخدا! آج برسوں کے بعد میری کتنی بڑی خواہش پوری ہو رہی ہے۔''

اس نے بے اختیار ماما کی پیشانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں بیان نہیں کرسکتا' آج آپ میرے ساتھ کتنی ... کررہی ہیں۔''

... تھ بے ساختہ اپنی پیشانی کے تل پر گیا۔ انہیں یاد ... نے اس تل کے متعلق سوال کیا تھا؟ کیوں کیا تھا؟ ... قت تو انہوں نے روا روی میں جواب دے دیا تھا کہ ... پیدائشی تل ہے مگر اب علی کو پھر اپنی پیشانی کی طرف ... ھتے پایا تو خیال آیا بلکہ سوال پیدا ہوا کہ ایک اجنبی شخص اس تل سے اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے؟

وہ آگے نہ سوچ سکیں۔ ماسٹر فو پوچھ رہا تھا۔ ''کیا آپ واپس چلنا چاہیں گی؟''

وہ بولیں۔ ''ہاں۔ شاپنگ تو ہوچکی ہے۔ بس ایک اُونی اسکارف خریدنا ہے۔''

ماسٹر فو نے علی سے کہا۔ ''تو پھر ہم گاڑی میں چل کر بیٹھتے ہیں۔''

حمزہ نے کہا۔ ''میں میڈم کے ساتھ ابھی آتا ہوں۔''

علی' ماسٹر فو کے ساتھ جانے لگا۔ میرے وہ دونوں محافظ اگرچہ اطمینان ظاہر کرچکے تھے مگر سیکیورٹی کے معاملے میں اپنے باپ پر بھی بھروسا نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے علی سے اپنوں جیسا رویہ اختیار کیا تھا لیکن اندر سے پوری طرح چوکنا تھے۔

علی کو تو ماما کے تل نے الجھا دیا تھا۔ وہ تل جیسے مقناطیس بن گیا تھا اور وہ اسی مقناطیس سے کھنچا جارہا تھا۔ اندر ایسی بے چینی' ایسی ہلچل پیدا ہوگئی تھی کہ اس نے دو مسلح باڈی گارڈز کے سامنے اپنی سلامتی کو اہمیت نہیں دی تھی۔ اپنا ریوالور نکال کر ان کے حوالے کردیا تھا۔

دوسری طرف ماما اور علی کی ملاقات کے پہلے لمحے سے میرے ان محافظوں کی عقابی نظریں کسی بھی اَن جانے دشمن کو تلاش کرتی رہی تھیں۔ لیکن اب تک ایسا کوئی بھی شخص دکھائی نہیں دیا تھا جس پر یہ شبہ کیا جاتا کہ وہ علی کو ماما کے پاس بھیجنے کے بعد دور ہی دور سے ان کی نگرانی کررہا ہو۔

میرے محافظوں کو یہ اطمینان ہوگیا تھا کہ شاپنگ سینٹر کے اندر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ لیکن باہر کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ عین ممکن تھا' باہر دشمن تاک میں بیٹھے ہوں۔ انہوں نے علی کو چارے کے طور پر ماما کے پاس بھیجا ہو اور اب اس انتظار میں ہوں کہ وہ ان کے ساتھ باہر آئے تو ماما پر ہلّا بول دیا جائے۔

اب ماسٹر فو' علی کے ساتھ باہر آیا تھا۔ یہ یقین تھا کہ اگر وہاں دشمن چھپے ہوئے ہیں تو وہ ضرور اسے علی کے ساتھ دیکھ کر اس پر حملہ کریں گے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہورہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی حمزہ کے موبائل فون کا بزر بولنے لگا۔ اس نے اسکرین پر نمبر پڑھے۔ ماسٹر فو کال کررہا تھا۔ اس نے فون کو کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بولو...!''

دوسری طرف ماسٹر فو نے علی کو ایک باڈی گارڈ کے ساتھ گاڑی میں بٹھا دیا تھا اور خود باہر رہ کر شاپنگ سینٹر کے بیرونی دروازے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس کے دائیں طرف ایک باڈی گارڈ مستعد کھڑا تھا۔

اس نے فون پر کہا۔ ''باہر کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میڈم کے ساتھ کسی وقت بھی آسکتے ہو۔''

حمزہ نے ''اوکے'' کہہ کر فون بند کردیا۔ ادھر ماما اپنا مطلوبہ اسکارف خرید چکی تھیں۔ پھر وہ پلٹ کر حمزہ سے بولیں۔ ''ہمیں چلنا چاہیے۔''

وہ اس کے ساتھ شاپنگ سینٹر سے باہر آگئیں۔ ماسٹر فو انہیں بیرونی دروازے سے باہر آتے دیکھ رہا تھا۔ اس کی تیز نگاہیں ان دونوں کے علاوہ آس پاس کے ماحول کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ ایسے ہی وقت وہ ایک دم سے چونک گیا۔ بات ہی چونکانے والی تھی۔

اُدھر ماما اور امیر حمزہ باہر آئے تھے اور اِدھر گاڑی میں بیٹھے ہوئے علی کا موبائل فون چیخنے لگا تھا۔ ماسٹر فو کے اندر جیسے بجلی سی بھر گئی۔ علی اپنا فون نکال کر کال اٹینڈ کرنا چاہتا تھا۔ ادھر ماسٹر فو نے ایک دم سے گھوم کر ریوالور نکال لیا۔ کھڑکی سے ہاتھ اندر کرتے ہوئے اسے نشانے پر رکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ''ہالٹ... فون اِدھر لاؤ۔''

اس نے دوسرا ہاتھ اندر بڑھا کر اسے جھٹکا دیا۔ علی نے نشانے پر آتے ہی گھبرا کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے تھے۔ کالنگ ٹون مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ ماسٹر نے اپنا ہاتھ جھٹک کر جیسے ڈپٹتے ہوئے کہا۔ ''ہری اَپ...''

اس کے ساتھ جو باڈی گارڈ بیٹھا ہوا تھا، اس نے علی کے ہاتھ سے فون چھین کر ماسٹر فو کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنے فون کو دیکھتے ہوئے ذرا پریشان ہوکر بولا۔ ''مجھے دیکھ تو لینے دو۔ کس کی کال ہے؟''

ماسٹر فو نے کوئی جواب نہ دیا۔ فوراً ہی پلٹ کر ماما اور امیر حمزہ کی طرف دیکھا۔ وہ دور سے آتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے فون کی اسکرین کو دیکھا۔ نمبر کے ساتھ نام نہیں آرہا تھا۔ یعنی کوئی ایسا شخص اسے کال کررہا تھا جس کا نمبر اس کے فون میں سیو نہیں تھا۔

ماسٹر فو نے دور دور تک نظریں دوڑاتے ہوئے اسے

آن کر کے کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف سے نہایت ہی مؤدبانہ سی مردانہ آواز سنائی دی۔ ''السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ...!''

اس نے جواباً کہا۔ ''وعلیکم السلام...!''

ادھر سے پوچھا گیا۔ ''آپ یقیناً علی صاحب بات کررہے ہیں؟''

اس وقت تک امیر حمزہ' ماما کے ساتھ ماسٹر فو کے پاس آ گیا تھا۔ اس نے علی کو سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر فون پر کہا۔ ''جی ہاں۔ میں بول رہا ہوں... فرمایئے؟''

اس بار بھی وہی عاجزانہ سا لہجہ سنائی دیا۔ ''فرمانا نہیں ہے، شکریہ ادا کرنا ہے۔ خداوند کریم آپ کی کمائی میں مزید برکت عطا فرمائے۔ آپ جیسے سخی لوگوں کے توسط سے ہی ہمارا یہ دینی مدرسہ قائم و دائم ہے۔ آپ نے رمضان کے اس مبارک مہینے میں جو ایک بھاری رقم کا چیک ہمیں بھیجا ہے، وہ موصول ہو چکا ہے۔ اسی کا شکریہ ادا کرنے کے لیے فون کیا تھا۔''

ماسٹر فو نے علی کو دیکھا۔ اس فون کال کے بعد اس پر کچھ اور اعتماد بڑھ گیا تھا۔ وہ واقعی ان کے لیے ایک بے ضرر سا شخص تھا۔ نیک اور دین دار بھی تھا۔ اس نے فون پر کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں ابھی ذرا مصروف ہوں۔ آپ سے بعد میں بات کروں گا۔''

امیر حمزہ اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ادھر علی کی نظریں بھی سوالیہ تھیں۔ ماسٹر فو نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کسی دینی مدرسے میں جو چیک بھیجا تھا' وہ وہاں موصول ہو چکا ہے۔ کوئی شخص شکریہ ادا کررہا تھا۔''

علی نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ ماما نے متاثر ہو کر اسے دیکھا۔ ماسٹر فو نے ریوالور اپنے لباس میں رکھ کر فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ ماما نے پوچھا۔ ''تم نے مہمان کا فون کیوں ریسیو کیا؟''

''سوری میڈم! یہ سیکیورٹی کا تقاضہ تھا۔''

علی نے کہا۔ ''آپ کے محافظ بہت ہی مستعد اور فرض شناس ہیں۔ یہ اپنی ڈیوٹی پوری طرح انجام دے رہے ہیں۔ میں نے مائنڈ نہیں کیا۔''

علی اس گاڑی کی پچھلی سیٹ پر تھا جسے دو فاضل سیکیورٹی گارڈز لے کر آئے تھے۔ ماما اپنی لگژری کار کی پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئیں۔ امیر حمزہ اور ماسٹر فو اگلی سیٹوں پر تھے۔ اس طرح یہ کارواں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

گھر آنے کے بعد ماما نے نقاب اتار دیا۔ میں اپنی داستان میں ماما کی شخصیت کے حوالے سے پہلے یہ ذکر کر چکا ہوں کہ وہ کسی نامحرم سے کلام نہیں کرتی تھیں، نہ سامنے جاتی تھیں۔ مگر اب بدلتے وقت اور حالات کے مطابق ان کے مزاج میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ مختلف لوگوں سے ملنے جلنے لگی تھیں۔ ضروری ہوتا تو نامحرم کے روبرو آ کر باتیں کر لیا کرتی تھیں۔ وہ گھر سے نقاب میں رہتی تھیں مگر گھر آنے والے مہمانوں سے پردہ کرتی تھیں۔

علی ان کے لیے اجنبی تھا۔ لیکن ان کا مدعو کیا ہوا مہمان تھا۔ اس لیے وہ بے پردہ ہو کر اس کے سامنے آ گئی تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی اس کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ پہلے وہ تل رہا تھا مگر اب پورا چہرہ کھل کر نظروں کے سامنے آ گیا تھا۔ اسے کس بات کی خوشی تھی... وہ کیا پا رہا تھا؟ یہ تو پانے والا ہی خوشیوں سے مالا مال ہونے والا ہی جانتا تھا۔

رحمانی بیگم' میڈم مارتھا کے ساتھ افطار کے پکوان تیار کررہی تھی۔ ماما بار بار اٹھ کر کچن میں جاتی تھیں۔ پکوان کی تیاری دیکھتی تھیں پھر رحمانی بیگم کو کوئی نہ کوئی ہدایت دے کر واپس ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ جاتی تھیں۔ ماسٹر فو اور امیر حمزہ انہیں دیکھ رہے تھے۔ ان کے ایسے انداز سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ اندر سے بہت خوش ہیں۔ چاہتی ہیں کہ مہمان نوازی میں کسی طرح کی کمی نہ رہ جائے۔

ماسٹر فو نے علی کا موبائل فون اس کے حوالے کر دیا تھا۔ دوبارہ گھنٹی بج سکتی تھی۔ کوئی نہ کوئی اسے مخاطب کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے سب سے نظریں بچا کر اسے آف کر دیا۔

افطار کا وقت ہونے والا تھا۔ مہمان کی خواہش کے مطابق فرشی نشست کا اہتمام کیا گیا تھا۔ دسترخوان پر انواع و اقسام کے پکوان سجا دیے گئے تھے۔ ماما' امیر حمزہ' علی اور رحمانی بیگم وضو کر کے دسترخوان پر آ گئے۔ ماسٹر فو کے ساتھ میڈم مارتھا بھی وہاں موجود تھی۔

علی نے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے' ایک طویل عرصے کے بعد اپنوں کے ساتھ بیٹھ کر افطار کر رہا ہوں۔ یہاں یہ سب میرے اپنے ہیں اور آپ بھی...''

اس نے بات پوری نہیں کی۔ مگر بات پوری کی پوری سمجھ میں آ گئی۔ وہ ماما کو اپنی کہہ رہا تھا۔ اس بار ماما کو صرف اس کی آواز اور لب و لہجے نے ہی نہیں' اس کی بات نے بھی چونکا دیا تھا۔

اس نے وہاں موجود سب ہی کو اپنا کہا تھا۔ ان اپنوں میں وہ اپنی بھی تھیں... اور یہ بات ماما کو بہت دور تک لے

رہی تھی۔ وہ وہاں بیٹھے ہی بیٹھے واقعی بہت دور بھٹکنے لگیں۔

وقت ٹی وی پر اذانِ مغرب کا اعلان ہوا تو وہ سب ہی روزہ افطار کرنے کی دعا پڑھنے لگے۔

ماما گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ علی نے دعا پڑھنے کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرے پھر ایک کھجور منہ میں رکھی۔ امیر حمزہ' رحمانی بیگم نے بھی یہی کیا۔ ماما کو بھی یہی کرنا چاہیے تھا لیکن وہ جوں کی توں بیٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھ بہ دستور دعائیہ انداز میں اٹھے ہوئے تھے۔ وہ جیسے وہاں موجود تو تھیں لیکن ذہنی طور پر حاضر نہیں تھیں۔

ماسٹر فو دسترخوان کے اس پار ان کے عین سامنے بیٹھا ہوا تھا اور بڑی توجہ سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ سنت نبویؐ کے مطابق کبھی روزہ افطار کرنے میں دیر نہیں کرتی تھیں لیکن اس وقت کر رہی تھیں۔ کوئی تو الجھن تھی... جو ابھی ماسٹر فو کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔

علی نے ذرا تعجب سے ماما کے ہاتھوں کو دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ آپ روزہ افطار نہیں کر رہی ہیں؟''

امیر حمزہ سر جھکا کر کھا رہا تھا۔ علی کی بات سن کر اس نے ماما کو دیکھا۔ ادھر وہ بھی چونک گئی تھیں۔ انہوں نے فوراً ہی ایک کھجور اٹھا کر منہ میں رکھی۔ حمزہ نے سر گھما کر ماسٹر فو کی طرف دیکھا۔ علی نے کہا۔ ''روزہ افطار کرنے میں کبھی دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

انہوں نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتی ہوں۔ لیکن پتا نہیں...''

انہوں نے ایک نظر علی کو دیکھا پھر سر جھک کر نظریں جھکا لیں۔ اُدھر ماسٹر فو کا دماغ ماما کی کسی اَن جانی الجھن میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے کھا رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ کھانے کے دوران کبھی کبھی گہری نظروں سے علی کو بھی دیکھ رہا تھا۔

امیر حمزہ کچھ بے چین سا ہو گیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے ایسے گہرے اور رازدار ساتھی تھے کہ ایک دوسرے کی خاموشی سے اور تیوروں سے کسی بھی معاملے کو کافی حد تک بھانپ لیتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ماسٹر فو وہاں سے اٹھ کر ایک کمرے میں آ گیا۔ حالانکہ وہ خاموشی سے آیا تھا لیکن امیر حمزہ سمجھ گیا تھا کہ اسے اپنے ساتھی کے پیچھے جانا چاہیے۔ لہٰذا وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کمرے میں آ گیا۔ ماسٹر ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔ امیر حمزہ نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

وہ اس کے قریب آ کر رکتے ہوئے بولا۔ ''میڈم کی ایک چھوٹی سی حرکت نے مجھے چونکا دیا ہے۔ کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے اس علی نامی شخص کے ساتھ ہیں۔ پھر ابھی ایسی کیا بات ہوئی کہ انہوں نے چونک کر اسے دیکھا اور سوچ میں ایسی گم ہوئیں کہ روزہ افطار کرنا بھی بھول گئیں؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں۔ یہ حیرانی کی بات ہے۔ وہ روزہ افطار کرنے میں کبھی دیر نہیں کرتیں۔''

ماسٹر فو نے ایک کھڑکی کے پاس آ کر پردے کو ذرا ہٹا کر لاؤنج کی طرف دیکھا۔ ماما اور رحمانی بیگم نماز کے لیے اٹھ گئی تھیں۔ علی بھی ایک طرف مصلے پر نماز ادا کر رہا تھا۔ ماسٹر فو گہری نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ آنکھیں بند کیے عبادت میں مصروف تھا۔

ماسٹر فو نے پلٹ کر امیر حمزہ کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''یہ شخص کچھ الجھا رہا ہے۔''

وہ بولا۔ ''کچھ بھی ہو مگر اتنا تو اندازہ ہے کہ یہ خطرناک نہیں ہے۔ قابلِ اعتماد ہے۔ اس کے پاس ایک ہی ہتھیار تھا' وہ بھی اس نے ہمارے حوالے کر دیا ہے۔ پھر تم نے اس کی فون کال بھی ریسیو کی تھی۔ وہ بھی تسلی بخش تھی۔''

وہ تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم مطمئن ہونے کے بعد ہی اسے گھر کے اندر لائے ہیں۔ لیکن میڈم کا وہ رویہ...''

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ حمزہ نے کہا۔ ''وہ اکثر ہی ذہنی الجھنوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ ان کی یادداشت بحال ہو چکی ہے۔ انہیں اپنے ماضی کی تمام اہم باتیں یاد آ گئی ہیں۔ پھر بھی یاد کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ ڈاکٹر شیبا نے بتایا تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے ماضی کی اہم باتوں کے علاوہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی یاد آتی چلی جائے گی۔ ممکن ہے' افطار کے وقت بھی ان کا دماغ ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا ہو اور وہ یونہی بیٹھے بیٹھے چونک گئی ہوں پھر سوچ میں گم ہو گئی ہوں۔''

ماما کے ساتھ کیا ہوا تھا اور اب کیا ہو رہا تھا؟ یہ تو وہی بتا سکتی تھیں۔ وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ ایسے وقت ان کی زبان پر اور دل و دماغ میں قرآنی آیتیں گونجتی رہتی تھیں۔ وہ پوری دنیا کو بھول کر خدا کو حاضر و ناظر جان کر بڑے خشوع و خضوع سے عبادت میں مصروف رہتی تھیں۔ لیکن ان لمحات میں بار بار ان کا دماغ بھٹک رہا تھا۔ وہ پوری توجہ کے ساتھ نماز ادا کرنا چاہتی تھیں مگر ذہنی یکسوئی حاصل نہیں ہو رہی تھی۔

وہ مہمان بن کر آنے والا ان کا دھیان بانٹ رہا تھا۔

اس نے جس ذو معنی انداز میں اپنائیت کی بات کی تھی' وہ بات رہ رہ کر ان کے اندر گونج رہی تھی۔ وہ آیتیں پڑھتے پڑھتے رک رہی تھیں' اٹک رہی تھیں۔ پھر سر جھٹک کر پڑھنے لگتی تھیں۔

بہ مشکل تین فرض ادا ہو سکے۔ سلام پھیرنے کے بعد وہ چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھی رہیں۔ گہری سوچتی ہوئی نگاہیں مصلے پر جمی ہوئی تھیں۔ انہیں یا تو اٹھ کر نماز کو جاری رکھنا چاہیے تھا یا پھر صرف فرض ادا کرنے کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنی چاہیے تھی۔ لیکن وہ جوں کی توں بیٹھی ہوئی تھیں۔ نہ خود اٹھ رہی تھیں' نہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رہی تھیں۔

رحمانی بیگم نے بھی ان کے برابر جائے نماز بچھا رکھی تھی۔ اس نے نماز ادا کرنے کے بعد ماما کو دیکھا۔ پھر ان کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے میڈم! آپ کچھ الجھی ہوئی ہیں۔ نماز بھی مکمل نہیں کی ہے۔''

انہوں نے سر گھما کر رحمانی بیگم کو دیکھا۔ پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے ایک نیکی کی۔ ایک مسلمان کی خواہش پوری کی لیکن وہ مسلمان میری عبادت میں خلل ڈال رہا ہے۔''

رحمانی بیگم نے ذرا چونک کر پوچھا۔ ''کیا مطلب؟ کیا آپ اِسی مہمان کی بات کر رہی ہیں؟''

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے لاؤنج کی طرف دیکھا پھر پوچھا۔ ''وہ آپ کی عبادت میں کیسے خلل ڈال سکتا ہے اور کیوں ڈالے گا؟''

ایسے ہی وقت ماما کے دل و دماغ میں پھر اس کی وہی بات گونجنے لگی۔ انہوں نے سر جھٹک کر رحمانی بیگم کو یوں دیکھا جیسے وہ بھی ان کے اندر گونجنے والی آواز کو سنتی رہی ہو۔ پھر یہ بات سمجھ میں آئی کہ اس معاملے میں کسی کو شریک نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے ساتھ جو ہو رہا ہے' اسے خود سمجھنا چاہیے۔

انہوں نے کترانے کے انداز میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم جا کر مہمان کو دیکھو۔ اسے کسی چیز کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ اور ہاں، چائے بنا لینا۔''

وہ ان کے حکم کے مطابق وہاں سے چلی گئی۔ ماما کی نگاہوں کے سامنے دونوں ہتھیلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ بسم اللہ پڑھ کر آنکھیں بند کر کے دعا مانگنا چاہتی تھیں۔ ایسے ہی وقت انہیں لگا' جیسے تسبیح کا ایک دانہ ان کی ہتھیلی پر آ گرا ہو۔ انہوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ پھیلی ہوئی ہتھیلیوں کی طرف دیکھا۔ پھر جائے نماز پر ادھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ وہاں کوئی موتی نہیں تھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا... لب بولیں۔ ''یا اللہ! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے... طرف آنا چاہتی ہوں۔ لیکن دل و دماغ بھٹک کر ا... طرف کیوں جا رہا ہے؟ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ کہاں... میرے ذہن کے دروازے پر دستک دے رہا ہے؟ ا... سی بات ہے جو میرے اندر کہیں اٹک رہی ہے مگر میری... میں نہیں آ رہی؟''

اوپر والے کا اپنا ایک نظام ہوتا ہے۔ وہ جب تک... ہے' انسان کو الجھائے رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے الجھنوں کو سلجھا دیتا ہے۔ ماما کی بہت سی الجھنیں سلجھ چکی تھیں... لیکن اب یہ نئی پیدا ہونے والی الجھن نہ جانے کس نوعیت کی تھی اور کب سلجھنے والی تھی؟ کوئی الجھن تھی بھی یا ان کا د... یونہی بھٹک رہا تھا؟ اور خوامخواہ اس اجنبی کے بارے میں جو... نہ کچھ سوچ رہا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک دعائیں مانگتی رہیں۔ پھر دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر کر اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ لاؤنج میں ماسٹر فو اور امیر حمزہ' علی کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ باتوں کے دوران یہ معلوم ہوا تھا کہ علی کی کوئی مستقل رہائش گاہ نہیں ہے۔ وہ کبھی ہوٹلوں کے کمروں میں رہتا ہے اور کبھی کہیں دو چار ماہ گزارنے کے لیے کوئی نہ کوئی کاٹیج کرائے پر لے لیتا ہے۔

لندن میں بھی اس کا قیام مستقل نہیں تھا۔ وہ اپنے بزنس کے سلسلے میں ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں گھومتا رہتا تھا۔ میرے دونوں محافظ باتوں کے دوران اس کے بارے میں اچھی خاصی معلومات حاصل کر رہے تھے۔

جب ماما ان کے درمیان آ کر بیٹھیں تو علی نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے ان سے پوچھا۔ ''آپ کے... بیٹے کہاں ہیں؟''

انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''ایک گم ہو گیا ہے اور دوسرا اسے تلاش کرنے گیا ہے۔''

ان کی بات سن کر اس نے پہلو بدل کر پوچھا۔ ''کیسے گم ہو گیا ہے؟ اور وہ اسے کہاں تلاش کرنے گیا ہے؟''

رحمانی بیگم چائے لے آئی تھی۔ ماما نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے کچھ خاندانی الجھے ہوئے معاملات ہیں۔ انہیں چھوڑیں... آپ چائے لیں۔''

وہ ایک کپ اٹھا کر چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ ماما نے رحمانی بیگم سے اپنا پرس منگوایا۔ پھر اس میں سے تسبیح کے دانے نکال کر گننے لگیں۔ علی چائے پی رہا تھا۔ انہیں دیکھ رہا تھا۔ اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ادھر میرے دونوں محافظ اسے ... نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جب دانوں کی گنتی ... تو علی نے ماما سے پوچھا۔ ''پورے ہیں؟''

انہوں نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں۔ تین دانے کم ہیں۔''

... پہلو بدل کر سوچتی ہوئی نظروں سے طشتری میں رکھے ہوئے دانوں کو دیکھا۔ ''تین دانے...؟''

پھر وہ بیٹھے بیٹھے اچانک چونک گیا۔ کن انکھیوں سے ماما کو دیکھنے لگا۔ پھر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اوہو... آپ لوگوں سے مل کر تو مجھے کچھ یاد ہی نہیں رہا۔ ایک بہت ضروری کام کے سلسلے میں کہیں جانا تھا۔ اب مجھے اجازت دیں۔''

وہ بولتے بولتے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ جانے کی بات سنتے ہی ماما کے اندر ایک عجیب سی ہلچل مچ گئی۔ انہوں نے ایک دم سے تڑپ کر یوں دیکھا جیسے اسے روکنا چاہتی ہوں۔ دل میں سوال پیدا ہوا۔ ''کیوں روکنا چاہتی ہوں؟''

ماسٹر فو اور امیر حمزہ بھی اپنی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ علی نے کہا۔ ''آپ لوگوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا ہے۔ اس فیملی ماحول میں روزہ افطار کرنے کی ایک بہت بڑی خواہش پوری ہو گئی۔''

ماما بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ پھر دونوں محافظوں کے ساتھ مہمان کو رخصت کرنے کے لیے بیرونی دروازے کی طرف جانے لگیں۔ ایسے ہی وقت فون کی گھنٹی سنائی دی۔ امیر حمزہ نے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں۔ آپ چلیں۔''

ماسٹر فو آگے آگے تھا۔ وہ ماما اور علی سے پہلے بیرونی دروازے سے نکل کر بنگلے کے احاطے میں پہنچ گیا۔ ماما علی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ وہ بیرونی دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ ان کی پیشانی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پیشانی کا یہ تل آپ کی شناخت ہے۔ خوش نصیب ہے وہ شخص جس نے پہلی بار آپ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔''

ماما نے ایک دم سے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ فوراً ہی آگے بڑھتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ اسے خالی خالی نظروں سے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ فوراً ہی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ کر گیا ہے اور انہوں نے کیا سنا ہے؟

وہ کچھ کھوئے کھوئے سے انداز میں آگے بڑھنے لگیں۔ شاید اسے مخاطب کرنا چاہتی تھیں۔ ایسے وقت امیر حمزہ کی آواز سنائی دی۔ ''میڈم!''

وہ آگے بڑھتے بڑھتے رک گئیں۔ امیر حمزہ نے کہا۔ ''شیبا میڈم کی کال ہے۔ آپ کو بلا رہی ہیں۔''

وہ دروازے پر رکی ہوئی تھیں۔ اِدھر سہیلی پکار رہی تھی اور اُدھر وہ مہمان ماسٹر فو کے ساتھ بیرونی گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ انہوں نے سر گھما کر اُدھر دیکھا۔ پھر دور لاؤنج میں رکھے ہوئے فون کی طرف دیکھا۔ حمزہ ان کے قریب سے گزرتا ہوا باہر چلا گیا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کدھر جائیں؟ اُدھر جائیں یا اِدھر...؟

انہوں نے دیکھا' وہ تینوں بیرونی گیٹ سے باہر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔ ان لمحات میں جیسے وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے محروم ہو گئی تھیں۔ دل و دماغ پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔

وہ دروازے سے پلٹ کر ایک ایک قدم چلتی ہوئی فون کی طرف جانے لگیں۔ مگر یہ واضح طور پر محسوس کر رہی تھیں کہ دل دوسری طرف کھنچا جا رہا ہے۔ انہوں نے چلتے چلتے دروازے کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ وہ اپنی کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہی تھیں۔ آگے بڑھ رہی تھیں اور پیچھے دیکھ رہی تھیں۔ پھر ٹیلی فون کے پاس پہنچ کر رک گئیں۔ صوفے پر بیٹھ کر ریسیور کان سے لگاتے ہوئے بولیں۔ ''ہیلو...!''

دوسری طرف سے شیبا آنٹی نے کہا۔ ''ابھی حمزہ نے بتایا ہے' کوئی مہمان آیا ہوا تھا؟''

انہوں نے بیرونی دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے مختصر سا جواب دیا۔ ''ہاں...''

شیبا آنٹی نے پوچھا۔ ''کون تھا...؟''

ماما نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔ ''پتا نہیں؟''

ان کی آواز جیسے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ شیبا آنٹی نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تمہارا لب و لہجہ کچھ عجیب سا لگ رہا ہے؟''

''مجھے بہت کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ کیا میں بعد میں تم سے رابطہ کر سکتی ہوں؟''

''میرا خیال ہے' تم کسی ذہنی الجھن کا شکار ہو؟''

''ہاں۔ شاید یہی بات ہے۔''

ایسا کہتے وقت بے ساختہ ان کا ہاتھ اپنی پیشانی پر گیا۔ ادھر سے شیبا آنٹی نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ ہم بعد میں بات کریں گے۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ ان کے ایک ہاتھ میں ریسیور تھا اور دوسرا ہاتھ پیشانی سے لگا ہوا تھا۔ وہ بھوؤں کے درمیان دھیرے دھیرے انگلیاں پھیرنے لگیں جیسے اس تل کو ٹٹول رہی ہوں اور اس تل کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی ٹٹول

رہی ہوں۔ ذہن پر بہ دستور دھندسی چھائی ہوئی تھی۔ کانوں میں علی کی باتیں گونج رہی تھیں۔ ''خوش قسمت ہے وہ شخص جس نے پہلی بار آپ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا...''

''شخص...؟ یہ کس شخص کی بات کر کے گیا ہے؟ مجھے تو کبھی کسی نے ہاتھ نہیں لگایا... نہیں۔ لگایا ہے...''

ذہن پر چھائی ہوئی دھند میں کوئی منظر ابھرنے لگا۔ پہلے وہ دھند میں لپٹا ہوا تھا پھر دھیرے دھیرے واضح ہوتا چلا گیا۔ وہ کسی اسپتال کا کمرا تھا۔ ماما خود کو ایک بیڈ پر لیٹا ہوا دیکھ رہی تھیں۔

ان کی دھڑکنیں تیز ہونے لگیں۔ وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے ذہن کی اسکرین پر چلنے والے منظر کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ ماحول ان کا دیکھا بھالا تھا۔ انہیں دھیرے دھیرے یاد آنے لگا کہ وہ پہلے بھی اس منظر کو دیکھ چکی ہیں۔ شاید خواب میں دیکھا تھا اور وہاں ان کے پاس ایک شخص آیا تھا۔

وہ اب بھی آرہا تھا۔ اس کی آہٹ سنائی دے رہی تھی مگر چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ماما سکتے کی حالت میں ایک بیڈ پر لیٹی رہتی تھیں۔

انہوں نے پہلے یہ منظر خواب میں دیکھا تھا۔ اب کھلی آنکھوں سے دیکھ رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد اس شخص کی صورت دکھائی دی۔ ان کے اندر جیسے ایک جھما کا سا ہوا۔ دل و دماغ کو ایسا جھٹکا سا لگا کہ ریسیور ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ دوسرا ہاتھ بھی کٹی ہوئی شاخ کی طرح زانو پر آ گیا۔

وہ دیدے پھیلائے خلا میں تک رہی تھیں۔ انہیں علی جیسی قد و قامت والا شخص دکھائی دے رہا تھا۔ بس صورت ویسی نہیں تھی جسے اب تک دیکھتی رہی تھیں۔

پہلے اس خواب میں پاپا ان کے قریب آئے تھے اور اب بھی خیالی اڑان میں وہی نظر آرہے تھے۔ ایسے ہی وقت انہوں نے ماما کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔

ایک دم سے ماما نے اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھ لیا۔ ذہن میں علی کی بات گونجنے لگی۔ ''خوش نصیب ہے وہ شخص جس نے پہلی بار آپ کی پیشانی پر ہاتھ رکھا...''

''اسے میرے حالات کا کیسے علم ہوا؟ وہ کیسے جانتا ہے کہ... قربان علی کبھی میرے قریب آئے تھے؟ کہیں یہ قربان علی تو نہیں ہیں؟''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ اس کی آواز اور لب و لہجہ پھر سے ان کے دل و دماغ میں گونجنے لگا۔ مگر الفاظ وہ نہیں تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں چوروں کی طرح [illegible] ہوں اور چوروں کی طرح چلا جاؤں گا۔''

ایک دم سے ذہن نے چیخ کر پوچھا۔ ''کیا وہ پہلے بھی چوروں کی طرح آکر گئے ہیں؟''

ماما کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر حیرانی اور بے یقینی سے بیرونی دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان لمحات میں وہ پھر ان کے اندر گونجنے لگا۔ ''قربان علی واسطی ولد زمان علی واسطی بعوض مہر ایک لاکھ روپے سکہ رائج الوقت کیا تمہیں قبول ہے...؟''

ماما کا ایک قدم بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ وہی لب و لہجہ پھر ان کے اندر گونجنے لگا۔ ''قبول ہے...؟''

ان کا دوسرا قدم بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے جیسے تیسری بار ان سے پوچھا۔ ''قبول ہے...؟''

بے ترتیب دھڑکنوں اور اتھل پتھل ہوتی ہوئی سانسوں کے ساتھ ساتھ ان کی رفتار بھی تیز ہوگئی۔ دل و دماغ میں اس کے الفاظ گڈمڈ ہو رہے تھے اور ادھر وہ دوڑتی ہوئی، ڈگمگاتی ہوئی بیرونی دروازے پر آئیں۔ دہلیز عبور کرتی ہوئی بنگلے کے احاطے میں آنا چاہتی تھیں۔ ایسے وقت ماسٹر فو اور امیر حمزہ گیٹ کھول کر اندر آتے ہوئے دکھائی دیے۔

ماما نے آگے بڑھتے ہوئے تقریباً چیخ کر پوچھا۔ ''وہ... وہ مہمان کہاں ہے؟''

میرے دونوں محافظوں نے ٹھٹک کر ماما کو دیکھا۔ سخت سردی کے باوجود ان کا چہرہ پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ وہ بُری طرح بوکھلائی ہوئی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں ان کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ ماسٹر فو نے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے میڈم! آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں؟''

وہ اسے نظر انداز کرتے ہوئے آہنی گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''وہ مہمان کہاں ہے؟''

امیر حمزہ نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا وہ کوئی گڑبڑ کر کے گیا ہے؟''

انہوں نے فوراً ہی انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں۔ اس نے کوئی گڑبڑ نہیں کی ہے۔''

''تو پھر آپ اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہیں؟ اتنی پریشان کیوں ہیں؟''

وہ الجھ کر آہنی گیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولیں۔ ''سوال نہ کرو۔ پہلے جا کر انہیں روکو۔ ورنہ وہ چلے [illegible] گے۔ جاؤ۔''

''[illegible] تو جا چکے ہیں۔''

[illegible] نے چونک کر پوچھا۔ ''کہاں...؟''

''[illegible] ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ وہیں گئے ہیں۔''

[illegible] ''تو پھر تم بھی وہاں جاؤ اور انہیں اپنے ساتھ [illegible]''

[illegible] نے پوچھا۔ ''میڈم! ہمیں سوال تو نہیں کرنا [illegible] مگر سیکیورٹی کا تقاضہ ہے۔ آخر آپ علی کو کیوں بلانا [illegible]؟''

[illegible] نے ان دونوں کو دیکھا پھر کہا۔ ''کیونکہ وہ صرف علی [illegible] ہیں۔''

انہوں نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا مطلب...؟''

''میں کیا بتاؤں؟ مجھ سے بڑی بھول ہوگئی۔ انہوں نے [illegible] تو میں نے اسی مختصر سے نام پر اکتفا کیا۔ ان کا پورا نام [illegible] پوچھا۔''

انہوں نے دونوں محافظوں کو باری باری دیکھتے ہوئے [illegible] ''میں ان کا پورا نام معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ وہ پاکستان [illegible] کہاں رہتے ہیں؟ کس فیملی سے تعلق رکھتے ہیں؟ میں ان [illegible] بہت کچھ معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ پلیز! ابھی جاؤ اور انہیں [illegible]۔''

ماسٹر فو نے پلٹ کر گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''حمزہ! تم یہیں ٹھہرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

اس نے گاڑی میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کیا پھر بنگلے سے [illegible] تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتا ہوا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ حمزہ نے ماما سے پوچھا۔ ''آپ اس کے معاملے میں اس قدر بے چین کیوں ہو رہی ہیں؟''

وہ پریشان سی ہو کر اپنی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ ''کیا بتاؤں جب وقت گزر جاتا ہے تب ایسی باتیں سمجھ آتی ہیں جو الجھا دیتی ہیں۔ شاید ملاقات کے پہلے لمحے [illegible] کوئی میرے اندر کچھ کہہ رہا تھا جسے میں سمجھ نہیں پا رہی تھی [illegible] اب جبکہ کسی قدر سمجھ میں آرہا ہے تو میں مزید بہت کچھ سمجھنا چاہتی ہوں۔ اس لیے ان کو واپس بلا رہی ہوں۔ ماسٹر فو کو [illegible] ہیں معلوم ہے؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔ ''وہ ہوٹل میٹروپولیٹن میں [illegible] ہوئے ہیں۔''

[illegible] بھی ایسا ہوتا ہے۔ زندگی میں کوئی چھوٹی سی [illegible] معمولی سا واقعہ پیش آتا ہے اور آکر گزر جاتا ہے۔ [illegible] بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعی معمولی نہیں تھا۔

ماما کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ کسی اجنبی سے ملاقات ایک غیر اہم سی بات تھی۔ لیکن اب سمجھ میں آرہا تھا کہ مقدر نے انہیں یونہی چلتے پھرتے ان کی زندگی کی سب سے اہم ہستی سے ملا دیا تھا۔ پاپا کا سراغ ملنے والا تھا۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔

اُدھر ماسٹر فو ان کے پیچھے گیا تھا۔ اِدھر ماما فوراً ہی ٹیلی فون کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ نانا جان کے نمبر پنچ کر کے ریسیور کان سے لگا کر رابطے کا انتظار کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد ان کی آواز سنائی دی۔ وہ بڑی شفقت سے انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولے۔ ''میری بیٹی آج مجھے بے وقت یاد کر رہی ہے۔ کیا بات ہے؟''

ماما نے انہیں سلام کرنے کے بعد کہا۔ ''میں کچھ الجھی ہوئی ہوں۔''

''میری بیٹی کی کیا الجھن ہے؟''

''ایک اجنبی مسلمان کو افطار کی دعوت دی تھی۔ یہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ان کے لیے اپنائیت سی کیوں پیدا ہو رہی ہے؟''

پھر وہ نانا جان کو اپنے اندر کے محسوسات بتانے لگیں۔ انہوں نے تمام باتیں سننے کے بعد کہا۔ ''بے شک! تمہیں اس کا پورا نام پوچھنا چاہیے تھا۔ ذہن کو زیادہ نہ الجھاؤ۔ ماسٹر فو اسے واپس لے آئے گا۔''

وہ اور کر بھی کیا سکتی تھیں؟ ماسٹر فو کے ساتھ ان کی واپسی کا انتظار ہی کرنا تھا۔ عجیب سی بے چینی تھی۔ آنے والے دروازے پر دستک دیتے ہیں مگر وہ جانے کے بعد بھی ان کے ذہن پر دستک دے رہا تھا...... کیونکہ آگہی کا دروازہ کھلتے ہوئے بھی کھل نہیں پایا تھا۔

انہوں نے پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نانا جان سے کہا۔ ''پتا نہیں، میرا ذہن اپنے مجازی خدا کی طرف کیوں جا رہا ہے؟ میں نے علی سے ملاقات کی، ان سے باتیں کیں۔ ان کا لب و لہجہ بالکل وجی کے پاپا جیسا ہے۔ مگر وہ خود ان جیسے نہیں ہیں۔ پھر بھی وہ مجھے قربان علی ہی لگ رہے ہیں۔''

نانا جان سوچ میں پڑ گئے۔ ماما نے کہا۔ ''یہ رشتہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ زخم کھا کر بھی زخم دینے والے سے مرہم کا طلب گار ہوتا ہے۔ جس شخص نے مجھے پچھلے بیس برسوں سے ذہنی صدمات پہنچائے، بدنامی کے خاروں میں گھسیٹا... مجھے دنیا والوں کے سامنے رسوا کر کے دشمنی کی انتہا کر دی... میرے ایک بچے کو گالی بنا دیا اور دوسرے کو اپنے سائے میں رکھ کر مجرم بنایا... اگر یہ وہی تھے تو ایسی سنگین دشمنی کرنے کے

بعد وہ آج مجھے معصوم اور شکستہ سے کیوں لگ رہے تھے؟''
''اگر تمہیں یقین ہے وہ قربان علی ہی تھا تو ممکن ہے' اللہ نے اسے عقل دے دی ہو اور وہ اپنے کیے پر پچھتا رہا ہو۔''
''گناہوں پر ندامت ہو اور غلطیوں کا احساس ہو جائے تو ان کا کفارہ ادا کیا جاتا ہے جبکہ انہوں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ وہ تو ایک جھونکے کی طرح آ کر گزر گئے ہیں۔''
''ہم یونہی اسے گزرنے نہیں دیں گے۔ بیس برس بہت ہوتے ہیں۔ وہ اچھی خاصی آنکھ مچولی کھیل چکا ہے۔ مجھے اطمینان ہے' ماسٹر فو اس کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ تم دیکھو گی، وہ اسے تمہارے قدموں میں لا کر ہی دم لے گا۔''
ماما نے جلدی سے کہا۔ ''لیکن میں انہیں قدموں میں گرانا نہیں چاہتی۔''
انہوں نے تعجب سے پوچھا۔ ''تم تو اس سے انتقام لینا چاہتی تھیں؟''
''وہ میرے بچوں کو اپنا نام دے دیں' انہیں صحیح اور مستند شناخت دے دیں۔ دنیا والوں کے سامنے کھل کر انہیں جائز کہہ دیں' میرے لیے یہ بات انتقام لینے سے کہیں بڑھ کر ہوگی۔''
وہ بولے۔ ''نیک نامی کے راستے ہموار ہو رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ایسا ہی ہوگا۔ میرا نواسہ آئندہ مستند ولدیت کے ساتھ زندگی گزارے گا۔''
''آپ صرف ایک کی بات کیوں کر رہے ہیں؟ میرا وکی بھی لوٹ کر آنے والا ہے۔''
نانا جان کے دل پر ایک گھونسا سا پڑا۔ انہوں نے بڑی حسرت سے سوچا۔ 'آہ وکی...! میں تمہاری ماں کو کیسے سمجھاؤں کہ اب تم کبھی لوٹ کر آنے والے نہیں ہو؟'
ایسے وقت امیر حمزہ کے موبائل فون کا بزر سنائی دیا۔ ماما نے چونک کر پوچھا۔ ''کس کا فون ہے؟''
وہ اسے آن کر کے کان سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''ماسٹر فو ہے...''
ماما نے بے چین ہو کر نانا جان سے کہا۔ ''ماسٹر فو کا فون آیا ہے۔ میں تمام حالات جاننے کے بعد آپ کو کال کروں گی۔''
انہوں نے ریسیور رکھ کر رابطہ ختم کر دیا۔ ادھر امیر حمزہ فون پر پوچھ رہا تھا۔ ''ہاں بولو... کیا خبر ہے؟''
دوسری طرف سے ماسٹر فو نے کہا۔ ''میں اس وقت مطلوبہ ہوٹل میں پہنچا ہوا ہوں اور یہاں آ کر معلوم ہو رہا ہے' ہمیں غلط انفارمیشن دی گئی ہے۔ اس نے اپنا روم نمبر ایک سو دس بتایا تھا جبکہ یہاں اس کمرے میں ایک نو بیاہتا جوڑا ٹھہرا ہوا ہے۔ میں نے رجسٹر چیک کروایا ہے۔ اس میں علی کے نام سے کوئی اندراج نہیں ہے۔''
پاپا نے ہوشیاری دکھائی تھی۔ اگرچہ یہ یقین تھا کہ ماما انہیں پہچان نہیں پائیں گی پھر بھی وہ محتاط رہتے ہوئے اپنے بارے میں غلط انفارمیشن دے کر چلے گئے تھے۔ امیر حمزہ نے مایوسی سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ مہمان ہمیں دھوکا دے کر گیا ہے۔''
ماما نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ وہاں کیا ہو رہا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ؟''
وہ انہیں تمام صورتِ حال سے آگاہ کرنے لگا۔ ادھر سے ماسٹر فو نے یہ کہہ کر رابطہ ختم کر دیا کہ وہ آس پاس کے ہوٹلوں میں معلومات حاصل کرنے جا رہا ہے۔ ماما کو یہ سن کر شدید مایوسی ہوئی تھی کہ پاپا اب بھی جھوٹ بول رہے ہیں' فریب دے رہے ہیں اور ایسی تکلیف دہ آنکھ مچولی کھیلنے سے باز نہیں آ رہے ہیں۔ شاید وہ اس کھیل کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے اتنے قریب آنے کے بعد بھی انہیں بھٹکا رہے ہیں۔ ایسی صورتِ حال سننے کے بعد یقین ہو گیا تھا کہ وہی میرے پاپا ہیں۔
وہ مایوس ہو کر ایک صوفے پر بیٹھ گئیں۔ پھر ریسیور اٹھا کر نانا جان کے نمبر پنچ کرنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی رابطہ ہو گیا۔ نانا جان سمجھ رہے تھے کہ پاپا' ماسٹر فو کی گرفت میں آ چکے ہیں۔ لیکن پھر یہ سن کر جھنجلاہٹ ہوئی کہ وہ اب بھی ہم سب کو بھٹکا رہے ہیں۔
وہ بولے۔ ''کتے کی دُم کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔ قربان علی بیس برس گزر جانے کے باوجود آج بھی ٹیڑھا ہے۔ مگر تم خدا پر بھروسا رکھو۔ اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت چھپی ہوتی ہے۔ یہ جو دیر ہو رہی ہے' یقیناً اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔''
انہوں نے ماما کو پیار سے سمجھا بجھا کر تسلیاں دے کر رابطہ ختم کر دیا۔ وہ بے دلی سے ریسیور رکھ کر سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ اپنے موجودہ حالات پر غور کرنے لگیں۔ ان لمحات میں وہ شدید کرب سے گزر رہی تھیں۔ دل ہی دل میں کہنے لگیں۔ ''یا خدا! اس دنیا میں کسی سے اپنے حقوق حاصل کرنا اتنا مشکل کیوں ہوتا ہے؟ تو بِن مانگے بہت کچھ دے دیتا ہے اور تیری یہ خلقت کتنی ظالم ہے؟ مانگنے' رونے اور گڑگڑانے سے بھی کچھ نہیں دیتی۔''
اس وقت ایک بیوی' ایک ماں کی کیا خواہش تھی...؟
وہ اپنے لیے نیک نامی اور اپنی اولاد کے لیے جائز ولدیت کا سرٹیفکیٹ چاہتی تھی۔ لیکن پاپا انہیں دو ڈرا رہے تھے۔ جائز حقوق دینے کے سلسلے میں ہلکان کر رہے تھے۔
انہوں نے تھکے ہوئے انداز میں میز پر رکھی ہوئی تھیلی کی طرف دیکھا۔ اس میں تسبیح کے جو دانے رکھے ہوئے تھے، ان میں تین دانے کم تھے۔ اس وقت ماما کے حالات بھی اس ٹوٹی ہوئی تسبیح کی طرح تھے۔ وہ اپنے سگے رشتوں سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ وہاں تین دانے کم تھے اور ان کی زندگی سے تین گہرے رشتے بچھڑ گئے تھے۔ میں' وکی اور پاپا ہم تینوں مل کر ان کی ٹوٹی پھوٹی زندگی کو پھر سے جوڑ سکتے تھے۔
مگر یہ سب اتنا آسان نہ تھا۔ فی الحال میں اپنے معاملات میں الجھا ہوا تھا۔ میری اور نانا جان کی دانست میں وکی کی واپسی ممکن نہیں تھی اور پاپا... ان کے معاملات تو ہماری سمجھ سے باہر ہو رہے تھے۔ پتا نہیں' وہ کب تک دوسروں کی جنگ لڑنے کے لیے ماما کو ذہنی طور پر ٹارچر کرنے والے تھے؟

☆☆☆

میرے پاپا اپنی عارضی رہائش گاہ میں آ گئے تھے۔ ایک طویل مدت کے بعد ماما کو پا کر مسرتوں سے بے حال ہو رہے تھے اور پاتے ہوئے بھی نہ پا کر نڈھال سے ہو رہے تھے۔
آدھی رات ہونے کو تھی۔ نیند آنے والی نہیں تھی۔ وہ تمام لائٹس آف کر کے ایک صوفے میں دھنس گئے تھے۔ مرادوں کی اُجلی نگری سے ہو کر نامرادی کے اندھیروں میں ڈوب رہے تھے۔ زندگی کے عجیب موڑ پر تھے۔ ماما نامحرم نہیں تھیں مگر وہ محروم ہو رہے تھے۔
یہ کیسی مجبوری تھی کہ وہ ماما سے اور مجھ سے چھپ رہے تھے؟ اتفاق سے سامنا ہونے کے باوجود اجنبی بن کر کترا گئے تھے۔ ماما کو بہت قریب سے دیکھنے اور ان سے باتیں کرنے کے بعد اب دوری برداشت نہیں ہو رہی تھی۔
دوریاں اور مجبوریاں ایسے وقت پیش آتی ہیں جب رکاوٹیں حائل ہوتی رہتی ہیں۔ اگر رکاوٹیں معمولی اور کمزور ہوتیں تو وہ انہیں بہت پہلے ہی توڑ چکے ہوتے۔ معاملات بہت سنگین تھے۔ وہ ایسی دلدل میں دھنسے ہوئے تھے جہاں سے نکل کر بیوی اور اپنی اولاد کے پاس نہیں آ سکتے تھے۔
وہ اپنی مجبوری اور بے بسی کے متعلق سوچتے ہوئے بیس برس پیچھے جانے لگے۔ نانا جان' زرینہ پھوپھی' پھوپھا سلیم نواز' رخشی اور بگ باس ماضی کی تاریکیوں میں دکھائی دینے لگے۔ ان میں سب سے اہم اور دل موہ لینے والی ہستی ماما کی تھی۔ ان دنوں پاپا سے ان کی نسبت طے ہو رہی تھی۔
انہی دنوں میرے نانا جان نے اعلان کیا کہ وہ رخشی کو طلاق دے رہے ہیں کیونکہ وہ فریبی اور بدکار ہے۔ اس نے جس بیٹے کو جنم دیا ہے' وہ ان کا لہو نہیں ہے۔ نانا جان نے اسے اپنا بیٹا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔
رخشی نے ان سے کہا۔ ''آپ کا یہ جھوٹا الزام عدالت میں سچ ثابت نہیں ہو سکے گا۔ قانوناً ماں کی زبان پر بھروسا کیا جاتا ہے۔ وہ جس کی طرف انگلی اٹھا کر کہتی ہے کہ بچے کا باپ وہ ہے تو عدالت اسی کو باپ تسلیم کرتی ہے۔''
نانا جان نے رخشی کو ایک ویڈیو فلم اور کئی ساکت تصویریں دکھائیں۔ ان کے ذریعے اس کے بیٹے کی ولدیت مشکوک ہو رہی تھی۔ اس ویڈیو فلم کے پیشِ نظر وہ قسمیں کھا کر بھی یقین نہیں دلا سکتی تھی کہ اس نے میرے نانا جان کی اولاد کو جنم دیا ہے۔ سب یہی کہتے کہ وہ بچہ ملاوٹ کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔
وہ مقدمہ ہار سکتی تھی۔ اس لیے عدالت تک نہ گئی۔ رخشی کا گناہ گار عاشق بگ باس تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کی بدنامی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''رخشی میری جان! ڈنمارک' سوئیڈن' ناروے اور جرمنی جیسے کسی بھی ملک میں چلی آؤ۔ یہاں کوئی بچے کے باپ کا نام نہیں پوچھتا۔ ولدیت کے خانے میں ماں کا نام لکھا جاتا ہے۔ یہاں تمہارے پاس شان دار بنگلہ' کاریں' بینک بیلنس اور بہت کچھ ہوگا۔''
رخشی نے کہا۔ ''میں بہت ہی اعلیٰ اور شریف خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے کزنز اور کئی بزرگ فوج اور حکومت، میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ میری بدنامی سے ان سب کے سر جھک جائیں گے۔ ہمارے دین میں اور معاشرے میں ولدیت کے حوالے سے شناخت سب سے اہم ہوتی ہے۔ یہ نہ ہو تو بچہ ناجائز کہلاتا ہے اور ماں پر بدنامی کی مہر لگ جاتی ہے۔''
وہ بگ باس کے آگے روتے ہوئے اور دہائی دیتے ہوئے بولی۔ ''صرف مجھے نہیں' میرے پورے خاندان کو کسی بھی طرح بدنامی سے بچاؤ۔ میں فری سیکس والے کسی بھی ملک میں منہ چھپا کر رہوں گی تو میرے تمام بزرگوں کے سر جھک جائیں گے۔ میں ان کے منہ پر بدنامی کی کالک مل کر نہیں جانا چاہتی۔''
بگ باس نے وعدہ کیا کہ وہ میرے نانا جان کو طلاق دینے سے روکے گا۔ پھر اس نے انڈر ورلڈ کے ایک پُراسرار سربراہ کی حیثیت سے انہیں سمجھایا کہ رخشی بدکار نہیں ہے۔ اس بے چاری کی زندگی برباد کرنے کے لیے کسی نے جدید

ٹیکنالوجی کے ذریعے وہ ویڈیو فلم اور تصویریں بنائی ہیں۔

بائیس برس پہلے ترقی یافتہ ممالک کے صرف اہم شعبوں میں کمپیوٹر کا وجود تھا۔ آج کی طرح ٹیکنالوجی اس قدر ایڈوانس نہیں تھی۔ رخشی کو بدنام کرنے کے لیے ایسی بازی گری دکھائی نہیں جا سکتی تھی جیسی کہ اس ویڈیو فلم اور تصاویر میں دکھائی گئی تھی۔

ناناجان نے بگ باس سے کہا۔ ''تم کچھ بھی کہہ لو' رخشی کا کردار مشکوک ہو گیا ہے۔ وہ جس عدالت میں بھی جائے گی، وہاں اس کے بچے میں ملاوٹ تسلیم کی جائے گی۔''

وہ بولا۔ ''کچھ بھی ہو' میں تمہیں شرافت سے سمجھا رہا ہوں۔ وہ بچہ تمہارا ہے۔ اسے باپ کا نام دو۔ رخشی کو طلاق دینے کا خیال دماغ سے نکال دو۔ ورنہ...''

ناناجان نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ورنہ تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔ مجھے مرعوب کرنے کے لیے یہ بتا چکے ہو کہ انڈر ورلڈ کے سربراہوں میں سے ایک ہو۔ تم میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ میرے سامنے آسکو یا اپنا نام ہی بتا سکو۔''

''جب سامنے آؤں گا تو مجھے دیکھ نہیں سکو گے۔ تمہاری آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی ہوں گی۔''

''آخر تم کب تک مجھ سے چھپ سکو گے؟ یقیناً میں نے ویڈیو فلم میں تمہیں ہی رخشی کے ساتھ دیکھا ہے۔ تمہاری خیریت اور سلامتی اسی میں ہے کہ مجھ سے چھپتے رہو۔ دور ہی دور سے گیدڑ بھبکیاں دیتے رہو۔''

''میں آخری بار سمجھا رہا ہوں۔ تمہاری صرف ایک ہی بیٹی ہے۔ تمہارا نام لیوا' تمہاری جائیداد کا کوئی وارث نہیں ہے۔ اُس بچے کو باپ کا نام دے دو۔ ورنہ اپنی بیٹی سے بھی محروم ہو جاؤ گے۔''

میرے پاپا دور کے رشتے سے رخشی کے کزن تھے۔ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ پاپا سے بولی۔ ''تمہارا ہونے والا سسر مجھے بدکار کہہ رہا ہے۔ تمہارا فرض ہے' اپنے خاندان کو اور مجھ کو بدنامی سے بچاؤ۔ اسے طلاق دینے سے باز رکھو۔''

پاپا نے ناناجان سے درخواست کی۔ ان سے کہا۔ ''میں آپ کا ہونے والا داماد ہوں۔ پلیز! میرا خیال کریں۔ رخشی کو طلاق نہ دیں۔ میرے خاندان والوں کا سر نہ جھکائیں۔''

ناناجان نے پوچھا۔ ''کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ بچہ میرا بیٹا بن کر آئندہ میری ناجائز نسلیں پیدا کرتا رہے؟''

پاپا کوئی جواب نہ دے سکے۔ کوئی بھی دودھ پینے کے لیے آنکھوں دیکھی مکھی نہیں نگلتا۔ ناناجان نے رخشی کو طلاق دے دی۔ تب رخشی اور بگ باس آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے۔ بگ باس نے اپنی چہیتی داشتہ کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ''صبر کرو۔ میں چوبیس گھنٹوں کے اندر اس کی بیٹی سعدیہ کو اغوا کرادوں گا۔''

وہ غصے سے پاؤں پٹخ کر بولی۔ ''سعدیہ کے مرنے سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟ زیادہ سے زیادہ علیم اولاد سے محروم ہو جائے گا۔ مگر مجھ پر لگایا ہوا بدکاری کا داغ کبھی نہیں دھلے گا۔ میں ایسا انتقام لینا چاہتی ہوں کہ علیم بھی ساری زندگی میری طرح انگاروں پر لوٹتا رہے۔''

''تم جس طرح چاہو گی' میں اسی طرح انتقام لوں گا۔ بولو...! کیا چاہتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''میں چاہتی ہوں' سعدیہ کو اغوا کراؤ۔ اسے بدمعاشوں کے حوالے کرو۔ جب وہ ماں بن جائے تو ناجائز بچے کے ساتھ اسے علیم کے پاس بھیج دو۔ میں اس کا جھکا ہوا سر دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس نے میرے بیٹے کو ناجائز کہا ہے۔ دیکھوں گی کہ وہ اپنے نواسے یا نواسی کو ناجائز کہے گا یا نہیں؟''

وہ متاثر ہونے کے انداز میں بولا۔ ''واقعی، عورت انتقام لینے پر آئے تو مرد منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ تمہاری یہ خواہش بہت جلد پوری ہوگی۔''

عورت پیٹ کی ہلکی ہوتی ہے۔ اس روز رخشی کی ملاقات میرے پاپا سے ہوئی تو اس نے پوچھا۔ ''قربان! اگر سعدیہ کنواری ماں بن جائے تو اس سے شادی کرو گے؟''

پاپا نے کہا۔ ''سب ہی جانتے ہیں' سعدیہ صوم و صلوٰۃ کی پابند ہے۔ آج تک کسی نامحرم نے اس کی صورت نہیں دیکھی۔ جتنے قریبی کزنز ہیں' وہ ان سے بھی پردہ کرتی ہے۔ پلیز! اس کے متعلق ایسی بات نہ کہو۔''

''میں کیا کہوں گی؟ آنے والا وقت ڈنکے کی چوٹ پر میری اس بات کو سچ کر دکھائے گا۔''

پاپا نے اس کے چیلنج کو اہمیت نہیں دی۔ یہی سمجھا کہ رخشی حاسد ہے' عداوت سے ایسا کہہ رہی ہے۔ آٹھ ماہ بعد ماما اور پاپا کا نکاح پڑھایا گیا۔ رخصتی بعد میں ہونے والی تھی۔ اس سے پہلے ہی پاپا کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا۔ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر گئے تھے۔ وہاں سے لاپتا ہو گئے۔ اس حادثے کا پس منظر یہ تھا کہ انہیں اغوا کر کے قیدی بنا لیا گیا تھا۔

ادھر ماما اچانک بیمار ہو کر اسپتال پہنچ گئی تھیں جہاں پاپا کو قید کیا گیا تھا۔ وہاں رخشی نے آ کر کہا۔ ''تمہارے ہونے والے سسر نے سیدھی انگلی سے گھی نکلنے نہیں دیا۔ اس لیے ہمیں ٹیڑھا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ سعدیہ یہاں بیمار پڑی ہے۔ علیم سمجھ رہا ہے' وہ صحت مند ہو کر گھر آئے گی۔ میں تمہیں بتا دوں کہ وہ اسپتال سے ناجائز بچے کی ماں بن کر باپ کے گھر جائے گی۔''

پاپا نے کہا۔ ''بکواس نہ کرو۔ میری سعدیہ کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔ علیم انکل اس کی حفاظت کریں گے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''علیم اپنی بیٹی کی حالت دیکھ کر بے بس ہے۔ وہ بے چاری سکتے میں ہے۔ اس کے سننے اور بولنے کی حس ختم ہو چکی ہے۔ علیم انتظار ہی کرتا رہے گا کہ وہ صحت یاب ہو تو اسے گھر لے جائے گا۔ مگر مہینوں اس کی نوبت نہیں آئے گی اور ہم اس دوران بہت کچھ کر چکے ہوں گے۔''

رخشی نے دوسرے دن پاپا کو ایک ویڈیو فلم دکھائی۔ انہوں نے اسکرین پر پہلی بار ماما کو دیکھا۔ وہ اسپتال میں بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھیں۔ ان کے پاس دو گن مین کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا۔ ''ہم کسی روک ٹوک کے بغیر یہاں آسکتے ہیں۔ یہ اسپتال ہمارے باس کے اشارے سے چل رہا ہے۔ اس کے حکم سے تمہاری ہونے والی دلہن کو ایسی دوائیں دی گئی ہیں جن کے نتیجے میں یہ گونگی اور بہری ہو گئی ہے۔ جب یہاں سے جائے گی تو اس کا دماغ کمزور ہو چکا ہوگا۔ یہ ایک طویل مدت تک ذہنی مریضہ بن کر رہے گی۔''

دوسرے گن مین نے کہا۔ ''اسے دواؤں کے ذریعے ہلاک کیا جا سکتا ہے اور ابھی ہم گولی بھی مار سکتے ہیں۔ مسٹر قربان علی واسطی! تم اسے زندہ سلامت دیکھنے کے لیے کیا کر سکتے ہو؟''

پاپا نے تڑپ کر کہا۔ ''میں سعدیہ کی سلامتی کے لیے تاوان ادا کروں گا۔ جو مطالبات کیے جائیں گے' انہیں پورا کروں گا۔''

رخشی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''ابھی نہ بولو۔ پہلے اسکرین پر ان کی باتیں سنو۔''

اس نے پلے کا بٹن دبایا تو اسکرین پر نظر آنے والے متحرک ہو گئے۔ ایک گن مین نے کہا۔ ''جانتے ہو، اسے سکتے کی حالت میں کیوں رکھا گیا ہے؟''

پاپا بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔ وہ بول رہا تھا۔ ''ہم اس پر جبر کریں گے' اس کی آبرو کی دھجیاں اڑائیں گے تو یہ سکتے کی حالت میں ہونے کے سبب نہ تو بول سکے گی' نہ ہی شور مچا سکے گی۔''

اس بات پر دونوں ہنسنے لگے۔ پاپا نے رخشی کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ کون لوگ ہیں؟ انہیں روکو۔ تم ایسی شیطانی حرکتیں کیوں کروا رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''ابھی ایسا کچھ نہیں کروایا ہے۔ فی الحال یہ صرف دھمکی ہے۔ آج رات دھماکا بھی بن سکتی ہے۔ اگر تم چاہو تو اس کی عزت آبرو سلامت رہ سکے گی۔''

''میں تو چاہتا ہوں... اپنی جان دے کر بھی یہی چاہوں گا۔ بتاؤ' تم کیا چاہتی ہو؟''

''میں علیم کو مجبور کر کے اپنے بیٹے کو اس کا وارث بنانا چاہتی ہوں اور اپنی طرح سعدیہ کی رسوائی چاہتی ہوں۔ میں اسے کنواری ماں ضرور بناؤں گی۔''

''بکواس مت کرو۔ ایسا ہونے سے پہلے میں تمہیں مار ڈالوں گا۔''

''میں تو بدنام ہو کر آدھی مر چکی ہوں۔ آدھی کو تم مار ڈالو لیکن میرے یار کو کیسے مارو گے؟ اپنی سعدیہ کو اس سے کیسے بچاؤ گے؟''

پاپا بے بسی سے اس کا منہ تکنے لگے۔ انہوں نے پریشان ہو کر کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا' میں کیا کروں؟ تمہارے آگے کس طرح اپنا سر پھوڑوں؟ تم میری جان لے لو مگر خدا کے لیے اس معصوم سے دشمنی نہ کرو۔''

وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ''سعدیہ کنواری ماں ضرور بنے گی۔ مگر اس طرح کہ تمہیں شرم نہیں آئے گی۔ تم فخر کرو گے لیکن علیم شرم سے مر جائے گا۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔ میں اپنی سعدیہ کی تباہی پر کیوں فخر کروں گا؟''

''اس لیے کرو گے کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بنے گی۔''

پاپا نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا...؟ وہ میرے بچے کی ماں...؟ مگر کیسے...؟''

''تم اسپتال جاتے رہو گے اور اس سے ازدواجی تعلق قائم کرتے رہو گے۔''

''تم ایسا بے ہودہ تماشہ کیوں کرنا چاہتی ہو؟''

''بے ہودہ نہ کہو۔ وہ تمہاری منکوحہ ہے۔ تم کوئی گناہ نہیں کرو گے۔ گناہ تو بدمعاشوں کے ذریعے ہوتا۔ میں تم پر مہربانی کر رہی ہوں۔ مجھ جیسی دشمن عورت سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنی ہونے والی دلہن کو آئندہ شرمندگی سے بچا لو۔''

''پلیز! مجھے بتاؤ' تم ایسی حرکتوں سے کیا حاصل کرنا چاہتی ہو؟''

''کہہ تو چکی ہوں' مجھے علیم کا سر جھکانا ہے۔ اسے کبھی یہ معلوم نہیں ہوگا کہ اس کی بیٹی نے ایک جائز اولاد کو جنم دیا ہے۔ وہ جائز ہوتے ہوئے بھی علیم کی اور دنیا والوں کی

نظروں میں ناجائز کہلاتی رہے گی۔ ولدیت کے حوالے سے اس کی صحیح شناخت کبھی نہیں ہو سکے گی۔''

پھر وہ فاتحانہ انداز میں بولی۔ ''اگر علیم کبھی اپنے ناجائز نواسے یا نواسی کو جائیداد کا وارث بنائے گا' تب... تب میں دعویٰ کروں گی کہ اپنے ناجائز بیٹے کو بھی وارث بناؤ۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بیوی گناہ گار ہو تو اسے طلاق دے دی جائے۔ بیٹی گناہ گار ہو تو اس کی اولاد سمیت اسے گلے لگا کر رکھا جائے؟''

پاپا نے اس وقت نانا جان کے معاملات کو اہمیت نہیں دی۔ وہ ہر حال میں ماما کی حیا اور پاکیزگی کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے سوچا' جب ماما کی طبیعت سنبھل جائے گی اور وہ اسپتال سے آنے کے بعد ان کی دلہن بن جائیں گی تو وہ انہیں اور نانا جان کو ساری حقیقت بتا دیں گے۔ پھر رخشی جو تماشہ کر رہی ہے' وہ محض ایک بچکانا کھیل بن کر رہ جائے گا۔

وہ بگ باس کے ہاتھوں میں کھیلنے والی عورت نادان نہیں تھی۔ پاپا کی سوچ سے بہت آگے، بہت دور تک منصوبے بنا چکی تھی۔ اس نے کہا۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو' ساحرہ تمہیں دل و جان سے چاہتی ہے۔ اس نے تمہاری خاطر اچھے اچھے رشتوں کو ٹھکرا دیا مگر تم نے اس کی قدر نہیں کی۔ اسے نظر انداز کر کے سعدیہ سے نکاح پڑھوالیا۔''

ساحرہ رخشی کی چھوٹی بہن تھی۔ دونوں بہنوں کی اس طرح توہین ہو رہی تھی کہ نانا جان نے رخشی کو طلاق دی تھی اور پاپا نے ساحرہ کو ٹھکرا کر ماما کو قبول کیا تھا۔ اس کے باوجود رخشی پاپا کو ماما سے ازدواجی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دے رہی تھی۔

صاف ظاہر تھا' وہ انتقاماً ایسا کر رہی ہے۔ اس نے پاپا سے کہا۔ ''تم ایک شرط پر سعدیہ کی آبرو کے محافظ بن کر رہو گے اور شرط یہ ہے کہ ساحرہ کو بھی اپنی شریکِ حیات بناؤ گے۔ میں اپنی بہن کی خوشیاں دیکھنا چاہتی ہوں۔''

وہ پاپا اور ماما پر اسی مقصد کے لیے مہربانی کر رہی تھی اور پاپا ہر قیمت پر ماما کو گناہوں کے سائے سے بچا کر اپنے سائے میں رکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے شرط مان لی۔ رخشی کے حکم کے مطابق نانا جان کی لاعلمی میں ساحرہ سے نکاح پڑھوالیا۔

ساحرہ کو شریکِ حیات بنانے کے بعد ہی پاپا کو گن پوائنٹ پر اسپتال جا کر ماما سے ملتے رہنے کی اجازت دی گئی اور یہ دھمکی دی گئی کہ وہ فرار ہونا چاہیں گے یا پولیس اور انٹیلی جنس والوں سے رابطہ کرنا چاہیں گے تو اسپتال میں ماما کو زندہ نہیں پائیں گے۔

انہیں ہر طرف سے جکڑنے کی پلاننگ پر عمل کیا جا رہا تھا۔ دنیا والوں سے ان کا رابطہ ختم کر دیا گیا تھا۔ سب یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ مر چکے ہیں۔ وہ بہت مجبور اور بے یار و مددگار تھے۔ اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ رخشی کی شرائط مان کر ماما کے لیے بہت کچھ کر رہے تھے۔

رخشی نے بگ باس سے کہا۔ ''قربان نے مجبور ہو کر میری بہن سے شادی کی ہے۔ وہ اپنی تمام محبتیں سعدیہ پر نچھاور کرتا رہے گا۔ ساحرہ کو محض رسمی طور پر محبت کی بھیک دیا کرے گا۔ لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔''

بگ باس نے پوچھا۔ ''تم کیا کرو گی؟''

''میں اسے سعدیہ سے دور کر دوں گی۔ وہ ساحرہ کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے گا۔''

''تم اسے کیسے مجبور کرو گی؟''

اس نے کہا۔ ''اگر سعدیہ ماں بنے گی تو آگے پیچھے کچھ عرصے میں ساحرہ بھی اس کے بچے کی ماں بن جائے گی۔ ہم سعدیہ سے ہونے والی اولاد کو ساحرہ کے پاس اور ساحرہ سے ہونے والے بچے کو سعدیہ کے پاس پہنچا دیں گے۔''

بگ باس نے کہا۔ ''میں سمجھا نہیں... اس طرح تم کیا حاصل کرو گی؟''

''قربان کے لیے سعدیہ کے بچے میں زیادہ کشش ہوگی۔ بچہ ساحرہ کے پاس رہے گا تو باپ بھی ساحرہ کے ساتھ دن رات رہنے پر مجبور ہو جائے گا۔ اُدھر سعدیہ بھی یہی چاہے گی کہ اس کے بچے کو تحفظ دینے اور اس کی نگرانی کرتے رہنے کے لیے قربان ساحرہ کے پاس ہی رہا کرے۔''

باس نے کہا۔ ''یہ عورتوں والی چالیں ہیں۔ ساحرہ اس کے بچے کی ماں بنے یا نہ بنے، میں سعدیہ کے بچے کو ساحرہ کے پاس پہنچا دوں گا۔''

وہ دونوں بہت کچھ سوچ رہے تھے۔ آئندہ بہت کچھ کرنے والے تھے۔ ایک ماہ بعد لیڈی ڈاکٹر نے رخشی کو بتایا کہ ماما امید سے ہیں۔ یہ بات میرے نانا جان سے چھپائی گئی۔ انہیں معلوم ہوتا تو وہ بدنامی اور ذلت سے بچنے کے لیے شاید حمل ضائع کروا دیتے۔

انہیں چار ماہ بعد معلوم ہوا۔ اس مرحلے پر کوئی ڈاکٹر اسقاطِ حمل کی اجازت نہیں دیتا۔ نانا جان مارے شرم کے مر پڑے۔ رخشی نے اسپتال میں آ کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھے رُلایا تھا۔ میں پرائی تھی۔ بیوی بن کر آئی تھی۔

ٹھکرا دیا تھا۔ اب بیٹی کو ٹھکراؤ یا ساری زندگی روتے رہو آنسو چھپاتے رہو۔''

ایسی ذلت اٹھانے کے بعد نانا جان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اگر وہ ماما کی حفاظت کے لیے سخت سیکیورٹی کے انتظامات رکھتے تو یہ نوبت نہ آتی۔ انہوں نے بعد میں ایسے انتظامات کیے مگر پانی تو سر سے گزر چکا تھا۔

اس دوران الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ نے بتایا کہ ماما دو بچوں کو جنم دینے والی ہیں۔ بگ باس نے رخشی سے کہا۔ ''پتا نہیں' تمہاری بہن کب اس کے بچے کی ماں بنے گی؟ ویسے تمہاری خواہش پوری ہو جائے گی۔ سعدیہ سے ہونے والے ایک بچے کو ساحرہ کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔''

پھر انہوں نے یہی کیا۔ جب میں نے اور وکی نے جنم لیا تو بے چارے وکی کو ماما سے جدا کر دیا گیا۔ ساحرہ اسے لے کر اس خفیہ رہائش گاہ میں آ گئی جہاں پاپا کو قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔

یوں ہم دونوں بھائیوں میں سے وکی کو باپ کی قربت ملی اور میں نانا جان کی سرپرستی میں آ گیا۔ ماما ذہنی مریضہ تھیں۔ یہ نہیں جانتی تھیں کہ انہوں نے کن حالات سے گزر کر دو بچوں کو جنم دیا ہے؟ انہیں مینٹل اسپتال میں رکھا گیا تھا۔

وکی بدنصیب تھا۔ سوتیلی ماں اسے ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ پاپا اسے فیڈر سے دودھ پلاتے تھے۔ دن رات اسے سنبھالتے تھے۔ ایک ماں کی طرح اس کا خیال رکھتے تھے۔ چند ماہ بعد ساحرہ نے خوش ہو کر بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔

بگ باس نے رخشی سے کہا۔ ''قربان یہ اچھی طرح سمجھ رہا ہے کہ ساحرہ اس کے بیٹے کو کبھی ماں کا پیار نہیں دے گی۔ وہ کسی دن بیٹے کو لے کر وہاں سے فرار ہو سکتا ہے۔ اُدھر علیم شیرازی نے اپنے ننھے نواسے کے لیے بڑے زبردست سیکیورٹی کے انتظامات کیے ہیں۔ ہم اس بچے کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ البتہ وکی کو چھین کر اسے ایک باپ کی ضرورت بنا سکیں گے۔''

رخشی نے کہا۔ ''ہاں۔ کسی بھی طرح قربان کو اپنے شکنجے میں رکھنا چاہیے۔ اس کے بیٹے کو چھین لیا جائے گا تو وہ اسے پانے کے لیے ہمارے آگے جھکتا رہے گا۔''

ان کی پلاننگ کامیاب رہی۔ ایک رات بگ باس کے بندے پاپا کے پاس آئے۔ انہوں نے ننھے وکی کو گن پوائنٹ پر اغوا کر لیا۔ کہا۔ ''ہم چپ چاپ اسے لے جانا چاہتے ہیں۔ تم روکنا چاہو گے' شور مچاؤ گے تو اسے گولی مار کر چلے جائیں گے۔''

پاپا نے وکی کو سلامت رکھنے کی خاطر حالات سے سمجھوتا کر لیا اور اسے ان کے حوالے کر دیا۔

بگ باس نے فون پر کہا۔ ''قربان علی! تمہارا بیٹا اس وقت تک زندہ سلامت رہے گا جب تک تم سعدیہ اور اپنے دوسرے بیٹے سے دور رہو گے۔ ہو سکتا ہے' کبھی وہ دوسرا بیٹا بھی ہمارے نشانے پر آ جائے۔ لہٰذا ہم جو چاہتے ہیں' وہی کرتے رہو۔ فی الحال ساحرہ کے ساتھ عیش و آرام سے رہو۔''

ایک بیوی اور دو بیٹوں کو ہار کر بھلا کون آرام سے رہ سکتا ہے؟ پاپا کانٹوں بھرے راستے پر چل رہے تھے۔ انہی دنوں ساحرہ نے ایک خوبصورت سی بیٹی کو جنم دیا۔ اس کا نام بینم واسطی رکھا گیا۔

بدنصیبی نے دو بیٹوں کو چھین لینے کے بعد دل بہلانے کے لیے ایک بیٹی دے دی۔ وہ حالات کے مارے تھے۔ اس بچی سے بہلنے لگے۔ وہ ایک رہائش گاہ میں نظر بند رہا کرتے تھے۔ مسلح افراد انہیں باہر جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس چار دیواری میں صرف ساحرہ کے پاس ایک موبائل فون رہتا تھا جسے پاپا استعمال نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ رشتے داروں اور دنیا والوں کے لیے مر چکے تھے۔

پھر اس یقین کے ساتھ رفتہ رفتہ انہیں رہائی دی گئی کہ وہ رخشی کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کر سکیں گے۔ وکی کو پہلے ہی ان کی کمزوری بنا دیا گیا تھا۔ یہ بھی اندیشہ تھا کہ وہ دشمن ماما کو پاگل خانے میں جانی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

جب نصیب بگڑتے ہیں تو پھر بگڑتے ہی چلے جاتے ہیں۔ ایک برس بعد ساحرہ کے دن پورے ہو گئے۔ وہ دو چار روز بیمار رہ کر چل بسی۔ رخشی نے بینم کو پاپا سے لے کر کہا۔ ''اگر تم مکمل طور پر رہائی اور آزادی چاہتے ہو تو بیٹی کو میرے پاس پرورش پانے دو۔ یہ میری چہیتی بہن کی نشانی ہے۔ اسے میں اپنے پاس رکھوں گی۔''

پاپا مکمل طور پر آزاد رہ کر اپنی دولت اور ذرائع سے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ لوہے کو کاٹنے کے لیے لوہا بن جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے سوچا۔ 'بینم کچھ عرصے تک رخشی کے پاس رہے گی۔ پھر وہ اچھی طرح قدم جمانے کے بعد اسے اپنی سرپرستی میں لے آئیں گے۔'

انہوں نے رخشی کے ارادوں کو نہیں سمجھا۔ اس نے بیٹی کو بھی باپ سے اسی طرح جدا کر دیا جس طرح بیٹوں کو کیا تھا۔ بینم کو بھی بگ باس کے حوالے کر دیا گیا۔

اس کے بعد پاپا بیٹی سے ملنے کو ترس گئے۔ وہ کبھی ویڈیو فلم کے ذریعے اسے دیکھتے تھے۔ انہوں نے کبھی اسے پالنے میں دیکھا' کبھی گھٹنوں کے بل رینگتے اور انگلی پکڑ کر قدم قدم آگے بڑھتے دیکھا۔

پاپا اسے ڈھونڈتے رہے۔ انہوں نے ہم دو بیٹوں کو بھی کسی کمزوری کے بغیر حاصل کرنے کے لیے جرائم کی دنیا میں قدم رکھا۔ اپنی دولت پانی کی طرح بہانے لگے۔ مگر مچھ جیسے مجرموں کو کچلنے کے لیے خود مگر مچھ بننے کی راہ پر چل پڑے۔

بیس برس بہت ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں وہ خطرناک تنظیموں سے اور بگ باس جیسے انڈر ورلڈ والوں سے نمٹ رہے تھے۔ وہ ان پر حاوی تو نہ ہو سکے مگر اپنا بچاؤ کرتے ہوئے ہم سے متحد ہونے کی کوششیں کرتے رہے۔

ان کی سب سے بڑی بدنصیبی یہ تھی کہ وکی بگ باس کی سرپرستی میں ایک بہت ہی چالباز مجرم بن چکا تھا۔ اکثر کئی معاملات میں پاپا سے ٹکرا جاتا تھا۔ انہیں بگ باس کے خلاف ناکام بنا دیتا تھا۔ کبھی خود ناکام ہو کر پاپا سے چھپتا پھرتا تھا۔

بگ باس نے صرف پاپا اور وکی کے درمیان ہی عداوت نہیں بڑھائی بلکہ اپنی چالبازی سے انہیں میری نظروں میں بھی دشمن بنا دیا۔ اس نے فون پر پاپا سے پوچھا۔

''اپنی بیٹی بینم سے ملنا چاہو گے؟''

انہوں نے کہا۔ ''وہ ایک باپ کی اور بھائیوں کی غیرت ہے۔ ہمارے جذبات سے نہ کھیلو۔ بتاؤ' میری بیٹی کہاں ہے؟''

''میرا ایک کام کرو گے تو اس کے عوض اپنی بیٹی سے مل سکو گے۔''

''کیا کام ہے؟''

''اپنے بیٹے وجی سے فون پر رابطہ کرو اور اس سے کہو کہ علیم شیرازی اپنی دولت اور جائیداد کا ستر فی صد حصہ رخشی کے بیٹے سلطان ظفر کے نام لکھ دے۔ وجی اپنے نانا کو راضی کرے گا۔ سلطان ظفر کو اس کا حق مل جائے گا تو اس خوشی میں بینم کو تمہارے حوالے کر دیا جائے گا۔''

وہ فون کے ذریعے میری اور پاپا کی پہلی ملاقات تھی۔ انہوں نے بگ باس کی طرف سے مطالبہ پیش کیا۔ ہم دونوں بیٹوں کو پس پشت ڈال کر رخشی کے بیٹے سلطان ظفر کے لیے جائیداد کا ستر فی صد حصہ طلب کیا۔ ان حالات میں ہم نے یہی سمجھا کہ وہ باپ ہو کر ہم سے دشمنی کر رہے ہیں۔

وکی تو انہیں دشمن سمجھتا ہی تھا، میں بھی اُن سے بدظن ہو گیا۔ رخشی اور بگ باس نے ایسا چکر چلایا تھا کہ ہم باپ بیٹے ایک دوسرے سے قریب ہونے کے بجائے مخالفانہ انداز میں دور ہوتے رہے۔

بیٹیاں اور بہنیں خاندان کی عزت ہوتی ہیں۔ سنگین معاملات میں باپ اور بھائیوں کی غیرت کو للکارتی ہیں۔ مگر ہم بینم جیسی معصوم بیٹی اور اپنی پیاری بہن سے بے خبر تھے۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ دشمنوں کے ہاتھوں میں کس طرح کٹھ

پتلی بنی ہوئی ہے؟

نانا جان نے رخشی کے بیٹے کو ناجائز کہا تھا۔ غلط کو غلط ہی کہا تھا مگر رخشی انتقاماً صحیح کو غلط ثابت کر رہی تھی۔ اپنے شیطانی ہتھکنڈوں سے ماما کی پارسائی کو داغ دار بنا رہی تھی۔ ابھی تو وہ نانا جان سے انتقام لے رہی تھی۔ آئندہ پاپا کی بیٹی اور ہماری بہن کے کردار کو بھی شرمناک بنا کر پیش کر سکتی تھی۔

بیس برس بعد پاپا' ماما سے مل کر مسرتوں سے مالا مال بھی ہو رہے تھے اور شکست خوردہ اور نڈھال بھی ہو رہے تھے۔ وہ کھل کر نہ تو ماما کے سامنے آ سکتے تھے' نہ ہی آزادی سے گھوم پھر سکتے تھے۔ وہ اپنا چہرہ صرف اپنوں سے ہی نہیں' دشمنوں سے بھی چھپائے رکھتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ ماما نے بیس برس پہلے سکتے کی حالت میں پاپا کا جو چہرہ دیکھا تھا' وہ آج ان کے سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ ایک بہروپیے بن کر اُن کے سامنے سے گزر گئے تھے۔

دوسری طرف سے دشمنوں نے چیلنج کیا تھا کہ وہ بیوی سے اور بیٹوں سے رشتہ جوڑیں گے تو ایک معصوم بیٹی کو ایسا تماشہ بنا دیا جائے گا کہ وہ سر نہیں اٹھا سکیں گے۔ کسی سے آنکھیں نہیں ملا سکیں گے۔

اب تک ہم ماما کی نیک نامی اور اپنی ولدیت کی صحیح شناخت کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ اب ایک بیٹی' ایک بہن کی نیک نامی کو برقرار رکھنے کا مسئلہ درپیش تھا۔

اور وہ معصوم سی لڑکی کہاں تھی؟ کس حال میں تھی؟

پاپا گہری تاریکی میں سر جھکائے بیٹھے تھے۔ دو بیٹے جو مضبوط بازو بن کر رہ سکتے تھے' انہیں الگ کر دیا گیا تھا۔ وہ بوڑھے تھے' تنہا تھے۔ ان کے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ایسے میں مدد حاصل کرنے کے لیے ایک دعا ہی رہ گئی تھی۔

وہ صحیح راہنمائی کے لیے روشنی کی ایک کرن چاہتے تھے۔ سر جھکائے زیرِ لب دعائیں مانگ رہے تھے۔ ایک بیوی کی نیک نامی کے لیے لڑنے والا اب ایک بیٹی کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔

اس تاریکی میں میرے پاپا کے تڑپنے کا منظر دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ بیوی بھی نہیں تھی۔ جوان بیٹے بھی نہیں تھے۔

کیا کیا جائے... حالات کے پلِ صراط سے تنہا ہی گزرنا پڑتا ہے۔

اپنی تلاش میں سرگرداں ایک بے شناخت کی اس دلچسپ داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے۔

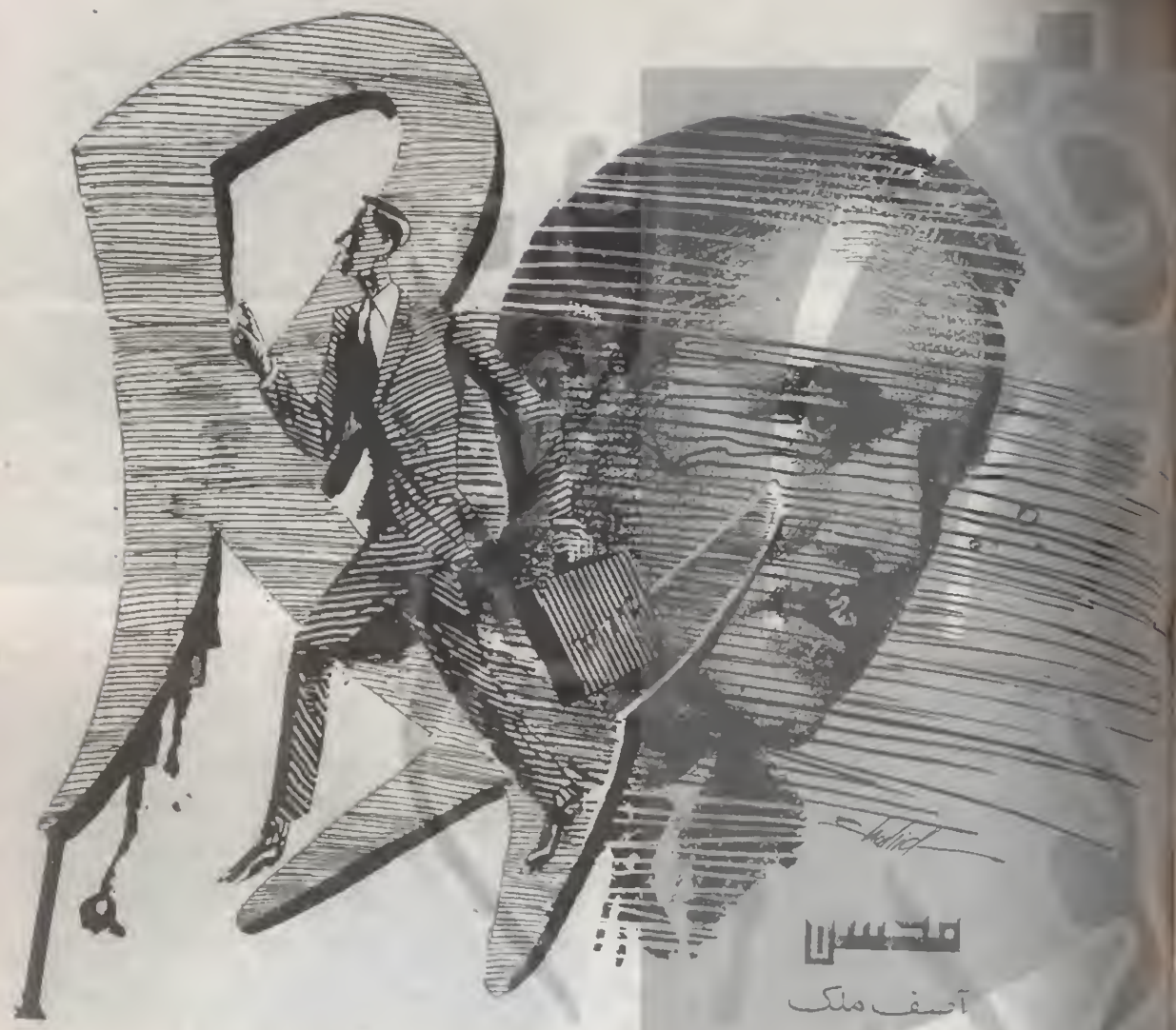

محسن

آصف ملک

کینسر کے خاتمے کے لیے تحقیق میں مصروف ایک محقق کے شب و روز اس کی جستجو میں محبت کیا شامل ہوئی' اس کی مساعی میں اضافہ ہو گیا مگر ایک رقیب نے آکر سب کچھ ختم کر دیا!

ہف نے خردبین سے ان خلیوں کو دیکھا۔ یہ بہ ظاہر عام انسانی خلیوں جیسے ہی تھے۔ مگر ڈاکٹر ہف جانتا تھا کہ یہ عام انسانی خلیے نہیں بلکہ یہ کینسر کے خلیے تھے۔ جو ہر سال در افراد کی جان لیتے ہیں۔ ڈاکٹر ہف نے خردبین سے ہٹایا۔ وہ گزشتہ کئی گھنٹے سے ان کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ ... کینسر پر تحقیق کرنے والی ایک بہت بڑی لیب ... ڈائریکٹر کے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ ریسرچ کا کام اس کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ ہف کا شمار اس شعبے میں ... نے والے قابل ترین سائنس دانوں میں ہوتا تھا اس نے اس موذی مرض کے علاج کے سلسلے میں کئی کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ خاص طور سے اس نے کینسر کی ... کے لیے ایک طریقہ کار ایجاد کیا تھا جس کی مدد سے اس مرض کا شکار ہونے والے افراد ابتدائی مرحلے میں تشخیص ہو جانے سے علاج کے بعد صحت یاب ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر ہف روجر کو اس کی خدمات کے صلے میں نوبل انعام بھی مل چکا تھا۔

گزشتہ ایک سال سے ڈاکٹر ہف اس تحقیق میں مصروف تھا کہ ایک صحت مند انسانی خلیہ کب اور کیسے کینسر کے موذی خلیے میں بدل جاتا ہے۔ یہ وہ سوال ہے... جس کا جواب سیکڑوں طبی ماہرین گزشتہ سو سال سے دریافت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر اب تک کامیابی حاصل نہیں کر سکے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ معلوم کر سکے تھے کہ کسی وجہ یا وجوہات کی بنا پر ایک خلیہ اچانک انسانی جسمانی نظام سے باغی ہو جاتا ہے اور اس نظام کے تحت کام کرنے کے بجائے

بغاوت کرتے ہوئے اپنا نظام خود بناتا ہے... اور پھر تقسیم در تقسیم کے عمل کے تحت بڑھنا شروع کر دیتا ہے... اور اس کیفیت کو کینسر کہتے ہیں۔

عام انسانی خلیے بھی تقسیم ہو کر اپنی تعداد بڑھاتے ہیں مگر یہ کام وہ جسم یا اعصاب کی ہدایت پر کرتے ہیں۔ جب کسی وجہ سے انسانی جسم کے ایک حصے کے خلیے مر جاتے ہیں یا ضائع ہو جاتے ہیں تو یہ نظام حرکت میں آجاتا ہے۔ خلیے سرعت سے تقسیم ہو کر مرنے والے خلیوں کی جگہ پوری کرتے ہیں اور جب مطلوبہ تعداد پوری ہو جاتی ہے تو یہ نظام خود بہ خود رک جاتا ہے۔ حادثات میں پیش آنے والے زخم اور سرجری کے زخم اسی طرح بھرتے ہیں۔ جل جانے والی کھال اور ضائع ہو جانے والے ناخن نئے سرے سے اُگ آتے ہیں۔

اس کے برعکس کینسر کے خلیے جب ایک بار بڑھنا شروع کرتے ہیں تو ان کی تعداد بڑھتی جاتی ہے اور یہ تقسیم کے عمل کو بے قابو کر دیتے ہیں۔ ان کے بڑھنے سے انسانی جسم میں جگہ کم پڑتی ہے اور یہ صحت مند خلیوں اور بافتوں کو تباہ کرنا شروع کر دیتے ہیں اور بالآخر انسان کی موت کا سبب بن جاتے ہیں۔ اس طرح یہ خلیے خود بھی مر جاتے ہیں۔ گویا یہ خلیے اپنے ہی جسم پر خودکش حملہ کرتے ہیں... اسے بھی مارتے ہیں اور خود بھی مر جاتے ہیں۔ مگر ماہرین یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ان خلیوں کو کون خودکشی پر اکساتا ہے۔ ڈاکٹر ہف یہی بات جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب وہ یہ وجہ یا پھر وجوہات جان جائے گا تو پھر وہ اس مرض کا حتمی علاج دریافت کر لے گا۔

ہر انسانی خلیے میں ہزاروں کی تعداد میں جینز ہوتے ہیں اور ہر جین ایک مخصوص کام کرتا ہے۔ ان میں اچھے جینز بھی ہوتے ہیں اور ایسے جینز بھی جو بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ہف کو ماہرین کے اس نظریے سے اتفاق تھا کہ کینسر کی وجہ انسانی خلیے میں چھپا ہوا کوئی جین ہے، اگر اس جین کا پتا چل جائے تو کینسر کے موذی مرض کا علاج ممکن ہو جائے گا۔ خاص طور سے ان لوگوں کا علاج آسانی سے ہو جائے گا جن کے خاندان میں کینسر کی شرح زیادہ ہو۔ یعنی ان میں کینسر ایک خاندانی مرض ہو۔ ان میں پائے جانے والے ایسے جین کی تلاش کی جا سکتی تھی جو ابھی تک نامعلوم ہو۔

''ہیلو ڈاکٹر!'' ہف کی ایک ساتھی مارتھا اندر آئی۔ وہ وائرس کی ماہر تھی کیونکہ خلیات میں کسی بھی چیز کی منتقلی کا کام وائرس کرتے ہیں اس لیے مارتھا ہف کی معاونِ خاص تھی۔

''تم نے چھٹی نہیں کرنی ہے؟'' مارتھا نے پوچھا۔ وہ سنہرے بالوں والی تقریباً تیس برس کی حسین عورت تھی۔ ہف اسے پسند کرتا تھا مگر یہ پسندیدگی ابھی اس درجے تک نہیں پہنچی تھی کہ وہ ہمہ وقت اس کے بارے میں سوچتا۔

''ہاں، بس میں جانے والا تھا۔'' ہف نے اپنا لیب کوٹ اتار کر اپنی الماری میں ٹانگتے ہوئے کہا۔ ''اور تم سناؤ جیمی کے ٹرانسفر کا کام کہاں تک پہنچا؟''

جیمز سدرن ان کا ساتھی تھا اور وہ بعض کینسر روکنے والی ادویات کو براہِ راست کینسر کے خلیوں تک پہنچانے کے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہا تھا۔ مارتھا اس کی معاونت کر رہی تھی۔

''ہاں، ٹھیک چل رہا ہے مگر جیمی درست وائرس کا انتخاب نہیں کر پا رہا۔ اسی وجہ سے بعض مشکلات بھی ہیں... اور تم نے کچھ سنا ہے؟''

''کوئی نئی بات؟'' ہف نے کوٹ پہنتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، یورو لیب کا کارل ہوٹز ہمارے ہاں آرہا ہے۔''

''اس نے یورو لیب چھوڑ دی ہے؟'' ہف نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، سنا ہے، اس کے لیب کے ڈائریکٹرز سے اختلافات ہو گئے تھے۔ اس نے استعفا دے دیا ہے۔''

''یورو لیب اس کے بغیر چلے گی کیسے... اس کا معمار وہی تو ہے۔ اسی کی وجہ سے تو لوگ لیب کو خطیر رقوم عطیہ کرتے ہیں۔''

''یہ تو یورو لیب کے ذمے داروں کو سوچنا چاہیے مگر سنا ہے کہ ہمارے لیب ڈائریکٹرز بے حد خوش ہیں کیونکہ کارل کے آنے سے لیب کو ملنے والے عطیات میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔''

کارل ہوٹز جرمن تھا۔ وہ تقریباً پچپن برس کا انتہائی خشک مزاج اور روکھا آدمی تھا۔ اسے دنیا میں صرف اپنے کام سے عشق تھا، اسی وجہ سے اس نے شادی بھی نہیں کی تھی۔ گزشتہ بیس برس سے اس کا شمار کینسر پر تحقیق کرنے والے چوٹی کے ماہرین میں ہوتا تھا اور اس نے اس میدان میں ایسی کامیابیاں حاصل کی تھیں کہ اس کا نام ایک افسانوی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ یورو لیب ان کی مارس لیب کی سب سے بڑی حریف تھی اور ہر سال کینسر پر تحقیق کے لیے ملٹی نیشنل کمپنیز کی جانب سے مختص بجٹ کا بڑا حصہ بھی یورو لیب لے جاتی تھی۔ مگر کارل ہوٹز کے یورو لیب چھوڑنے کے بعد اس کا مستقبل ... نہیں دے رہا تھا۔

''کارل کس حیثیت میں یہاں آرہا ہے؟'' ہف نے ... فکرمندی کے ساتھ کہا۔ ''سنا ہے اس کے ساتھ کام ... بے حد دشوار کاموں میں سے ایک ہے۔''

''سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔'' مارتھا نے شانے دلکش ... میں ہلائے۔ ''ویسے مجھے بھی نہیں معلوم کہ کارل کس ... ثیت میں آرہا ہے۔ اگر وہ ہمارا باس بن کر آرہا ہے تو ممکن ہے ہمیں یورو لیب کا رخ کرنا پڑے۔'' مارتھا کی بات نے ... کو فکرمند کر دیا تھا۔ اس نے مارس لیب کے لیے دن رات محنت کی تھی اور اسے امید تھی کہ کچھ عرصے میں اسے ریسرچ ڈائریکٹر بنا دیا جائے گا لیکن کارل کے آنے کی صورت میں اسے اپنی یہ متوقع پوسٹ خطرے میں لگ رہی تھی۔

وہ باہر آئے۔ ''آج کیا پروگرام ہے؟'' ہف نے پوچھا۔ وہ تقریباً چالیس برس کا ہینڈسم شخص تھا۔

''کچھ نہیں... مجھے گھر جانا ہے۔''

''ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''سوچ لو تم جانی پہچانی شخصیت ہو... کل کو اخبارات ... کوئی اسکینڈل نہ کھڑا ہو جائے۔'' مارتھا ہنسی۔ وہ جانتی تھی ... ہف اسے پسند کرتا ہے۔

''تمہارے ساتھ اسکینڈل بھی قبول ہے۔'' ہف نے پہلی بار اس سے بے تکلفی سے کہا۔

☆☆☆

ہف روجر کا خدشہ درست ثابت ہوا۔ کارل ہوٹز ریسرچ ڈائریکٹر بن کر آیا تھا اور ہف اس کا ماتحت تھا۔ ہف کیا، تمام ہی تحقیقاتی عملہ اب ہوٹز کا ماتحت تھا۔ ہف نے اس بات پر لیب ڈائریکٹرز سے احتجاج کیا تھا۔ ان کی طرف سے ہف کو یقین دلایا گیا تھا کہ اس کے تمام پروجیکٹس جوں کے توں رہیں گے اور وہ ان کے معاملے میں خودمختار رہے ... البتہ اسے کارل ہوٹز کی معاونت کرنا ہوگی۔

''یعنی وہ جب چاہے گا مجھے استعمال کر سکے گا؟'' ہف نے تلخی سے کہا۔

''مسٹر ہف روجر! وہ تمہارے مقام سے واقف ہے۔ ... فکر مت کرو... کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جو تمہیں تمہارے ... سے کم کرے۔''

مگر ہف کے خدشات برقرار رہے۔ کارل ہوٹز نے ... کے بعد لیب کے اہم ریسرچر سے میٹنگ کی اور اس ... میں ہی واضح ہو گیا کہ وہ اپنی من مانی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے دو جاری پروجیکٹس پر اعتراضات کیے تھے اور ان کو بند کرنے کا حکم دیا تھا۔

''میں فضول باتوں پر توجہ دینے کا قائل نہیں ہوں۔'' کارل نے خشک لہجے میں کہا۔ ''ہمیں اصل کام کی طرف توجہ دینی ہوگی۔''

بند ہونے والے پروجیکٹس میں ایک پروجیکٹ جیمی کا بھی تھا۔ وہ بے حد دل برداشتہ تھا۔ اس نے غصے سے کہا۔

''مسٹر ہوٹز! مہربانی کر کے اصل کام کی وضاحت بھی کر دی جائے۔ ہم اتنے برس سے یہاں جھک مار رہے تھے۔''

''کینسر ہونے کی وجوہات!''

''میں اس پر کام کر رہا ہوں۔'' ہف روجر نے اسے مطلع کیا۔

''فی الحال تم کام جاری رکھو۔ اس کے پروسیس کو بعد میں دیکھیں گے۔'' کارل ہوٹز نے اس انداز میں کہا جیسے جتا رہا ہو کہ جیمی کے بعد ہف کی باری بھی جلد آئے گی۔

''مسٹر ہوٹز! میرے پروجیکٹ میں اگر دیکھنے کی کوئی چیز

آپ بھی بھرپور طاقت کے مالک بنیئے طبی دنیا میں کامیاب اور لاجواب نسخہ

مرد حضرات ہی پڑھیں۔

برسا برس سے ہمارے ماہر طب خصوصاً ایسے مریضوں کے لیے جو اپنی ناسمجھی کی بنا پر پیچیدہ امراض میں مبتلا ہو کر طرح طرح کے علاج سے مایوس ہو گئے تھے کے لیے اپنے تجربہ و تحقیقات انتھک محنت لگن اور کاوشوں سے ایسا نسخہ تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے کئی ناکارہ بوڑھوں کو بہت کم دنوں میں جوان مرد بنا دیا اور مایوس گئے گزرے کمزور نوجوان ایک ایک بچے آزما کر یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ جوہر واقعی بے پناہ قوت کا سرچشمہ ہے آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے ہیں کہ اس کے استعمال سے جسم میں نیا اور تازہ خون پیدا ہونے لگتا ہے چہرے پہ سرخی آ جاتی ہے دنوں میں چستی توانائی ظاہر کر کے صحت کو قابل رشک بنا دیتا ہے اور آپ کو وہ تمام خوشیاں میسر ہو جائیں گی جس کے لیے آپ ایک مدت سے محروم رہے ہیں آج ہی ایک خط اپنی مکمل کیفیت لکھ کر جوابی لفافے کے ہمراہ ہمیں روانہ کریں آپ کو یہ نسخہ فوراً روانہ کر دیا جائے گا۔

حکیم اینڈ سنز
پوسٹ بکس نمبر 2159 کراچی 74600 پاکستان

ہے بھی تو اس کا فیصلہ میں کروں گا کہ وہ کیا چیز ہے۔'' ہف نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''سچ!'' کارل کا لہجہ مذاق اڑانے والا تھا مگر ہف نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس لیے بات آگے نہ بڑھ سکی۔ میٹنگ سے آنے کے بعد ہف نے غصے میں مارتھا سے کہا۔

''اگر اس شخص نے میرے کسی بھی معاملے میں دخل دیا اور ڈائریکٹرز نے اس کی حمایت کی تو میں استعفا دے دوں گا۔''

''تمہارے استعفے سے ان کو کیا نقصان ہوگا؟''

''میں کہیں اور چلا جاؤں گا۔''

''ہف! یہ حقیقت ہے کہ کام کرنے کی جو سہولتیں تمہیں مارس لیب میں میسر ہیں، وہ تمہیں کہیں بھی نہیں ملیں گی۔ پیسا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ کام کا ماحول اور کام کرنے والے ساتھی سب سے اہم ہوتے ہیں۔''

''یہاں یہ دونوں خراب ہونے والے ہیں۔''

''پھر بھی تمہیں تحمل سے کام لینا چاہیے۔''

''اور اس سے اپنی بے عزتی کرانی چاہیے۔'' ہف نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تم نے دیکھا، جیمی سے اس کا رویہ کیسا تھا؟ وہ اس سے کتنی حقارت سے بات کر رہا تھا۔''

''جیمی ناکام جا رہا ہے اور اس کا پروجیکٹ جلد یا بہ دیر بند ہونا ہی تھا مگر تمہاری بات دوسری ہے۔ تمہارا یہ پروجیکٹ کامیابی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ جیمی والا سلوک نہیں کر سکتا۔''

''میں اسے اس کی اجازت بھی نہیں دوں گا۔'' ہف نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

ہف کا تعلق سوئیڈن سے تھا مگر وہ گزشتہ پندرہ سال سے پیرس میں مقیم تھا۔ مارس لیب کا ہیڈ کوارٹر اسی شہر میں تھا۔ ہف نے اسی جگہ اپنا گھر لے لیا تھا اور اس کا ارادہ مستقل پیرس میں رہنے کا تھا۔ مارتھا فرانسیسی تھی جبکہ کارل ہوٹز جرمن تھا۔ مارس لیب میں سارے یورپ بلکہ امریکا تک سے ریسرچرز آ کر کام کر رہے تھے۔ کارل کے آنے سے ہف ذرا متاثر ہوا تھا اور شروع میں اس کی توجہ کام سے ذرا ہٹ گئی تھی مگر پھر وہ سارے معاملات ذہن سے جھٹک کر کام میں مصروف ہو گیا۔ اسے علم نہیں تھا کہ کارل اس کے پروجیکٹ کی نگرانی کر رہا ہے۔ ایک دن وہ اچانک ہف کے دفتر آ گیا۔

''میں ادھر سے گزر رہا تھا تو سوچا تم سے ملتا چلوں۔''

''شکریہ مسٹر ہوٹز!'' ہف نے اسے کافی پیش کی۔ ''میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

''فی الحال تم سے کام نہیں ہے۔'' کارل نے کافی پر چسکی لی۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ کام کی بات پر آ گیا۔ ''میں نے سنا ہے کہ تم جین تھراپی کے نظریے پر کام کر رہے ہو؟''

''ریسرچ ڈائریکٹر کے طور پر تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔'' ہف محتاط ہو گیا۔

''میں نے ابھی زیادہ چھان بین نہیں کی ہے۔ ویسے میرے خیال میں جین تھراپی کا نظریہ بے کار ہے۔ میں ماحولیاتی بگاڑ کے نظریے پر یقین رکھتا ہوں۔''

''یہ تمہارا خیال ہے مسٹر ہوٹز... ضروری نہیں ہے کہ میں اس سے اتفاق کروں۔''

''سچ!'' کارل ہوٹز نے اسے غور سے دیکھا۔ یہ اس کا تکیہ کلام لگتا تھا۔

''مجھے جھوٹ بولنے سے نفرت ہے۔''

''ممکن ہے مسٹر روجر، جلد وہ وقت آئے جب تم میرے نظریے سے اتفاق کرنے لگو۔''

''میرا خیال ہے، ایسا مشکل ہے۔'' ہف نے سکون سے کہا۔ ''میں کوئی نظریہ اپنانے یا قائم کرنے سے پہلے خوب غور کرتا ہوں اور جب اس پر پختہ ہو جاتا ہوں تو کسی کے کہنے سے اس سے پیچھے نہیں ہٹتا۔ اگر نظریہ ہی غلط ہو جائے تو الگ بات ہے۔''

''ماحولیاتی بگاڑ کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ ماحولیاتی بگاڑ ہی ہے جو اس جین کو متحرک کرنے کا باعث بنتا ہے۔ کینسر کے عوامل میں ضرر رساں مادے جیسے اسکوحل یا نکوٹین سرفہرست ہیں۔ مگر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگانے والے کو جگر کا اور سگریٹ نہ پینے والے کو پھیپھڑوں کا کینسر ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس یہ دونوں نشیات بے تحاشا استعمال کرنے والوں کو کچھ بھی نہیں ہوتا۔''

''اچھا نقطہ ہے۔''

''اسی وجہ سے مجھے ماحولیاتی بگاڑ کا اکیلا نظریہ دل کو نہیں لگتا۔ میرے خیال میں اس کے ساتھ جین کو ملا کر دیکھا جائے تو بات زیادہ معقول لگتی ہے۔''

''مگر ابھی تک ایسا کوئی جین دریافت نہیں ہوا ہے۔''

''بہت سارے امراض کے ذمے دار جینز دریافت ہو چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جلد یہ جین بھی مل جائے گا اور اس کے بعد انسان کے جسم سے کینسر کے امکانات کو ختم کیا جا سکے گا۔''

''کینسر کے امکانات!'' کارل نے دہرایا۔ ''مسٹر ہف! تم جانتے ہو... کینسر صرف ایک مرض نہیں ہے، ایک قوت ہے۔ اگر انسان نے اسے قابو کر لیا تو اس سے ایسے کام لیے جا سکتے ہیں جو آج کے دور میں ناممکن سمجھے جاتے ہیں۔ ہمیں اسے ختم کرنے کے بجائے قابو کرنا چاہیے۔''

''مجھے تمہاری بات سے اختلاف ہے۔ کینسر ایک لعنت ہے، اس سے تعمیری کام لینا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اسے ختم کرنا بہتر ہے... بہ نسبت اسے قابو کرنے کے!''

''ممکن ہے، تم درست کہہ رہے ہو۔'' کارل ہوٹز نے کافی کا خالی کاغذی کپ ڈسٹ بن میں ڈال دیا۔ ''کافی کا شکریہ... پھر ملیں گے۔''

ہف کو خدشہ ہونے لگا کہ کارل ہوٹز اس کے پروجیکٹ میں بھی چھیڑ چھاڑ کرے گا اس لیے اس نے کام تیز کر دیا۔ اس کام کے لیے وہ جینز میپنگ سے مدد لے رہا تھا۔ یہ عظیم جینیاتی نقشہ کچھ دن پہلے ہی تیار ہوا تھا۔ دس برس تک ڈیڑھ سو اعلیٰ درجے کے سائنس دان ایک انسانی خلیے میں موجود جینز کا ڈیٹا حاصل کرتے رہے تھے اور انہوں نے ایک لاکھ سے زیادہ جینز کو الگ الگ شناخت کر لیا تھا۔ مگر ان میں سے صرف پانچ ہزار جینز کے بارے میں یہ پتا تھا کہ وہ کیا کام کرتے ہیں اور باقی کے بارے میں سائنس فی الحال تاریکی میں تھی۔ ہف کے خیال میں کینسر پیدا کرنے والے جین انہی میں چھپے تھے اور وہ اسے تلاش کرنا تھا۔ اگرچہ یہ کام ایسا ہی تھا جیسے ایک ننھی سی مچھلی پکڑنے کے لیے بحرِ اوقیانوس کھنگالنا یا بھوسے میں سے سوئی تلاش کرنا۔ ہف اس صبر آزما کام کے لیے تیار تھا اور اسے معلوم تھا کہ سست روی سے صحیح مگر وہ ایک دن یہ کام کر لے گا۔

مگر کارل ہوٹز کے آنے کے بعد ہف نے سست روی کا طریقہ ترک کر دیا تھا۔ اس نے کینسر کے شکار افراد کے جسمانی خلیوں اور کینسر زدہ خلیوں میں فرق معلوم کرنے کا کام تیز کر دیا تھا۔ ویسے تو کینسر زدہ خلیات خود بھی بگڑی ہوئی اور زخمی سی صورت اختیار کر لیتے ہیں مگر بہ ظاہر ان میں اور ایک عام خلیے میں اندرونی فرق نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود ایک عام خلیے کی پروگرامنگ جسے ڈی این اے بھی کہتے ہیں اور جو دراصل خلیے کو چلانے والا سافٹ ویئر ہوتا ہے... اس میں ایسی کوئی تبدیلی آتی ہے جس سے خلیہ جسمانی نظام کا باغی کینسر زدہ خلیہ بن جاتا ہے۔

مارتھا کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ دو دن سے دفتر نہیں آ رہی تھی۔ اس لیے ہف خود اس کی مزاج پرسی کے لیے اس کے گھر چلا گیا۔ مارتھا نے دروازہ کھولا تو اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور وہ دو دن میں خاصی کمزور ہو گئی تھی۔

''تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہے۔'' ہف نے تشویش سے کہا۔

''نہیں... چند دن سے جسم میں درد تھا۔ میں ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔'' مارتھا اسے اندر لے آئی۔ ''ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ یہ موسم کا اثر ہے۔''

''مگر موسم کے اثر میں کوئی اتنا کمزور تو نہیں ہوتا... اپنی رنگت تو دیکھو۔''

''ہاں... میڈیسن لے رہی ہوں، ٹھیک ہو جاؤں گی۔ تم کیا پیو گے؟''

''کچھ نہیں، میں تمہیں دیکھنے آیا تھا۔''

''اور سناؤ، ہوٹز کا رویہ کیسا ہے؟''

''مجھے لگ رہا ہے کہ وہ میرے پروجیکٹ کو چھیڑنے کی تیاری کر رہا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''اس نے چند مخصوص مشینیں مجھ سے طلب کر لی ہیں حالانکہ وہ خاص طور سے میرے پروجیکٹ کے لیے لی گئی تھیں۔''

''تم نے کیا جواب دیا؟''

''میں نے فی الحال یہی کہا ہے کہ مشینیں فارغ نہیں ہیں۔''

''ہف! مجھے لگ رہا ہے کہ کارل ہوٹز تم سے چڑنے لگا ہے۔ تم اس کے اختیارات کی راہ میں رکاوٹ ہو۔''

''یہ سائنس کا میدان ہے۔ وہ اپنے نظریے کے مطابق کام کرے اور مجھے میرے نظریے کے مطابق کام کرنے دے۔''

''وہ اس قسم کا آدمی نہیں ہے۔ وہ مکمل حاکمیت چاہتا ہے۔''

''میری بلا سے وہ بھاڑ میں جائے۔ میں اس کی قطعی پروا نہیں کرتا۔''

''ہف! وہ باس ہے۔'' مارتھا نے آہستہ سے کہا۔

اور یہ حقیقت تھی۔ کارل ہوٹز باس تھا اگر وہ اپنے اختیارات استعمال کرنا چاہتا تو کوئی اسے روک نہیں سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ جب اگلے روز ہف لیب پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ... خاصی مشینیں جن سے وہ جین میپنگ کا کام لیتا تھا، اس کے سیکشن سے ہٹا دی گئی تھیں۔ وہ بھنا کر کارل ہوٹز کے پاس پہنچا۔

''مشینیں میرے شعبے سے کیوں لی گئی ہیں؟ ایسی کیا

ضرورت تھی؟ اور مجھ سے پوچھے بغیر کیوں مشینیں لی گئیں جبکہ میرا کام ان پر جاری ہے۔''

''میں ریسرچ کا انچارج ہوں اور مجھے پتا ہے...''

''مسٹر ہوٹز! تم ریسرچ کے انچارج ضرور ہو... لیکن اپنے پروجیکٹس کا انچارج صرف میں ہوں اور یہ مشینیں خاص طور سے میرے پروجیکٹس کے لیے آئی ہیں۔ ان کا لیب کی دوسری مشینوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لیے ان کو فوراً واپس کردو۔''

''اس لیب کی ہر مشینری میرے انڈر ہے۔'' وہ غرایا۔

''میں ابھی تمہاری خوش فہمی دور کر دیتا ہوں۔'' ہف نے کہا اس نے اپنے دفتر میں آکر لیب کے ڈائریکٹر کو کال کی اور اسے صورتِ حال بتائی۔

''تم فکر مت کرو... مشینیں ابھی تمہارے سیکشن میں آجائیں گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر میں اس قسم کے ماحول میں کام کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ مہربانی کر کے مسٹر ہوٹز کو میرے معاملات میں دخل اندازی سے روک دیا جائے۔''

''وہ آئندہ ایسا نہیں کرے گا۔''

ایک گھنٹے کے اندر اندر مشینیں ہف کے سیکشن میں واپس آچکی تھیں مگر اس کا موڈ اتنا خراب ہوگیا تھا کہ وہ دو دن تک کوئی کام نہیں کرسکا۔ تیسرے دن وہ دفتر سے سیدھا مارتھا کے اپارٹمنٹ گیا۔ وہ ابھی تک دفتر نہیں آئی تھی۔ ہف اسے دیکھ کر حیران ہوگیا۔ وہ پہلے سے زیادہ کمزور اور زرد دکھائی دے رہی تھی۔ ''مارتھا! تمہیں کیا ہوگیا ہے؟''

''وہی جس کی ہم ریسرچ کرتے ہیں۔''

ہف دم بہ خود رہ گیا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ ''کینسر!''

مارتھا نے سر ہلایا۔ ''ہڈیوں کا... ابھی یہ دوسرے درجے میں ہے۔''

ہف جانتا تھا کہ ہڈیوں کا کینسر دیر سے تشخیص ہوتا ہے اور علاج کے لحاظ سے سب سے مشکل ہوتا ہے۔

''دائیں ران کی ہڈی میں دو عدد ٹیومر بن چکے ہیں اور دوسری ہڈیوں میں بھی ان کے آثار ہیں۔'' مارتھا نے اسے اپنے سی ٹی اسکین اور دوسری رپورٹس دکھائیں۔

''ڈاکٹر کیا کہتا ہے؟'' ہف نے اپنے صدمے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''پچاس فیصد امکانات ہیں... مجھے کیموتھراپی کرانا ہوگی۔'' مارتھا پھیکے انداز میں مسکرائی۔

ہف لرز گیا۔ وہ کیموتھراپی کے بھیانک اثرات سے واقف تھا۔ مارتھا کے جسم کے تمام بال جھڑ جاتے، کھال لٹک جاتی اور اس کا حسین بدن گھلنا شروع ہوجاتا۔ اس کی بھوک اڑ جاتی۔ مستقل متلی والی کیفیت رہتی۔ اسے نہ نیند آتی اور نہ ہی وہ درست طریقے سے کھا پی سکتی۔

''کب سے ہے؟''

''جلد از جلد!''

''تم لیب میں آجاؤ۔ میں تمہاری کیموتھراپی کروں گا۔''

''نہیں، میں اسپتال میں ٹھیک رہوں گی۔'' اس نے انکار کیا۔

مارتھا کے کینسر کا سن کر ہف کی اندر سے عجیب سی حالت ہوگئی تھی۔ اسے پہلی بار اندازہ ہوا کہ وہ مارتھا سے محبت کرنے لگا ہے۔ اس نے دل میں سوچا کہ کاش وہ جین تھراپی والے علاج کا طریقہ دریافت کرلے۔ اس طرح سے مارتھا کا علاج ہوسکتا تھا۔ وہ بچ جاتی۔ یہ سوچ کر ہف روجر تن من سے کام میں لگ گیا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ سورج نکلنے سے پہلے کام پر آجاتا اور سب کے جانے کے بعد رات دیر تک لیب میں مصروف رہتا تھا۔ وہ صرف پہلی کیموتھراپی کے دن چھٹی کر کے مارتھا سے ملنے اسپتال گیا تھا۔ اسے ریڈی ایشن والا انجکشن دیا گیا۔

کیموتھراپی میں مخصوص طریقے سے کینسر کے خلیات کو نشانہ بنایا جاتا ہے مگر اس سے عام خلیات بھی متاثر ہوتے ہیں۔ تاب کاری پورے جسم پر اثر ڈالتی ہے جس سے جسم کے خلیے نیم مُردہ ہوجاتے ہیں۔ اس کے اثر سے بال جھڑ جاتے ہیں اور جگر اور آنتوں پر زیادہ اثر ہوتا ہے۔ مارتھا نے مسکرا کر انجکشن لگوایا۔

''مارتھا! تم ایک بہادر عورت ہو۔'' ہف نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''ہاں لیکن میں مرنے سے ڈرتی ہوں۔'' مارتھا نے سرگوشی کی۔

''ڈیئر! میں ان دنوں چودہ گھنٹے کام کر رہا ہوں... صرف اس لیے کہ جلد از جلد اس جین کو تلاش کرلوں جو کینسر کا سبب بنتا ہے۔''

''تو اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟''

''ہوگا کیوں نہیں۔'' ہف نے جوش سے کہا۔ ''میں صرف جین پکڑنا نہیں چاہتا بلکہ اس کی پروگرامنگ کی خامی کو جان کر اسے ٹھیک کرنے کی تکنیک بھی دریافت کروں گا۔ تم سمجھ رہی ہو نا؟ مصنوعی طور پر پروگرام کیے ہوئے جینز جسم کے کینسر کے خلیوں کو پھر سے ٹھیک کر کے ان کو عام انسانی خلیہ بنا

دیں گے۔ کینسر پلٹ جائے گا۔''

''یہ ممکن ہے؟''

''میں اس تکنیک پر کام کر رہا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ کرلوں گا۔''

انجکشن لینے کے باوجود مارتھا کا چہرہ جوش سے جگمگانے لگا۔ ''میرا کینسر خود بہ خود ختم ہوجائے گا؟''

''اگر میں نے وہ طریقۂ کار دریافت کرلیا تو ایسا ہی ہوگا۔''

''پلیز ہف!'' مارتھا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ''نہیں ڈیئر... تمہیں التجا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں نہیں خود کو بچانے کے لیے یہ جنگ لڑ رہا ہوں... اور میں کامیاب ہو کر رہوں گا۔''

''میرے لیے... مگر کیوں؟'' مارتھا بے قرار ہوگئی۔

ہف نے اس کا چہرہ تھام لیا۔ ''کیونکہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔ میں سمجھتا تھا کہ میں تمہیں صرف پسند کرتا ہوں لیکن جب سے میں نے تمہارے کینسر کے بارے میں سنا ہے، میرے اندر کی حالت ہی بدل گئی ہے... مارتھا! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

''میں بھی۔'' وہ رونے لگی۔

''تمہیں میری خاطر... میرے لیے زندہ رہنا ہوگا۔ پورے حوصلے سے!''

''میں زندہ رہوں گی... تمہاری خاطر!'' مارتھا نے گرم جوشی سے جواب دیا۔

''اگر میں تم سے ملنے نہ آسکوں تو سمجھ لینا کہ میں تمہارے کام میں ہی مصروف ہوں اور میں تمہیں ہر وقت اپنی سوچوں میں رکھے ہوئے ہوں۔''

''میں تمہارے آنے کی منتظر رہوں گی... اور تم کامیاب ہو۔''

کام کی زیادتی رفتہ رفتہ ہف کے لیے جنون بن گئی تھی۔ اسے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ اسے کھانا پینا یاد نہیں رہتا تھا۔ اسے ہمہ وقت یہی خیال رہتا تھا کہ وہ جلد از جلد جین تھراپی کی تکنیک دریافت کرلے جس سے مارتھا کا کینسر پلٹ جائے اور وہ پہلے کی طرح صحت یاب ہوجائے۔ اس کا یہ جنون روجر ہوٹز سے چھپا نہیں رہا تھا۔ ایک دن اس نے ہف کو طلب کرلیا۔

''مسٹر روجر! تم کس چیز پر کام کر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جین تھراپی کی تکنیک پر!''

''تو اس لیے تم اپنا آرام اور سکون حرام کر کے کیوں کام کر رہے ہو؟''

''کیونکہ آرام سکون میرا نہیں اور میں جلد کامیاب ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد کسی قسم کے کینسر کے علاج کی ضرورت باقی نہیں رہے گی بلکہ جین تھراپی کی مدد سے اسے پلٹ دیا جائے گا۔ کینسر ختم نہیں ہوگا بلکہ درست ہوجائے گا۔''

''یہ تھیوری میرے حلق سے نہیں اتر رہی ہے۔'' کارل نے سرد لہجے میں کہا۔

''جب کامیاب ہوگی تو خود حلق سے اتر جائے گی۔'' ہف مسکرایا۔

''کہیں تم یہ سب اس لڑکی مارتھا کے لیے تو نہیں کر رہے؟''

''اگر اس کے لیے بھی کر رہا ہوں تو اس میں کیا برائی ہے؟''

''اس طرح تم لیب کے وسائل ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہو۔''

ہف اس کی طرف جھکا... ''مسٹر ہوٹز! جب میں تمہارے بارے میں دوسروں سے کچھ باتیں سنتا تھا تو میں سوچتا تھا کہ اتنا بڑا آدمی اور سائنس دان ایسا کیسے ہوسکتا ہے... مگر اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ لوگ ایسا غلط بھی نہیں کہتے تھے۔''

ہف، کارل کے دفتر سے نکلا تو بھنّایا ہوا تھا۔ اس نے کارل کو گالیاں دیں اور دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ یہ پروسیس ایجاد کرنے میں کامیاب رہا تو لیب کے ذمے داروں کے سامنے یہ مطالبہ رکھے گا کہ اسے بہرصورت الگ شعبہ دیا جائے، ورنہ وہ پروسیس لے کر کہیں اور چلا جائے گا۔ اسے یقین تھا کہ اس ایجاد پر اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا مگر ابھی اصل مرحلہ باقی تھا۔ اسے تکنیک پر کام کرنا تھا۔ دوسرے مہینے اسے کامیابی کے آثار نظر آنے لگے۔ اس نے بالآخر وہ جین تلاش کرلیا تھا جو کینسر کا سبب بنتا تھا۔ بار بار کے تجربات سے بالآخر ثابت ہوگیا کیونکہ تمام کینسر زدہ خلیات میں یہی جینز متحرک پائے گئے تھے۔

ہف تمام سائنسی کاموں اور پیش رفت کا ریکارڈ دو جگہوں پر محفوظ رکھتا تھا... ایک تو اپنے ذاتی لیپ ٹاپ کمپیوٹر میں اور دوسرا لیب کے کمپیوٹر میں۔ دونوں جگہوں پر اس کے علاوہ اور کوئی رسائی حاصل نہیں کرسکتا تھا... سوائے آئی ٹی کے شعبے کے انچارج کے۔ وہ کمپیوٹر کا منیجر تھا اور تمام پاس ورڈز اس کے پاس ہوتے تھے۔ ایلم روزنگر کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ قابلِ اعتماد شخص ہے اور اس پر پوری لیب کو بھروسا تھا۔

ہف نے اس جین کے اندرونی پروگرام کی کھوج شروع کردی تھی۔ یہی پروگرام اصل میں جین کو متحرک کرتا تھا اور وہ خلیات کو کینسر زدہ خلیے میں تبدیل کردیا کرتا تھا۔

ہف مسلسل اس کی کھوج میں لگا رہا۔ آخر کار وہ جان گیا کہ جین کے اندر ایک خاص قسم کا پروٹین تھا جو اسے متحرک کرتا تھا اور اس کے بعد یہ جین کینسر کا سبب بن جاتا تھا۔ یہ خاصی پیچیدہ قسم کا پروٹین تھا اور اس کی ساخت معلوم کرنا آسان نہیں تھا مگر کئی ہفتے کی محنت اور تقابل کے بعد بالآخر ہف جان گیا کہ یہی پروٹین خلیات میں عمل کر کے ان کو مسلسل تقسیم پر اکساتا تھا۔ گویا یہی کینسر کا سبب تھا اور تمام کینسر زدہ خلیوں میں پایا گیا تھا۔

دوسرا مرحلہ اس پروٹین کو کام کرنے سے روکنے کا تھا۔ اس کے لیے ہف کو مارتھا کی ضرورت تھی اور وہ بیمار ہو کر اسپتال میں لیٹی تھی۔ یہ کام بھی ہف کو خود کرنا پڑا۔ اس نے ایک کیریئر وائرس منتخب کیا اور اسے ری پروگرام کر کے اس خاص پروٹین کا دشمن بنا دیا۔ یہ جین میں داخل ہو کر اور اس پروٹین پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیتا تھا۔

لیب میں کینسر کے خلیات کی پرورش کر کے یعنی ان کو آکسیجن اور خوراک کی فراہمی کی مدد سے مصنوعی رسولیوں میں بدل دیا گیا تھا۔ جب کینسر کے خلاف کوئی حربہ یا دوا تیار کی جاتی تھی تو اس کا تجربہ انہی خلیات پر کیا جاتا تھا۔ ہف نے اپنے تیار کردہ وائرس کا ان خلیات پر تجربہ کیا اور تجربہ کامیاب رہا۔ اس نے اپنے تجربے کو بار بار دہرایا اور ہر بار اسے کامیابی حاصل ہوئی۔

☆☆☆

''ایسی کیا بات ہے جس کے لیے تم نے مجھے میرے بستر سے کھینچ کر نکال لیا؟'' کارل نے ناگواری سے کہا۔

''سوری ڈاکٹر... لیکن یہ ضروری ہے۔'' ہف نے عام سے لہجے میں معذرت کی۔ اسے معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد اس کی معذرت بے معنی ہو جائے گی۔

''آخر بات کیا ہے؟''

''میں نے وہ جین اور اس کا مخصوص پروٹین تلاش کر لیا ہے جو ایک عام خلیے کو کینسر زدہ خلیے میں بدل دیتا ہے۔''

''ناممکن!'' کارل نے بے یقینی سے کہا۔

''کوئی بھی کام ہونے سے پہلے ناممکن سمجھا جاتا ہے اور جب وہ ہو جاتا ہے تو...'' ہف مسکرایا۔ ''یہ دیکھو، میں نے ایک کینسر زدہ رسولی پر اپنے بنائے ہوئے وائرس چھوڑے ہیں۔'' ہف نے طاقتور خردبین کی اسکرین کی طرف اشارہ کیا۔ اس میں رسولی کا اصل سے کروڑ گنا بڑا سائز دکھایا گیا تھا۔ وائرس اتنے چھوٹے تھے کہ بہ مشکل نظر آ رہے تھے۔ وہ رسولی پر حملہ کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے رسولی کا سائز گھٹنے لگا اور وہ بے جان ہوتی جا رہی تھی۔

''یہ مر رہی ہے۔'' ہف نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ ''وائرس صرف خاص پروٹین والے جینز پر حملہ کرتے ہیں جو صرف کینسر کے خلیات میں پائے جاتے ہیں۔ باقی جسمانی بافتوں اور خلیات کے لیے یہ بے ضرر ہیں... تو ڈاکٹر! اب محض ایک معمولی سے انجکشن سے کینسر کے آخری درجے کے مریضوں کو بھی بچایا جا سکتا ہے۔''

''ناممکن!'' کارل ہوئز نے غصے سے کہا۔

''میں نے اسے عملی طور پر تمہارے سامنے پیش کر دیا ہے۔'' ہف نے حیرت سے کہا۔ ''پھر تم اسے کس طرح ناممکن قرار دے رہے ہو؟''

''میں اسے نہیں... کینسر کے ختم ہونے کو ناممکن قرار دے رہا ہوں۔''

''وہ تو ظاہر ہے... ہر سال ایک کروڑ افراد کینسر میں مبتلا ہو جاتے ہیں مگر اب ان سب کو بچایا جا سکے گا۔ اور یقین کرو... یہ طریقۂ علاج بہت سستا پڑے گا۔''

''میں یہ نہیں کہہ رہا... احمق آدمی! کینسر مرض ہے... مگر بنی نوع انسان کی امید بھی ہے۔ اس کی مدد سے انسان اپنی جسمانی صلاحیت بڑھا سکے گا، رات کو دیکھ سکے گا۔ گھوڑے کی طرح دوڑ سکے گا۔ پرندوں کی طرح ہوا میں اڑ سکے گا۔ مچھلی کی طرح پانی میں آکسیجن کے بغیر تیر سکے گا۔''

''یہ کیا احمقانہ بات ہے؟'' ہف نے جھنجلا کر کہا۔ ''ہمیں انسانوں کو مرنے سے بچانا ہے۔''

''انسان کو موت پھر بھی آنی ہوتی ہے مگر کینسر ہی ضائع ہو جانے والے اعضا کی دوبارہ تیاری میں مدد کرے گا۔''

''افسوس کہ تمہارا یہ خواب اب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو گا۔'' ہف نے مسکرا کر کہا۔ ''میں نے کینسر کے موذی مرض کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔''

''نہیں... میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔'' کارل ہوئز نے ہذیانی لہجے میں کہا اور اپنے لباس سے ننھا سا پستول نکال لیا۔

''یہ کیا پاگل پن ہے؟''

''ہاں، اسے پاگل پن ہی کہا جائے گا لیکن آنے والے وقت میں دنیا مجھے اپنا محسن کہے گی۔''

اس سے پہلے کہ ہف کوئی حرکت کر سکتا، کارل نے ٹریگر دبا دیا۔

✱

اعتماد

مدیحہ شاہ

اعتماد بڑی قوت ہے۔ اس کے بل پر ناممکن کو ممکن بنایا جا سکتا ہے ...اور ممکنات کو روکا بھی جا سکتا ہے! ایک ملزم پر کیے گئے ایک جج کے اعتماد کی کہانی

جج نارمن اس وقت اپنے چیمبر میں بیٹھا تھا۔ اس ... 16 سالہ نوجوان پال کھڑا تھا۔ وہ جج سے نظریں ... تھا بلکہ اس کی نظریں فرش پر گڑی ہوئی تھیں۔ جج ...ے غور سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پال ایک ...صورت نوجوان تھا مگر اس وقت خاصا نڈھال دکھائی ... تھا۔

''...ل!'' جج نارمن نے اسے مخاطب کیا تو اس نے ... اٹھائے بغیر ''سر'' کہا۔ اس لڑکے نے عدالت میں بھی ... میں بھی جج کو ''سر'' کہہ کر پکارا تھا۔ اس نے ایک ... نہ تو جارحانہ انداز اختیار کیا تھا اور نہ ہی جج کو بدتمیزی ...طب کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی آواز نرم اور مؤدب تھی۔ جج کی تجربہ کار نگاہوں نے اسے بتا دیا تھا کہ لڑکے نے ...الت میں جھوٹ بولا ہے اور نہ اس کے چیمبر میں۔

''پال! تم نے اپنی عمر سے بڑا جرم کرنے کی کوشش کی'' جج نے کہا۔ ''تم نے ایک شہری پر حملہ کیا۔ اس وقت ...ے ہاتھ میں لوہے کا پائپ بھی تھا۔ تم نے اسے لوٹنے ...شش کی مگر کامیاب نہیں ہو سکے۔ وہ شخص مر بھی سکتا تھا۔ ... بچوں کا باپ تھا اور اپنے گھر کا واحد کفیل۔ اگر وہ مر جاتا ... کے بیوی بچوں کا کیا ہوتا؟''

''سر! میں نے اسے ہلاک کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔'' پال نے کہا۔ ''میں نے تو صرف...''

''میں جانتا ہوں کہ تم اسے قتل نہیں کرنا چاہتے تھے، صرف اسے لوٹنا چاہتے تھے۔ مگر تم نے لوہے کے پائپ سے اس کے سر پر کئی وار کیے۔ وہ مر بھی سکتا تھا۔'' نارمن نے کہا۔

''لیکن سر! میں نے اسے ہلاک کرنے کے ارادے سے اس کے سر پر وار نہیں کیے تھے۔ صرف اسے بے ہوش کرنا چاہتا تھا تاکہ اس کی جیبیں خالی کر سکوں۔''

''یعنی تمہیں رقم کی ضرورت تھی؟'' جج نے سوال کیا تو پال نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتے ہو مگر بھوکے نہیں مرتے۔ تمہارا کسی نہ کسی طرح گزارہ ہو رہا ہے۔ تم چھوٹی موٹی پارٹ ٹائم ملازمت بھی کرتے ہو۔ پھر تمہیں ایسی کیا ضرورت آن پڑی تھی کہ تم نے یہ حرکت کر ڈالی؟'' جج نارمن نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

''وہ... سر... وہ میری دوست نے... کہا تھا کہ... اسے رقم چاہیے۔'' پال نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''گویا تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ تم کسی بھی لڑکی کے کہنے پر چار بچوں کے غریب باپ پر حملہ کر دو؟'' جج نے کہا۔

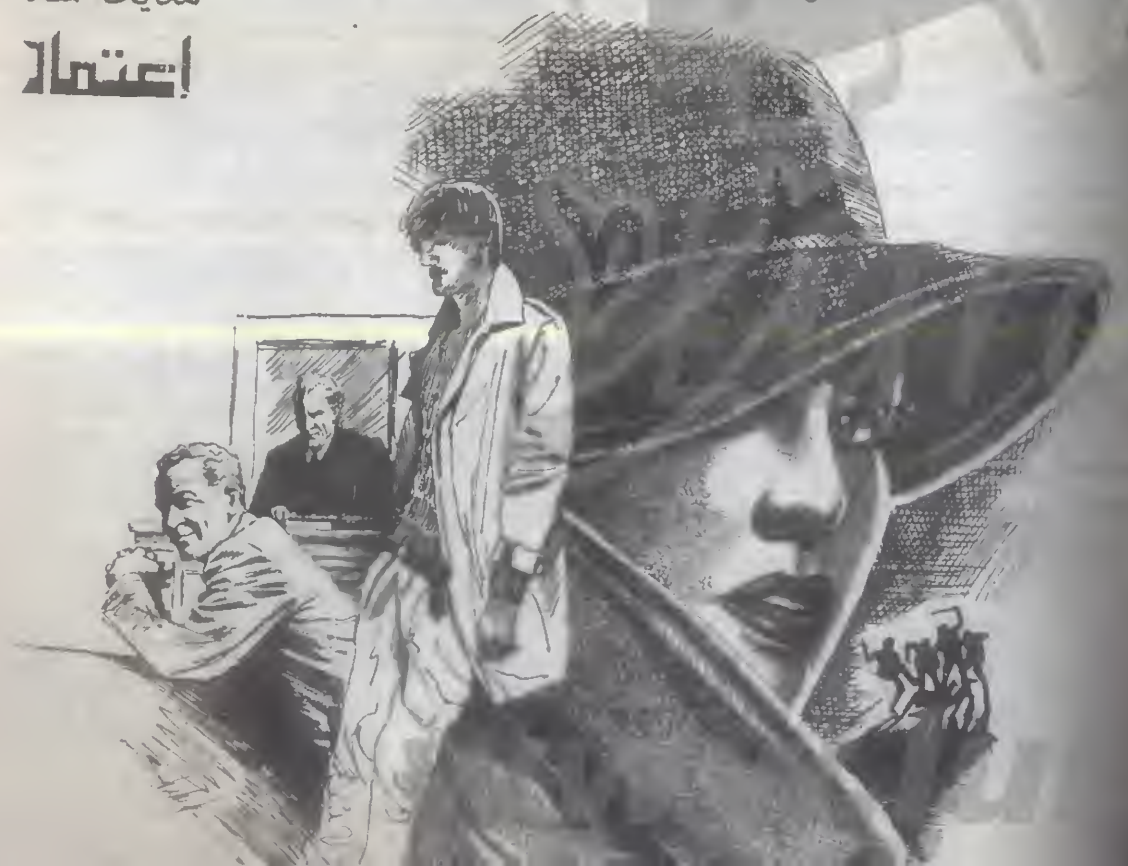

ویسے اس کو اس بات کی خوشی تھی کہ لڑکے نے جھوٹ نہیں بولا۔ ”کیا وہ تمہاری نظر میں اتنی اہم تھی کہ تم نے اس کی خاطر ایک انسان کی جان لینے کی کوشش کی؟“

”سر! اس وقت تو میں لڑکی کے کہنے پر جوش میں آ گیا تھا مگر بعد میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔“ پال نے حسبِ معمول نظریں نیچی کیے کیے جواب دیا۔

”مجھے خوشی ہے کہ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔“ جج نے سنجیدگی سے کہا اور غور سے پال کو دیکھنے لگا۔

”احساس تو ہوا... مگر دیر میں... سر!“ پال نے آہستگی سے کہا۔

جج نارمن سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے اس 16 سالہ لڑکے کو لمبی سزا دی تو معاشرہ ایک ایسے نوجوان سے محروم ہو جائے گا جو ممکن ہے بعد میں معاشرے کے لیے کارآمد ثابت ہو۔ اسے جیل بھیجنے کا مطلب یہ تھا کہ اس کی زندگی برباد ہو جائے گی اور مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس نے خاصی سنگین غلطی کی تھی لیکن اگر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا تو اس کے ساتھ نرم سلوک ہونا چاہیے تھا اور کوئی سخت سزا نہیں ملنی چاہیے تھی۔ جج نارمن اپنے سامنے کھڑے پال کو دیکھے جا رہا تھا جبکہ پال کی نظریں زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک مرتبہ بھی نظر اٹھا کر جج کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کے انداز میں شرمندگی تھی۔ وہ کہیں سے بھی مجرم نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی کیفیت دیکھ کر جج کو اس پر ترس آنے لگا تھا۔

آخر اس نے پال سے کہا۔ ”یہ تمہاری زندگی کی پہلی غلطی ہے۔ تم کوئی پیشہ ور مجرم یا بدمعاش نہیں ہو بلکہ ایک بچے ہو اور ناسمجھی میں یہ حرکت کر بیٹھے ہو۔ میں چاہوں تو تمہیں ایک اصلاحی ادارے میں بھیج سکتا ہوں جہاں تم جیسے کم عمر بچوں کی اصلاح اور تربیت کی جاتی ہے۔ وہ ایک فارم ہے جو شہر سے کافی دور واقع ہے۔ اس کا نام تو اصلاحی ادارہ ہے مگر وہ کسی جیل سے کم نہیں ہے۔ اس اجاڑ اور غیر آباد علاقے میں واقع اس فارم پر تم جیسے بہت سے نوجوان ہیں مگر زیادہ تر ضدی اور ہٹ دھرم ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کی رفاقت تمہیں مزید بگاڑ دے گی۔ تمہیں وہاں بھجوانا ٹھیک نہیں رہے گا۔“ یہ کہہ کر جج نارمن چپ ہو گیا۔ وہ سخت مشکل میں تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکے کے ساتھ کیا کرے... اسے کس قسم کی سزا دے کہ اس کی اصلاح ہو جائے۔

پال بالکل خاموش کھڑا تھا۔ چیمبر میں سناٹا تھا پھر جج نارمن نے کہا۔ ”بہرحال... میں تمہیں اس اصلاحی ادارے میں نہیں بھیجوں گا اور نہ بچوں کی جیل بھیجوں گا۔ مجھے تم اچھے لڑکے لگتے ہو۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ تم پر اعتبار کروں اور تمہیں ایک موقع دے دوں۔ میں تمہیں دو سال کی آزمائشی مدت کے لیے رہا کر رہا ہوں۔ ٹھیک ہے؟“

”کیا... سر؟“ نوجوان پال نے حیرت اور خوشی سے جج کی طرف دیکھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جج نے اسے آزادی کی خبر سنائی ہے۔ اس کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے تھے۔ روتے ہوئے وہ ایک دم آگے بڑھا اور جج کے قدموں میں گر گیا۔

”آپ کا شکریہ سر! آپ کا بے حد شکریہ... سر...!“

جج نارمن خوش بھی تھا اور فکرمند بھی۔ اس نے ایک مشکل فیصلہ کیا تھا اور ایک قسم کا جوا کھیلا تھا۔ پال اسے دھوکا بھی دے سکتا تھا۔

”مگر تمہیں خود کو اس نرمی کا مستحق ثابت کرنا ہوگا۔“ جج نے کہا۔ ”اس دوران کوئی جھگڑا، کوئی لڑائی نہیں ہوگی۔ اگر تم نے ایسی کوئی حرکت کی تو فوراً ہی بغیر کسی رعایت کے جیل پہنچا دیے جاؤ گے۔ امید ہے کہ تم میرے اعتماد پر پورے اترو گے اور میرے اس بھروسے کو نہیں توڑو گے جو میں نے تم پر کیا ہے۔“

☆☆☆

اس رات کھانے کی میز پر جج نارمن اپنی بیوی سیلیا سے باتیں کر رہا تھا۔ ”میرے خیال میں پال کو اس کی غلطی کی سزا مل چکی ہے۔ اس نے غلطی ضرور کی تھی مگر وہ کوئی عادی مجرم نہیں تھا۔“

”اوہ! تو تمہیں وہ لڑکا مجرم ہی نہیں لگا۔“ سیلیا نے ناگواری سے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ایک لڑکا لوہے کے پائپ سے ایک راہ گیر کے سر پر وار کرتا ہے اور تم اسے بھولا اور معصوم قرار دے رہے ہو؟“

”یہ بات نہیں ہے... اصل بات نیت کی ہے...“

نارمن نے کہا تو سیلیا نے غصے سے اس کی بات کاٹ دی اور بولی۔ ”پھر تو تم اس شہر کے سبھی کم عمر لڑکوں کو ایسی حرکتیں کرنے کی کھلی چھٹی دے رہے ہو۔“

جج نے اپنی پُرکشش بیوی کی بات سکون سے سنی اور نرم لہجے میں بولا۔ ”میں نے اسے آزمائشی مدت کے لیے رہا کیا ہے۔ اس دوران اگر اس نے کوئی گڑبڑ کی تو اسے سخت سزا ملے گی۔“

”بہرحال، اس آزمائشی مدت میں وہ اپنا کام دکھا دے گا۔ سزا تو بعد میں ملے گی۔“ سیلیا نے کہا۔

”وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا۔“ جج نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ”میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ معصوم ہے۔“

”کیا تم اس کی ضمانت لے سکتے ہو؟“

”بالکل!“ نارمن نے کہا۔ ”میں نے اس لڑکے کا بغور مشاہدہ کیا ہے اور اسے خوب اچھی طرح سمجھ چکا ہوں۔ تم پال کے معاملے میں، میں دھوکا نہیں کھاؤں گا۔“

”پتا نہیں تم کس طرح کے جج ہو۔“ سیلیا نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تمہیں تو کسی نرسری اسکول میں ٹیچر ہونا چاہیے تھا۔ تم ایک نرم مزاج انسان ہو جبکہ تمہارے پیشے میں جذبات سے عاری درشت مزاج لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔“

سیلیا کی تلخ باتیں سن کر بھی نارمن کو غصہ نہیں آیا۔ وہ ایسا آدمی تھا جسے اپنے اعصاب پر مکمل قابو تھا۔ وہ کسی بھی بات پر آپے سے باہر نہیں ہوتا تھا۔

☆☆☆

ابھی اس واقعے کو پانچ ماہ گزرے تھے کہ اطلاع ملی، پال نے ایک بار پھر قانون شکنی کی ہے۔ اتفاق سے یہ اطلاع سیلیا کو ملی تھی۔ لیفٹیننٹ ہینسن نے اسے فون کر کے بتایا تھا کہ اس نے پال کو گرفتار کر لیا ہے۔ جج نارمن اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ وہ کسی کانفرنس میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا۔ وہ واپس گھر پہنچا تو سیلیا نے دروازے پر ہی اسے یہ خوش خبری سنائی۔ ”تم نے اپنے جس چہیتے کو آزمائشی مدت کے لیے رہا کیا تھا، اس نے تمہارے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔ لیفٹیننٹ ہینسن نے فون کیا تھا۔ اس نے پال کو گرفتار کر لیا ہے۔“

وہ نصف شب کا وقت تھا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ سیلیا کی بات سن کر نارمن رک گیا۔ اس کے چہرے پر تھکن تھی۔ وہ آرام کرنے کے موڈ میں تھا مگر اس خبر نے اسے پریشان کر دیا۔ اس نے سیلیا سے پوچھا۔ ”پال نے کیا کیا ہے؟“

”لیفٹیننٹ ہینسن نے مجھے اس کے جرم کی تفصیل نہیں بتائی۔ صرف تمہارا پوچھا تھا۔ جب میں نے کہا کہ تم گھر پر نہیں ہو تو اس نے مجھے یہ خبر دیتے ہوئے کہا کہ تمہیں بتا دوں۔“

”کہاں ہے پال؟“ نارمن نے واپس دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”کہاں جا رہے ہو تم؟“ سیلیا نے سوال کیا۔

”پال کے پاس... کس پولیس اسٹیشن میں ہے وہ؟“ نارمن نے برہمی سے کہا۔ ”مجھے ابھی جانا ہے اس کے پاس۔“

”تم صبح بھی تو جا سکتے ہو۔“ سیلیا نے پریشانی سے کہا۔

”نہیں... صبح تک بہت دیر ہو جائے گی۔“ نارمن نے کہا۔ ”مجھے ابھی جانا ہوگا۔ آخر پتا تو چلے کہ وہ کون سے پولیس اسٹیشن میں ہے۔“

”وہ گیریسن اسٹریٹ کے پولیس اسٹیشن میں ہے۔“ سیلیا نے کہا۔ ”تم فون کر لو۔“

”نہیں... مجھے خود ہی جانا ہوگا۔“ نارمن نے کہا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

باہر سخت سردی تھی۔ ہوا اس کے جسم کو جیسے کاٹ رہی تھی۔ اس کی کار کا انجن ابھی تک گرم تھا۔ اس نے کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا اور کار کا رخ گیریسن اسٹریٹ پولیس اسٹیشن کی طرف کر دیا۔ راستے بھر وہ پال کے بارے میں سوچتا رہا۔ بہ ظاہر سیدھا سادہ اور معصوم نظر آنے والا پال اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائے گا، یہ خیال ہی اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔ اس نے اس لڑکے کی ضمانت لی تھی اور اسے اپنی ذمے داری پر دو سال کی آزمائشی مدت کے لیے رہا کیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب اگر اس نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی تھی تو وہ اسے کسی حال میں نہیں چھوڑے گا۔

صرف پندرہ منٹ بعد وہ گیریسن پولیس اسٹیشن میں تھا۔ سارجنٹ نے فون پر لیفٹیننٹ ہینسن کو جج نارمن کی آمد کی اطلاع دی تو لیفٹیننٹ بھاگا ہوا اس کے پاس آ گیا اور بولا۔ ”میں نے تو صرف اطلاع دی تھی، آنے کے لیے نہیں کہا تھا۔“ اس کا انداز معذرت خواہانہ تھا۔

”میں خود ہی چلا آیا۔“ جج نارمن نے جواب دیا۔

لیفٹیننٹ، جج کو اپنے ساتھ لے کر کمرے میں آیا اور اسے اپنی کرسی پر بیٹھنے کو کہا مگر جج اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تو لیفٹیننٹ ہینسن اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

”تم نے پال کو دوبارہ گرفتار کر لیا ہے؟“ جج نے پوچھا۔

”ہاں۔ اس نے پہلے والی حرکت کی ہے۔“ ہینسن نے جواب دیا۔ ”ایک آدمی پر حملہ کیا، اسے زدوکوب کیا اور اس کی جمع پونجی چھین لی۔ وہ آدمی بُری طرح زخمی ہے اور اسپتال میں داخل ہے جہاں اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ کام پال کا ہی ہے؟“ جج نے پوچھا۔

”سو فیصد!“ لیفٹیننٹ نے جواب دیا۔

جج نارمن کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جب ہر چیز ہی اس لڑکے کے خلاف ہے تو اس سے ملنے یا سوال کرنے کا کیا فائدہ؟ سیلیا نے ٹھیک ہی کہا تھا، اس لڑکے کو سمجھنے میں وہ غلطی کر گیا تھا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ کم از کم پوری بات تو معلوم کرے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ اس نے پال کو سمجھنے میں غلطی کی ہو۔

”لیفٹیننٹ! مجھے پوری بات بتاؤ۔“ نارمن نے کہا۔

”یہ واقعہ ڈیرنگ اسٹریٹ پر پیش آیا ہے۔“ لیفٹیننٹ ہینسن نے کہا۔ ”چارلس میز نام کا ایک شخص وہاں سے گزر رہا تھا کہ ایک نوجوان لڑکے اور ایک نوجوان لڑکی نے اس پر چھلانگ لگائی۔ لڑکی ہائی اسکول کی طالبات کی عمر کی تھی۔ لڑکے نے پیچھے سے چارلس کے سر پر کچھ مارا۔ وہ شاید خالی

بوتل تھی مگر چونکہ چارلس ہیٹ پہنے ہوئے تھا، اس لیے اس کے زیادہ چوٹ نہیں آئی مگر وہ سڑک پر گر گیا اور ان دونوں نے پل بھر میں اس کی جیبیں صاف کر دیں۔ بے چارہ چارلس غریب آدمی ہے۔ ایک بیکری میں ملازم ہے۔ شاید قدرت کو اس پر رحم آگیا تھا کیونکہ عین موقع پر ہمارا گشتی سپاہی جوڈیم وہاں پہنچ گیا۔ اس نے دور سے یہ تماشا دیکھا تو چیخ کر ان دونوں کو للکارا۔ پھر وہ ان کی طرف دوڑا۔ لڑکے اور لڑکی نے جوڈیم کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اپنے شکار کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جوڈیم نے ہوائی فائر کیے تو لڑکی ڈر کر رک گئی مگر لڑکا بھاگتا رہا۔ جوڈیم نے لڑکی کو گرفتار کرلیا اور فوراً مجھے فون کر دیا۔ اس لڑکی کا نام لنڈا ہے۔ اسی نے مجھے بتایا کہ اس کے مفرور ساتھی کا نام پال ہے۔ ہم نے پال کے گھر گاڑی بھیجی تو وہ وہاں نہیں ملا۔ وہ ڈیئرنگ اسٹریٹ سے دو میل دور رہتا ہے۔ بہرحال، وہ گیارہ بج کر پینتیس منٹ پر اپنے گھر پہنچا تو بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کی کیفیت بتا رہی تھی جیسے وہ کہیں سے دوڑتا ہوا آرہا ہے۔ ہم نے اسے حراست میں لے لیا۔ اس وقت وہ اور لنڈا دونوں لاک اپ میں ہیں۔'' یہ کہہ کر لیفٹیننٹ خاموش ہوگیا۔

''کیا پال نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہے؟'' جج نے پوچھا۔

''نہیں... وہ اس سے مسلسل انکار کررہا ہے۔'' ہینسن نے کہا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ وہ گیارہ بجے تک لنڈا اور دوسرے چھ سات لڑکوں کے ساتھ تھا۔ جب ان لوگوں نے کسی راہ گیر کو لوٹنے کی باتیں شروع کیں تو وہ ان سے الگ ہوگیا۔ ان لوگوں نے اس کے اس طرح واپس جانے پر اس پر آوازے بھی کسے تھے مگر اس نے کوئی پروا نہیں کی کیونکہ وہ ماضی کی غلطی دہرانا نہیں چاہتا تھا۔''

''یہ کس جگہ کی بات ہے؟'' جج نے سوال کیا۔

''ڈیئرنگ اسٹریٹ کے آس پاس کی۔'' لیفٹیننٹ نے کہا۔ ''یہ بات پال نے تسلیم کرلی ہے۔''

''دوسرے لڑکوں کے بارے میں معلوم کیا؟ وہ کون تھے؟'' جج نارمن نے سوال کیا۔

''لنڈا کا کہنا ہے کہ اس کے ساتھ پال کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔'' لیفٹیننٹ نے کہا۔ ''پال نے یہ مان لیا ہے کہ لنڈا اس کی گرل فرینڈ تھی مگر وہ دوسرے لڑکوں کے نام نہیں بتا رہا۔ اس کا کہنا ہے کہ چونکہ وہ واپس چل دیا تھا، اس لیے کہہ نہیں سکتا کہ جس وقت یہ واردات ہوئی تو کون سا لڑکا لنڈا کے ساتھ تھا۔ وہ خوامخواہ کسی پر الزام نہیں لگانا چاہتا۔''

''تم نے اس شخص چارلس میز سے پوچھا کہ اس پر کس نے حملہ کیا تھا؟'' جج نے پوچھا۔

''اس پر پیچھے سے وار ہوا تھا اس لیے وہ اپنے حملہ آور لڑکے کو نہیں دیکھ سکا۔ مگر اس نے لنڈا کو دیکھ لیا تھا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے لنڈا کی بات پر سو فیصد اعتبار کرلیا ہے؟'' نارمن نے کہا۔

''یقین کرنا ہی ہوگا۔'' ہینسن نے کہا۔ ''پہلی بات یہ ہے کہ واردات سے پہلے پال وہاں موجود تھا اور دوسرے اس کا سابقہ ریکارڈ۔''

جج نارمن سوچ میں پڑ گیا۔ تمام شہادتیں پال کے خلاف تھیں اور اس کا مجرم ہونا واضح نظر آرہا تھا۔ مگر پال اپنا جرم تسلیم کیوں نہیں کر رہا تھا؟ اس سے پہلے جب وہ پکڑا گیا تھا تو اس نے فوراً ہی اعتراف جرم کرلیا تھا۔ لیکن اس بار... ممکن ہے، اس نے سوچا ہو کہ اگر اس بار بھی اس نے پہلے والی غلطی کی تو پھنس جائے گا۔

جج نارمن سوچتا رہا مگر اس کا دل کہہ رہا تھا کہ پال نے کوئی جرم نہیں کیا۔ وہ بے گناہ ہے۔ اسے خوامخواہ اس کیس میں پھنسایا جا رہا ہے۔

''میں ان دونوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا یہ ممکن ہوگا؟'' جج نارمن نے ہینسن سے پوچھا تو اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''ٹھیک ہے... پہلے اس لڑکی کو بلواؤ۔'' جج نے کہا اور لیفٹیننٹ نے انٹرکام پر سارجنٹ کو ہدایت دی کہ وہ لنڈا کو لے آئے۔ چند منٹ بعد ہی وہ لیفٹیننٹ کے کمرے میں تھی۔

جج نارمن نے اس کا جائزہ لیا۔ وہ دوسری آوارہ گرد لڑکیوں کی طرح تھی۔ ایسی لڑکیاں پہلے بھی جج کے سامنے پیش کی جاچکی تھیں۔ لنڈا کے جسم پر چست مگر سستا سا لباس تھا جس میں اس کا جسم نمایاں ہو رہا تھا۔ اس کے انداز کو دیکھ کر نارمن نے دل ہی دل میں تاسف محسوس کیا۔ وہ بڑی بے باکی سے کھڑی تھی۔ کبھی وہ جج کی طرف دیکھ رہی تھی اور کبھی لیفٹیننٹ ہینسن کی طرف! لڑکی اچھی خاصی پرکشش تھی۔ جج دل میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر وہ آوارہ گرد نہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا!

''آج شام ڈیئرنگ اسٹریٹ پر تم پال کے ساتھ تھیں؟'' جج نارمن نے اپنا تعارف کرائے بغیر سوال کیا تو لڑکی نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''تم دونوں نے چارلس میز نامی شخص پر حملہ کیا اور اسے لوٹا تھا... کیا یہ سچ ہے؟'' جج نے دوسرا سوال کیا۔

''میں نے اس پر حملہ نہیں کیا تھا۔ یہ کام تو پال نے کیا تھا۔'' لنڈا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں؟ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟'' نارمن نے سوال کیا۔

''ہمیں رقم کی ضرورت تھی۔'' لنڈا نے بے دھڑک کہا۔

''تم تو پال کی گرل فرینڈ ہو۔'' جج نے کہا۔ ''پھر تم نے اس کے بارے میں پولیس کو کیوں بتایا؟''

یہ سن کر وہ ایک لمحے کو پریشان نظر آئی مگر پھر اس نے خود کو سنبھال لیا اور بولی۔ ''دراصل پولیس نے مجھ پر سختی کی تھی اس لیے میں نے اس کا نام لے دیا ورنہ...''

یہ بات سن کر لیفٹیننٹ کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔

''کیا اس گشتی پولیس والے سپاہی جوڈیم نے سڑک پر اس لڑکی پر سختی کی تھی؟'' جج نارمن نے ہینسن سے پوچھا۔ ''کیا اس نے وہیں اس سے اگلوا لیا تھا کہ اس کا بھاگنے والا ساتھی کون تھا؟''

''وہ... اس لڑکی نے ہی جوڈیم کو بتایا تھا کہ اس کا بھاگنے والا ساتھی پال تھا۔'' ہینسن نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔'' جج نے کہا۔ ''اس پر کسی نے سختی نہیں کی بلکہ اس نے اپنی مرضی سے ہی پال کا نام بتایا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے جج نے مڑ کر لنڈا سے سوال کیا۔ ''تم یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے بوائے فرینڈ کا نام پولیس والے کو کیوں بتایا تھا؟''

تھوڑی دیر تک لنڈا خاموشی سے جج نارمن کو گھورتی رہی، آخر اس نے کہا۔ ''دراصل مجھے اس پر غصہ تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ میں اس مشکل میں پھنس گئی تھی اور وہ نکل گیا تھا۔''

''اب تو ٹھیک ہے نا؟'' لیفٹیننٹ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس نے آپ کے سامنے بتا دیا ہے کہ بھاگنے والا لڑکا کوئی اور نہیں بلکہ پال ہی تھا۔''

''ٹھیک ہے، تم جاؤ لڑکی!'' جج نے سر ہلایا تو لیفٹیننٹ کی ہدایت پر سارجنٹ لنڈا کو لے گیا اور پال کو لے آیا۔ پال کمرے کے اندر آکر مجرم کی طرح سر جھکا کر کھڑا ہوگیا۔ وہ جج نارمن کو دیکھ چکا تھا۔ جج کی موجودگی نے اسے ہراساں کر دیا تھا۔

''پال!'' جج نے اس سے پوچھا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ تم نے چارلس میز نامی کسی شخص کو مارا پیٹا اور اس کو لوٹا؟''

''ہر آدمی یہی کہہ رہا ہے۔'' پال نے تلخی سے جواب دیا۔ ''مگر سچ یہ ہے کہ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''تمہاری گرل فرینڈ کا کہنا ہے کہ یہ کام تم نے کیا ہے۔'' جج نے کہا۔ ''تمہارا پولیس ریکارڈ بھی تمہارے خلاف جا رہا ہے۔''

''سر! اگر میں پہلے مجرم تھا تو اب بھی ہوں... پہلے بھی میں نے کسی کو لوٹنے اور مارنے کی کوشش کی تھی تو اب بھی کی ہے۔ اگر آپ لوگوں کو اس کا یقین ہو ہی گیا ہے تو سوال جواب کا فائدہ؟'' پال نے ناگواری سے کہا تو جج حیرت سے اسے تکنے لگا۔

''سنو لڑکے! پولیس کی تفتیش ایسے ہی ہوتی ہے۔'' جج نے ناگواری سے کہا۔ ''جو پوچھا جائے اس کا جواب دو۔''

''ٹھیک ہے۔'' پال نے آہستگی سے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح تمہیں معصوم اور بے گناہ ثابت کردوں۔'' جج نے نرمی سے کہا۔ ''اس کے لیے تمہیں میرے ساتھ تعاون کرنا چاہیے۔''

جج نارمن کی بات سن کر پال گویا شرمندہ ہوگیا۔

''اس کے پاس سے لوٹی ہوئی رقم برآمد ہوئی؟'' جج نے لیفٹیننٹ سے سوال کیا۔

''نہیں۔ چارلس میز کا کہنا ہے کہ اس کی جیب میں ڈھائی سو ڈالرز تھے مگر پال کے پاس سے صرف ایک ڈالر نکلا ہے۔'' ہینسن نے کہا۔ ''ممکن ہے، اس نے رقم راستے میں کہیں پھینک دی ہو۔''

''پال! تمہاری اپنے ساتھیوں سے تکرار ہوئی تھی۔'' جج نارمن نے کہا۔ ''اس کے بعد تم ان لوگوں سے الگ ہوگئے تھے۔ مجھے اس بارے میں بتاؤ۔''

''وہ کسی کو لوٹنے کا پروگرام بنا رہے تھے... اس لیے میں ان سے الگ ہوگیا اور اپنے گھر چلا گیا۔'' پال نے کہا۔

''بحث و تکرار کیوں ہوئی تھی؟'' جج نے سوال کیا۔

''انہوں نے مجھے بزدل کہا تھا۔'' پال نے جواب دیا۔

''اور لنڈا نے کیا کہا تھا؟'' جج نارمن نے پوچھا۔

''اس نے کہا تھا کہ اگر میں کنگلا ہوگیا ہوں تو میرا اور اس کا ساتھ نہیں چلے گا۔ اس نے مجھ سے علیحدہ ہوکر کسی اور کی گرل فرینڈ بننے کی دھمکی دی تھی۔ اس نے مجھ پر زور دیا تھا کہ میں چوری کردوں یا ڈاکا ڈالوں... اس کو رقم لاکر دوں۔''

جج نے لیفٹیننٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب ہمیں وقت پر غور کرنا ہوگا۔ ڈکیتی کی واردات سوا گیارہ بجے ہوئی تھی جبکہ تم نے پال کو گیارہ بج کر پینتیس منٹ پر گرفتار کیا ہے۔ پال کے گھر اور ڈکیتی کے مقام کے درمیان دو میل کا فاصلہ ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ صرف بیس منٹ میں پال دو میل کا سفر طے کرلے؟''

''جب وہ اپنے گھر پہنچا تو بری طرح ہانپ رہا تھا۔'' لیفٹیننٹ نے اطمینان سے کہا۔

''کیا تم نے اسے خود دیکھا تھا؟'' جج نے سوال کیا۔ یہ سن کر ہینسن نفی میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کے انداز میں بے چارگی تھی۔

جج نے پال کی طرف گھوم کر کہا۔ ''تم نے پولیس کو بتایا ہے کہ تم اپنے گروپ سے گیارہ بجے علیحدہ ہوئے تھے۔ کیا یہ صحیح ہے؟''

''ہاں... کیونکہ جب میں واپس چلا تھا تو میں نے ٹاور کلاک کی طرف دیکھا تھا۔ اس میں گیارہ بج چکے تھے۔''

''تم اپنے گھر آرام سے گئے تھے یا بھاگتے ہوئے؟''

''آرام سے گیا تھا مگر اتنا آرام سے بھی نہیں... ذرا تیز قدموں سے گیا تھا۔ ممکن ہے، اسی وجہ سے میرا سانس پھول گیا ہو۔ میں مے روز بلیوارڈ سے گیا تھا۔ راستے میں مجھے آوارہ گردوں کی ایک کار بھی ملی تھی۔ وہ لوگ اندھا دھند ڈرائیونگ کر رہے تھے۔ میں ان سے بچنے کے لیے دوسری طرف بھاگا تو سامنے سے آنے والی ایک کار سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ قسمت اچھی تھی جو بچ گیا۔ ورنہ میرا تو کام تمام ہو گیا تھا۔'' پال نے تفصیل سے جواب دیا۔

''آوارہ گردوں کی وہ کار تمہیں مے روز بلیوارڈ پر کس جگہ ملی تھی؟'' جج نے پوچھا۔

''اسٹریٹ نمبر 33 کے قریب...'' پال نے کہا۔ ''وہ لوگ رانگ سائیڈ جا رہے تھے اور کافی دور تک ایسے ہی گئے تھے۔''

''تم نے اس گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا؟'' جج نے پوچھا۔

''نہیں۔'' پال نے جواب دیا۔

''یہ کب کی بات ہے... میرا مطلب ہے، کتنے بجے کی؟'' اس بار سوال لیفٹیننٹ ہینسن نے کیا تھا۔

''میں اپنے گھر کا آدھا راستہ طے کر چکا تھا۔'' پال نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ گیارہ بج کر بیس منٹ ہوئے ہوں گے۔''

''لیفٹیننٹ! تم میرے ساتھ آؤ۔'' جج نارمن نے کہا تو ہینسن اٹھ کر اس کے پاس گیا اور جج اسے کمرے سے باہر لے گیا۔ لیفٹیننٹ پریشانی کے عالم میں اپنے کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''وہ کہیں نہیں جائے گا... تم فکر مت کرو۔'' جج نارمن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''آج رات میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے گیا تھا اور جب واپس آ رہا تھا تو مے روز بلیوارڈ پر اسٹریٹ نمبر 33 کے قریب ایک نوجوان اچانک میری کار کے سامنے آ گیا۔ وہ تو میں نے بروقت بریک لگا دیے ورنہ نوجوان میری کار کے نیچے آ جاتا۔ میری طرف کی سڑک پر ایک کار رانگ سائیڈ آ رہی تھی جس میں اوباش نوجوان سوار تھے۔ میں نے ان کی کار کا نمبر دیکھنے کی کوشش کی مگر کار پل بھر میں میرے سامنے سے گزر گئی۔ میں نے اس کار کا پیچھا بھی کیا مگر اسے نہیں پا سکا۔ واپس آیا تو نوجوان بھی جا چکا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں... یہی لڑکا پال تھا۔'' یہ کہہ کر جج نارمن نے مسکراتی نظروں سے ہینسن کی طرف دیکھا۔

''اور یہ کتنے بجے کا واقعہ ہے؟'' لیفٹیننٹ نے سوال کیا۔

''گیارہ بج کر بیس منٹ کا۔'' جج نے جواب دیا۔ ''کیونکہ میں نے کار کے تعاقب میں ہار ماننے کے بعد اپنی گھڑی دیکھی تھی۔''

لیفٹیننٹ ہینسن کچھ دیر سوچتا رہا پھر وہ راہ داری کی طرف بڑھ گیا۔ جج واپس کمرے میں چلا آیا جہاں پال اس کا منتظر تھا۔ نارمن نے جب یہ کہانی پال کو سنائی تو وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں... یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ جج ہیں... لوگوں کو انصاف فراہم کرتے ہیں... اگر انصاف دینے والے ہی جھوٹ بولنے لگے تو کیا ہوگا؟ آپ میری ہمدردی میں جھوٹ نہ بولیں۔''

''میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔'' جج نارمن نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے جو بھی کہا ہے، سچ ہے۔''

کچھ دیر بعد لیفٹیننٹ ہینسن کمرے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر اطمینان تھا۔ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے کہا۔ ''لنڈا نے اپنا بیان بدل دیا ہے۔ جیسے ہی میں نے اسے بتایا کہ مجھے پال کی بے گناہی کی شہادت مل گئی ہے تو وہ اپنے سابقہ بیان سے پھر گئی۔ اس نے اب جو بیان دیا ہے، اس کے مطابق پال بالکل بے گناہ ہے۔ وہ جائے واردات پر موجود ہی نہیں تھا۔''

''کیا تم اس کے بیان سے متفق ہو؟'' جج نے سوال کیا۔

''ہاں... اور اس کے بیان نے پال کو بے گناہ قرار دلوا دیا ہے۔'' لیفٹیننٹ نے کہا۔ ''لنڈا نے اپنے اس ساتھی کا نام بتا دیا ہے جو اس موقع پر اس کے ساتھ تھا اور جس نے پارکس میز پر حملہ کیا تھا۔ میں نے اس لڑکے کو لانے کے لیے گاڑی بھجوا دی ہے۔''

جج نارمن نے مسکرا کر پال کی طرف دیکھا تو وہ بالکل اسی انداز میں اس کے قدموں میں گر گیا جس طرح کچھ عرصہ پہلے اس کے چیمبر میں گرا تھا۔ نارمن نے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ آخر کار اس نے اپنی بیوی سیلیا کے خیال کو غلط ثابت کر دیا تھا اور اسے اس پر فخر تھا کہ نوجوان پال نے اس کے اعتماد کو دھوکا نہیں دیا تھا۔

خطیر رقم جیت کر جوئے خانے سے نکلنے والے جواری کا قصہ۔ اس کی زندگی داؤ پر لگ چکی تھی اور اسے بہت سنبھل کر چال چلنی تھی۔ صحیح یا غلط، بالآخر وہ آخری داؤ لگا بیٹھا!

سادگی

شکیل ادریس

ہیری برنس جب تھری اسٹار کلب کا شیشے کا دروازہ کھول کر اندر گیا تو اسے وہاں کا ماحول مصنوعی معلوم ہوا۔ ہر چند کہ وہاں رنگ برنگی روشنیاں، چمکتا فرش اور صاف ستھری وردی والی ویٹرس تھیں، لیکن ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کی حرکات و سکنات مشینی ہوں۔

اس احساس کے ساتھ اسے ایک احساس اور بھی تھا کہ آج قسمت کی دیوی اس پر ضرور مہربان ہوگی اور وہ ڈھیروں رقم جیت کر جائے گا۔

کلب کے ریکریشن کے آگے کیسینو تھا جہاں جوئے کی بہت سی مشینیں لگی تھیں۔ فرش پر دبیز اور قیمتی قالین تھا اور دیوار کے قریب قیمتی صوفے پڑے تھے۔

وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ کشادہ راہ داری میں بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ فضا میں مسحور کن خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں

اور قہقہے مچل رہے تھے۔

پہلی بار جب وہ کمپنی کے کاروباری دورے پر اس شہر میں آیا تھا تو تھری اسٹار کلب کی شہرت سن کر وہاں آ گیا تھا۔ اناڑی لوگوں کی طرح اس نے الٹے سیدھے داؤ لگائے تو اتفاق سے سب ہی داؤ ٹھیک لگ گئے۔ یوں اس نے بارہ سو ڈالرز جیت لیے اور وہاں سے سینہ پُھلا کر رخصت ہو گیا۔

اس کی بیوی اور بچے بہت خوش ہوئے۔ اس کی بیوی نے تو تفریح کرنے کا ایک پروگرام بھی ترتیب دے ڈالا... مگر ہیری نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ جب وہ دوبارہ اس کلب سے رقم جیتے گا تب وہ کسی دوسرے شہر جانے کا پروگرام بنائیں گے۔

ہیری نے اپنے سر کو جھٹکا اور نزدیکی رولٹ مشین کی طرف چلا گیا۔ سب سے پہلے اس نے کریپ ٹیبل پر داؤ لگایا مگر وہ چھوٹی چھوٹی رقوم ہارتا چلا گیا۔ تاہم وہ حوصلہ نہیں ہارا اور مسلسل رقوم لگاتا رہا۔ آخرکار اس کا داؤ لگ گیا اور وہ جیت گیا۔ ہار کی رقم اور کچھ اضافی رقم اس کی جیب میں آ گئی۔ ہیری کا دل بڑھ گیا۔

اس نے دوسری میز کی طرف رخ کیا اور وہاں کھیلنے لگا۔ وہاں جیتنے کے امکانات کم تھے اس لیے اِکّا دُکّا لوگ کھڑے تھے۔ ان کے انداز میں بے دلی سی تھی۔

ہیری نے جوا کھلانے والے کو ہزار ڈالر کا نوٹ دے کر سفید، نیلی، پیلی اور کالی چپس خرید لیں۔ وہ پچاس اور سو ڈالر والی چپس تھیں۔

دل کش آنکھوں اور چھریرے جسم والی ایک حسینہ اس کے قریب آ کر بولی۔ ''جناب! آپ کیا پینا پسند فرمائیں گے؟''

''بربن!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

اسے معلوم تھا کہ جو لوگ سو ڈالر والی چپس لے کر کھیلتے ہیں، کلب کی انتظامیہ انہیں شراب ضرور پلاتی ہے تاکہ ان کے ہوش و حواس قائم نہ رہ سکیں۔ بہرحال، ایک پیگ پینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

پیگ پی کر اس کا دماغ گرم ہو گیا۔ وہ رولٹ مشین کی طرف چلا گیا جہاں ایک ننھی سی فولادی گولی پہیے پر کھنکھناتی ہوئی اچھل رہی تھی۔

پانسا پھینکے جانے سے پہلے اس نے داؤ لگایا۔ قسمت اس کا ساتھ دے رہی تھی اور وہ جیت گیا۔ اس کے آگے چپس کا ڈھیر سا بن گیا۔

اس کا خیال صحیح ثابت ہوا اور وہ داؤ پہ داؤ جیتتا چلا گیا۔ سب اس کی طرف رشک سے دیکھ رہے تھے۔ کلب کی کئی لڑکیوں نے لگاوٹ کا اظہار کر کے اس کے قریب ... لیکن اس نے ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

جب وہ اپنے سامنے پڑے ڈھیر... سرخ و سفید... پیلی چپس لے کر کیشیر کے پاس گیا تو اس نے حساب ... باون ہزار ڈالر کے نوٹ اس کے سامنے رکھ دیے ... بڑی مالیت کے نوٹ تھے اس لیے اس کی جیبیں بھر گئیں ... لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کلب سے باہر آ گیا۔

کلب کے سامنے ایک ٹیکسی کھڑی تھی اور ڈرائیور نے دروازہ کھول رکھا تھا۔ ''آیئے جناب! ائرپورٹ تک چلیے گا!''

ہیری اس کی مستعدی پر خوش ہوا اور جھٹ سے اندر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی چل پڑی تو ہیری کو احساس ہوا کہ وہ تنہا نہیں ہے۔ ٹیکسی کی پچھلی نشست پر پہلے سے ایک شخص بیٹھا ہوا ہے۔ جب ٹیکسی چھ رویہ سڑک پر پہنچ گئی تو اس کے پہلو میں بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ ''اگر تم طیارے میں سوار ہونے سے پہلے زندہ رہنا چاہتے ہو تو تمہیں اس کی قیمت ادا کرنا پڑے گی لڑکے۔''

ہیری اپنی جگہ پر سمٹ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جب قسمت کی دیوی اس پر اتنی مہربان ہو ... اسے اتنی پیچیدگی اور الجھن کا سامنا کرنا پڑے گا۔

''میں نے کلب میں تمہیں رولٹ مشین پر کھیلتے دیکھا ہے۔'' وہ آدمی اس کا ہاتھ تھام کر کہنے لگا۔ ''تم نے سارا بازیاں جیت لی ہیں۔ کسی کو اپنے سامنے ٹھہرنے نہیں دیا ... اس وقت تمہاری جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی ہیں۔ یہ میرے حوالے کر دو۔ تمہاری قسمت آج زوروں پر ہے۔ کلب میں جا کر داؤ لگانا اور اس سے زیادہ رقم جیت لینا۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو اور میرا بازو چھوڑ دو۔'' ہیری نے کہا۔ اس آدمی نے اس کا ہاتھ موڑا ہوا تھا اس لیے ... تکلیف محسوس کر رہا تھا۔ اس نے بے چارگی سے اگلی نشست پر بیٹھے ہوئے ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے دانت نکا... استہزائیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔

ہیری کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کی طرف سے مدد کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ ڈرائیور اس شخص سے ملا ہوا ہے۔

''میں اپنا کام دو طریقوں سے کروں گا۔'' اس شخص نے کہا جو بھاری تن و توش رکھتا تھا اور ہیری سے قامت ... ہوا تھا۔ ''پہلا طریقہ یہ ہے کہ میں رقم لے کر تمہیں ائر... سے دو بلاک کے فاصلے پر اتار دوں گا۔ دوسرا یہ کہ تم مز... کرو گے تو میں رقم تم سے چھین لوں گا اور تم کسی رگیٹر ... پڑے ہو گے... مردہ!''

... اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا۔

... ہو؟ زندہ یا مُردہ؟''

... خوف طاری تھا مگر اس کا خوف بہ تدریج کم ... جگہ غصے نے لے لی تھی۔ اس نے سوچا، یہ ... تعمیر کر سکتی ہے۔ وہ اپنا کوئی مناسب ... ہے۔ اپنی کمپنی کا وہ خود باس ہو گا۔ چنانچہ وہ ... ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتا۔

... ہے... تم رقم لے لو۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔''

... اس جملے پر ہنسنے جیسے آدمی نے اس کے شانے پر ... ڈھیلی کر دی۔ ہیری کو سکون محسوس ہوا اور وہ ... مزید سرک گیا۔ پھر اس نے اپنا بایاں ہاتھ پتلون ... میں ڈال کر دو نوٹ اور اپنا لائٹر نکالا۔

... کا اسکریو آگے تک گھما کر وہ شعلے کو لمبا کر لیتا ... اس کا مشغلہ تھا۔ وہ اپنے دوستوں کے سامنے لائٹر ... شعلے سے انہیں ڈرا دیتا تھا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ ... تکلیف پہنچ جائے۔'' اس نے کہا پھر نوٹ نکال کر ... بڑھائے۔

... شخص نے اپنے ہاتھ بڑھائے، ہیری اپنا ہاتھ ... کے نیچے لے گیا اور اس نے لائٹر جلا دیا۔

... خدایا! یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' وہ اضطراری طور پر ... اس نے اپنے ہاتھ ٹھوڑی کی طرف بڑھائے تو وہ شعلے ... جل گئے۔ تنومند شخص بلبلانے لگا۔

... نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگا دی۔ ... کنارے گرا پھر لڑھکتا چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ ... سامنے بنے ہوئے مکانات کی طرف دوڑ لگا دی۔ دو ... کے درمیان تنگ سی گلی تھی۔ وہ اس میں داخل ہو گیا۔ ... پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ پلٹ کر دیکھ سکتا۔ ... زدہ تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور اور وہ دیو قامت شخص ... تعاقب کر رہے ہوں، اس لیے وہ جان لگا کر بھاگتا رہا۔ ... تھوڑی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ اس کا پیچھا نہیں کیا ... تو وہ رک گیا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔

... ایک عمارت کے چبوترے پر بیٹھ کر گہرے گہرے ... پندرہ منٹ بعد وہ اٹھا اور مختلف گلیوں کے چکر ... بعد پھر سڑک پر آ گیا۔ وہاں سے ٹیکسیوں کے ... پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

... وہ دیکھ بھال کر ایک ٹیکسی میں بیٹھ گیا جس کا ... معقول لگتا تھا۔

... کر کے ائرپورٹ چلو۔'' وہ بولا۔

اندازہ

ایک امریکی جوڑا سیاحت کی غرض سے میکسیکو گیا۔ واپسی سے پہلے وہ یادگار چیزیں خریدنے گئے۔ بیوی کو چاندی کے وہ کپ نظر آ گئے جو وہ کافی عرصے سے خریدنے کی خواہش مند تھی۔ قیمت پوچھی تو اندازے سے دگنی تھی۔ چنانچہ وہ بولی۔ ''کیوں؟ یہ کپ مجھے آدھی قیمت میں اپنے وطن میں مل جائیں گے۔''

''آہ سینورا!'' دکاندار نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ظاہر ہے آپ اتنی دور سے مجھے صرف یہ بتانے تو نہیں آئی ہوں گی۔''

(محمد اکرم، رحیم یار خان)

''ابھی چلتا ہوں جناب! آج آپ جوئے میں جیتے؟''

وہ جوئے خانوں اور شراب خانوں کا شہر تھا، اس لیے اگر ٹیکسی ڈرائیور نے ایسا سوال کر دیا تھا تو یہ کوئی تشویشناک بات نہیں تھی۔ اس کے ملائم رویے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ حیوان نہیں، انسان ہے۔

''نہیں۔ آج میں کچھ نہیں جیت سکا... لیکن اتنا ہارا بھی نہیں کہ میری آئندہ نسلیں مقروض پیدا ہوں۔'' وہ بولا۔

اپنے بارے میں وہ کوئی ایسی اطلاع نہیں دینا چاہتا تھا کہ باون ہزار ڈالر اس کی جیب میں ہیں۔

''چلو، اچھا ہوا تم برابر پر چھوٹ گئے۔'' ڈرائیور نے قہقہہ لگا کر کہا۔ ''ورنہ یہاں جیسے ہی کوئی شخص جیت جاتا ہے، شہر کے سارے بدمعاش اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں اور جیتنے والے کا حلیہ مشتہر کر دیا جاتا ہے۔''

ہیری پچھلی نشست پر سنبھل کر بیٹھ گیا تو ڈرائیور نے ٹیکسی چلا دی۔ پھر وہ ایسے بہت سے قصے سنانے لگا جس میں جواری جیتنے کے بعد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔

''اے لڑکے! کیا تم سو گئے؟'' ڈرائیور نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ''ہم ائرپورٹ پہنچنے والے ہیں۔''

''اوہ... ہاں۔ یونہی اونگھ سی آ گئی تھی۔'' ہیری نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ آنکھیں جب کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اسے ائرپورٹ کا لاؤنج دکھائی دیا جہاں مناسب روشنی ہو رہی تھی اور لوگ آ جا رہے تھے۔

پھر وہ آدمی بھی دکھائی دیے جنہوں نے تھوڑی دیر پہلے اسے لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ ان میں سے بھاری قامت والے شخص نے اپنی ٹھوڑی کو رومال سے دبا رکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اسی کے انتظار میں ہوں۔

ہیری چونکہ دروازہ کھول کر اتر چکا تھا اس لیے ان لوگوں کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ ان کے درمیان شیشے کا ایک بڑا دروازہ حائل تھا۔ وہ دونوں اس دروازے کی طرف بھاگنے لگے۔

ہیری سراسیمہ ہو گیا۔ وہ پلٹ کر پھر اسی ٹیکسی کی طرف دوڑا جس سے اترا تھا۔ اس کی پچھلی نشست پر بیٹھنے کے بعد نہ جانے کیوں اسے یہ احساس ہوا کہ جیسے وہ ان لوگوں سے محفوظ ہو گیا ہو۔

"یہاں سے جلدی نکل چلو۔" اس نے ہیجان زدہ لہجے میں کہا۔

"اب کہاں جانا چاہتے ہو لڑکے؟" ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔

"بس کہیں بھی چلو... یہاں سے نکل چلو۔ شہر کے کاروباری علاقے کی طرف چلو۔" وہ اضطراب سے بولا۔

ڈرائیور چونکہ صورتِ حال سے واقف نہیں تھا، اس لیے اس کا ہر اقدام سست روی پر مشتمل تھا۔ تاہم جب اس کی ٹیکسی پارکنگ لاٹ سے نکل رہی تھی تب وہ دونوں لٹیرے دوڑتے ہوئے وہاں تک پہنچے تھے۔ ہیری یہ دیکھنے سے قاصر رہا تھا کہ وہ اس کا تعاقب کر رہے ہیں یا وہیں رک گئے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ٹیکسی مرکزی سڑک پر پہنچ گئی اور عقب نما آئینے میں ہیری کو بہت سی کاروں کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر دونوں لٹیرے اس کے پیچھے آ رہے ہیں تو ان میں سے کون سی کار ان کی ہو سکتی ہے؟

"دیکھو لڑکے! میں ایسے چکروں میں اپنی گردن نہیں پھنساتا۔" ڈرائیور نے گردن گھما کر سراسیمہ ہیری سے کہا۔ "ویسے اگر تم کسی مصیبت میں ہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے صورتِ حال کا علم ہونا چاہیے۔"

اس کے ہمدردانہ رویے سے ہیری ذہنی اور دلی طور پر اس کے قریب ہو گیا۔ لہٰذا اس نے بلا کم و کاست سارا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا۔ یعنی طیارے سے اترنا، کلب جانا، وہاں جیتنا اور لٹیروں کا پیچھا کرنا وغیرہ۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ اس وقت اس کے پاس باون ہزار ڈالرز ہیں۔

"میرا خیال ہے، بہتر ہو گا کہ تم مجھے پولیس اسٹیشن پر لے جا کر اتار دو۔ میں وہیں محفوظ رہ سکوں گا۔"

"اس معاملے میں تم یقین سے یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو، لڑکے؟" ڈرائیور نے رسان سے کہا۔ "تمہیں معلوم نہیں ہے کہ پولیس شریف شہریوں کے خلاف کیسے کیس تیار کرتی ہے؟ ان دونوں میں سے ایک اپنی جلی ہوئی تھوڑی دکھائے گا اور معلوم نہیں کیا کیا، اول فول تمہارے خلاف کہے گا۔ وہ دو ہوں گے اور تم اکیلے۔ تمہارے مقابلے میں ان کی بات زیادہ سنی جائے گی اس لیے کہ تمہارے جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں ہے۔ وہ لوگ تم پر یہ الزام بھی عائد کر سکتے ہیں کہ تم نے رقم چھینی ہے۔ یہ نہ سوچنا کہ کیسینو کا عملہ تمہاری طرف داری کرے گا... اس لیے کہ انہوں نے اس سے پہلے تم کو کبھی نہیں دیکھا ہے، وہ تم سے قطعی واقف نہیں ہیں۔ علاوہ یہ بات بھی مدنظر رکھنا ہو گی کہ اگر یہ بات ریکارڈ پر آ گئی کہ تم نے اتنی رقم جیت لی ہے تو پھر انکم ٹیکس والوں کو ہوش آ جائے گا اور وہ تم سے ٹیکس طلب کرنے لگیں گے۔ تم لڑکے! میرے پاس ایک اور راستہ ہے۔"

"ٹھیک ہے بتاؤ۔"

"میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو پرائیویٹ سراغ رساں کے طور پر کام کرتا ہے۔ اس کے پاس لائسنس وغیرہ نہیں ہے لیکن وہ مناسب اجرت لے کر پوری طرح مدد کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اس سے رابطہ کر لیا جائے تو وہ حفاظت سے تمہیں یہاں سے نکال دے گا۔ اگر تم مناسب سمجھو تو میں اسے فون کر دوں؟"

"ہاں۔ مہربانی کر کے اس کو فون کر دو۔" ہیری نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "میں اس وقت ایسے ہی کسی شخص کی مدد چاہتا ہوں۔ کیا وہ شخص تمہارا دوست ہے؟"

"ہاں... اور یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ میں اس کی خدمات حاصل کر رہا ہوں۔ یہ جواریوں اور شرابیوں کا شہر ہے اور یہاں ہر لمحہ ایسے کسی مضبوط شخص کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔"

ہیری کو یہ سن کر مزید اطمینان ہوا کہ وہ اس شہر میں مصیبت زدہ نہیں ہے۔ اس جیسے اور بھی ہیں۔ پھر یہ کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی طریقہ بھی ہے۔

ٹیکسی ایک ٹیلی فون بوتھ کے قریب جا کر ٹھہر گئی اور ڈرائیور اندر چلا گیا۔ اس بوتھ کا دروازہ نہیں تھا اس لیے ہیری کو اس کی آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ "سام! میں پیری بول رہا ہوں۔ ہاں... ہاں... میری بات تو سنو۔ میرے پاس تمہارے لیے ایک کلائنٹ ہے جو تمہاری مدد چاہتا ہے اور یہاں سے بہ حفاظت اپنے گھر واپس جانا چاہتا ہے۔ چند لٹیرے اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ میں اس وقت شہر کے کاروباری علاقے میں ہوں۔ کیا میں تمہارے آفس میں ملاقات کروں؟"

پیری نے ریسیور کی طرف سے چہرہ ہٹایا اور ہیری کی طرف مڑتا ہوا بولا۔ "سام کہتا ہے کہ میں پانچ سو ڈالرز لوں گا۔ ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔ مناسب رقم ہے۔ میں ادائی کر دوں گا۔" ہیری نے جواب دیا۔

"وہ پانچ سو ڈالر ادا کرنے پر راضی ہے۔" پیری نے پھر ریسیور کان سے لگا لیا۔ "دس منٹ بعد میں تم سے بینگو کلب کے سامنے ملوں گا۔" اس نے ریسیور ہک سے لٹکا دیا اور پھر بوتھ سے باہر آ گیا۔

"سارے معاملات طے ہو گئے ہیں لڑکے! اب تمہیں کسی بات پر فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ دوبارہ ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور مناسب رفتار سے چلتا ہوا بینگو کلب کے نزدیک پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک پرانی سی کیڈی لاک پیچھے سے آ کر اس ٹیکسی کے قریب کھڑی ہو گئی۔ اس کار سے ایک چھوٹے قد کا آدمی اترا جس نے سیاہ پتلون اور اسپورٹس کوٹ پہنا ہوا تھا۔ ہیری کا خیال تھا کہ وہ مجموعی طور پر سراغ رساں دکھائی دیتا تھا۔ وہ نپے تلے قدم رکھتا ہوا ٹیکسی کے قریب آیا اور ڈرائیونگ سائیڈ پر جھک کر بولا۔ "کیا حال ہے پیری؟"

"میں خیریت سے ہوں مگر میرے ساتھ ایک لڑکا ہے جو مصیبت میں مبتلا ہے۔" اس نے اپنا سر ہلا کر ہیری کی طرف اشارہ کیا۔

سام نے ٹیکسی کا پچھلا دروازہ کھولا اور ہیری کو اترنے کا اشارہ کیا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم جیسے ہی اس شہر سے دور ہوں گے... ساری مصیبتیں دور ہو جائیں گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"تمہارے اس تعاون کا شکریہ۔" ہیری نے ٹیکسی سے اترتے ہوئے پیری سے کہا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی ٹانگیں اس کا ساتھ نہیں دے پا رہی ہیں۔ اس نے فینڈر کا سہارا لیا اور ڈرائیونگ سیٹ کے قریب پہنچ کر اپنی جیب سے دو سو ڈالرز نکالے اور پیری کو تھماتے ہوئے بولا۔ "یہ تمہارا کرایہ ہے۔"

پھر وہ کیڈی لاک کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے دروازہ کھول کر بیٹھنے میں عجلت کا مظاہرہ نہیں کیا، اس لیے کہ سام سرگوشی میں پیری سے باتیں کر رہا تھا۔ فاصلے کی وجہ سے ہیری کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے کیا کہہ رہے ہیں۔

جب سام کیڈی لاک کی ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا تو ہیری نے جھک کر کھڑکی سے کہا۔ "اگر کوئی حرج نہ ہو تو میں تمہارے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ جاؤں؟"

"ہاں۔ یہ مناسب رہے گا۔" اس نے کہا تو ہیری اس کے برابر والی نشست پر بیٹھ گیا۔ پھر سام نے کار کو اسٹارٹ کیا اور تھوڑی سی دیر میں ٹریفک میں شامل ہو گیا۔ "تم پریشان دکھائی دیتے ہو اس لیے میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔" سام نے کہا۔ "مگر پہلے یہ بتاؤ کہ کون لوگ تمہارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟ ان کا حلیہ کیا ہے؟"

ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
صرف 500 روپے سالانہ بینک ڈرافٹ، پے آرڈر یا منی آرڈر کے ذریعے جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے نام مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کر دیں اور 12 ماہ اپنے گھر کی دہلیز پر اپنی پسند کا پرچہ رجسٹرڈ ڈاک سے وصول کرتے رہیں۔ 500 روپے فی پرچہ کے حساب سے آپ ایک سے زائد پرچوں کے لیے یکمشت رقم بھیج کر طویل مدت کے لیے بے فکر ہو سکتے ہیں۔
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس، مین کورنگی روڈ، کراچی
فون 5895313 فیکس 5802551
E-mail:jdpgroup@hotmail.com
اگر آپ کو پرچوں کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے تو مندرجہ ذیل فون نمبر پر رابطہ کر سکتے ہیں
ثمر عباس: 0301-2454188

''ان میں سے ایک طویل القامت اور بھاری جسم والا ہے۔ اس کے رخسار پر زخم کا نشان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ باکسر رہ چکا ہے۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کو لائٹر سے جلا دیا ہے۔ دوسرا ایستہ قامت ہے اور دبلا پتلا۔''

''وہ لوگ کیسی کار میں تھے؟'' سام نے پوچھا۔

''پیری کی طرح ان کے پاس بھی ایک ٹیکسی ہے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ وہ اسے استعمال کر رہے ہیں یا نہیں۔'' ہیری نے بتایا۔

کار کارخ شہر سے باہر ہو گیا تھا۔ ہیری کو ائرپورٹ کی عمارت دکھائی دی جہاں وہ لٹیروں کے ہاتھوں میں جاتے جاتے بچا تھا۔ سام کار کو چلاتا ہوا ایک ایسے علاقے میں پہنچ گیا جہاں سناٹے کی حکمرانی تھی۔

''اب تمہیں کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' سام نے کہا۔ ''اگر وہ لوگ ائرپورٹ پر بہ دستور تمہارا انتظار کر رہے ہیں تب بھی ان کے فرشتوں کو یہ علم نہیں ہو سکتا کہ تم میری کیڈی لاک میں بیٹھے ہو۔''

''تمہارا شکریہ... تم میری مدد پر آمادہ ہو گئے، ورنہ میں تو سہم گیا تھا۔'' ہیری نے کہا۔

''مطمئن ہو کر بیٹھ جاؤ۔ یہ چار ہزار میل لمبا سفر ہے اور تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ میں نے چھ سات بار یہ سفر کیا ہے اور میرے کسی کلائنٹ کو مجھ سے شکایت نہیں ہوئی ہے۔''

''مجھے اس شہر سے نکلتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔'' ہیری نے کہا پھر سام کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس نے پشت گاہ سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔

معلوم نہیں وہ کتنی دیر تک سوتا رہا پھر اسے اپنے دائیں شانے میں تکلیف کا احساس ہوا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔

''ہائیں... کیا بات ہے؟'' اس نے چونک کر کہا۔

کار اس وقت ایک ریگستان میں رکی ہوئی تھی جہاں نہ کوئی آدم تھا نہ آدم زاد!

''کبوتر کے بچے! اپنی آنکھیں کھولو۔'' سام نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ریوالور تھا اور وہ اس کی نال سے ہیری کے شانے پر کچوکے لگا رہا تھا۔

''باہر نکلو۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''ہم کہاں ہیں اور تم کیا کر رہے ہو؟'' ہیری نے ہراساں لہجے میں پوچھا۔ اچانک آنکھ کھلنے پر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ صورتِ حال کیا ہو چکی ہے۔

''تمہیں نہیں معلوم؟ اگر تم میں اتنی عقل نہیں ہے تو تمہیں اپنے گھر میں بیٹھنا چاہیے تھا۔ تم اتنی دور کیوں آ گئے؟ تمہاری جیب میں بادن ہزار ڈالرز ہیں۔ کیا تم مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ میں تمہیں حفاظت سے رقم لے جانے دوں گا؟ آگے چلو کبوتر کے بچے!''

''رقم کے بارے میں تمہیں کیسے پتا لگا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''پیری اور میں مل کر کام کرتے ہیں۔ اس نے ٹیلی فون کر کے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ جب تم گہری نیند سو رہے تھے تو میں نے تمہاری جیب سے رقم نکال لی۔ واقعی پورے بادن ہزار ڈالرز ہیں۔''

''تم میری رقم لے کر فرار نہیں ہو سکتے۔ میں دنیا کے آخری گوشے تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔'' ہیری نے خشک لہجے میں کہا۔ وہ سام کے ریوالور سے خوف زدہ نہیں تھا۔

''اگر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں پرائیویٹ سراغ رساں ہوں تو یہ تمہاری بھول ہے۔'' سام نے کہا۔ ''لوٹ مار کرنا اور لوگوں کی جیبیں خالی کرانا میری روزمرہ کی مصروفیات میں شامل ہے۔ یہ تو تم دیکھ ہی رہے ہو گے کہ یہ ایک ویران سی جگہ ہے، اس لیے یہاں کوئی نہیں آتا۔ خاص طور پر سیاح تو ادھر کا رخ بالکل نہیں کرتے۔ تمہیں یہ سن کر صدمہ ہو گا کہ اس ریگستان کی ریت کے نیچے بہت سی لاشیں پڑی ہیں۔ اگر یہاں بلڈوزر چلایا جائے تو وہ سب مل سکتی ہیں مگر آج کل لوگوں کے پاس اتنی فرصت کہاں ہے؟''

''ٹھہرو! مجھے قتل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تمہیں اس رقم میں سے...'' وہ یک لخت خاموش ہو گیا۔ اس لیے کہ اس کی انگلیاں اپنے کوٹ کی خالی جیب سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سام درست کہہ رہا تھا۔ وہ بادن ہزار ڈالرز پہلے ہی اس کی جیب سے نکال چکا تھا۔

صحرا میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور سارا منظر انتہائی دل فریب معلوم ہونے کے ساتھ جان لیوا اور ہولناک معلوم ہو رہا تھا۔

''اچھا، سنو! ہم اس مسئلے پر بات کر سکتے ہیں اور کسی نتیجے پر...'' ہیری نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی آواز اس فائر میں دب گئی جو سام کے ریوالور سے ہوا تھا۔

چند لمحوں بعد سام اس کی لاش کے قریب پہنچا اور اس نے ہیری کی لاش کو ٹھوکر مار کر نشیب میں گرا دیا اور بولا۔ ''جاؤ اور جا کر ان خوش نصیب لوگوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے آرام کرو جو گاہے بہ گاہے یہاں کے کیسینوز میں جیت جاتے ہیں اور پھر جیتی ہوئی رقم لے کر یہاں سے نکلنا چاہتے ہیں۔ پیارے ہیری! میں ان کی اسی طرح مدد کیا کرتا ہوں۔''

❄

تفریحاً شکار کرنے والے کے، خود شکار ہونے کا قصہ اسے معلوم نہیں تھا کہ فطرت بھی اپنی خوب صورتی کی حفاظت کے لیے محافظ متعین کر رکھتی ہے

حادثہ

رضوانہ منظر

میرا نام بل اسٹوڈرڈ ہے اور میں صنعتی اداروں کو سیکیورٹی گارڈز فراہم کرنے والے ادارے کا سربراہ ہوں۔ یہ منگل کی صبح کا ذکر ہے جب میں اپنے آفس پہنچا تو وہاں چارلی کورڈ کی بیوی... بلکہ بیوہ میری منتظر تھی۔ وہ حال ہی میں بیوہ ہوئی تھی۔ اس کے شوہر چارلی کورڈ کی ہلاکت کی خبر میں نے ریڈیو پر بھی سنی تھی اور اخبار میں بھی پڑھی تھی۔ وہ خاصی مشتعل لگ رہی تھی۔

''یہ جان کر مجھے بے حد دکھ ہوا کہ تمہارے شوہر چارلی کورڈ ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے۔'' میں نے سر جھکا کر کہا۔

وہ میری طرف عجیب نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس کی سنکھوں میں اداسی کم اور غصہ زیادہ تھا۔ وہ خاصی حسین اور پُرکشش

عورت تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔
کچھ دیر میری طرف گھورتے رہنے کے بعد اس کے حلق سے غراتی ہوئی سی آواز نکلی۔ ''بل! میری مدد کرو۔ پتا لگاؤ کہ میرا شوہر، میرا چارلی کس طرح ہلاک ہوا ہے۔''
''مگر کیسے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔
''تم پہاڑوں پر جاؤ... اس جگہ کا وزٹ کرو جہاں چارلی گیا تھا اور اس حادثے کی وجہ معلوم کرو۔ میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ چارلی حادثاتی موت کا شکار ہوا ہے۔''
''مگر یہ حادثہ تو غالباً...''
میں نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ وہ میری بات کاٹ کر بولی۔ ''ریاست کولوریڈو کے پہاڑی قصبے کوارٹز میں ہوا ہے۔ وہاں تک جانے آنے کا تمام خرچ میں ادا کروں گی... ساتھ ہی تمہاری فیس بھی۔''
''لیکن میں تو صنعتی اداروں کو سیکیورٹی گارڈز فراہم کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''بھلا میں کسی حادثے کی تفتیش کیسے کر سکتا ہوں؟''
''بل! یہ کام تم ہی کو کرنا ہوگا۔'' اس نے اصرار کیا۔
''مسز چارلی! میں نے سنا ہے کہ تمہارے اور چارلی کے تعلقات زیادہ اچھے نہیں تھے... پھر بھی تم چاہتی ہو کہ...'' میں نے کہا تو اس نے ایک بار پھر بیچ میں ہی میری بات کاٹ دی۔
''یہ بالکل سچ ہے کہ چارلی کے اور میرے درمیان تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہے مگر آخر کو وہ میرا شوہر تھا... میرا سب کچھ تھا۔ اس کے سوا میرے پاس اور کیا تھا؟''
میں تذبذب کے عالم میں اس کی طرف دیکھنے لگا تو وہ بولی۔ ''تمہارے سوا میری نظر میں ایسا کوئی آدمی نہیں ہے جس پر میں بھروسا کر سکوں۔''
میں اسے غور سے دیکھنے لگا۔ میں اسے زیادہ اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔ اس کے آنجہانی شوہر چارلی سے میری رسمی شناسائی تھی... اور یہ عورت مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں اس کے شوہر کی حادثاتی موت کا سبب تلاش کروں جو ایک پہاڑی مقام پر ہلاک ہو گیا تھا۔
''میں نے سنا ہے کہ چارلی لالچی انسان تھا اور اس نے محض دولت کے لالچ میں تم سے شادی کی تھی۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے یہ کہا تو وہ آہستہ سے ہنس پڑی۔
''یہ کون سی ڈھکی چھپی بات ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ چارلی نے دولت کے لالچ میں مجھے پھانسا تھا۔ میرے ڈیڈی ایک بڑی کمپنی کے ڈائریکٹر ہیں اور اس کے 16 فیصد حصص کے مالک بھی ہیں۔ چارلی نے مجھ سے نہیں بلکہ ان 16 فیصد حصص سے شادی کی تھی۔''
''کیا نام ہے تمہارے ڈیڈی کی کمپنی کا؟''
''شیفلن ایرو اسپیس!'' مسز چارلی نے جواب دیا۔ ''شادی کے بعد ڈیڈی نے چارلی کو اس کمپنی میں سیلز اینڈ مارکیٹنگ ڈویژن میں ملازمت دے دی تھی اور وہ چالیس ہزار سالانہ تنخواہ لے رہا تھا۔''
''مگر وہ لالچ والی بات...'' میں نے کہا۔
''اسی طرف آ رہی ہوں۔'' مسز چارلی بولی۔ ''چارلی واقعی احسان فراموش اور لالچی آدمی تھا۔ وہ آستین کا سانپ تھا۔ شادی سے پہلے تو وہ میرے تلوے چاٹتا تھا مگر شادی کے بعد اس نے مجھ سے بدسلوکی شروع کر دی۔ وہ ایک بے ہودہ انسان تھا۔ بے ہودہ باتیں کرتا تھا اور بدقماش لوگوں کے ساتھ رہتا تھا۔ ہر وقت کھاتا رہتا تھا۔ وہ کسی جنگلی سور سے کم نہیں تھا۔ نئی کاروں کا رسیا تھا اور شکار کا بے حد شوقین تھا... مگر اس نے کمپنی کی ترقی کے لیے بھی کافی کام کیا ہے۔ البتہ میرے ساتھ اس نے وہ سلوک کیا کہ میری زندگی جہنم بنا ڈالی۔'' کہتے کہتے مسز چارلی کی آواز بھرا گئی۔ ''مجھے زندہ درگور کر دیا تھا... مگر میں اسے کچھ نہیں کہتی تھی کیونکہ دنیا میں وہی تو میرا سب کچھ تھا۔ اس سے بھی لڑتی تو کہاں جاتی؟''
کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولی۔ ''وہ میرے لیے تھا... اور میں اس کے لیے تھی۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تم اس کے قاتل کا پتا چلاؤ۔ میں اس سے انتقام لوں گی۔''
''کیا؟ مگر وہ تو محض ایک حادثہ تھا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔
''نہیں... وہ حادثہ نہیں تھا۔'' مسز چارلی نے کہا۔ ''اس پر دو فائر کیے گئے تھے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے آنسو صاف کیے اور بولی۔ ''میں نے اپنے ڈیڈی سے بات کی ہے۔ وہ بھی میرے ہم خیال ہیں۔ تم چارلی کے قاتل کا پتا چلاؤ۔ تمام اخراجات ڈیڈی کی کمپنی ادا کرنے کو تیار ہے۔ تم فوراً روانہ ہو جاؤ۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

طیارے پر سفر کے دوران میں راستے بھر مسز چارلی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے شوہر کو قتل کیا گیا ہے۔ چلنے سے پہلے میں نے کولوریڈو دو کالز بھی کی تھیں اور اس کیس کے متعلق معلومات حاصل کی تھیں۔ چھ روز پہلے چارلی بہ ذریعہ ہوائی جہاز ڈینور پہنچا تھا۔ وہاں سے اس نے

... کی کار لی تھی اور اس کے ذریعے پہاڑی قصبے کوارٹز گیا ... حوں اور شکاریوں کی دلچسپی کا مرکز تھا۔
... نے رات ایک موٹیل میں گزاری تھی اور صبح ''را کی ... فاریز لمیٹڈ'' کے ایک پروفیشنل گائیڈ کے ہمراہ ... طرف روانہ ہو گیا تھا۔ اس گائیڈ کا نام سام میلوری ... ایک پہاڑی جیپ میں گئے تھے اور ان کے ساتھ ... روز کا کھانے پینے اور دیگر ضروریات کا سامان تھا۔ چار روز ... میلوری، چارلی کی لاش کے ساتھ واپس پہنچا جسے اس ... مرے ہوئے چوبیس گھنٹے گزر چکے تھے۔
... شرف کے دفتر سے پتا چلا تھا کہ چارلی پر ایک بڑی ... سے دو فائر کیے گئے تھے۔ سام نے شیرف کو بتایا تھا کہ ... حادثے کا کوئی علم نہیں ہو سکا۔ وہ کیمپ لگانے میں ... مصروف تھا کہ چارلی اپنی رائفل لے کر قریبی چوٹی پر چڑھ ... وہ اس سے کہہ گیا تھا کہ وہ رات کے کھانے کے لیے ... نے جا رہا ہے۔ اسے گئے ہوئے ایک گھنٹا ہو گیا تو سام ... نے دو مرتبہ فائر کی آواز سنی۔
... س نے اس آواز پر کوئی توجہ نہیں دی کیونکہ اس طرح ... ان پہاڑوں میں ہوتی رہتی تھی۔ وہ سمجھا تھا کہ ... نے رات کے کھانے کے لیے شکار مار لیا ہے مگر جب ... دو گھنٹے تک واپس نہیں آیا تو سام کو پریشانی ہوئی لیکن ... نے یہ سوچ کر اپنے دل کو تسلی دے لی کہ چارلی کا شکار ... ہو کر بھاگ گیا ہوگا اور وہ اس کے تعاقب میں آگے نکل ... ہوگا۔ جب سہ پہر بھی ڈھلنے لگی اور چارلی کو گئے ہوئے ... گھنٹے ہو گئے تو سام کو تشویش ہوئی۔ حالانکہ چارلی ... کے پاس تمام ضروری سامان تھا۔ دوربین، نقشہ، کمپاس وغیرہ... پھر بھی وہ کہیں بھٹک گیا تھا... یہ خیال اسے پریشان ... رہا تھا۔
سام، چارلی کی تلاش میں گیا مگر اس وقت تک اندھیرا پھیل چکا تھا اس لیے وہ مجبوراً واپس آ گیا لیکن اس نے رات ... اپنے کیمپ کے سامنے آگ جلائے رکھی تاکہ چارلی اسے ... کر آسانی سے کیمپ تک پہنچ جائے... مگر چارلی واپس نہیں ... صبح کی سپیدی نمودار ہوتے ہی سام دوبارہ چارلی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور آخر کار ساڑھے آٹھ بجے کے ... اسے چارلی مل گیا... مگر اس حالت میں کہ اس کے سینے ... کی دو گولیاں پیوست تھیں۔ یہ دیکھ کر وہ بڑبڑا گیا۔ ... نے چارلی کی لاش اپنی جیپ میں ڈالی اور اسے لے کر ... شیرف کے پاس پہنچ گیا۔

☆☆☆

نمک پارے

1- جانوروں کو کبھی یہ فکر نہیں ہوتی کہ گھڑی میں کیا بجا ہے۔
2- جانور موت کے احساس کے بغیر مر جاتے ہیں۔
3- ان کے آخری لمحات غیر ضروری رسموں اور بوجھل تکلفات سے آلودہ نہیں ہوتے۔
4- ان کی تجہیز و تکفین پر کچھ خرچ نہیں ہوتا۔
5- ان کی موت کے بعد کوئی ان کی وصیت کے سلسلے میں مقدمے بازی نہیں کرتا۔

شیرف کے دفتر میں، میں نے اس کے ساتھ اس حادثے کے حوالے سے گفتگو کی۔
''کیا وہ رائفل ملی جس سے چارلی کو شوٹ کیا گیا تھا؟''
''نہیں۔'' شیرف نے جواب دیا۔ ''البتہ گولیاں لاش میں سے نکال لی گئی تھیں۔ وہ کسی طاقتور رائفل سے فائر کی گئی تھیں۔ اصولاً ان گولیوں کو چارلی کے جسم کے پار ہو جانا چاہیے تھا مگر وہ جسم میں پیوست ہوئی تھیں جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ دور سے فائر کی گئی تھیں۔ اسی لیے چارلی تک آتے آتے ان کی رفتار اور طاقت میں کمی آ گئی۔''
میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو شیرف نے کہا۔ ''ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس پہاڑ پر موجود کوئی دوسرا شکاری چارلی کو کوئی جانور سمجھا ہو اور اس غلط فہمی میں اس نے فائر کر دیا ہو۔''
''دونوں فائر اس کے سینے پر ہوئے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہے کہ نشانہ تاک کر لگایا گیا تھا۔ دونوں گولیاں ایک دوسرے سے تین انچ کے فاصلے پر پیوست ہوئی تھیں... اور یہ فائر سامنے والی اونچی پہاڑی سے ہوئے تھے۔''
''تم ایسا کرو کہ سام میلوری سے مل لو۔'' شیرف نے کہا۔ ''وہ تمہیں اس سچویشن کے بارے میں زیادہ بہتر طور سے بتا سکے گا۔ وہ چارلی کا گائیڈ تھا۔''
''شیرف! تم نے اپنے طور پر جو تفتیش کی ہے، اس کے بارے میں بھی تو مجھے بتاؤ۔'' میں نے کہا۔
''میں سام میلوری کے ساتھ جائے وقوعہ پر گیا تھا۔'' شیرف نے کہا۔ ''میں نے ایک جگہ جوتوں کے نشان بھی دیکھے تھے۔ شکاری نیچے کہیں سے اوپر آیا تھا اور اس نے وہاں سے چارلی پر فائر کیے تھے۔ پھر وہ اپنے شکار کو دیکھنے آگے آیا۔ جب اسے پتا چلا کہ اس نے جانور کے بجائے کسی انسان کو مار دیا ہے تو وہ تھوڑی دیر وہاں کھڑا رہا۔ اس نے اپنی رائفل درخت کے تنے سے ٹکا کر کھڑی کر دی اور آخر کار واپس چلا گیا۔ ہم نے اس کے قدموں کے نشانات کے ساتھ

اس کی رائفل کے رکھنے کا نشان بھی دیکھا تھا۔''

''وہ نشان واپس کہاں گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''نیچے ڈھیروں غار ہیں، انہی میں سے ایک غار تک جا کر اس کے قدموں کے نشان غائب ہو گئے تھے۔'' شیرف نے کہا۔

''یہ تو ناکافی ثبوت ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے چارلی کی بیوہ نے بھیجا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ میں اس کے شوہر کے قاتل کا پتا چلاؤں۔ وہ ٹھوس شہادتیں چاہتی ہے۔ محض اندازوں کو وہ کبھی تسلیم نہیں کرے گی۔''

''مسٹر بل!'' شیرف نے مجھ سے کہا۔ ''یہ ایک پہاڑی جنگل ہے جس میں بے شمار شکاری جانور ہیں۔ جب ایک جگہ بہت سے شکاری شکار کے لیے آئیں گے تو اس طرح کے حادثات تو پیش آئیں گے ہی... اس سے پہلے بھی یہاں کئی شکاری مارے جا چکے ہیں۔''

''اچھا...؟ اس سے پہلے کتنے لوگ اس جگہ مارے گئے ہیں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''پچھلے سیزن میں پانچ یا چھ شکاری یہاں اسی طرح کی اندھی فائرنگ سے ہلاک ہوئے تھے۔'' شیرف نے کہا۔ ''اس سے پہلے دو یا تین مرے تھے۔ اس سے پہلے چار... غرض ہر سیزن میں چند ایک شکاری اس شکار گاہ میں ضرور قربان ہوتے ہیں۔ پچھلے سیزن میں جو شکاری مارے گئے تھے، ان میں سے دو کسی طاقتور رائفل کا نشانہ بنے تھے جبکہ باقی تین اپنی ہی رائفلوں کے ذریعے مارے گئے تھے۔''

''اس طرح کے واقعات کے بارے میں تم لوگ کیا کرتے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''عام طور سے اس طرح کے واقعات کی رپورٹ فائل کر دی جاتی ہے۔'' شیرف نے بتایا۔ ''ہم کیا کر سکتے ہیں؟ جن شکاریوں کو لائسنس دیے گئے ہیں، انہیں انسان اور جانور کے درمیان فرق کرنا نہیں آتا۔ اس کی ذمے داری کس پر ہے؟ جب تک اس صورتِ حال کا سختی سے تدارک نہیں کیا جاتا، اس طرح کے حادثات ہوتے رہیں گے۔''

☆☆☆

شیرف کے پاس سے میں سیدھا ''راکی ماؤنٹین گیم فاریز لمیٹڈ'' کے دفتر پہنچا۔ میں اپنی کرائے کی کار میں سوار تھا۔ اس دفتر کے باہر چند خچر اور چند گھوڑے کھڑے تھے۔ پوری جگہ چمڑے کی بساند میں بسی ہوئی تھی۔ میں نے وہاں موجود بوڑھے سے، سام میلوری کے بارے میں پوچھا تو اس نے عقبی حصے میں بنے ہوئے ایک نیم پختہ گھر کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ گھر درختوں کے درمیان واقع تھا۔

سام میلوری کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کوئی سخت گیر قسم کا بوڑھا ہوگا لیکن وہ ایک ہنس مکھ جوان نکلا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ وہ بہ مشکل تیس برس کا ہوگا۔ اس کے پیچھے ایک نوجوان عورت، ایک شیر خوار بچے کو گود میں لیے کھڑی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ سام کی بیوی ہوگی۔

''مجھے شیرف نے فون کر کے تمہاری آمد کے بارے میں بتا دیا تھا۔'' سام میلوری نے کہا۔ وہ مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے آیا جس میں ایک ریک میں زنجیر سے بندھی ہوئی پانچ رائفلیں کھڑی تھیں۔

سام نے مجھے تفصیل سے چارلی والے حادثے کے بارے میں بتایا۔ اس نے کم و بیش وہی سب کچھ بتایا تھا جو میں پہلے سے جانتا تھا۔

''شیرف کا کہنا ہے کہ چارلی کو جس رائفل سے مارا گیا ہے، وہ کافی پرانی ہے اور پہلی جنگِ عظیم میں استعمال ہوتی تھی۔'' میں نے سام میلوری کو بتایا۔ ''تمہارے پاس بہت سی رائفلیں ہیں۔'' میں نے اس کی رائفلوں والی ریک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان میں کوئی اتنی پرانی رائفل ہے؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' سام میلوری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا چارلی کی موت میں میرا ہاتھ ہے؟ تم مجھ پر شبہ کر رہے ہو... ہے نا؟''

''نہیں، میں شبہ نہیں کر رہا بلکہ ایک بات پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں ایک شکاری ہوں، قاتل نہیں۔'' سام نے کہا۔ ''میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی انسان کو قتل نہیں کیا۔''

''تم نے چارلی کو کیسا انسان پایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کسی بھی حرکت کرنے والی چیز پر فائر کرنے کو تیار رہتا تھا۔'' سام نے جواب دیا۔ ''مجھے اس طرح کے شکاری کبھی اچھے نہیں لگے جو محض تفریحِ طبع یا اپنی تسکین کے لیے جانوروں کو شکار کرتے ہوں... ہاں جو شکاری گوشت کی ضرورت کے تحت شکار کرتے ہیں، ان کی بات سمجھ میں آتی ہے۔ ایسے لوگ بے مقصد طور پر جانوروں کو ہلاک نہیں کرتے۔ انہیں خوامخواہ خون بہانے کا کوئی شوق نہیں ہوتا۔''

''تم ایک شکاری گائیڈ ہو۔'' میں نے سام سے کہا۔ ''چارلی جیسے بے رحم شکاریوں کو اپنے ساتھ لے جاتے ہوئے... کیسا محسوس کرتے ہو؟''

''یہ بہر حال میری روزی ہے۔'' سام نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اگر شکاری بے مقصد طور پر جانوروں کا خو...

...ہب تو میں کیا کر سکتا ہوں؟'' اس کے لہجے میں افسردگی ...ی۔

...ں جب تمہارے ساتھ شکار پر گیا تو اس نے تم ...ر کو ...رنے کی فرمائش کی تھی؟''

...نے سام میلوری سے سوال کیا تو اس نے جواب ...''اس نے مجھ سے ان جانوروں کا شکار کرنے کی ...تھی جو پہلے ہی ختم ہو رہے ہیں۔ ان کی نسلیں معدوم ...ہی ...اس لیے ان کے شکار پر پابندی ہے۔''

''مثلاً؟'' میں نے سوال کیا۔

''مثلاً... جنگلی بکرے۔ ان کی نسل کو خطرہ ہے۔'' سام ...ی سے جواب دیا۔ ''میں نے چارلی کو سمجھایا مگر وہ ...۔ وہ تو طے کر کے آیا تھا کہ جنگلی بکرا مارے بغیر واپس ...ں جائے گا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر اسے جنگلی ...ں کا ریوڑ نظر آ گیا تو وہ ایک آدھ کو نہیں مارے گا بلکہ سبھی ...ر رکھ دے گا۔''

''...رلی کا نشانہ کیسا تھا؟'' میں نے سوال کیا۔

''بہت عمدہ تو نہیں... مگر وہ اچھا نشانے باز تھا۔'' سام نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے... مجھے وہ جگہ بتاؤ جہاں چارلی مارا گیا ...'' ...نے سام سے کہا تو وہ فوراً اٹھ گیا۔

''...ہاں کوئی رہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ نیشنل فاریسٹ ہے... قومی پراپرٹی ہے یہ...'' سام نے ...ہا۔ ''وہاں نہ کوئی زمین خرید سکتا ہے اور نہ گھر بنا کر رہ سکتا ہے۔''

''مگر وہ زمین لیز پر حاصل کر سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''...م مجھ سے غلط بیانی کیوں کر رہے ہو سام؟''

میری بات سن کر وہ پہلی مرتبہ بے چین نظر آیا۔ میں نے ...ے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ وہاں کوئی ...بوڑھا رہتا ہے۔ اس نے ایک ڈھلوان غار میں اپنا ...ٹھکانا بنا رکھا ہے۔ وہ برسوں سے وہاں رہ رہا ہے۔ پتا نہیں وہ ...یوں رہتا ہے؟''

''...اں... یہ سچ ہے۔'' سام نے کہا۔ ''اس کا نام ...ک ...ے۔''

''میں ...ں سے ...نا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''...کیوں؟'' سام نے چونک کر سوال کیا۔

''...بکرے کے منہ جیسی چٹان کے پاس رہتا ہے۔'' ...کہا۔ ''ممکن ہے اس نے قاتل کو دیکھا ہو۔''

''یہ نہیں ہو سکتا۔'' سام نے کہا۔ ''وہ پہاڑی کے ...طرف، کافی دور رہتا ہے۔''

آپ بیتی، جگ بیتی، دور و نزدیک کی سچی کہانیاں
زندگی کی ہفت رنگ سچائی کا آئینہ دار
ماہنامہ سرگزشت کراچی
شمارہ جنوری 2009ء کی ایک جھلک
مصورِ مشرق
اس مصور کا احوالِ زیست جو پاکستان کی پہچان بنا
درۂ بولان
تاریخ کے آئینے میں دنیا کے انوکھے ریلوے ٹریک کا احوال
پتھریلا ہاتھ
ہٹلر سے جڑا ایک انوکھا مگر دلچسپ واقعہ
ابھرتے سورج کی سرزمین
جاپان ایک عورت کی نظر سے۔ منفرد سفرنامہ
باکمال
پاکستان میں پلاٹینم جوبلی فلموں کی شروعات کرنے والے کا مختصر تعارف
سیاسی غلطی
کیا قیامِ پاکستان کا مطالبہ سیاسی غلطی تھا۔ ایک دلچسپ سچ بیانی
اس کے علاوہ
شکاریات، قلمی الف لیلہ، میاں صاحب کی روداد، انتہائی دلچسپ طویل آپ بیتی ''سراب'' اور بھی بہت کچھ جسے پڑھنے کے بعد آپ خود کہیں گے یہی کچھ تو میں پڑھنا چاہتا تھا۔
آج ہی نزدیکی بک اسٹال سے طلب کریں
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون: 5895313 فیکس: 5802551

"تم مجھے اس کے پاس لے چلو۔ مجھے اس سے ملنا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں تمہیں اس کی فیس ادا کروں گا۔"

"ٹھیک ہے... تم جب کہو گے، میں تمہیں لے چلوں گا۔" سام نے کہا۔

"میرا خیال ہے، ہم صبح دس بجے چلیں۔" میں نے کہا۔

☆☆☆

میں نے صبح ڈینور فون کر کے ضروری معلومات حاصل کیں اور دس بجے کے کچھ دیر بعد سام میلوری کے پاس پہنچا۔ وہ اپنے مخصوص ٹرک کے ساتھ میرا منتظر تھا۔ میرے پہنچتے ہی اس نے ٹرک اسٹارٹ کر دیا اور اس کا رخ اس ڈھلوان راستے کی طرف کر دیا جو صنوبر کے درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔

"سام!" میں نے راستے میں اسے مخاطب کیا۔ "میں نے تھوڑی بہت معلومات جمع کی ہیں۔ اس کے مطابق اس علاقے میں گزشتہ چھ برسوں کے دوران سترہ شکاری ہلاک ہوئے ہیں اور وہ سب پہاڑی بکرے کے منہ جیسی چٹان کے قریب مارے گئے تھے۔ ان میں سے نو شکاری اسی پرانی مگر پاورفل رائفل سے مارے گئے تھے۔"

"اس طرح کی رائفلیں سبھی شکاریوں کے پاس ہوتی ہیں۔" سام نے چونکے بغیر جواب دیا۔ وہ ساری توجہ ڈرائیونگ پر دے رہا تھا۔ ٹرک اونچے نیچے اور پُرخطر راستے پر ہچکولے کھاتا گزر رہا تھا۔ "دوسرے یہ کہ زیادہ تر شکاری بکرے کے منہ جیسی چٹان کے پاس ہی اپنا بیس کیمپ بناتے ہیں۔"

"اچھا، چھوڑو اس بات کو... اور مجھے اس بوڑھے بگ کولن کے بارے میں بتاؤ۔" میں نے موضوع بدلا۔

"وہ بوڑھا مگر نفیس اور مہذب انسان ہے۔" سام نے کہا۔ "وہ خون ریزی کو پسند نہیں کرتا۔ وہ ایسے شکاریوں سے نفرت کرتا ہے جو محض تفریح طبع کے لیے جانوروں کو ہلاک کرتے ہیں۔ اس کے خیال میں ایسے لوگ نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔"

"کیا تمہارا واسطہ ایسے نفسیاتی مریضوں سے پڑا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں... ہم نے چند ایک کو گرفتار بھی کیا تھا۔" سام نے کہا۔ "مگر وہ اس قدر ظالم اور بے رحم لوگ تھے کہ انہوں نے اپنے ہی گرفتار ساتھیوں پر دستی بموں سے حملہ کر دیا تھا تا کہ وہ ان کے خلاف گواہی نہ دے سکیں۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے کہا۔ "یہ تمہارا چارلی بھی مجھے کوئی نفسیاتی مریض لگا تھا۔"

"اور بگ کولن کے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟"

میں نے سام سے سوال کیا تو وہ مسکرا دیا۔

"وہ ہر جاندار کا احترام کرتا ہے۔ اس کے خیال میں جان چاہے جانور کی ہو یا انسان کی... یکساں طور پر احترام کی مستحق ہے۔" سام نے کہا۔ "لیکن وہ حیوانوں کی جانوں سے کھیلنے والوں سے نفرت کرتا ہے۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ پہاڑی بکرے کے منہ جیسی پہاڑی چٹان کے قریب رہنے والا بگ کولن نام کا بوڑھا انسانوں سے نفرت اور جانوروں سے محبت کرتا ہے؟" میں نے آہستگی سے کہا۔ وہ محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔ آگے راستہ زیادہ غیر ہموار اور خطرناک تھا۔ وہ اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ پر دے رہا تھا جبکہ میں بھی سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ ٹرک بہت زور زور سے ہچکولے کھا رہا تھا۔

دن کے دو بجے اس نے ایک ناہموار غار کے سامنے ٹرک روک دیا۔ غار کے باہر دو تین پتھروں کے پاس ایک اسٹیل کی کیتلی اور دو تین پیالیاں رکھی تھیں۔ ان پتھروں کے درمیان آدھ جلی لکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ بگ کولن کا چولہا تھا جو اس نے غار کے باہر بنا رکھا تھا۔ میں نے ٹرک سے اتر کر غار کے اندر نظر دوڑائی تو ایک کونے میں گھاس پھوس کے بستر پر سلیپنگ بیگ پڑا نظر آیا۔ پتھروں کے ساتھ چند کتابیں رکھی تھیں۔ بگ کولن کہیں نظر نہیں آیا۔

"کہاں ہے بگ کولن؟" میں نے پوچھا تو سام کوئی جواب دیے بغیر آگے کی طرف چل دیا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔

آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد میں نے ہتھوڑے کی آواز سنی۔ پھر ہمیں وہ نظر آ گیا۔ اس کی لمبی سیاہ و سفید ڈاڑھی تھی۔ وہ ہتھوڑے کی مدد سے چٹان کو توڑ رہا تھا۔ اس کے جسم پر لمبا کوٹ اور گہری سبز پتلون تھی۔ اس کا جسم اس عمر میں بھی خاصا مضبوط نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک بھی تھی اور کسی بچے جیسی معصومیت بھی۔

"یہ مسٹر بل ہیں۔" سام نے بوڑھے بگ کولن سے میرا تعارف کرایا۔ "یہ چارلی کی موت کی تفتیش کر رہے ہیں۔"

"اچھا... اچھا... وہ شکاری جو ابھی کوئی ہفتہ بھر پہلے پہاڑی کے دوسری طرف ہلاک ہوا تھا؟" بگ کولن نے کہا۔

"ہاں۔" سام نے کہا تو میں نے بگ سے پوچھا۔ "تم کیا کرتے ہو؟"

اردو کا جنازہ

محفل میں کسی شخص نے سر عبدالقادر کے سامنے سید عطاء اللہ بخاری کی سحر کلامی کی بہت تعریف کی۔ سر عبدالقادر بولے "ہاں، عطاء اللہ شاہ بخاری خوب بولتے ہیں لیکن محسن الملک مرحوم بھی کسی سے کم نہ تھے۔"

پھر انہوں نے نواب محسن الملک مرحوم کی جادو بیانی کا ذکر کرتے ہوئے دو واقعات سنائے۔ کہنے لگے۔

"1900ء میں یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر سر انٹونی میکڈانل نے اردو کے خلاف مہم شروع کی تو نواب محسن الملک نے اس کا جواب دینے کے لیے لکھنو میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا۔ جس میں، میں بھی شریک ہوا۔ محسن الملک نے اس جلسے میں جس جوش و خروش سے تقریر کی، اس کی نظیر میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کہ الفاظ کا ایک لاوا تھا جو ابل ابل کر پہاڑ سے نکل رہا تھا۔ آخر میں نواب محسن الملک نے یہ کہتے ہوئے کہ اگر حکومت اردو کو مٹانے پر ہی تل گئی ہے تو بہت اچھا، ہم اردو کی لاش کو گومتی دریا میں بہا کر خود بھی ساتھ ہی مٹ جائیں گے اور والہانہ انداز میں یہ شعر پڑھا۔

چل ساتھ کہ حسرت دل محروم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اقتباس: نور احمد چشتی کی کتاب "یادگار چشتی" سے

انتخاب: محمد عثمان علی، راولپنڈی

"دیکھ نہیں رہے...؟ چٹانوں کو تراش رہا ہوں۔" بوڑھے بگ کولن نے جواب دیا۔ "انہیں مختلف مجسموں کی صورت میں تراشنے کے بعد یہاں آنے والے شکاریوں... بلکہ سیاحوں کو فروخت کر دیتا ہوں۔ ہاں... تم اس مرنے والے شکاری کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہو؟"

"کسی نے اسے گولی ماری تھی۔" میں نے کہا۔ "میں نے اس مقام کا جائزہ لیا ہے جہاں وہ مارا گیا تھا۔ سامنے تمہاری پہاڑی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید تم نے کسی مشتبہ شخص کو اس طرف دیکھا ہو..."

"نہیں... میں نے اس روز کسی کو بھی ادھر نہیں دیکھا تھا۔" بگ کولن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تو اس روز تم نے فائر کی آواز بھی نہیں سنی ہوگی؟" میں نے کہا تو بوڑھا زور سے ہنس پڑا۔

"میں سارا دن ان پہاڑوں میں فائرنگ کی آوازیں سنتا ہوں۔ یہ وہ موسم ہے جب بہت سے بے ہودہ، اور بدتمیز شکاری اس علاقے میں آ کر خون ریزی کرتے اور فساد مچاتے ہیں۔"

ابھی اس کی بات مکمل ہوئی تھی کہ ایک چھوٹی سی بکری عجیب انداز سے اچھلتی ہوئی سامنے آ کر رک گئی۔ میں نے اسے دیکھا تو پتا چلا کہ اس کی صرف تین ٹانگیں ہیں مگر وہ ان تینوں ٹانگوں کی مدد سے بڑی شان سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔

"آؤ فیلی... آؤ!" بگ کولن نے بکری کو پکڑ کر اس کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

"مسٹر بگ کولن! اس کی... میرا مطلب ہے، فیلی کی چوتھی ٹانگ کو کیا ہوا؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ بے چاری ان آزاد فضاؤں میں اس پہاڑ پر چھلانگیں مارتی پھر رہی تھی کہ ایک ظالم شکاری نے اسے دیکھ لیا اور اپنی رائفل سے فائر کر کے اس کی ایک ٹانگ اڑا دی۔ یہ نیم مردہ حالت میں پہاڑی پر پڑی تھی کہ میں نے اسے دیکھ لیا۔ میں نے اسے اٹھا کر اپنے غار میں پہنچایا اور اس کی مرہم پٹی کی۔ یہ ٹھیک تو ہو گئی مگر اپنی ایک ٹانگ سے محروم ہو گئی۔ اس وقت سے یہ میرے پاس ہے۔"

"اس واقعے کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سات سال۔" یہ کہہ کر بگ کولن پیار سے فیلی کے کان کھینچنے لگا۔ معصوم بکری بھولی بھالی نظروں سے بگ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ تینوں ٹانگوں پر اچھلتی ہوئی جنگل کی طرف چلی گئی۔

"تم لوگ بھوکے ہو گے۔ میرے ساتھ چلو... میں تمہیں زبردست قسم کا کھانا کھلاؤں گا۔" بگ کولن نے کہا تو ہم دونوں اس کے ساتھ چل دیے۔

☆☆☆

بگ کولن نے مٹر، آلو، پیاز، سلاد اور اسی طرح کی دیگر سبزیوں سے پُرتکلف کنچ تیار کیا اور ہمیں کھلایا تو ہم اس کے ذائقے سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔

''یہ سبزیاں تم کہاں سے لاتے ہو؟'' میں نے پوچھ ہی لیا۔

''پہاڑی ڈھلوان کے نیچے ایک قطعہ نسبتاً ہموار ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''وہاں میں اپنی ضرورت کی سبزیاں خود اُگاتا ہوں۔ معذرت خواہ ہوں کہ میرے پاس گوشت نہیں ہے۔ میں اس علاقے کے جانوروں سے محبت کرتا ہوں تو ان کا خون کیسے بہا سکتا ہوں؟ ویسے بھی میرے پاس مہمان کم ہی آتے ہیں۔ اس لیے گوشت کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔''

''گویا تم سبزی خور ہو مسٹر بگ!'' میں نے کہا۔

''اب تو سات سال ہو گئے ہیں۔ اس عرصے میں ایک مرتبہ بھی گوشت کو ہاتھ نہیں لگایا۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہارا دل نہیں چاہتا کہ پہاڑ سے نیچے جاؤ اور لوگوں سے میل جول رکھو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں آدم بے زار ہوں۔ ہاں... جانوروں کا پکّا دوست ہوں۔'' اس نے ایک خاص انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ہم لوگ کھانا کھا رہے تھے کہ فیلی دوبارہ نمودار ہو گئی اور بگ کولن نے اپنی پلیٹ میں رکھا ہوا سارا سلاد اسے کھلا دیا۔ اس کی آنکھوں میں بے پایاں خوشی تھی۔

اچانک مجھے یاد آیا کہ جب ہمارا ٹرک یہاں آ کر رکا تھا تو میں نے چولہے کے قریب ایک رائفل بھی دیکھی تھی۔ میں نے دیکھا تو رائفل اسی جگہ نظر آئی۔ میں نے وہ رائفل اٹھائی اور اسے دیکھنے لگا۔ بگ کولن نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ رائفل کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کی مناسب دیکھ بھال کی جاتی ہے۔

''تم تو سبزی خور ہو۔'' میں نے بگ کولن سے کہا۔ ''پھر اس رائفل کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟''

میں دیکھ رہا تھا کہ سام میلوری اپنی جگہ سے اٹھا اور ٹرک کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔

''بل! وہ رائفل وہیں رکھ دو۔'' سام نے کہا تو میں حیرت سے کبھی اس کی طرف اور کبھی بگ کی طرف دیکھنے لگا۔ میری نظریں اس رائفل کا بہ غور جائزہ لے رہی تھیں۔

آخر میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ وہی رائفل ہے جس سے چارلی مارا گیا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے بگ کولن اور اس کی تین ٹانگوں والی بکری فیلی کی طرف دیکھا۔ فیلی بگ کی گود میں تھی۔

''مسٹر بگ! کیا چارلی نے تمہاری اس بکری... فیلی کو نشانہ لینے کی کوشش کی تھی جو تم نے انتقاماً اس پر فائر کر کے اسے ہلاک کر دیا؟'' میں نے بگ کولن سے پوچھا۔

''نہیں... وہ اس جنگل کی ایک معصوم سی بھیڑ کا شکار لے رہا تھا اور کسی بھی لمحے وہ اس پر فائر کر دیتا... مگر میں نے اسی رائفل سے اس کا شکار کر لیا۔ بھیڑ کی وہ قسم اب نایاب ہو گئی ہے اور اس کے شکار پر پابندی ہے۔'' بگ کولن نے اطمینان سے کہا۔

''تم اس جنگل کے پُرامن باسیوں، اس کے جانوروں کو بے رحم اور ظالم شکاریوں سے اکیلے کب تک بچاؤ گے؟'' سام میلوری نے بگ کولن سے کہا۔

''جب تک میرے سینے میں دل دھڑک رہا ہے اور جب تک میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے، میں اپنے جنگل کے جانوروں کو محض بعض لوگوں کی تفریحِ طبع کے لیے مرنے نہیں دوں گا۔'' بگ کولن نے ایک عزم کے ساتھ کہا۔

''تم دونوں ایک دوسرے کو کب سے جانتے ہو؟'' میں نے سام اور بگ سے ایک ساتھ سوال کیا۔ ''کیونکہ میرا خیال ہے، یہاں آنے والے سفاک شکاریوں کا تم دونوں خوب شکار کر رہے ہو اور اس حوالے سے ایک ہو۔''

''سام میرا بھتیجا ہے۔ میں اس کا چچا ہوں۔'' بگ کولن نے نرمی سے کہا۔

''لیکن سام تو گوشت کھاتا ہے۔ ظاہر ہے، یہ جانوروں کا شکار بھی کرتا ہو گا؟'' میں نے بوڑھے بگ کولن سے کہا۔

اس کے بجائے سام نے جواب دیا۔ ''میں ان کا بھتیجا ضرور ہوں مگر ضروری نہیں کہ میں ان کی ہر بات مانوں۔''

''میری بات سنو۔'' بگ کولن نے مجھ سے کہا۔ ''سام نے کبھی کسی شکاری کو ہلاک نہیں کیا۔ یہ کام تو میں کرتا تھا۔ میں ان شکاریوں کو تاک تاک کر نشانہ بناتا رہا ہوں کیونکہ میری نظر میں وہ شکاری نہیں بلکہ قاتل تھے۔''

میں نے بگ کولن کی رائفل واپس چٹان کے پاس رکھ دی اور ٹرک میں جا بیٹھا جہاں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا سام میلوری میرا انتظار کر رہا تھا۔

☆☆☆

راستے میں سام نے مجھ سے پوچھا۔ ''شیرف کو چارلی کی بیوی کو اپنی چھان بین کا کیا نتیجہ بتاؤ گے؟''

''میں یہی کہوں گا کہ یہ محض ایک حادثہ تھا۔'' میں نے اطمینان سے کہا تو سام مسکرا دیا۔

*

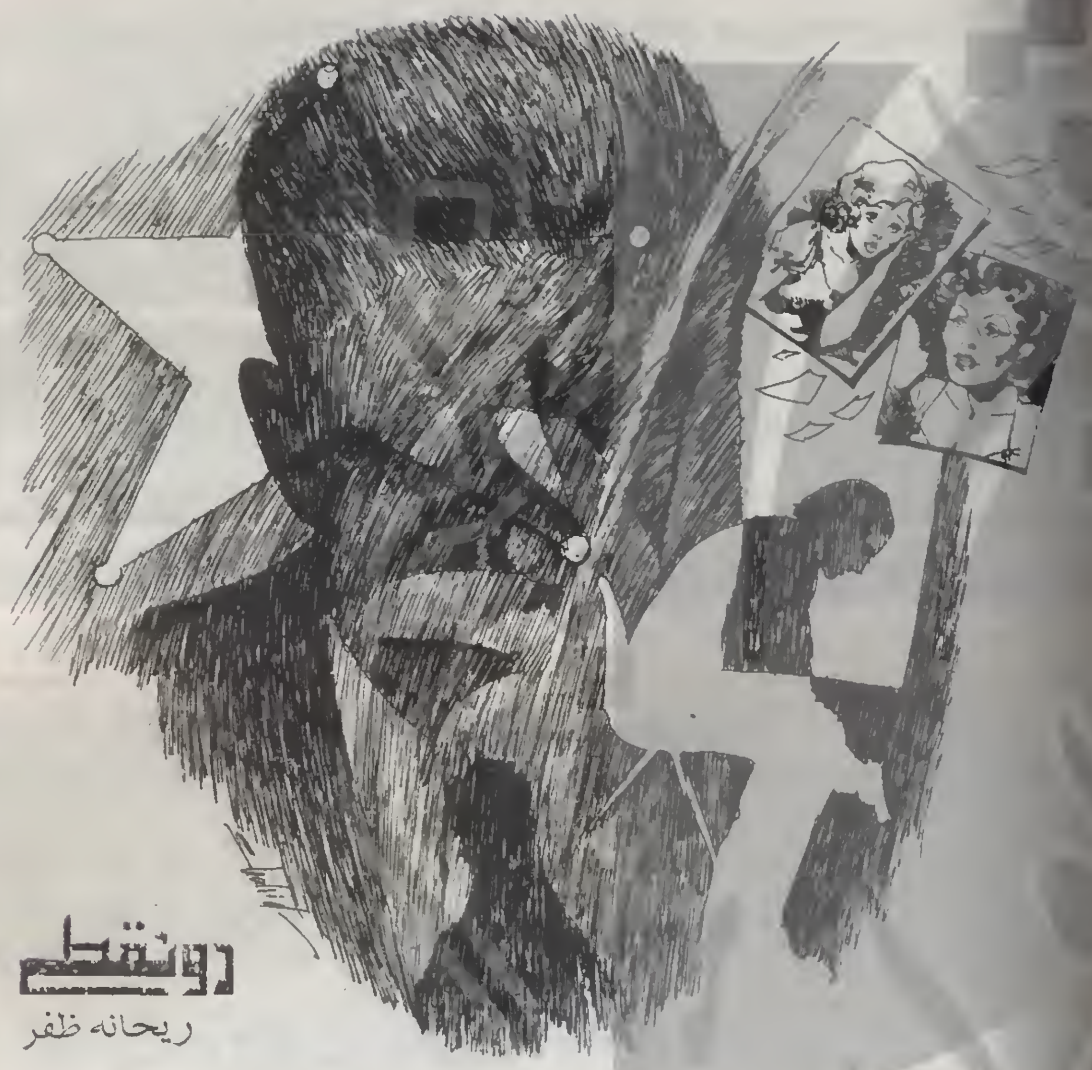

دو نقطے

ریحانہ ظفر

محبت آدمی کو بہادر بنا دیتی ہے اور بزدل بھی! خود غرض بھی اور بے غرض بھی! کچھ ایسا ہی اس عاشق کے ساتھ بھی تھا محبت نے اسے مظلوم بھی بنا دیا تھا اور ظالم بھی!

.....

دن کے دو بجے برف باری کا آغاز ہوا تو موسم اتنا خراب نہیں لگ رہا تھا مگر بعد میں برف باری میں اتنی شدت پیدا ہو گئی کہ چار بجے تک پورا شہر برف سے ڈھک چکا تھا۔ تمام گھروں کی چھتیں برف سے اَٹ چکی تھیں۔ سڑکوں پر کئی کئی فٹ برف پڑ چکی تھی۔ اس پر یخ بستہ ہوائیں ہڈیوں میں گودا تک جمائے دے رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ہی برف صاف کرنے والی گاڑیاں سڑکوں پر آ گئیں اور انہوں نے صفائی کا کام شروع کر دیا۔

میں شیرف کے دفتر میں کھڑکی کے پاس کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ میں شیرف کا ڈپٹی تھا اور جولیو کا منتظر تھا کہ وہ آ جائے تو میں گھر جاؤں۔ میری ڈیوٹی ختم ہونے والی تھی

حیاتِ خسرو ازعلامہ شبلی نعمانی

امیر خسرو کو خدا نے فرزندانِ معنوی کے علاوہ اولادِ ظاہری بھی عنایت کی تھی۔ ان کے ایک صاحب زادے کا نام ملک احمد ہے۔ وہ شاعر تھے اور سلطان فیروز شاہ کے دربار میں ندیم تھے ان کی شاعری نے چنداں فروغ حاصل نہیں کیا لیکن شعر و شاعری کے دقائق سے خوب واقف تھے۔ اشعار کے عیب و ہنر کو خوب پرکھتے تھے اور نہایت نازک اور دقیق نکتے پیدا کرتے تھے' چنانچہ اکثر اساتذہ کے اشعار پر جو حرف گیریاں کیں عموماً اہلِ فن اس کو تسلیم کرتے تھے لیکن انصاف یہ ہے کہ امیر صاحب کی یادگار سے ہم اس سے زیادہ توقع رکھتے تھے۔ بدایونی نے ان اصلاحوں کو نقل کر کے سچ لکھا ہے کہ ملک احمد چونکہ خسرو کی یادگار تھے اس لیے بادشاہ اور درباری ان کو بھی امیر کا تبرک سمجھتے تھے اور غنیمت جانتے تھے۔

امیر صاحب کی ایک صاحب زادی تھیں لیکن سخت افسوس ہے کہ اس زمانے میں عورتوں کی ایسی بے قدری تھی کہ امیر کو ان کے پیدا ہونے کا رنج تھا۔ جب وہ سات برس کی ہوئیں تو امیر صاحب نے لیلیٰ مجنوں لکھی۔ اس میں صاحب زادی سے خطاب کرتے ہیں' پہلے آرزو کی ہے کہ کاش تم پیدا نہ ہوتیں یا ہوتیں تو بٹی کے بجائے بیٹا ہوتیں پھر طرح طرح کی تاویلوں سے تسلی دی ہے کہ خدا کے دیے کو کون ٹال سکتا ہے اور آخر میرا باپ بھی تو عورت سے پیدا ہوا اور میری ماں بھی تو آخر عورت تھی۔'' صاحب زادی کو جو نصیحتیں کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عورتوں کی حالت بہت پست تھی۔ امیر صاحب خود صاحب دولت و ثروت تھے لیکن بیٹی سے کہتے تھے کہ خبردار' چرخہ کاتنا نہ چھوڑنا اور کبھی موکھے کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر نہ جھانکنا۔

امیر صاحب کو اپنی والدہ سے بے انتہا محبت تھی۔ بڑی عمر کو بھی پہنچ کر وہ اس جوش محبت سے ماں سے ملتے تھے جس طرح چھوٹے بچے ماں سے لپٹ جاتے ہیں۔ اودھ کی معقول ملازمت صرف اس بنا پر چھوڑ دی تھی کہ ماں دلی میں تھیں اور ان کو یاد کیا کرتی تھیں۔ اودھ سے جب دلی میں آئے ہیں تو ماں سے ملنے کا حال اس جوش سے لکھا ہے کہ لفظ لفظ سے محبت کی شراب ٹپکتی ہے۔

مرسلہ: اقتدار احمد خان' باغ و بہار' خان پور کٹورہ

اور میری جگہ رات کی ڈیوٹی کرنے کے لیے شیرف کا دوسرا ڈپٹی جولیو آنے والا تھا۔ برف باری کے طوفان کی وجہ سے اندیشہ تھا کہ بہت سے حادثات بھی ہوئے ہوں گے مگر ابھی تک ایسی کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ کہیں کوئی ہنگامی صورتِ حال پیش نہیں آئی تھی، اب شام ہونے کو تھی۔ میں کھڑکی میں کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ اگر کہیں سے کوئی اطلاع آ گئی تو میری رات کالی ہو جائے گی۔ شیرف فوسٹر بھی چپ چاپ بیٹھا تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی میرا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا اور ماؤتھ پیس میں کہا۔ ''یہ فوکس ریور کے شیرف کا آفس ہے۔ میں اس کا ڈپٹی گیٹس بول رہا ہوں۔''

''میں ہائیڈن بات کر رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے کسی نے کہا۔ ''شیرف فوسٹر کہاں ہے؟''

''دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور شیرف فوسٹر کی طرف منہ کر کے آہستگی سے کہا۔

''سر! فون پر ہائیڈن ہے... کیا کہوں؟''

''مجھے دو۔'' شیرف نے غصے سے کہا۔ ''میں بات کروں گا۔''

میں نے ریسیور اس کی طرف بڑھا دیا۔ شیرف فوسٹر کے بارے میں پورے شہر کو یہ بات معلوم تھی کہ اس کی محبوبہ رونا کو ہائیڈن نے اس سے چھین لیا تھا۔ ہائیڈن سے ملاقات سے پہلے رونا، شیرف فوسٹر کی دیوانی تھی اور اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔

فوسٹر کی بھی یہی خواہش تھی مگر درمیان میں نہ جانے کہاں سے یہ ہائیڈن کا بچہ آ گیا تھا جو ایک معمولی شکل و صورت کا آدمی تھا۔ مگر چونکہ وہ ایک بڑا ناول نگار تھا، اس لیے رونا اس کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ فوسٹر کی محبت بھی اسے نہ روک سکی۔

آخر اس نے ہائیڈن سے شادی کر لی۔ اس شادی کے بعد شیرف فوسٹر کی محبت کا قصہ ختم ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ شیرف، ہائیڈن سے نفرت کرتا تھا اسی لیے میں نے سوچا تھا کہ وہ اس سے بات کرنا پسند نہیں کرے گا مگر جب اس نے غصے کے عالم میں میرے ہاتھ سے ریسیور لے لیا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کندھے اچکا دیے۔ میں کیا کر سکتا تھا؟ یہ شیرف کا معاملہ تھا۔ میں نے سوچا۔ 'وہ جانے اور اس کا کام جانے۔'

فوسٹر اور میں بہت پرانے دوست تھے۔ ہم دونوں ویت نام کی جنگ کے دوران بھی محاذ پر ساتھ رہے تھے۔ بعد میں وطن واپسی کے بعد جب فوسٹر اس علاقے کا شیرف بن گیا تو اس نے مجھے زبردستی اپنا ڈپٹی بنوا دیا۔

فوسٹر ٹیلی فون پر ہائیڈن سے بات کرنے لگا۔ اسی دوران دروازہ کھلا اور تیز و تند برفانی جھکڑ کے ساتھ ہی میرا ساتھی اور فوسٹر کا دوسرا ڈپٹی جولیو اندر داخل ہوا۔ اس کا اوورکوٹ برف کی وجہ سے سفید ہو رہا تھا۔ اس کے سینے پر ڈپٹی شیرف کا مخصوص پیتل والا چمک دار بیج لگا ہوا تھا۔ اس کے دانت بج رہے تھے۔

''غضب کی سردی ہو گئی ہے۔'' اس نے آتے ہی کہا۔ ''اگر یہ حالت کچھ دیر اور رہی تو پورا شہر جم جائے گا۔''

اسی وقت فوسٹر نے ٹیلی فون بند کیا اور بڑبڑاتا ہوا کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

''گیٹس! میرے ساتھ آؤ۔'' فوسٹر نے کہا۔ ''رونا آج صبح آٹھ بجے فوٹو گرافی کے لیے نکلی تھی۔ وہ ابھی تک واپس نہیں پہنچی ہے۔''

''کہاں گئی تھی وہ؟'' میں نے سوال کیا۔

''ہائیڈن کا کہنا ہے کہ وہ وادی میں گئی تھی۔'' شیرف نے جواب دیا۔

''اوہ! رات ہونے والی ہے... تاریکی میں اور بھی مشکل ہو گی۔'' میں نے فوسٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بے وقوف آدمی نے خود اسے تلاش کرنے میں سارا دن ضائع کر دیا۔'' فوسٹر نے غصے سے کہا۔ ''مجھے اب بتا رہا ہے کہ...''

''ہم کہاں جائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے ہائیڈن کے پاس...'' شیرف فوسٹر نے کہا۔

''اس کے بعد اس کیبن پر جائیں گے جو چند سال پہلے میں نے اور اس نے مل کر بنوایا تھا... وہ یقیناً وہیں کہیں ہو گی... اگر وہ وہاں نہیں ملی تو...'' یہ کہہ کر شیرف خاموش ہو گیا۔

میں اس کی بات کے پیچھے چھپے اندیشے کو سمجھ چکا تھا۔ ظاہر ہے، اس وقت درجۂ حرارت صفر سے بھی نیچے گر چکا تھا۔ ایسے میں اگر رونا گھر سے باہر تھی تو اس کا زندہ بچ جانا ممکن نہیں تھا۔ ویسے بھی دھند اس قدر زیادہ تھی کہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سڑکوں پر برف جمی ہوئی تھی... تاریکی نے ہر طرف ڈیرا ڈال دیا تھا۔

''خدا رحم کرے رونا پر!'' میں نے دل ہی دل میں کہا۔

☆☆☆

ہائیڈن اور رونا کا گھر شہر سے دس میل دور مضافات میں تھا۔ اس کے گھر تک جانے کے لیے ایک تنگ راستہ تھا۔ اسے پختہ بھی رونا کی فیملی نے ہی کرایا تھا۔ رونا کے دادا کا شہر کے مال دار ترین آدمیوں میں شمار ہوتا تھا مگر وہ بلا کے کنجوس تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ اس شخص نے ساری زندگی اپنی دولت کی حفاظت کرنے میں لگا دی تھی۔ اس کے ساتھ ''چمڑی جائے دمڑی نہ جائے'' والی بات تھی۔ بہرحال، اب وہ مر چکے تھے اور اس فیملی کے باقی لوگ بھی دنیا سے جا چکے تھے۔ صرف رونا اور اس کا بڑا بھائی ڈالٹن ہی زندہ بچے تھے۔ لہٰذا خاندان کی تمام دولت اور جائیداد کے مالک یہ دونوں بہن بھائی تھے۔

رونا اتنی مال دار تو تھی مگر ابھی تک وہ اپنی دولت سے فیضیاب نہیں ہو سکی تھی کیونکہ اس کی دولت پر اس کا بڑا بھائی ڈالٹن قابض تھا۔ البتہ وہ یہ ضرور کرتا تھا کہ رونا کے کسی کام میں مداخلت نہیں کرتا تھا۔ وہ جو چاہتی، کر سکتی تھی۔ اس نے اپنی مرضی سے شیرف سے عشق کیا۔ اپنی مرضی سے ہائیڈن سے شادی کی۔ اس کا ایک اور شوق بھی تھا... وہ تھا پرندوں اور جانوروں سے محبت!

وہ ہر وقت کیمرا ساتھ لیے ان کی تصویریں بناتی رہتی تھی۔ یہ پوری وادی اسی کے خاندان کی ملکیت تھی۔ کئی ایکڑ پر پھیلی ہوئی اس وادی میں پہاڑیاں بھی تھیں اور جنگل بھی۔ ایک پہاڑی چشمہ اور ایک جھیل بھی تھی۔ وہ اس وادی کے حسن سے خوب لطف اندوز ہوتی تھی اور اس نے اس کے قدرتی حسن کو اپنے کیمرے میں قید کر لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اس کی کئی تصویری کتابیں منظرِ عام پر آ چکی تھیں اور وہ ایک قدرتی عکاس اور جنگلی حیات کی فوٹو گرافر کی حیثیت سے ایک اہم مقام حاصل کر چکی تھی۔

ہائیڈن ایک منحنی سا انسان تھا۔ وہ عمر میں رونا سے لگ بھگ پندرہ سال بڑا تھا۔ وہ نیویارک کا ایک بڑا ناول نگار تھا۔ ایک بار رونا نیویارک گئی تو ہائیڈن سے ملی۔ مختصر ملاقات کے بعد ہی اس نے ہائیڈن سے شادی کا فیصلہ کرلیا اور شادی کے بعد زبردستی اسے نیویارک سے لے آئی۔ ہائیڈن ایک نفیس اور شائستہ انسان تھا۔ اس نے شادی کے بعد رونا سے ہمیشہ اچھا سلوک کیا۔

جب ہم ہائیڈن کے گھر پہنچے تو وہ ہم سے ملنے باہر آگیا۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ شیرف فوسٹر کے مقابلے میں کہیں پستہ قد اور کمزور تھا، عمر میں بھی اس سے خاصا بڑا تھا... میں سوچ رہا تھا کہ نہ جانے رونا کو اس بوڑھے ناول نگار میں ایسی کیا بات نظر آگئی تھی کہ اس نے شیرف فوسٹر سے ترکِ تعلق کر کے اسے اپنے دل میں بسالیا تھا۔ مجھے تو ہائیڈن میں کوئی کشش نظر نہیں آئی۔

''فوسٹر! میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' ہائیڈن بولا۔

''ٹھیک ہے مگر یہ بتاؤ کہ وہ اس کیبن کی طرف تو نہیں گئی جو اس نے جھیل سے تھوڑی دور بنوایا تھا؟'' فوسٹر نے پوچھا۔

''ہاں، وہ کہہ رہی تھی کہ اس نے وہاں قطبی پرندے دیکھے ہیں۔'' ہائیڈن نے جواب دیا۔ ''وہ انہی کی تصاویر اتارنے کو بے چین تھی۔ یقینی طور پر ادھر ہی گئی ہوگی۔''

''وہ پیدل گئی تھی یا برف پر چلنے والی کار لے گئی تھی؟'' فوسٹر نے سوال کیا۔

''اسنوموبائل لے گئی تھی۔'' ہائیڈن نے جواب دیا۔ ''حالانکہ اس کی آواز سے پرندے اڑ جاتے ہیں اور انہیں دوبارہ کہیں بیٹھنے میں وقت لگ جاتا ہے۔''

''اوہ! میں تو سوچ رہا تھا کہ اسنوموبائل میں چلیں گے۔'' فوسٹر نے کہا تو ہائیڈن بولا۔ ''میرے پاس دو ہیں۔ ایک رونا لے گئی ہے، دوسری میرے پاس ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' شیرف نے کہا اور ہائیڈن اسنوموبائل نکالنے کے لیے اندر چلا گیا۔

☆☆☆

تھوڑی دیر میں ہم تینوں رونا کی تلاش میں روانہ ہو گئے۔ باہر ہر طرف برف ہی برف تھی مگر درختوں کی موجودگی نے ہوا کے زور کو کم کر دیا تھا۔ اسنوموبائل کی تیز سرچ لائٹ گردش کر رہی تھی جس کی روشنی میں برف کے سفید ذرات چمک رہے تھے۔

جیسے ہی ہم ایک چھوٹے چشمے کے کنارے پہنچے تو تیز اور کاٹ دار ہوا نے ہمارا استقبال کیا۔ اسنوموبائل کا انجن غرانے لگا۔ شاید وہ اتنا لوڈ نہیں اٹھا پا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں گاڑی سے اتر گیا اور پیدل ہی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ہائیڈن اور فوسٹر گاڑی میں ہی تھے۔

گاڑی آگے بڑھ گئی۔ میں پیچھے ہی تھا کہ مجھے سفید برف پر کوئی بڑی سی چیز پڑی نظر آئی تو میں نے چیخ کر ہائیڈن کو رکنے کو کہا۔ پہلے تو ہوا کے شور کی وجہ سے وہ نہیں سن سکا مگر بعد میں اس نے میری آواز سن لی اور میرے ہاتھ ہلانے پر اپنی اسنوموبائل کا رخ واپس میری طرف کر دیا۔ میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ دائیں طرف کچھ نظر آرہا ہے۔ اس نے اپنی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کا رخ اس طرف کر دیا۔

ہمارے سامنے ایک اسنوموبائل الٹی پڑی تھی۔ ظاہر ہے، وہ رونا کی گاڑی تھی۔ ہائیڈن نے گاڑی رفتہ رفتہ آگے بڑھائی اور اس کے قریب لے جا کر روک دی۔ گاڑی کی تیز روشنی میں منظر واضح ہو چکا تھا۔ برف پر رونا بے سدھ پڑی تھی۔ اس کا آدھا جسم برف سے ڈھک چکا تھا۔ اس کے اوپر جس طرح گاڑی گری تھی، اس کے بعد اس کے زندہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں، فوسٹر اور ہائیڈن تینوں ہی گویا منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ ہمارے سروں پر برف بھی گر رہی تھی اور سرد ہوا تھپیڑے لگا رہی تھی مگر ہم اس منظر میں گویا گم ہو کر رہ گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہمیں ہوش آیا تو ہم نے رونا کی لاش کو اٹھا کر اسنوموبائل میں رکھا اور واپس چل دیے۔ اس بار میں اور فوسٹر دونوں پیدل چل رہے تھے۔

برف باری اور تیز ہوا کا طوفان مسلسل جاری تھا۔ ہم ہائیڈن کے گھر پہنچ گئے۔ دو گھنٹے بعد ایمبولینس آگئی۔ رونا کی لاش کے ساتھ ہائیڈن اور فوسٹر اسپتال چلے گئے جبکہ میں اس کے گھر میں ہی رک گیا۔ میں نے سوچا تھا کہ صبح کی روشنی میں جائے حادثہ کا ایک بار تفصیل سے جائزہ لوں گا تاکہ حادثے کی وجہ کا تعین ہو سکے۔

☆☆☆

دروازے پر ہونے والی دستک سے میری آنکھ کھلی۔ میں نے اس آواز پر غور کیا۔ جب مجھے یہ پتا چلا کہ میں اپنے گھر میں نہیں ہوں تو میں اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس جگہ کا جائزہ لیا تو سب کچھ یاد آگیا۔ دروازے پر ہائیڈن اور رونا کی ملازمہ لیوی تھی۔ اس سفید بالوں والی ادھیڑ عمر عورت

سے میں پہلے سے واقف تھا۔

''تم... یہاں؟ میڈم رونا کہاں ہے؟'' لیوی نے پوچھا۔ ''اور صاحب بھی نظر نہیں آرہے۔'' وہ بہت حیران تھی۔

''تمہاری میڈم رونا مر چکی ہے۔'' میں نے اسے بتایا تو مجھے ایسے دیکھنے لگی جیسے اسے میری دماغی صحت پر شک ہو۔ میں نے اسے گزشتہ رات کے حادثے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ رونا کی لاش اسپتال پہنچا دی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہائیڈن بھی ہے۔

''بے چارہ!'' لیوی نے کہا۔ ''وہ پہلے ہی پریشان تھا کہ یہ نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔''

''پریشان تھا... کیوں؟ کس لیے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ہائیڈن اپنی بیوی رونا سے بے حد محبت کرتا ہے۔'' لیوی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''مگر اس کا اس جگہ دل نہیں لگا تھا۔ وہ نیویارک جانا چاہتا تھا مگر اس طرح کہ رونا کا دل نہ ٹوٹے۔ وہ اسے ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن اس کی خواہش سے بھی واقف تھا۔ اس لیے وہ زبان سے کچھ نہیں کہتا تھا مگر دل ہی دل میں بے حد کڑھتا تھا۔ بہرحال، اب تو وہ مر گئی۔''

''باہر موسم کیسا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل صاف۔'' لیوی نے کہا۔ ''برف صاف کرنے والی مشینوں نے سڑک صاف کر دی ہے۔''

''ٹھیک ہے... میں چلتا ہوں۔ بس تم مجھے کافی پلوا دو۔'' یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''صرف کافی کیوں؟ میں ناشتا تیار کرتی ہوں۔'' لیوی نے کہا اور کچن کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

ہائیڈن کی اسنوموبائل میں، میں دوبارہ جائے حادثہ پر پہنچا۔ اب وہاں کا منظر بالکل واضح تھا۔ راستہ ناہموار اور اونچا نیچا تھا جس کی وجہ سے گاڑی کو مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔ یقیناً طوفان میں رونا راستہ بھٹک گئی ہوگی۔ کسی گڑھے کی وجہ سے اسے جھٹکا لگا ہوگا اور وہ اچھل کر باہر گر گئی ہوگی۔ پھر اس کی اسنوموبائل اس کے اوپر گر گئی ہوگی۔ ممکن ہے وہ فوراً مر گئی ہو اور ممکن ہے کہ وہ برف کے طوفان میں پھنس کر مدد کے لیے پکارتی رہی ہو اور سردی کی وجہ سے ٹھٹھر کر مر گئی ہو۔ اس کی موت کی وجہ تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی معلوم ہو سکتی تھی۔

کافی دیر تک میں اس جگہ کا جائزہ لیتا رہا۔ کاش...

بیرونِ ملک مقیم قارئین

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ، ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

کے

سالانہ خریدار

بن کر بذریعہ رجسٹرڈ ائر میل

اپنا پسندیدہ ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کریں

ایشیا یورپ اور افریقہ کے لیے فی ڈائجسٹ

زرسالانہ 4000 روپے یا 65 امریکی ڈالر

امریکہ، آسٹریلیا، کینیڈا اور نیوزی لینڈ کے لیے فی ڈائجسٹ

زرسالانہ 5000 روپے یا 80 امریکی ڈالر

اپنے ڈرافٹ اور منی آرڈر ادارے کے نام، درج ذیل پتے پر ارسال کریں۔ یہ کراچی میں قابل ادائیگی ہونا ضروری ہیں۔ بیرونِ شہر ادائیگی کی صورت میں کوریئر چارجز اور بینک کمیشن کے 500 روپے اور بیرونِ ملک ادائیگی والے ڈرافٹ وغیرہ پر اس مد میں 20 امریکی ڈالر کا اضافہ کرلیں

رابطے کے لیے

ثمر عباس: 0301-2454188

یا

بدرالدین سرکولیشن منیجر

فون نمبر (92)(21)5802552,5804200

فیکس نمبر (92)(21) 5802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C PHASE II EXTENSION ,
D.H.A., MAIN KORANGI ROAD,
,KARACHI 75500
E-MAIL :JDPGROUP@HOTMAIL.COM

میرے پاس کیمرا ہوتا تو میں اس جگہ کی تصویریں اتار لیتا۔ اچانک مجھے ہائیڈن کی بات یاد آئی۔ اس نے بتایا تھا کہ رونا کیمرا لے کر قطبی پرندوں کی تصویریں اتارنے گئی تھی۔ اس کا کیمرا یہیں کہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اس کے کیمرے کی تلاش میں نظریں دوڑانی شروع کیں۔ کوئی آدھے گھنٹے کی محنت کے بعد مجھے برف میں دبا ہوا کیمرا مل گیا۔ میں نے اسے اٹھایا اور جلدی جلدی جائے حادثہ کی کئی تصویریں اتارنے کے بعد واپس چل دیا۔

☆☆☆

کنگز فوٹو اسٹوڈیو پر رک کر میں نے رونا کا کیمرا کنگ کے حوالے کر دیا تاکہ وہ تصاویر تیار کر دے۔

''جب تصویریں تیار ہو جائیں تو مجھے فون کر دینا۔'' میں نے کنگ سے کہا اور اپنے دفتر پہنچا۔ وہاں صرف جولیو تھا۔

میں نے فوسٹر کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا۔ ''وہ ہائیڈن کو اس کے گھر لے گیا ہے۔ ممکن ہے، وہ ڈائلن کی طرف بھی گیا ہو۔ رونا کا بھائی اپنی بہن کی موت پر بے حد دکھی ہے۔''

''کوئی اور خاص بات؟'' میں نے پوچھا تو جولیو نے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ بھی خاصا افسردہ لگ رہا تھا۔

''تم نے کوئی چھان بین کی؟'' جولیو نے سوال کیا۔

''مجھے تو یہ حادثہ ہی لگ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر ایک الجھن یہ ہے کہ رونا اس علاقے کے چپے چپے سے واقف تھی۔ وہ آسمان کو دیکھ کر طوفان کی آمد کی اطلاع دے دیا کرتی تھی۔ ایسا کیسے ہو گیا کہ وہ اچانک ہی طوفان میں پھنس گئی...؟''

''ممکن ہے، اس کے فوٹوگرافی کے جنون نے اسے واپس آنے نہ دیا ہو۔'' جولیو نے کہا۔ ''یا اسے وہ منظر اتنا اچھا لگ رہا ہو کہ اس نے وہاں رکنے کا خطرہ مول لے لیا ہو... وہ بہت اچھی فوٹوگرافر تھی۔''

میں دفتر سے نکل کر اسپتال پہنچا۔ ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ رونا کی موت کی وجہ اس کی ریڑھ کی ہڈی کا ٹوٹنا ہے۔ اس کی گردن بھی ٹوٹ گئی تھی۔

''ہم نے اسے اسنوموبائل کے نیچے دبا ہوا پایا تھا۔'' میں نے ڈاکٹر کو بتایا۔ ''اس حساب سے اس کی ساری پسلیاں ٹوٹ گئی ہوں گی اور اندر کئی جگہ سے خون وغیرہ بھی نکلا ہوگا۔''

''فی الحال اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''تفصیلی رپورٹ بعد میں آئے گی۔''

میں ڈاکٹر سے مل کر اپنے گھر پہنچا تاکہ تھوڑی بہت نیند لے لوں مگر نیند نہیں آئی۔ میرا ذہن مسلسل اس کیس میں الجھا ہوا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ رونا کی موت اس طرح نہیں ہوئی ہے جس طرح ہم سمجھ رہے ہیں بلکہ اصل کہانی کچھ اور ہے... مجھے حقیقت کو تلاش کرنا تھا۔

☆☆☆

آخر میں نے بستر چھوڑ دیا اور اپنے لیے ایک کپ گرما گرم کافی کا تیار کیا۔ جیسے جیسے میں اس کے گھونٹ لے رہا تھا، ویسے ویسے میرا دماغ کام کر رہا تھا۔

میں گھر سے نکلا اور سیدھا کنگز اسٹوڈیو پہنچا۔ وہاں تصویریں تیار تھیں۔ میں نے کنگ سے لفافہ لے کر تصویریں باہر نکالیں اور ان پر نظریں دوڑانے لگا۔ کچھ تصویریں جائے حادثہ کی تھیں جو میں نے کھینچی تھیں جبکہ باقی تصویریں رونا کی کھینچی ہوئی تھیں۔ وہ واقعی قابلِ دید تصاویر تھیں۔ ان میں فطرت کا حسن نمایاں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رونا بہت اچھی فوٹوگرافر تھی۔

یکایک ایک تصویر پر میری نظریں جم گئیں۔ وہ برف کی ڈھلوان پر ایک دھبا سا تھا جس نے میری توجہ اپنی جانب کھینچ لی تھی۔ اس تصویر میں یقیناً کوئی عجیب بات تھی۔ اس وادی کے حسن، اس کے درختوں، پرندوں اور جانوروں سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ ایسے میں کوئی عجیب سا دھبا... بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میرا ذہن چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

''کنگ! تمہارے پاس محدب عدسہ ہے؟'' میں نے پوچھا تو وہ بھی چونکا۔ اس نے میز کی دراز میں سے عدسہ نکال کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے محدب عدسے کی مدد سے تصویر کو دیکھا تو وہ دھبا تھوڑا سا اور نمایاں ہو گیا مگر اس کا کوئی واضح نقشہ نہیں تھا۔ کبھی ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی انسان ہے اور کبھی ایسا لگتا تھا جیسے وہ کوئی جانور ہے۔

''اس تصویر کو بڑا کر سکتے ہو؟'' میں نے کنگ سے کہا۔

''ہاں... مگر بہت زیادہ بڑا کرنے سے تصویر دھندلی ہو جائے گی۔'' کنگ نے تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس حد تک بڑا کر دو کہ یہ تصویر... اور بالخصوص اس میں موجود یہ دھبا واضح ہو جائے۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں کل پہنچا دوں گا۔'' کنگ نے کہا اور میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

راستے بھر میرا دماغ اس تصویر میں الجھا رہا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی انسان ہے... لیکن رونا کی پرائیویٹ

...جنبی کا کیا کام؟ کہیں وہ ہائیڈن تو نہیں ہے؟

☆☆☆

...پنے دفتر میں موجود تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ ...۔ وہ گزشتہ رات سے جاگ رہا تھا۔

...پھر رہے ہو؟'' اس نے مجھ سے سوال کیا تو میں ...ت کا کوئی جواب نہیں دیا اور اسپتال کا نمبر ملانے ...ہونے پر میں نے ڈاکٹر سے بات کی۔

...ہارا خیال صحیح ہے۔'' ڈاکٹر نے مجھے بتایا۔ ''رونا کی ...اں ٹوٹ چکی ہیں مگر اس کے اندر نہ تو زخم ہیں اور نہ ...ون نکلا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ گاڑی کے ...ے سے پہلے ہی مر چکی تھی۔''

''...یا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

...ی گردن کی ہڈی پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی۔'' ڈاکٹر ...ب ...یا۔ ''پھر اس پر اسنوموبائل گر گئی۔''

...اس کی گردن کی ہڈی کیسے ٹوٹی؟'' میں نے پوچھا۔

...کی زوردار ضرب سے یا دباؤ سے۔'' ڈاکٹر نے

...میں آ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر ...نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ آخر اس نے کہا۔ ...ل تو بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟''

میں نے اسے ڈاکٹر سے ہونے والی تازہ گفتگو اور اس ...تصویر کے بارے میں سب کچھ بتا دیا اور کہا۔ ''میرا ...یہ تصویر میں جو دھبا ہے، وہ کوئی آدمی ہے اور ممکنہ ...رونا کا قاتل ہے۔ اس نے رونا کو ہلاک کرنے ...بعد اس کی اسنوموبائل اس کے مُردہ جسم پر گرا دی تاکہ ...ت حادثاتی لگے۔''

''...رونا کو کون قتل کر سکتا ہے؟'' فوسٹر نے سنجیدگی سے ...تو کوئی بھی دشمن نہیں ہے۔''

''...ایک دولت مند عورت تھی۔'' میں نے کہا۔ ...مندوں کے سو دشمن ہو سکتے ہیں۔ ہمیں اس کے وکیل ...معلوم کرنا چاہیے کہ اس کے وارث کون ہیں۔''

''...ت۔'' فوسٹر نے غصے سے کہا۔

''...میرے باس ہو... میں نے جو سمجھا، کہہ دیا۔ اگر تم ...میں بات کرنا پسند نہیں کرتے تو ٹھیک ہے۔ میں اب ...گا۔'' میں نے کہا۔

...مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ٹیلی فون سیٹ اپنی ...اور ایک نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆☆☆

گفتگو سے فارغ ہونے کے بعد شیرف فوسٹر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''رونا دولت مند ضرور تھی مگر اس کا اس دولت پر کوئی اختیار نہیں تھا۔ اسے صرف ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ اس کی ساری دولت کا نگراں اس کا بڑا بھائی ڈائلن ہے۔ اسے اس وقت تک رونا کی دولت اور جائیداد کی نگرانی کرنی تھی جب تک رونا کی شادی کو ایک سال نہ ہو جاتا۔ اس ساری چکر بازی کا مطلب یہ تھا کہ رونا سے کوئی بھی شخص شادی کرنے کو تیار نہ ہو اور وہ کنواری ہی رہ جائے۔

''وکیل کے بیان کے مطابق، یہ طے کیا گیا تھا کہ اگر رونا نے شادی کی اور وہ اسے ایک سال تک قائم رکھنے میں کامیاب رہی تو اسے قانوناً اپنی دولت و جائیداد پر مکمل اختیار حاصل ہو جائے گا۔ لیکن اگر وہ شادی ایک سال سے پہلے ختم ہو گئی تو ڈائلن بہ دستور اس کی تمام دولت و جائیداد کا نگراں رہے گا۔ دوسری طرف رونا کی موت کی صورت میں بھی سب کچھ خود بہ خود ڈائلن کو منتقل ہو جائے گا۔''

''اور ہائیڈن؟'' میں نے سوال کیا۔

''وکیل کا کہنا ہے کہ اگر رونا شادی کے ایک سال کے اندر اندر مر جاتی ہے تو اس کے شوہر کو ایک لاکھ ڈالرز ملیں گے لیکن اگر یہ شادی ہی ختم ہو گئی تو اس کے شوہر کو کچھ نہیں ملے گا۔'' فوسٹر نے کہا۔

''پھر تو ہمیں ان دونوں سے بات کرنی ہو گی۔'' میں نے کہا۔ ''رونا کی ملازمہ لیوی کا کہنا ہے کہ ہائیڈن رونا کو چھوڑ کر واپس نیویارک جانے والا تھا۔ اس کا دل یہاں نہیں لگ رہا تھا۔ رونا کی موت کے بعد اس کا راستہ صاف ہو گیا۔ ایک لاکھ ڈالرز الگ ملیں گے۔ یہ خاصی معقول رقم ہے۔''

''تم ہائیڈن کو دیکھو۔'' فوسٹر نے کہا۔ ''اور میں ڈائلن کی طرف جا رہا ہوں۔''

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد ڈائلن اور ہائیڈن شیرف کے آفس میں موجود تھے۔ میں اور فوسٹر ان سے بات چیت کر رہے تھے۔ ڈائلن اس بات پر سخت ناراض تھا کہ اس پر اس کی بہن کے قتل کا شبہ کیا جا رہا ہے۔ دوسری جانب ہائیڈن سراسیمہ نظر آ رہا تھا۔ ان دونوں نے ہی اس بات سے انکار کیا تھا کہ انہوں نے رونا کو قتل کیا ہے۔

''یہ کام تمہارا ہے۔'' اچانک ڈائلن نے ہائیڈن سے کہا۔ ''تم لالچی ہو۔ اس کی دولت حاصل کرنا چاہتے

www.urdutech.com

تھے۔''

''مجھے دولت کی کوئی تمنا نہیں ہے۔'' ہائیڈن نے زخمی لہجے میں کہا۔ ''میں پہلے بھی دولت کے بغیر رہتا تھا اور آئندہ بھی رہ لوں گا۔''

''صرف تمہیں یہ معلوم تھا کہ رونا کہاں گئی ہے۔'' ڈاکلن نے ہائیڈن پر پھر الزام لگایا۔

''بکواس ہے یہ... سراسر الزام ہے۔'' ہائیڈن چیخا۔

فوسٹر نے گہری نظروں سے ڈاکلن کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔ ''مجھے رونا کو ہلاک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہائیڈن اسے چھوڑ کر جانے والا تھا۔ اس کے بعد سب کچھ میرے ہی ہاتھ میں رہتا۔ ایسے میں مجھے اس کو ہلاک کرنے کی کوئی تک نہیں بنتی۔''

غرضیکہ وہ دونوں ایک دوسرے پر الزام لگاتے رہے مگر ان میں سے ایک نے بھی یہ بات تسلیم نہیں کی کہ رونا کو قتل کس نے کیا ہے۔ شیرف کی حالت عجیب تھی۔ کبھی وہ ڈاکلن کی طرف جھک جاتا اور ہائیڈن کو شک کی نظر سے دیکھنے لگتا تو کبھی ہائیڈن کے ساتھ نرمی کا سلوک کر کے ڈاکلن کو مشتبہ قرار دے دیتا۔ میں ان تینوں کے درمیان ہونے والی تلخ گفتگو سن رہا تھا۔ میرا دماغ بھی مسلسل کام کر رہا تھا۔ آخر شیرف نے ان دونوں کو جانے کی اجازت دے دی۔ وہ چلے گئے تو فوسٹر نے اپنا سر پکڑ لیا۔

''گینس! تم بتاؤ کہ مجرم کون ہے...؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے تو ڈاکلن پر شک ہے۔'' میں نے کہا تو شیرف اٹھا اور بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے سے باہر چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے رک کر میری طرف دیکھا تو میں نے کہا۔ ''وہ بڑی تصویر آنے دو، ممکن ہے ہم کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔''

''ہاں۔'' اس نے اس انداز سے کہا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہیں ہو۔

''فوسٹر! رونا تمہاری محبوبہ تھی۔ کبھی تم اسے بے حد چاہتے تھے، اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار رہتے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر اس کی موت پر تم اس طرح گم صم ہو کہ مجھے ڈر لگ رہا ہے... کہیں یہ خاموشی تمہیں توڑ کر نہ رکھ دے۔''

''میں ٹھیک ہوں۔'' فوسٹر نے کہا۔ ''بس ذرا تھک گیا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ گویا گھسٹتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا، وہ اپنی کار میں سوار ہو رہا تھا۔ ادھر اس کی کار وہاں سے روانہ ہوئی اور ادھر کنگ کی کار وہاں پہنچ گئی۔ کنگ سیدھا میرے کمرے میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا لفافہ تھا۔

اس نے لفافہ میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔''

میں نے لفافے میں سے تصویر نکال کر میز پر نیچے کر لی۔ اب وہ منظر بالکل واضح تھا۔ بلاشبہ وہ آدمی تھا لیکن اس کی صورت واضح نہیں تھی۔ وہ براؤن کوٹ پہنے تھا اور کیمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ واضح نہیں تھا البتہ دو چمک دار نقطے نظر آر ہے تھے۔ وہ غالباً اس کی آنکھیں تھیں۔ یکایک میرا دل زور سے دھڑکا اور مجھے معلوم ہو گیا کہ رونا کو کس نے قتل کیا ہے... اس کا قاتل میری نظروں کے سامنے تھا۔ میں نے تصویر لفافے میں ڈالی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے کنگ کا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔ وہ حیرت سے مجھے باہر جاتا دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

میں نے شیرف فوسٹر کے گھر کے سامنے اپنی کار روکی اور کار سے نکل کر اس کے مکان کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ فائر کی آواز سنی۔ وہ آواز فوسٹر کے گھر کے اندر سے آئی تھی۔ میری رگوں میں گویا خون جمنے لگا۔ میرے دل نے دھڑکنے سے انکار کر دیا۔ اس کے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر میں لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہوا تو ایک دل خراش منظر نے مجھے گویا ساکت کر دیا۔ آتش دان کے قریب کرسی پر شیرف فوسٹر لڑھکا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہ پستول ابھی تک موجود تھا جس سے اس نے خودکشی کی تھی۔ لیمپ کے نیچے میرے نام خط لکھا تھا جس میں صرف یہ لکھا تھا۔ ''میں رونا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔''

میں شیرف کو خوب جانتا تھا۔ اس نے اپنے تمام دکھ اپنے دل کے اندر چھپا لیے تھے۔ وہ رونا کو کبھی نہیں بھول سکا تھا۔ جب بات اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تو اس نے پہلے رونا کو ہلاک کر دیا اور بعد میں خود کو... میں نے اس لفافے پر نظر ڈالی جس میں وہ تصویر موجود تھی جو میں شیرف کو دکھانے آیا تھا۔ اس تصویر میں جو دو چمک دار نقطے نظر آر ہے تھے، ان کی مدد سے میں نے رونا کے قاتل کو پہچانا تھا۔ وہ نقطے دراصل شیرف کا بیج تھا جو روشنی کے منعکس ہونے کی وجہ سے تصویر میں آ گیا تھا ورنہ شاید مجھے زندگی بھر پتا نہ چلتا کہ رونا کو کس نے قتل کیا تھا۔

عجیب بستی

بابر نعیم

ایک عجیب بستی اور اس کے عجیب تر باسیوں کا احوال۔ صحرا اور سونے کے پراسرار راز ان کے سینوں کی گہرائی میں دفن تھے... اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ!

...حال طیارہ مراکش کے شہر رباط سے روانہ ہوا ... کی منزل تین ہزار میل دور وسطی افریقا میں ایک ... تھی جو جنگ عظیم دوم میں اتحادی افواج نے ... فوجوں پر فضائی حملوں کے لیے تخلیق کی تھی۔ ... سیاحوں کو لانے اور لے جانے والے طیاروں ... میں تھی۔ ایر اسٹرپ نائجر کے دارالحکومت ... شمال مغرب میں کوئی سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھی۔ ... الجزائر اور مالی کی سرحدیں زیادہ دور نہیں تھیں۔ ... میں دو پائلٹوں کے علاوہ گیارہ افراد تھے۔ ڈاکٹر ... تعلق برطانیہ سے تھا وہ گلاسگو یونیورسٹی میں ... کا پروفیسر تھا۔ دوسری اس کی نائب انجیلا روسٹن ... تین افراد جین گائے، ہارڈورڈ اور مائیکل کاسنے کا تعلق ... تھا اور یہ تینوں بھی آثاریات کے ماہر تھے۔ ڈاکٹر ... من تھا۔ ہیری بیئر کا تعلق فرانس سے تھا۔ ماریو روسی کا تعلق اٹلی سے تھا اور نالینا روس سے آئی تھی۔ ٹیم کے باقی دو افراد میں ٹیم کا منیجر عبدالناصر جو ناصر کہلاتا تھا مصر سے تھا اور اس کی نائب صوفیہ بوسنیا سے آئی تھی۔ یہ ٹیم نائجر میں دریافت ہونے والی ایک قدیم تہذیب کے کھنڈرات پر تحقیقات کرنے جا رہی تھی۔ گیارہ افراد کے علاوہ ان کا تقریباً تین ٹن سامان بھی اس پرانے سیسنا طیارے پر بار تھا۔ اس میں ذاتی سامان کم اور مہم کے آلات اور رسد کا سامان زیادہ تھا۔

پائلٹوں کا تعلق افریقا سے تھا۔ احمد بن محمد الجزائر کی ایر فورس میں تھا اور وہاں سے فرار ہو کر مراکش آیا تھا جبکہ رفیق بن بیلا مراکش کا ہی تھا۔ عبدالناصر سے ان کے پرانے تعلقات تھے اور اس سے پہلے بھی وہ بے شمار بار افریقا کے مختلف خطوں میں جا چکے تھے۔ ناصر کا کام یہی تھا۔ رباط سے انہیں روانہ ہوئے چار گھنٹے گزر چکے تھے اور وہ اپنی منزل

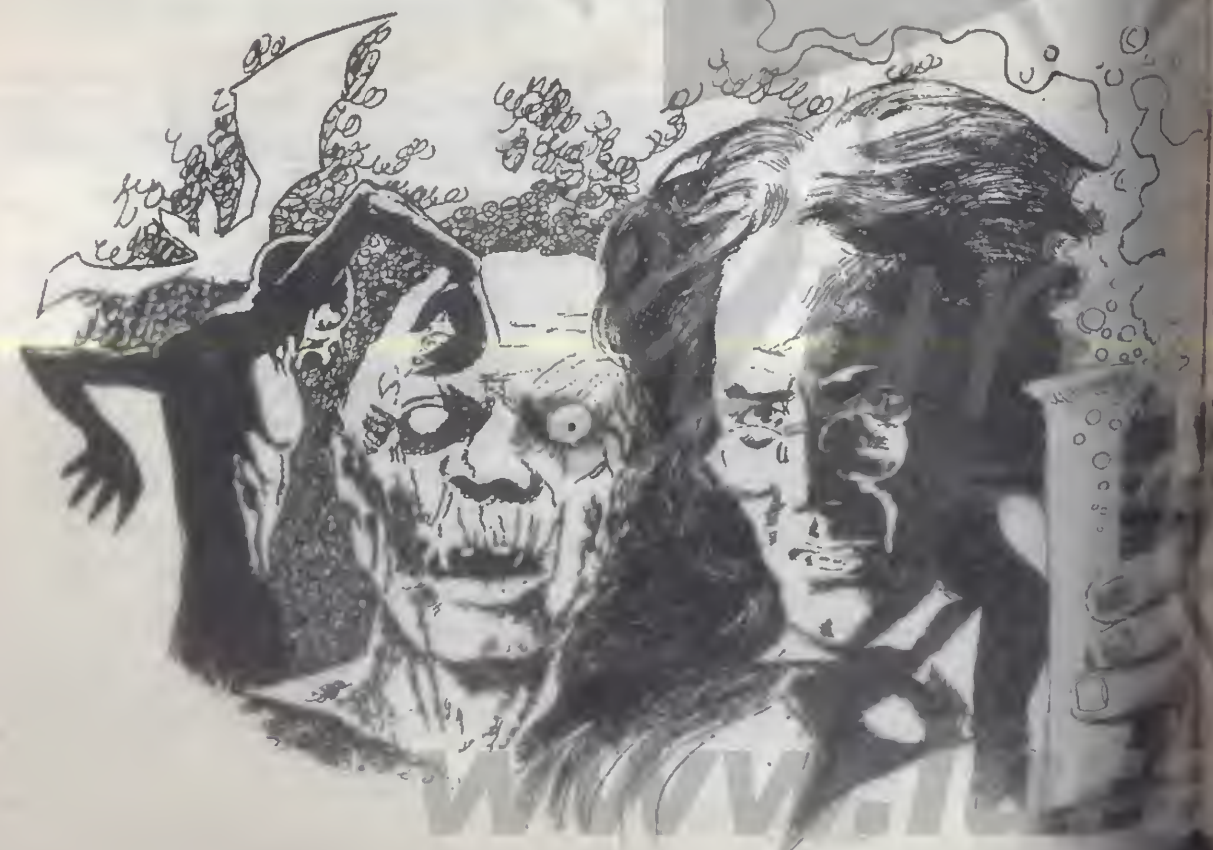

سے چودہ سو میل کے فاصلے پر تھے۔ نیچے صحرائے سہارا اپنی پوری وسعت اور تنہائی کے ساتھ پھیلا تھا۔ یہ الجزائر کا جنوبی حصہ تھا اور یہاں دور دور تک کوئی بستی نہیں تھی، صرف خانہ بدوشوں کے قافلے سفر کرتے تھے۔ ان خانہ بدوشوں کے سوا کوئی صحرا کی ان وسعتوں میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ یہ خانہ بدوش زیرِ زمین پانی کے ذخائر کے بارے میں جانتے تھے اور ان کو چھپا کر رکھتے تھے۔ اس طرح وہ وسطی افریقا سے شمالی افریقا تک جانے میں کامیاب ہوتے تھے۔ ناصر کے برابر والی نشست پر ڈاکٹر ڈین ایک موٹی سی کتاب میں گم تھا۔ یہ وسطی افریقا کے بارے میں تھی۔ ڈاکٹر ڈین تقریباً پچاس برس کا مضبوط آدمی تھا۔ اس کی نائب انجیلا بھی مضبوط جسامت رکھتی تھی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ ان چند حسین عورتوں میں سے تھی جنہیں اب تک ناصر نے دیکھا تھا اور اس نے دنیا جہاں کا حسن دیکھ رکھا تھا۔ اس کے مقابلے میں نالینا مرد مار کہ عورت تھی اور اس وقت بھی سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہی تھی۔ جبکہ صوفیہ دلکش لیکن عام سی لڑکی تھی۔ اس کی اب تک شادی نہیں ہوئی تھی۔ جنگ کے بعد وہ سرائیوو یونیورسٹی سے ماسٹر مکمل کرنے والی پہلی لڑکی بھی تھی۔ جنگ میں اس کے دو بھائی اور ماں باپ سربوں کی بربریت کا نشانہ بنے تھے۔ ایک بہن قیدیوں کے کیمپ میں اس وقت تک سربوں کا نشانہ بنتی رہی جب تک اس نے ایک سرب افسر کو قتل نہیں کر دیا تھا اس کے بعد اسے بھی مار دیا گیا تھا۔

صوفیہ سے پہلی ملاقات مصر میں ہوئی تھی جہاں وہ طلبا کے ایک گروپ کے ساتھ اہرام مصر کے مطالعے پر آئی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اس سفر کے لیے اخراجات جمع کیے تھے۔ جب طلبا اسران کی طرف جا رہے تھے تو صوفیہ حسرت و یاس سے واپسی کے لیے سامان باندھ رہی تھی۔ ناصر نے اس سے پوچھا کہ وہ اسران کیوں نہیں جا رہی ہے تو اس نے حسرت سے اپنا خالی پرس دکھا دیا تھا۔ ناصر جانے والوں کا ٹور منیجر تھا، اس نے صوفیہ کو پیشکش کی۔ ''مجھے ان دنوں ایک اسسٹنٹ کی ضرورت ہے جو مصر کی تاریخ سے بھی واقف ہو۔ تم میری اسسٹنٹ بن کر چلو، اس طرح تمہارے اخراجات نہیں ہوں گے اور کچھ کما بھی لو گی۔''

ناصر کی یہ پیشکش صوفیہ کے لیے نعمتِ غیر متوقع تھی۔ اس نے فوراً قبول کر لی اور اس کے بعد یہ سلسلہ چل نکلا تھا۔ بعد میں صوفیہ یورپ سے ناصر کے لیے گاہک لانے لگی تھی اور وہ اسے معقول کمیشن دیا کرتا تھا۔ البتہ اس مہم میں وہ ناصر کو اسسٹ کر رہی تھی۔ گزشتہ سال اس نے افریقا کی چند تہذیبوں کے تقابل پر اپنا تحقیقی مقالہ یونیورسٹی میں پیش کیا تھا اور اس سال اسے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملنے والی تھی۔ ناصر نے اسے پیشگی مبارک دے دی تھی۔ تین ہفتوں میں ان کے درمیان بہت اچھی دوستی اور تعلقات ہو گئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے مخلص تھے۔

طیارے کے بیشتر مسافر اونگھ رہے تھے۔ نالینا نے سگریٹ کا آخری کش لے کر ٹوٹا فرش پر پھینک کر جوتے سے بجھایا تو سب نے سکون کا سانس لیا۔ وہ تیز بو والا سگریٹ پی رہی تھی۔ نالینا چیزوں کی قدامت کے بارے میں تحقیق کرتی تھی۔ اس لحاظ سے وہ اس ٹیم کی سب سے اہم فرد تھی۔ گزشتہ سال ڈاکٹر ڈین اور ناصر وسطی افریقا میں ان کھنڈرات تک پہنچے تھے اور کچھ کھدائی بھی کی تھی لیکن جلد ڈاکٹر ڈین کو اندازہ ہو گیا کہ یہ مہم اس اکیلے کے بس کی بات نہیں، لہٰذا اس واپس جا کر اپنی یونیورسٹی کے توسط سے دوسری یونیورسٹیوں سے رابطہ کیا اور چھ بین الاقوامی یونیورسٹیوں نے مل کر مہم کو اسپانسر کیا تھا۔ ڈاکٹر ڈین کو امید تھی کہ اس تہذیب کے کھنڈرات کی کھدائی سے یہ بات جاننے میں مدد ملے گی اصل میں انسانی تہذیب کا آغاز کہاں سے ہوا تھا۔ کیونکہ گزشتہ چند سال سے جاری تحقیقات سے یہ شواہد سامنے آ رہے ہیں کہ انسان کا آغاز وسط افریقا میں کسی مقام سے ہوا تھا۔

ناصر نے ڈاکٹر سے پوچھا تھا۔ ''آخر افریقا کو انسان کا آغاز کیوں کہا جاتا ہے؟''

''کیونکہ جس دور میں انسان کا آغاز ہوا اس وقت یورپ اور ایشیا کا بیشتر حصہ برف کی لپیٹ میں تھا اور وہاں انسان کا پنپنا مشکل تھا۔ ایسے میں افریقا واحد سرزمین رہ جاتی ہے جہاں انسان رہ سکتا تھا۔''

نالینا دوسری سگریٹ جلانے جا رہی تھی کہ طیارے کو پہلا جھٹکا لگا۔ ناصر نے کھڑکی سے باہر دیکھا، اسے گرد و غبار اڑتا نظر آیا تھا۔ شاید انہیں ریت کے طوفان کا سامنا تھا۔ وہ اٹھ کر کاک پٹ کی طرف بڑھا۔ دوسرا جھٹکا اتنا شدید تھا کہ وہ سنبھلنے کی کوشش میں تقریباً انجیلا پر جا گرا۔ اس کے شانے کا سہارا لے کر خود کو سنبھالا اور جلدی سے بولا۔ ''سوری۔''

''نو پرابلم۔'' انجیلا بھرپور انداز میں مسکرائی تھی۔ ''کوئی مسئلہ ہے؟''

''شاید ہمیں راستے میں کوئی طوفان مل گیا ہے۔''

ناصر نے کاک پٹ میں جھانکا تو اسے ونڈ شیلڈ کے

وقت گزاری کے لیے ڈائجسٹ پڑھا جاتا تھا
مگر اب معلومات کا ذخیرہ بڑھانے کے لیے لوگ ماہنامہ سرگزشت پڑھتے ہیں
اپنے اردگرد پھیلی کہانیوں کا گلدستہ، سچائی کا مرقع،
ایک ایسا ڈائجسٹ جس نے ذوقِ مطالعہ کو فروغ دیا
آج ہی نزدیکی بک اسٹال سے طلب کریں

سی جانب مٹی نظر آئی تھی۔ ''کیا حالات ہیں دوستو؟''

''بہت خراب۔'' احمد نے جواب دیا۔ ''طوفان اچانک ہے اور ہمیں جاننے کا موقع ہی نہیں ملا کہ اس کی بلندی کتنی ہے۔''

''میرا خیال ہے ہمیں طیارہ اوپر اٹھانا چاہیے۔'' رفیق نے تجویز دی۔ وہ احمد کا نائب تھا۔

مگر تجویز ذرا تاخیر سے آئی تھی، ریت نے انجنوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا اور ان کی طاقت گھٹ رہی تھی۔ پائلٹ نے زمین کا رخ کیا تھا۔ پائلٹ اسے سنبھالنے اور اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اچانک دائیں طرف کا انجن بند ہو گیا۔ ''سیٹ پر جاؤ..... سب سے کہو سیٹ باندھ لیں۔''

مگر ناصر کو کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی کیونکہ طیارہ جس طرح لرز رہا تھا، سب نے اپنی اپنی سیٹ بیلٹس باندھ لی تھیں۔ ناصر بھی اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر ڈین اور سارے تمام افراد متفکر نظر آ رہے تھے۔ ''مسئلہ کیا ہے؟'' کسی نے پوچھا۔

''ریت کے طوفان کا سامنا ہے۔ پائلٹ طیارے کو اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''فی الحال ہم نیچے جا رہے ہیں۔'' نالینا نے سگریٹ سلگانے کی جاری رکھتے ہوئے کھڑکی کے باہر دیکھا۔

''خدا کے لیے اس وقت تو سگریٹ بجھا دو۔'' ناصر نے اس سے کہا تو اس نے بادلِ ناخواستہ سگریٹ بجھا دی تھی۔ طیارہ بدستور جھٹکے لے رہا تھا اور اس کی بلندی کم ہوتی جا رہی تھی۔ اب چاروں طرف نیم تاریکی تھی۔ ہوا کی لہروں کے ساتھ اڑتی ریت صاف نظر آتی تھی۔ جب وہ کھڑکی کے شیشوں سے ٹکراتی تھی۔ ناصر نے طیارے کے انجنوں کی گونج کے آہنگ میں مزید کمی محسوس کی تھی، شاید کوئی اور انجن بند ہو گیا تھا۔ مزید چند منٹ بعد ایک انجن اور بند ہوا تو طیارہ زیادہ تیزی سے نیچے جانے لگا تھا۔ احمد نے مائیکروفون میں کہا۔

''طیارے کے تین انجن بند ہو چکے ہیں۔ اب صرف ایک انجن کام کر رہا ہے۔''

نالینا ہنسی۔ ''روسی طیاروں کے ساتھ بھی آئے دن ایسے ہی معاملات ہوتے ہیں۔''

پھر آخری انجن بھی بند ہو گیا اور پائلٹ ہوا کے منہ زور جھکڑوں کے بالمقابل طیارے کو سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ طیارہ یوں ڈول رہا تھا کہ بعض اوقات لگتا تھا ابھی پلٹ کر زمین پر جا گرے گا۔ احمد پھر چلایا۔ ''سب ہوشیار ہو جائیں..... سامنے کی طرف جھک کر سر کو ہاتھوں سے چھپا لیں..... ہم کریش لینڈنگ کرنے جا رہے ہیں۔''

ناصر نے جلدی سے دل میں کلمہ پڑھا اور خدا سے عافیت کی دعا مانگی۔ سب ہی خدا سے دعا مانگ رہے تھے، سوائے نالینا کے جو روسی زبان میں ایک گیت گا رہی تھی۔ انجیلا نے اس سے درخواست کی۔

''خدا کے لیے چپ رہو۔''

مگر چپ ہونے کے بجائے نالینا چلائی۔ ''ساتھیوں ہم مرنے والے ہیں لہٰذا جس کے دل میں جو بھی خواہش ہو وہ پوری کر لے۔''

ناصر اور دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ موت کے خوف سے نالینا کا دماغ الٹ گیا تھا۔ اس وقت سب کو اپنی پڑی تھی اس لیے پھر کسی نے نالینا پر توجہ نہیں دی جو بہ دستور نغمہ سرائی کر رہی تھی۔ اس کے برابر میں بیٹھے روسی نے تنگ آ کر کہا۔

''میری خواہش ہے کہ تمہارا گلا دبا دوں۔''

''ضرور دبا دو۔ مرنا تمہیں پھر بھی پڑے گا۔ اگر کریش میں بچ گئے تو میرے بدلے مارے جاؤ گے۔ سنا ہے ان علاقوں میں جان کے بدلے جان کا قانون ہے۔''

''بکواس مت کرو۔'' روسی بری طرح جھلا گیا تھا۔

اسی لمحے طیارے نے شاید زمین کو چھوا تھا کیونکہ سب کو اتنا شدید جھٹکا لگا تھا کہ سب دہل کر رہ گئے تھے۔ نالینا اب گانے کے بجائے روسی زبان کی نایاب و نادر گالیاں دے رہی تھی۔ صوفیہ نے بلند آواز سے کلمہ پڑھا تھا۔ دوسرے جھٹکے کے ساتھ طیارہ زمین پر گر کر پھسلنے لگا تھا۔ اس کے لینڈنگ گیئر شاید پہلے ہی دھچکے میں ٹوٹ گئے تھے۔ ایک ٹیلے سے ٹکرا کر ناصر نے طیارے کا بایاں پر مع دونوں انجنوں کے غائب ہوتے دیکھا۔ چند لمحے بعد یہ حشر دوسرے پر اور انجنوں کا بھی ہوا۔ اب طیارہ پوٹے کے بل برق رفتاری سے ریت پر پھسل رہا تھا۔ ناصر کو لگ رہا تھا کہ ابھی طیارے کے

ٹکڑے ہو جائیں گے اور ساتھ میں ان کے بھی چیتھڑے اڑ جائیں گے۔

زمین ناہموار تھی۔ ہوا نے ریت کو لہروں میں بانٹ دیا تھا اور طیارہ ان لہروں پر پھسلتا نامعلوم انجام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ نامعلوم یوں کہ سامنے چند گز سے آگے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اچانک طیارے کا عقبی حصہ غائب ہو گیا اور اکھڑ جانے والے اس حصے کے ساتھ روسی کی سیٹ بھی غائب ہو گئی تھی۔ اس کا انجام دیکھ کر نالینا ساری گلوکاری بھول گئی تھی اور شاید بے تحاشا چیخ رہی تھی لیکن اس کی معمولی سی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ طوفان اور دوسرے افراد کی چیخوں میں کسی کے لیے کچھ سننا ناممکن تھا۔

ناصر اور ڈاکٹر ڈین کی عقبی دو نشستوں پر ہیری اور جین گائے بیٹھے تھے، ان کی نشستیں بھی غائب تھیں۔ ناصر نے مڑ کر دیکھا، عقب میں ایک مہیب خلا تھا جس میں سوائے ریت کے اور کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ چند لمحے بعد نالینا بھی مع سیٹ کے اڑ گئی۔ اس کی آخری بھیانک چیخیں سب نے سنی تھیں۔ طیارہ اب بھی برق رفتاری سے پھسل رہا تھا۔ دونوں پائلٹ بھی اپنی جدوجہد ترک کر کے انجام کے منتظر تھے۔ تمام کنٹرول ختم ہو چکے تھے اور طیارہ اب صرف رفتار کے بل پر پھسل رہا تھا۔ انجام اچانک ہی آیا تھا۔ طیارہ ریت کے ایک ٹیلے میں گھس گیا۔ دھماکے اور شدید جھٹکے نے ناصر کے حواس چھین لیے تھے۔ کم سے کم اسے یہی لگا جیسے اس کا آخری وقت آ گیا ہو۔

نہ جانے اسے کتنی دیر بعد ہوش آیا تھا۔ طیارے کے عقبی حصے سے ہلکی سی روشنی جھلک رہی تھی۔ ابھی دن تھا۔ وہ صبح سات بجے رباط سے روانہ ہوئے تھے اور حادثہ شاید ساڑھے گیارہ بجے پیش آیا تھا۔ اس نے خود کو ٹوٹی سیٹ کی بیلٹ سے آزاد کیا۔ طیارے کے فرش میں نصب کرسی کے آہنی پائے نکل گئے تھے صرف ایک پایا معمولی سا اٹکا رہ گیا تھا ورنہ اس کا بھی وہی حشر ہوتا جو ہارڈ ورڈ اور ڈاکٹر فونشے کا ہوا تھا۔ وہ کرسیوں سمیت کاک پٹ کی دیوار سے جا ٹکرائے تھے اور وہیں چپک گئے تھے۔ صوفیہ، انجیلا، ڈاکٹر ڈین اور مائیکل کاسنے اپنی نشستوں پر نظر آرہے تھے۔ وہ سب ہی زخمی تھے مگر زندہ تھے۔ کاک پٹ کے سامنے خاصا ملبہ تھا۔ نہ جانے احمد اور رفیق کا کیا انجام ہوا تھا۔ ناصر نے سوچا۔ اسی لمحے کاک پٹ کی جانب سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی تھی۔ ناصر چلایا۔

''کوئی زندہ ہے..... میری آواز سن رہا ہے..... مجھے جواب دے۔''

''میں بچ گیا ہوں۔'' رفیق کی کراہتی آواز آئی۔ ''احمد مر گیا ہے۔''

ناصر ملبہ ہٹانے لگا۔ فرش پر ڈاکٹر فونشے اور ہارڈ ورڈ کا خون بھی پڑا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح ملبہ ہٹا دیا اور اندر جھانکا۔ ٹوٹی ہوئی ونڈ شیلڈ سے ریت اندر تک گھس آئی تھی۔ احمد کا تو صرف چہرہ باہر تھا۔ رفیق کا نصف جسم بھی ریت میں دفن تھا۔ ناصر نے اس کی سیٹ بیلٹ ٹٹول کر کھولی اور اسے بغلوں سے پکڑ کر کاک پٹ سے باہر کھینچ لیا۔ وہ کراہا تھا۔

''میری ٹانگ۔''

رفیق کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ ہڈی کھال اور پتلون پھاڑ کر نکل آئی تھی۔ ناصر اسے طیارے کے عقبی حصے تک لایا اور اس سوراخ سے باہر جھانکا۔ باہر ریت تھی۔ شاید طیارہ آخری حصے تک ریت میں گھس گیا تھا۔ ناصر نے ریت ہٹا کر سوراخ بڑا کیا اور رفیق کو باہر کھینچ لیا۔ طیارہ تقریباً پورا ہی یعنی جتنا بچا تھا، وہ ریت میں چھپ گیا تھا۔

''تمہاری ٹانگ۔'' ناصر نے رفیق کو ریت سے ٹیک لگا کر بٹھایا۔ ''یہ ٹوٹ گئی ہے۔''

''تم اندر دیکھو..... شاید اور لوگ بھی زندہ ہیں۔'' رفیق نے حوصلے سے کہا۔ ''مجھے بعد میں دیکھنا۔''

ناصر اندر آیا۔ صوفیہ ہوش میں آ گئی تھی لیکن شاک کی کیفیت میں تھی۔ باقی افراد بھی کراہ رہے تھے یا ہل جل رہے تھے۔ ناصر نے صوفیہ کو ہلایا۔ وہ چونکی۔

''میں زندہ ہوں۔''

''ہاں..... اور شاید ٹھیک بھی ہو۔ باہر جا کر رفیق کو دیکھو..... وہ زخمی ہے۔''

صوفیہ سیٹ بیلٹ کھول کر اٹھی اور خلا سے باہر چلی گئی۔ ڈاکٹر ڈین اور مائیکل بھی ہوش میں آ گئے۔ البتہ انجیلا بے ہوش تھی۔ اس کے بازو اور سر پر چوٹ آئی تھی۔ وہ بے سدھ پڑی تھی۔ ناصر نے اس کی بیلٹ کھولی۔ ڈین بھی اس کی مدد کے لیے آیا تھا جبکہ مائیکل ان سے بے پروا باہر کی طرف بڑھ گیا۔ انجیلا خاصی وزنی تھی اس لیے دونوں مل کر ہی اسے باہر لا سکے تھے۔ شام کے چار بج رہے تھے۔ صحرا کی مخصوص گرمی میں کمی آ رہی تھی۔ شمالی کرے میں شدت کی سردی پڑ رہی تھی مگر جنوری کے مہینے میں بھی اس جگہ بلا کی گرمی تھی۔

''اس کی بے ہوشی گہری لگ رہی ہے۔'' ڈاکٹر ڈین نے تشویش سے انجیلا کی طرف دیکھا۔

''باقی افراد؟'' صوفیہ نے ناصر کی طرف دیکھا۔

اندر موجود افراد مر چکے ہیں۔ باقی جو طیارے سے گئے تھے ان کا بچنا بھی محال ہے۔''

''ہمیں ان کو تلاش کرنا چاہیے۔'' مائیکل نے پہلی بار کہا۔ ''ممکن ہے وہ زندہ ہوں۔''

ناصر نے طیارے کے عقب میں دور تک پھیلے تہ در تہ ریت کو دیکھا۔ ریت پر کسی اور چیز کا نام و نشان نہیں تھا۔ اس نے مائیکل کی طرف دیکھا۔ ''آؤ ہم دونوں دیکھیں۔''

وہ گرم ریت پر پیچھے کی طرف جانے لگے۔ وہ ڈھلوان نیچے جا رہے تھے۔ یعنی آخری مرحلے میں طیارے کے پائلٹ نے چڑھائی پر سفر کیا تھا، اس وجہ سے رفتار کم ہوئی تھی ورنہ ان میں سے شاید کوئی نہ بچتا۔ وہ چلتے رہے۔ ریت طوفان کے بعد پُرسکون تھی۔ ناصر جانتا تھا کہ طوفان صحرا کی صورت بدل دیتا ہے۔ ریت کے پورے کے پورے ٹیلے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں سب کچھ ریت تلے دب جاتا ہے۔ وہ تقریباً دس منٹ تک چلتے رہے اور طیارے سے اتنی دور نکل آئے تھے کہ وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ انہیں اب تک کچھ نظر نہیں آیا تھا، گویا یہ کہ طیارے کا ٹوٹ جانے والا کوئی حصہ بھی نہیں دکھائی دیا تھا۔

''ہمیں طیارے سے زیادہ دور نہیں جانا چاہیے۔ راستہ بھٹک سکتے ہیں۔'' ناصر نے کہا۔

مائیکل نے پلٹ کر دیکھا اور سر ہلایا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو..... لیکن کچھ دور تک اور دیکھ لیتے ہیں۔''

''تب تم اس جگہ رکو، میں دیکھ کر آتا ہوں۔'' ناصر نے کہا اور آگے بڑھ گیا وہ تقریباً دو سو گز اور آگے گیا اور کوئی نشان نہ پا کر لوٹ آیا۔ ''ان کی تلاش بے کار ہے۔ شاید ہی کوئی بچا ہو۔ سب کچھ ریت میں دفن ہو گیا ہے۔''

وہ مایوس لوٹ آئے۔ ڈاکٹر ڈین طیارے کے اندر چیزیں کھوج رہا تھا۔ انجیلا اب ہوش میں تھی اور صوفیہ نے قمیص سے رفیق کی ٹوٹی ہوئی ہڈی سیٹ کر کے اس پر پٹیاں باندھ دی تھیں۔ انجیلا کے سر پر اس کی شرٹ کا ایک ٹکڑا بندھا تھا۔ ڈاکٹر اندر سے پانی کی بوتل اور ایک چھوٹا میڈیکل بکس نکال لایا۔ ان حالات میں ان دو چیزوں سے زیادہ اہم چیز اور کوئی نہیں تھی۔ ذرا سی دیر میں ان سب کا پیاس سے برا حال ہو گیا تھا۔ سب نے چند گھونٹ پانی پیا۔ اپنی اور ایک دوسرے کی مرہم پٹی کی۔ ناصر کی گردن پر زخم آیا تھا۔ صوفیہ نے اس پر پٹی لگائی۔ کچھ دیر بعد وہ سب غور و فکر کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے سوال کیا۔ ''ہم صحرا کے کس حصے میں ہیں۔''

''میرے خیال میں ہم الجزائر کی حدود میں ہیں۔'' ناصر نے جواب دیا۔ ''اس جگہ سے مالی اور نائجر زیادہ فاصلے پر نہیں ہیں۔ اس جگہ سے ہزار کلومیٹر تک کوئی انسانی آبادی نہیں ہے۔ دنیا میں اس سے زیادہ ویران جگہ اور کوئی نہیں ہے۔''

ان سب کے چہرے ست گئے تھے۔ ''یعنی ہمارے بچنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔'' ڈاکٹر ڈین نے کہا۔

''امید تو نہیں رکھنی چاہیے لیکن صحرا میں خانہ بدوشوں کے قافلے سفر کرتے ہیں، اگر ہمیں کوئی قافلہ مل گیا تو بچ سکتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے ہمیں تاریکی چھانے سے قبل اردگرد کا علاقہ دیکھ لینا چاہیے۔'' مائیکل نے اردگرد دیکھا۔ ''ممکن ہے ہمیں کہیں پناہ مل سکے۔''

ناصر نے سر ہلایا۔ ''دن جتنا گرم ہوتا ہے رات اتنی ہی سرد ہو جاتی ہے۔ درجۂ حرارت بعض اوقات منفی میں چلا جاتا ہے مگر یہاں کسی پناہ گاہ کا ملنا محال ہے۔''

صوفیہ بولی۔ ''دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ تم نے بتایا ہے کہ اس علاقے میں خانہ بدوش قبائل سفر کرتے رہتے ہیں۔''

اس بار ناصر اور صوفیہ مخالف سمت میں روانہ ہوئے۔ ٹیلا خاصا بلند تھا۔ اس پر چڑھ کر انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔ ہر طرف ریت کے ٹیلے بکھرے تھے۔ بائیں جانب نشیب میں ریتیلا میدان تہ درتہ ڈھلکتا جارہا تھا۔ صوفیہ نے سامنے ایک اور بلند ٹیلے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس تک جاکر دیکھتے ہیں، ممکن ہے کچھ نظر آئے۔''

ناصر نے اس سے اتفاق کیا۔ ریت پر اترنا آسان ہوتا ہے کیونکہ گرنے کی صورت میں چوٹ لگنے کا خطرہ نہیں ہوتا البتہ چڑھائی کسی عذاب سے کم نہیں ہوتی ہے۔ چلنے کے دوران وہ حادثے پر بھی تبصرہ کررہے تھے۔ صوفیہ نے بتایا۔ ''جب آخری جھٹکا لگا تو میری تو جان ہی نکل گئی تھی اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔''

''میری کیفیت اس سے مختلف نہیں رہی تھی۔'' ناصر بولا۔ ''جب ہوش آیا تب بھی یقین نہیں تھا کہ میں بچ گیا ہوں۔''

ٹیلے پر چڑھتے ہوئے وہ اس بری طرح ہانپ رہے تھے کہ بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جیسے تیسے وہ اوپر تک پہنچے۔ پہلے صوفیہ نے دوسری طرف جھانکا اور حیرت سے بولی۔ ''میرے خدا یہ تو کھنڈرات ہیں۔''

ناصر نے بھی جلدی سے دیکھا۔ پہلی نظر میں پتھروں سے بنی یہ جگہ کسی بستی کے کھنڈرات لگے تھے لیکن جلد ہی اسے سمجھ میں آگیا کہ یہ کھنڈرات نہیں تھے بلکہ پتھروں کو ہوا نے اس طرح تراش دیا تھا کہ وہ کھنڈرات نظر آتے تھے۔ جب ناصر نے صوفیہ کو بتایا تو اس کے جذبات پر اوس پڑ گئی تھی ورنہ وہ اس وقت ایک نئی تہذیب کی باقیات بھی دریافت کرچکی تھی۔ اس نے تجویز پیش کی۔ ''پھر بھی ہمیں اسے پاس جاکر دیکھنا چاہیے۔''

ناصر نے اس خیال سے اتفاق کیا کہ ممکن ہے ان کھنڈرات میں انہیں پانی مل جائے۔ آج تو دن ڈھل گیا تھا۔ لیکن کل جب صبح سے عذاب ناک گرمی شروع ہوگی تو انہیں تھوڑی دیر بعد پانی کی ضرورت پڑے گی، ورنہ پانی کی کمی ان کی جان لے لے گی۔ کھنڈرات درحقیقت ذرا بلندی پر تھے۔ ٹیلے سے ذرا نشیب میں اتر کر انہیں پھر سے اوپر جانا تھا۔ وہ کھنڈرات کے قریب پہنچے تو ناصر کو اپنے خیال میں ترمیم کرنا پڑی تھی۔ اسے خیال آیا کہ ان کھنڈرات کی تعمیر میں کہیں نہ کہیں انسانی ہاتھ ضرور تھا۔ یہی بات صوفیہ نے بھی محسوس کی تھی۔

''مجھے لگ رہا ہے یہاں کبھی نہ کبھی انسان رہے ہوں گے۔''

''شاید... اور ممکن ہے اب بھی ہوں، اس لیے چپ رہو۔''

''ہمیں خطرہ ہوسکتا ہے؟'' صوفیہ نے سرگوشی میں پوچھا۔

''پلیز چپ رہو۔'' ناصر نے درخواست کی۔ اس کی اندرونی حس کہہ رہی تھی کہ وہاں کوئی ذی روح تھا۔ چٹانیں اوپر سے کھردری تھیں لیکن ان کے درمیان میں تراشے ہوئے راستے تھے۔ صوفیہ اس کے ساتھ تھی۔ کھنڈرات نما چٹانیں وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ ناصر کو محسوس ہوا کہ وہاں ان کے چلنے کے علاوہ بھی کچھ آہٹیں ہیں۔ صوفیہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''یہاں کوئی ہے؟''

اس کے باوجود جب وہ دو افراد ان کے سامنے آئے تو وہ اچھل پڑے تھے۔ ان افراد نے سفید کپڑے کا عربی لباس پہن رکھا تھا مگر ان کے چہرے مشرق بعید کے باشندوں جیسے تھے۔ ناصر نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا سامنا افریقا کے وسط میں ایسے افراد سے ہوگا۔

''یہ تو مشرق بعید کے لوگ ہیں۔'' صوفیہ سہمے ہوئے انداز میں بولی۔

دونوں افراد طویل قامت، خالی ہاتھ اور پُرسکون تھے۔ ناصر نے محسوس کیا کہ وہ انہیں دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کا انداز ذرا بھی جارحانہ نہیں تھا، اس کے باوجود صوفیہ نے بھاگ نکلنے کا مشورہ دیا، اور ناصر نے اس سے اتفاق کیا مگر فوراً ہی انہیں پتا چل گیا کہ فرار ناممکن ہے۔ کیونکہ آگے کے بعد پیچھے بھی سفید پوش آگئے تھے لیکن یہ مشرقِ بعید کے نہیں بلکہ افریقا کے سیاہ فام تھے۔ پھر دائیں طرف سے سفید فام نمودار ہوئے اور بائیں جانب سے عام عرب نقوش رکھنے والے افراد سامنے آئے تھے۔ ان سب نے ایک جیسا سفید لباس پہن رکھا تھا۔

''میرے خدا یہ کون ہیں۔ ان میں ساری دنیا کے باشندے ہیں کیا؟'' صوفیہ بولی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے لگے کھڑے تھے۔ ناصر خوف زدہ ہونے کے باوجود انہیں بہ غور دیکھ رہا تھا۔ سفید فاموں کے بال سنہری اور آنکھیں نیلی تھیں۔ جلد بے حد شفاف اور گلابی تھی۔ سیاہ فام مکمل افریقی نقش رکھتے تھے۔ عرب نظر آنے والے شامی عربوں کی طرح خوب صورت تھے۔ مختلف حصوں سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ ایک جیسی جسامت اور قطع وضع کے باعث ملتے جلتے لگ رہے تھے۔ انہوں نے چاروں طرف

...صوفیہ کو گھیر لیا تھا۔

...ہو تم؟'' ناصر نے عربی میں کہا۔ اس کے ...نقوش والے تھے۔

...یہاں رہتے ہیں۔'' ایک عرب نے خاصی مشکل ...تھا۔ ''تم دونوں کون ہو؟''

...ے خیال میں وہ بے حد قدیم عربی بول رہے تھے ...دنیا سمیت کہیں بھی رائج نہیں تھی۔ مگر وہ قدیم ...ہوں سے واقفیت کی بنا پر یہ زبان کسی قدر سمجھ اور بول سکتا ...نے انہیں بتایا کہ ان کا طیارہ کریش ہوگیا تھا اور وہ ...تھے۔ طیارے کا ذکر سن کر انہوں نے کوئی ردِعمل ...تھا۔ وہ شاید طیاروں سے واقف تھے۔ ویسے ...اس دور دراز خطے میں انسانوں کی موجودگی پر حیرت ...تھی۔ وہ شاید صدیوں سے ان کھنڈرات میں تھے۔

''تمہارے باقی ساتھی کہاں ہیں؟'' سوال کرنے والے ...نے پوچھا۔

''پہلے یہ بتاؤ تم ہمارے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟'' ...نے جواب دینے کے بجائے کہا۔

''تم ہمارے مہمان ہو اور مصیبت زدہ بھی ہو، تم سے ہم ...سلوک کریں گے۔''

کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ ناصر نے انہیں وہ سمت بتا ...جہاں طیارے کا ڈھانچا اور اس کے بقیہ ساتھی تھے۔ ...معمولی سی عربی جانتی تھی اس لیے ان کی گفتگو سمجھنے سے ...ناصر تھی۔ اس نے پوچھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں؟''

...صر نے اسے مختصراً ہونے والی گفتگو کا خلاصہ بتایا۔ ...اس دوران میں عرب نے اپنے ساتھیوں کو جاکر طیارے ...کے باقی افراد کو بھی لانے کو کہا۔ چھ افراد چلے گئے، دونوں ...وہاں رہے تھے۔ ناصر نے انہیں بتایا کہ ایک شخص ...زخمی ہے اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ عرب نے اسے ...دی۔ ''تم فکر مت کرو، وہ سب آرام سے آجائیں ...تم میرے ساتھ آؤ۔''

...اس کا ساتھی وہیں رہا تھا۔ صوفیہ اور ناصر عرب کی ...رہنمائی میں آگے بڑھے۔ ایک جگہ جہاں چٹانوں کا ڈھیر تھا ...نے دونوں ہاتھ زور سے ایک چٹان پر مارے اور وہ ...حیرت انگیز طور پر ایک طرف کھسکتی چلی گئی تھی۔ سامنے وسیع ...صاف ستھرا راستہ تھا۔ اوپر کہیں سے قدرتی روشنی آرہی ...عرب نے اشارے سے انہیں اندر چلنے کو کہا۔ صوفیہ اور ...خوف زدہ سے اس کے اشارے پر اندر داخل ہوئے۔ یہ

ماہنامہ پاکیزہ کراچی جنوری 2009ء
سالِ نو نمبر کے شمارے کی ایک جھلک

سوزِ محبت کا رنگ لیے، محبت کے حصار میں مقید کرداروں کی پُراثر داستان۔ انجم انصار کے قلم سے

شیریں حیدر اور عالیہ بخاری کے سلسلے وار ناول

مایوس دلوں کو روشنی بخشتے لفظوں سے مزین صائمہ اکرم، فرحانہ ناز ملک اور رخسانہ نگار عدنان کے ناولٹ

کبھی کبھی صدیوں کی ریاضت ایک پل میں ضائع ہوجاتی ہے ایسے ہی ایک پل کی نشاندہی کرتی راحت وفا اور ریحانہ زیدی کی تحریریں

نئے سال کی آمد پر گزری ہوئی باتیں اور یادیں ذہن ودل پر ایک بار پھر سے دستک دینے لگتی ہیں اس تناظر میں کیا گیا سروے

خورشید اختر، یمنیٰ احمد، عقیلہ حق، نیناں عروج اور سعدیہ رئیس کی دلچسپ تحریریں

اس کے علاوہ آپ کی آرا و نگارشات سے سجے مستقل سلسلے

کیا آپ نے اس ماہ کا پاکیزہ پڑھا؟ نہیں! کمال ہے!

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون 5895313 فیکس 5802551

کشادہ اور اونچی چھت والی سرنگ تھی جس میں جابہ جا روزن تھے جن سے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی۔ وہ آگے بڑھے تو سرنگ شاخوں میں تقسیم در تقسیم ہونے لگی تھی۔ اندر بے شمار لوگ تھے۔ انہوں نے مخصوص طرز کے لمبے لباس پہن رکھے تھے اور وہ ان چار نسلوں کے افراد میں سے تھے جنہیں ناصر باہر دیکھ چکا تھا۔ اس کا ذہن اس چکر کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

''میں اپنے میزبان کا نام جان سکتا ہوں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''نسوم۔'' اس نے کہا۔ جواب میں ناصر نے اپنا اور صوفیہ کا تعارف کرایا۔

''آیئے میں آپ دونوں کو پہلے ماں سے ملواتا ہوں۔''

''ماں۔'' ناصر چونکا۔ ''یہ محترم ہستی آپ کی والدہ ہیں؟''

''نہیں ہم سب کی ماں ہیں۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''ہماری سربراہ وہی ہیں۔''

اتنی دیر میں ناصر نے دیکھ لیا تھا کہ زیرِ زمین سرنگوں اور غاروں میں انسان ایک پوری ثقافت اور تہذیب کے ساتھ آباد تھے۔ صحرائے سہارا کے وسط میں وہ ایسی کسی تہذیب کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے نسوم سے سوال کیا۔ ''آپ سب مختلف قوموں میں بٹے ہوئے ہیں۔''

''قوم۔'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''یہ کیا ہوتی ہے؟''

''میرا مطلب ہے آپ سب مختلف کیوں ہیں؟''

''کیونکہ ہم چار بھائیوں کی اولاد ہیں۔'' نسوم نے وضاحت کی۔

''اور آپ کی والدہ محترمہ؟''

''ظاہر ہے وہ ایک ہی ہیں۔'' نسوم مسکرایا پھر بولا۔ ''اوہ اچھا...... تم ماں کی بات کر رہے ہو۔ ہمارے ہاں سربراہ عورت ہوتی ہے۔''

کچھ دیر بعد صوفیہ اور ناصر ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے۔ نسوم نے خود بھی جوتے اتارے اور ان کو بھی ایسا کرنے کا کہا۔ انہوں نے بھی جوتے اتار دیے تھے۔ اندر ایک خوب صورتی اور سادگی سے سجا کمرا تھا۔ وسط میں بچھے قالین پر چوکی رکھی تھی جس پر ایک عمر رسیدہ عورت بیٹھی تھی۔ بال تمام سفید تھے۔ بھویں تک سفید ہو چکی تھیں لیکن سرخ و سفید، بے داغ چہرہ اور روشن آنکھیں اس کی عمر کی نفی کر رہی تھیں۔ ناصر نے اتنی عمر رسیدہ اور اتنی شاہانہ عورت نہیں دیکھی تھی۔

''ماں یہ مصیبت زدہ لوگ ہیں۔ ان کا جہاز صحرا میں گر گیا ہے۔'' نسوم نے احتراماً عورت کے سامنے جھک رہا تھا۔ ''ان کے اور ساتھی بھی ہیں، جلد وہ بھی آجائیں گے۔''

''میرے بچو! اب تم محفوظ ہو۔'' عورت نے شفقت سے کہا۔ ''یہاں آرام سے رہو۔''

''شکریہ مادرِ مہربان۔'' ناصر نے بھی جھک کر کہا تھا۔

عورت نسوم کو ہدایت دینے لگی کہ وہ ان کا پورا خیال رکھے اور ان کی ہر ممکن خاطر مدارت کرے۔ نسوم نے سر جھکا کر حکم کی تعمیل کا کہا۔ وہ صوفیہ اور ناصر کو لے کر اس زیرِ زمین بستی کے ایک حصے میں آیا۔ ناصر نے محسوس کیا کہ اندر خوش گوار سی خنکی تھی حالانکہ باہر صحرا اس وقت بھی تپ رہا تھا۔ اس حصے میں کشادہ کمرے بنے ہوئے تھے جن کے فرشوں پر دبیز قالین بچھے تھے۔ نسوم نے ناصر سے کہا۔ ''تم دونوں یہاں رکو...... تمہارے ساتھی بھی یہاں آنے والے ہیں۔''

''ہمیں پیاس لگ رہی ہے۔'' ناصر نے اسے بتایا۔

''فکر مت کرو، ابھی سب آجائے گا۔ تمہیں کھانا بھی ملے گا۔ پانی بھی اور علاج بھی۔''

نسوم انہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ اس مہمان خانے میں کئی چیزیں ایسی تھیں جن سے ظاہر تھا کہ ان کا رابطہ بیرونی دنیا سے ہے۔ صوفیہ حیران تھی۔ ''یہ لوگ کون ہیں اور انہوں نے بنیادی نسلوں کے لوگ کیوں جمع کر رکھے ہیں؟''

''بنیادی نسلیں۔'' ناصر نے اسے دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''دنیا میں چار بنیادی نسلیں یہی ہیں یعنی سفید فام، سیاہ فام، مشرق بعید کی اقوام اور عرب...... باقی تمام نسلیں ان کی ذیلی شاخیں ہیں۔ یورپ والے اور وسط ایشیا کے لوگ نسلی اعتبار سے ایک ہیں۔ عرب اور ہندوستان کے قدیم لوگ بھی ایک ہی نسل سے ہیں۔ اسی طرح منگولیا سے انڈونیشیا تک آباد چپٹی ناکوں والے ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ عربوں اور سیاہ فام نسلوں میں گہرا تعلق ہے لیکن دونوں الگ نسلیں ہیں۔''

''اس شخص کا کہنا ہے، یہ چار بھائیوں کی اولاد ہیں اور صدیوں سے اس جگہ آباد ہیں۔'' ناصر نے اسے بتایا۔

''حیرت انگیز...... مجھے یہ اس خطے کی باقی اقوام سے مختلف نظر آتے ہیں۔ کیا یہ واقعی صدیوں سے سب سے الگ تھلگ اس مقام پر رہ رہے ہیں۔''

''کم سے کم ان کا دعویٰ......'' ناصر کی بات ادھوری رہ گئی۔ ان کے بقیہ ساتھی بھی آگئے تھے اور خاصے پریشان تھے۔ مائیکل نے انہیں دیکھ کر کہا۔ ''اوہ تم بھی پکڑے گئے۔''

''آرام سے بیٹھو...... ہم ان کے مہمان ہیں، قیدی نہیں۔''

ڈاکٹر ڈین خاصا مضطرب تھا۔ ''ہم نے یہاں عجیب دیکھی ہے، اس زیرِ زمین جگہ چار بنیادی نسلوں کے لوگ ہیں۔''

''یہ خود کو چار بھائیوں کی اولاد قرار دیتے ہیں۔''

ڈاکٹر چونکا۔ ''تم ان کی زبان سمجھتے ہو؟ مجھے لگتا ہے یہ عربی بول رہے ہیں۔''

ناصر نے سر ہلایا۔ ''بے حد قدیم اور مشکل عربی...... جسے اب شاید ہی کہیں بولا جاتا ہو۔''

''کتنی عجیب بات ہے...... یہ کہاں سے آئے اور یہاں کیوں رہ رہے ہیں؟'' انجیلا بولی۔

''اسے مارو گولی......'' مائیکل نے اضطرابی لہجے میں کہا۔ ''اہم بات یہ ہے کہ ہم نے دنیا کی ایک قدیم ترین زندہ تہذیب ڈھونڈ نکالی۔ ایک مکمل طور پر زندہ اور جاری تہذیب...... اس کا ابھی تک دنیا کو کوئی علم نہیں ہے۔'' وہ بے حد پُرجوش ہو رہا تھا۔

''واقعی...... یہ تو زندہ آثار ہیں۔'' انجیلا نے اس کی تائید کی تھی۔ ''ہم نے وہ دریافت کیا ہے جو اس سے پہلے کسی نے نہیں کیا۔''

''تم لوگ کچھ زیادہ ہی دور کی سوچ رہے ہو۔'' ناصر نے کہا۔ ''فی الحال ہم پناہ گزین ہیں۔ بے شک ہم بچ گئے ہیں لیکن یہ کہنا دشوار ہے ہم اس جگہ سے نکل سکیں گے یا نہیں۔''

''ہاں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔'' ڈاکٹر ڈین نے سر ہلایا۔ ''ابھی ہمیں ان لوگوں کو سمجھنے اور ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کرنی ہے۔''

''رفیق کہاں ہے؟'' صوفیہ کو خیال آیا۔

''اسے علاج کے لیے وہ کہیں لے گئے ہیں۔'' انجیلا بولی۔

دروازے پر آہٹ ہوئی تو سب متوجہ ہو گئے۔ پردہ ہٹا اور ایک شخص اندر آیا۔ اس نے ایک بکس اٹھا رکھا تھا۔ اس نے ناصر سے کہا۔ ''میں علاج کرتا ہوں...... کسی کو طبی مدد کی ضرورت ہے تو مجھے بتائے۔''

سب کو ہی طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اس نے ان سب کے زخموں کی مرہم پٹی کی اور اس کے بعد اپنے بکس سمیت رخصت ہو گیا۔ اس کے کچھ دیر بعد ان کے لیے کھانا آگیا۔ ابلے ہوئے چاول اور شکر قند کا ملا جلا سا کھانا تھا اور مزے کا تھا۔ ناصر نے کہا۔ ''یہ دونوں چیزیں وسط افریقا سے آتی ہیں۔ یعنی ان کا باہر کی دنیا سے رابطہ ہے۔''

''سوال یہ ہے کہ انہوں نے اب تک خود کو کس طرح کامیابی سے چھپائے رکھا ہے۔ ان کے بارے میں جدید دنیا کو ذرہ برابر نہیں معلوم۔'' مائیکل بولا۔

''افریقا کے بہت سارے اسرار ابھی جدید دنیا کے علم میں نہیں آئے ہیں۔'' ناصر نے خشک لہجے میں کہا۔

''لیکن اب یہ چھپا نہیں رہے گا۔'' مائیکل ہنسا۔

اس حادثے نے ان پر برا اثر ڈالا تھا۔ ذہن اور جسمانی طور پر تھکن کے ساتھ ہمراہیوں کی موت نے بھی انہیں توڑ ڈالا تھا۔ اس بستی کی دریافت نے انہیں ذرا سا پُرجوش کیا تھا مگر کچھ دیر بعد ان پر سستی اور اداسی طاری ہو گئی تھی۔ کئی گھنٹے بعد نسوم نظر آیا۔ اس نے اشارے سے ناصر کو باہر بلایا۔

''تمہارے ساتھیوں کی لاشیں مل گئی ہیں۔ جو صحرا میں گر گئے تھے ان کی بھی...... اب وہ سب تدفین کے لیے تیار ہیں۔ تم میں سے جو آنا چاہے وہ آجائے۔''

ناصر نے انہیں بتایا تو سب چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اندھیرا چھاتے ہی ان لوگوں نے مشعلیں روشن کر لی تھیں۔ وہ خفیہ راستے سے کھنڈرات سے باہر آئے۔ اور ذرا دور واقع ایک ہموار جگہ پہنچے جہاں ان کے ساتھیوں کی چادروں میں لپٹی لاشیں تدفین کی منتظر تھیں۔ نسوم نے ناصر سے کہا۔ ''اگر تم لوگ انہیں اپنی کسی مخصوص مذہبی رسم کے ساتھ دفنانا چاہتے ہو تو ایسا کر لو۔''

مگر ان میں سے کسی کو رسومات کی ادائیگی نہ تو آتی تھی اور نہ اس کا خیال تھا۔ البتہ ناصر اور صوفیہ نے احمد کے لیے دعا کی تھی۔ باقی افراد لاتعلقی سے مردوں کو دفناتے دیکھ رہے تھے۔ تدفین کے بعد وہ اندر لے جائے گئے تھے۔ راستے میں ناصر نے نسوم سے کہا۔ ''ہمارا زخمی ساتھی کہاں ہے؟''

''آؤ میں تمہیں اس سے ملواؤں۔'' نسوم نے کہا اور اسے دوسری طرف لے گیا۔ رفیق کو ایک الگ غار میں رکھا گیا تھا۔ اس کی ٹانگ پٹیوں میں جکڑی تھی اور وہ ہوش میں تھا۔

''کمال کا علاج کیا ہے انہوں نے...... مجھے بالکل درد نہیں ہو رہا۔'' اس نے ناصر کو بتایا۔ ''کیا یہ لوگ عربی بول رہے ہیں؟''

''بہت پرانی...... ہماری عربی سے خاصی مختلف ہے۔'' ناصر نے اسے بتایا۔

''سنو مجھے اکیلا مت چھوڑ دو۔'' رفیق نے التجا کی۔

"مجھے باقی سب کے پاس لے چلو۔"

"انہوں نے علاج کے لیے تمہیں یہاں رکھا ہے ورنہ ہم سب ایک جگہ ہیں۔ یہ بہت اچھے لوگ ہیں، ہمارے ساتھ بہترین سلوک کر رہے ہیں۔ تم فکر مت کرو۔"

ناصر نے نسوم سے کہا۔ "کیا تمہاری ساری بستی زیرِ زمین ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "اوپر کے خوفناک موسم میں کوئی زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ ہم میں سے کوئی دن میں باہر نہیں نکلتا ہے۔"

"تم لوگ پانی اور کھانے کا سامان کہاں سے حاصل کرتے ہو؟"

"پانی کے لیے یہاں بہت بڑا چشمہ ہے اور کھانے کا سامان ہمیں اِدھر سے آنے جانے والے قافلے لا کر دیتے ہیں۔ بدلے میں ہم انہیں پانی اور سنہری ذرات والی مٹی دیتے ہیں۔"

"سنہری ذرات۔" ناصر کے کان کھڑے ہو گئے۔ "یعنی سونا۔"

"سونا۔" نسوم نے دہرایا۔ "یہ کیا ہوتا ہے؟"

"تم مجھے سنہری ذرات والی مٹی دکھاؤ گے؟" اس نے نسوم سے التجا کی۔

"ہاں...... لیکن تم اسے لے نہیں سکتے۔" اس نے صاف کہا۔

"نہیں میں صرف اسے دیکھوں گا۔" ناصر نے وعدہ کیا تھا۔ نسوم اسے لے کر زیرِ زمین دنیا کے مزید نیچے جانے والے راستوں سے گزرا تھا۔ یہاں نمی زیادہ تھی۔ پھر ناصر نے پانی بہنے کی آواز سنی۔ اس نے مشعل کی روشنی میں وہ ندی دیکھی جس کے پانی کی دھار پتھریلی دیواروں سے ٹکراتی کہیں جا رہی تھی۔ پانی بہت تھا۔ ناصر نے خوش ہو کر منہ ہاتھ دھویا اور ہلکا سا نمکین لیکن خوش ذائقہ پانی پیا تھا۔ "یہ ہمارے لیے پانی کا واحد ذریعہ ہے۔ جب سے ہم اس جگہ آباد ہوئے ہیں تب سے یہ پانی بھی ہمارے کام آ رہا ہے۔ آج تک یہ ختم نہیں ہوا۔ اس پانی کی وجہ سے یہ بستی آباد ہے۔"

ندی کے پاس سے ایک سرنگ مزید نیچے کی طرف جا رہی تھی۔ یہاں سرنگ کے دونوں جانب جا بہ جا چھوٹی چھوٹی سرنگیں کھدی تھیں۔ ناصر نے محسوس کیا کہ سرنگ کی دیواریں چمک رہی تھیں۔ ناصر نے نسوم سے مشعل لے کر دیکھا۔ اس کے شبہے کی تصدیق ہو گئی۔ یہ سونے کی کان تھی، اس کی مٹی میں سونے کے ذرات اتنے زیادہ تھے کہ معمولی روشنی میں بھی ان کی چمک واضح محسوس کی جا سکتی تھی۔ ناصر اس سے پہلے بھی نائجر میں سونے کی ایک کان دیکھ چکا تھا۔ اس نے وہاں کی مٹی میں سونے کے ذرات کی اتنی تعداد نہیں دیکھی تھی۔ یہ ان لوگوں کا ایک قیمتی اثاثہ تھا۔ کان سرنگ در سرنگ تھی اور بہت وسیع رقبے پر پھیلی تھی۔ ان لوگوں نے کان کنی کے اصولوں کے عین مطابق کھدائی کی تھی۔ یعنی محفوظ طریقے سے مٹی نکالتے تھے۔ اندرونی کان میں کھدی ہوئی مٹی کے ڈھیر تھے۔ ان میں ذرات کے ساتھ خام سونے کے ریزے اور خاصے بڑے ڈلے بھی چمک رہے تھے۔

ناصر نے واپس آ کر ان لوگوں کو بتایا کہ اس بستی کے نیچے سونے کی ایک بہت بڑی کان بھی ہے تو ان کے منہ کھلے رہ گئے تھے۔ مائیکل نے حریصانہ انداز میں کہا۔ "اس سونے میں سے ہم اپنا حصہ حاصل نہیں کر سکتے؟"

ڈاکٹر ڈین نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ "ہم یہاں سونے کے لیے نہیں آئے ہیں۔"

"ہم آئے کہاں ہیں، قدرت نے یہاں پہنچایا ہے...... اور شاید اس نے ہمیں موقع دیا ہے۔ اگر ہم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو پرلے درجے کے احمق کہلائیں گے۔"

"ہمیں عقل مند بننے کا شوق نہیں ہے۔" ڈاکٹر نے خشک لہجے میں کہا۔

مگر ناصر دیکھ رہا تھا اس کی نائب انجیلا مائیکل کی باتوں میں خاصی دلچسپی لے رہی تھی۔ وہ اس کے پاس جا بیٹھی اور دونوں دھیمی آواز میں بات کرنے لگے۔ ناصر، ڈاکٹر اور صوفیہ ایک طرف جا بیٹھے۔ ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا۔ "کہیں یہ دونوں کوئی حماقت نہ کر جائیں۔ ان لوگوں کا کچھ پتا نہیں ہے۔ پتا نہیں کون سی بات انہیں مشتعل کر دے۔"

"ڈاکٹر ان لوگوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" صوفیہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"مجھے لگ رہا ہے وہ آدمی درست کہہ رہا ہے۔ یہ لوگ کئی صدیوں سے یہاں آباد ہیں۔"

"لیکن ڈاکٹر یہ کیسے ممکن ہے۔ اتنے عرصے سے یہ ساتھ ہیں اور ان کی جداگانہ نسلی خصوصیات برقرار ہیں۔ آب و ہوا کا اثر ان پر کیوں نہیں ہوا؟"

"تمہارا اشارہ اس نظریے کی طرف ہے کہ شروع میں انسان ایک جیسے تھے لیکن جیسے جیسے یہ دنیا کے دوسرے خطوں میں آباد ہوتے چلے گئے۔ ویسے ویسے ان کی جسمانی خصوصیات الگ ہوتی چلی گئیں۔"

"ہاں ڈاکٹر۔"

"یہ نظریہ فرسودہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ آب و ہوا کا انسانی اثر نہیں پڑتا ہے۔ سیاہ فام صدیوں سے یورپ میں مگر وہ سیاہ فام ہی ہیں۔ سفید فام صدیوں سے افریقا اور یہاں کا تیز گرم موسم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ شمالی اور نیوزی لینڈ و آسٹریلیا میں ہزاروں سال سے آباد ہے مگر اس کی شکل و صورت استوائی ایشیا کے باشندوں سے مختلف نہیں ہے۔"

"تو پھر انسان کے مختلف ہونے کی وجہ کیا ہے؟" ناصر نے پوچھا۔

"دراصل انسان شروع سے مختلف نسلوں میں تقسیم ہے اور اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے یہ کوئی نہیں جانتا ہے۔"

"یہی بات یہ لوگ بھی کہہ رہے ہیں۔" ناصر نے اسے بتایا۔ "اتنی سی جگہ میں ان کی نسلی تقسیم نہ جانے کتنی صدیوں سے برقرار ہے۔"

وہ رات کے کھانے کے بعد سو گئے تھے۔ اس بار ابلے چاولوں کے ساتھ آلو کا شوربا تھا۔ چاول ان لوگوں کی بنیادی غذا تھی۔ وہ مکئی اور گندم بھی کھاتے تھے۔ البتہ وہ تازہ سبزیوں سے نا آشنا تھے۔ گوشت بھی اس وقت ملتا جب اِدھر سے گزرنے والے خانہ بدوش انہیں کوئی جانور دے جاتے تھے۔ وہ جانور پال نہیں سکتے تھے ان کی پرورش کیسے کرتے۔ یہ ساری معلومات انہیں اگلے دن حاصل ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر اور باقی افراد ماں سے ملے تھے۔ انہوں نے اس پوری زیرِ زمین بستی کی سیر کی تھی۔ بستی خاصی وسیع و عریض تھی البتہ اس میں بسنے والے افراد کی تعداد پانچ سو سے زیادہ نہیں تھی۔ نسوم نے انہیں بتایا کہ ان میں شرح پیدائش اور شرح اموات بہت کم تھی۔ بچے کم پیدا ہوتے تھے لیکن لمبے عرصے تک جیتے تھے۔

ڈاکٹر ڈین اور صوفیہ ان لوگوں کی تاریخ جاننے کے لیے بے چین تھے۔ ڈاکٹر نے بستی کی سردار ماں سے سوالات کی اجازت مانگی جو اسے مل گئی۔ ناصر کے توسط سے اس نے بہت سوالات کیے۔

"آپ لوگ کب سے یہاں آباد ہیں؟"

"نامعلوم مدت سے۔" ماں نے جواب دیا۔ "ہمیں نہیں معلوم کہ کب سے یہاں آباد ہیں۔"

"آپ کہاں سے آئے اور کیوں آئے؟"

"شمال سے......" ماں نے ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔ "ہمارے آباؤ اجداد کسی بہت بڑے پانی سے بچنے کے لیے اس طرف آئے تھے۔ پھر اس جگہ کو محفوظ جان کر یہیں رہ گئے۔"

ڈاکٹر نے معنی خیز نظروں سے صوفیہ کی طرف دیکھا۔ "یہ تو طوفانِ نوح کا ذکر کر رہی ہے۔"

صوفیہ نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ "وہ تو بہت عرصہ ہوا آیا تھا۔"

"یہ لوگ بھی پرانے لگتے ہیں۔" ڈاکٹر نے کہا اور ناصر کے توسط سے اگلا سوال کیا۔ "آپ لوگوں میں یہ نسلی فرق کیوں ہے؟"

"ہم یہ بھی نہیں جانتے۔" ماں نے جواب دیا۔ "لیکن یہ فرق صرف مردوں میں ہے ان کی اولاد میں لڑکے بھی ان جیسے ہوتے ہیں۔"

"اور لڑکیاں؟"

ماں مسکرائی۔ "سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ میرے نقوش دیکھ رہے ہو نا...... بس سمجھ لو میری طرح ہوتی ہیں۔"

"یہاں آپ کو کبھی خطرہ نہیں پیش آیا؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔ "کسی نے حملہ نہیں کیا؟"

"شروع میں خانہ بدوشوں نے ہمیں تنگ کیا تھا لیکن پھر دوستی پر مجبور ہو گئے۔ انہیں ہم سے پانی لینا تھا اور ہم ان سے دوسری اشیا لیتے تھے۔"

"آپ لوگوں کا مذہب کیا ہے؟"

"ہم جانتے ہیں خدا ایک ہے۔" ماں نے سادہ سا جواب دیا۔ "اس سے زیادہ ہمیں مذہب کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔"

"میں نے ان لوگوں کو کسی قسم کی عبادت کرتے نہیں دیکھا ہے۔" ناصر نے ڈاکٹر کو بتایا۔ "اس کے باوجود مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ الہامی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا کوئی بت یا اس قسم کا خدا نہیں ہے۔ یہ خدا کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جیسے الہامی مذاہب میں ہے۔ یعنی ان دیکھا خدا جو ہر جگہ موجود ہے۔"

"آپ بیرونی دنیا کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟" ڈاکٹر نے اگلا سوال کیا۔

"یہاں سے باہر بھی انسان ہیں اور وہ شاید ہم سے بہتر ہیں کیونکہ یہاں موجود ساری اشیا باہر کی دنیا سے آتی ہیں۔ اس سے زیادہ ہم ان کے بارے میں نہیں جانتے۔ خانہ بدوشوں سے بھی ہمارا تعلق صرف لین دین کی حد تک ہے۔ نہ تو ہمارا کوئی آدمی ان کے ساتھ جاتا ہے اور نہ ہی ان کا کوئی آدمی بستی میں آتا ہے۔"

www.urdutech.com

ناصر نے بتایا۔ ”نامعلوم مدت بعد باہر اولین انسان ہم ہیں جو اس بستی میں داخل ہوئے ہیں۔“

”کیا آپ کو باہر کی دنیا سے خوف محسوس نہیں ہوتا؟“

”نہیں...... کیونکہ ہمارا ایمان اس پر ہے کہ جو بھی ہوتا ہے خدا کی مرضی سے ہوتا ہے۔“

”ہم باہر کے لوگ ہیں...... جب ہم جا کر دنیا کو آپ کے بارے میں بتائیں گے تو شاید آپ سب مشکل میں پڑ جائیں۔“

ناصر نے ڈاکٹر کو گھورا۔ ”یہ کرنے والا سوال ہے...... آپ ہم سب کا خاتمہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”نہیں تم اس سے یہ سوال کرو۔ میں ان کا ذہن جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟“

بادل ناخواستہ ناصر نے ماں سے سوال کیا۔ بوڑھی عورت پھر مسکرائی۔ ”میں نے کہا نا...... ہم خدا پر بھروسا کرنے والے لوگ ہیں، وہی ہمیں ہر مشکل سے بچاتا ہے۔“

”یعنی آپ ہمیں جانے کی اجازت دے دیں گی؟“

”ہاں...... آپ سے ہمیں کیا نقصان ہوا ہے جو ہم آپ کو روکیں؟“ ماں نے حیرت سے کہا۔

”حیرت انگیز۔“ ڈاکٹر نے گہری سانس لی تھی۔ ”یہ بہت ہی سادہ اور پختہ عقیدہ رکھنے والے لوگ ہیں۔“

شاید اس وجہ سے اس جیسی جگہ پر بھی آباد اور محفوظ ہیں۔ ورنہ یہ علاقہ چاروں طرف سے خوں خوار قبائل میں گھرا ہوا ہے۔ یہاں کے خانہ بدوش بھی کم وحشی نہیں ہوتے ہیں۔“

مائیکل اور انجیلا خاموشی سے ان کی بحث...... سوالات اور ان کے جوابات سن رہے تھے۔ مائیکل نے کہا۔ ”ان سے پوچھو، ان کو سونے کی اہمیت کا کیسے پتا چلا۔ یہاں کتنا سونا ہے؟“

”یہ سوال تم خود کرلو۔“ ڈاکٹر نے رکھائی سے کہا۔

”معاف کرنا میں اس قسم کا کوئی سوال نہیں کروں گا۔“ ناصر نے بھی صاف جواب دے دیا۔ ”مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا ہے کہ سونے کو یہاں سے لے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔“

مائیکل اس پر جھنجلایا ہوا نظر آنے لگا۔ آنے والے چند دنوں میں وہ بستی کے افراد سے خاصے گھل مل گئے تھے۔ ان کی عورتیں پردہ کرتی تھیں۔ ناصر نے سوائے ماں کے اور کسی عورت یا جوان لڑکی کو بنا پردے کے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ بارہ سال سے کم عمر لڑکیاں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ نسلی اختلاف کے باوجود ان لوگوں کی ثقافت، زبان اور مذہب یکساں تھے۔ اور چار بھائیوں کی اولاد ہونے کے باوجود وہ ایک تھے۔ ایک بہت بوڑھے شخص نے جو چہرے مہرے سے چینی لگتا تھا ناصر کو بتایا کہ چار بھائی اپنی بیویوں اور ماں کے ساتھ یہاں آئے اور اس مقام پر آباد ہوئے تھے۔ فطری طور پر ماں ان کی سربراہ تھی، اس وقت سے یہ روایت چلی آرہی ہے۔ بستی کی سب سے معمر عورت سربراہ ہوتی ہے اس کے مرنے کے بعد سب سے زیادہ عمر والی عورت خود بہ خود سربراہ بن جاتی ہے مگر ماں برائے نام سربراہ ہوتی ہے اور صرف بعض مخصوص حالات میں حکم دے سکتی تھی۔ ورنہ بستی کا انتظام مشاورتی کونسل چلاتی تھی۔ ایک خاص حد سے زیادہ عمر کا ہر مرد اس کونسل کا رکن بن جاتا تھا۔ یہ ایک طرح سے اس بستی کی پارلیمنٹ تھی۔ ناصر کو ان لوگوں کی ذہانت پر رشک آیا۔ بوڑھی عورت کو سردار بنا کر انہوں نے سرداری سے منسلک تمام جھگڑے ہی ختم کردیے تھے۔

ان کی عورتیں بستی کی عورتوں میں گھل مل گئی تھیں۔ صوفیہ نے تصدیق کی کہ عورتیں ساری ہی تقریباً ایک جیسے خدوخال رکھتی تھیں اور سب بے حد حسین تھیں۔ مائیکل نے انجیلا سے ان کی تعریف سن کر اس سے کہا۔ ”تم سے زیادہ حسین نہیں ہوں گی۔“

ان لوگوں پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ پوری بستی میں ہر جگہ جاسکتے تھے۔ سوائے رہائشی حصوں اور سونے کی کان کے۔ باہر بھی جاسکتے تھے لیکن صرف صبح یا شام...... جب بستی کے دوسرے افراد بھی ضروری کاموں سے باہر جاتے تھے۔ دن میں کوئی نہیں نکلتا تھا۔ صبح منہ اندھیرے سے ذرا دن چڑھنے تک وہ اپنے کام نمٹاتے تھے اور پھر شام ڈھلنے تک آرام کرتے تھے۔ اس کے بعد پھر کام اور رات کے ابتدائی پہر میں سو جاتے تھے۔ دن میں دو بار کھانا کھاتے تھے۔ صدیوں کی کفایت شعارانہ عادات کی وجہ سے وہ سب مختصر خوراک لیتے تھے، اس کے باوجود لمبے تڑنگے اور صحت مند تھے۔ مردوں میں شاید ہی کسی کا قد چھ فٹ سے کم ہو۔ بعض تو ساڑھے چھ سے بھی اوپر تھے۔ ان کی عورتیں بھی ایسی ہی جسامت رکھتی تھیں۔ عورتوں میں بچے پیدا کرنے کی شرح کم تھی۔ بہت کم عورتیں تیسرے بچے کو جنم دیتی تھیں۔ اس طرح بہت کم عورتیں ایک بچے والی تھیں۔ زیادہ تر دو بچے پیدا کرتی تھیں۔ شاید اسی وجہ سے ان کی آبادی اتنی ہی چلی آرہی ہے۔ بہ قول نسوم کے... قدرت خود ان میں یہ تناسب برقرار رکھتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ ان کی آبادی کم ہوئی اور کبھی زیادہ لیکن یہ تناسب نہیں بگڑا تھا۔ ناصر اور اس کے ساتھیوں کے لیے یہ حیران کن سرزمین تھی ڈاکٹر ڈین نے بستی کو ونڈر لینڈ کہا تھا۔ ایک جیتا جاگتا عجوبہ۔

...وگ طیارے کا ملبہ اور اس میں پایا جانے والا سامان ...ئے۔ ان کا کچھ سامان بچ گیا تھا مگر ذاتی سامان ...ئب ہو چکا تھا۔ اس لیے چند دن کے لیے انہیں ان ...ں کے کپڑے پہننا پڑے تھے۔ کپڑے بھی انہیں خانہ ...کردیتے تھے۔ اسے یہ خود سی کر لباس وضع کرلیتے تھے ...توں نے پھرتی سے دیے جانے والے لباس پھر ...ر ناصر اور اس کے ساتھیوں کے مطابق کردیے تھے۔ پہلی بار ایک دوسرے کو اس حلیے میں دیکھ کر وہ خوب ہنسے ...۔ نہانے دھونے کے لیے چشمے کے پاس ایک جگہ مخصوص ...۔ مردوں کے لیے ہفتے میں چار دن تھے اور عورتوں کے ...ن دن۔ عجیب بات تھی کسی قسم کے علم سے نہ آشنا ہونے ...ں رسم الخط کی عدم موجودگی میں ان لوگوں کو ہفتے، مہینے ...ال کا پتا تھا۔ یہ ان کی مدد سے اپنی عمریں نکالتے تھے۔

صوفیہ نے مزے سے مقامی عورتوں والا لباس پہن لیا ...میں گھومتی پھرتی تھی لیکن انجیلا نے صاف انکار کردیا ...لباس دھو کر اس نے چادر باندھ لی تھی اور قابلِ ...تراض حلیے میں مزے سے ان کے درمیان چلی آئی تھی۔ ...کے مرد تو اسے دیکھتے ہی اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے۔ ...عورتیں بھی پاس نہیں آتی تھیں۔ ناصر نے اسے سمجھانے کی ...کی کہ اس کا محض چادر باندھ کر گھومنا ان لوگوں کے ...م و رواج کے خلاف ہے مگر وہ نہیں مانی۔ صوفیہ نے ناصر ...سے کہا۔ ”میری بات لکھ کر رکھ لو۔ یہ عورت اور مائیکل ہم پر ...کوئی مصیبت لانے والے ہیں۔ میں نے اس عورت کو ...کے افراد سے نازیبا حد تک فری ہوتے دیکھا۔ یہ افراد ...سونے کی کان میں کام کرتے ہیں۔“

”یہ تو تشویشناک بات ہے۔“ ناصر بولا۔ اس نے ...ڈین کو بتایا تو وہ بھی پریشان نظر آنے لگا۔ ...اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ ہم جلد از جلد یہاں سے ...چلے جائیں۔“

...ڈاکٹر مجھے ان لوگوں کے بارے میں خدشہ ہے جب ...ان کا پتا چلے گا تو۔“

...بہت مشکل ہے... تم کیا سمجھتے ہو... اس صحرا میں ...تلاش کرنا آسان ہے۔ ہم میں سے کسی کو نہیں معلوم کہ ...ہیں۔ اطمینان رکھو جب ہم جائیں گے تو کوئی دوبارہ اس بستی کو تلاش نہیں کر سکے گا۔“

”یعنی آپ کا ارادہ کسی کو بتانے کا نہیں ہے؟“

”دیکھو میں علمی آدمی ہوں صرف وہی بات کہتا ہوں جسے ثابت کرسکوں۔ تم ان سے بات کرو، اب ہمارا یہاں سے جانا ضروری ہوگیا ہے۔ خاص طور سے انجیلا کی طرف سے مجھے تشویش ہے۔ اچھی خاصی معقول لڑکی تھی۔“

”میرا خیال ہے مائیکل اسے بہکا رہا ہے۔ سونا دیکھ کر اس کے دل میں لالچ آگیا ہے۔“

ناصر نے نسوم سے بات کی۔ اس دوران میں اس سے دوستوں جیسی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ اس نے کھل کر نسوم سے بات کی۔ ”اس سے پہلے کہ تمہارے یا ہمارے لیے کوئی مسئلہ کھڑا ہو ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے۔“

”مشاورتی کونسل میں بھی آج کل یہی بات ہو رہی ہے۔ تمہاری طرف کی دوسری عورت کی وجہ سے یہاں خاصی گڑبڑ ہے۔ وہ کان پر کام کرنے والوں کے ساتھ غاروں میں جاتی رہی ہے۔ یہ ہمارے معاشرت کے خلاف ہے۔ مہمان ہونے کی وجہ سے تم لوگوں کو اب تک کچھ نہیں کہا جا رہا ہے۔“

”میرے خدا، نوبت یہاں تک آگئی ہے۔“ ناصر پریشان ہوگیا تھا۔

”مسئلہ یہ ہے کہ جب تک خانہ بدوشوں کا کوئی قافلہ ادھر سے نہیں جاتا تم لوگ یہاں سے نہیں نکل سکتے ہو۔ اس خوفناک صحرا میں راستے بس وہی جانتے ہیں۔“

ناصر نے فوری طور پر واپس جا کر مسئلہ ڈاکٹر اور دوسرے لوگوں کے سامنے رکھا۔ انجیلا بھڑک اٹھی تھی۔

”بکواس کرتے ہیں، مجھ پر بہتان لگاتے ہیں۔“

”ہم سب بھی آنکھیں رکھتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے اس سے سرد لہجے میں کہا۔ ”براہِ کرم ان لوگوں کو شرافت ترک کرنے پر مجبور مت کرو..... ورنہ دنیا کو کبھی ہمارا سراغ نہیں ملے گا۔“

انجیلا اور مائیکل سرکشی پر آمادہ تھے مگر کچھ دیر میں ہی نسوم نے آکر مشاورتی کونسل کا حکم سنایا جس کے مطابق وہ سب پابند کردیے گئے تھے کہ اپنے رہائشی حصے سے باہر نہ جائیں۔ ساتھ ہی نسوم نے کہا کہ کچھ دن بعد خانہ بدوشوں کے ایک قافلے کی آمد متوقع ہے جو جنوب کی طرف جائے گا، وہ اس کے ساتھ جاسکتے تھے۔ انجیلا اور مائیکل کے منہ اتر گئے تھے۔ مائیکل نے دانت پیس کر کہا۔

”ایک بار یہاں سے نکل جاؤں پھر تم سب کو دیکھ لوں

گا۔''

''امریکی فوج سمیت چڑھ دوڑو گے۔'' صوفیہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''ان لوگوں کو اس رویّے پر پچھتانا پڑے گا۔''

''ایسا نہ ہو تمہارے اس رویّے پر ہم سب کو پچھتانا پڑ جائے۔'' ناصر نے کہا۔

آزادی سلب ہو جانے کے بعد شب و روز ان کے لیے اذیت ناک بن گئے تھے۔ باہر بھی جاتے تھے تو ان کی نگرانی میں جاتے تھے۔ مائیکل کبھی کبھی انہیں گالیاں دینے لگتا تھا اور باقی سب اس سے بےزار تھے۔ کوئی دسویں دن نسوم آیا۔ اس نے بتایا کہ خانہ بدوشوں کا قافلہ آ گیا ہے اور وہ کل روانہ ہو گا۔ وہ ان کے ساتھ جائیں گے۔ ناصر نے فکرمندی سے پوچھا۔ ''خانہ بدوش ہمیں بہ حفاظت کسی جگہ پہنچا دیں گے؟''

''ہاں کیوں نہیں...... وہ تمہیں آرام سے لے جائیں گے۔''

''ویسے یہ خانہ بدوش سونے کا راز فاش نہیں کرتے؟'' ناصر نے پوچھا۔ اس نے نسوم کو سونے کی اہمیت بتائی تھی۔

نسوم مسکرایا۔ ''اس طرح خود بھی سونے سے ہاتھ دھو لیں گے۔''

اگلے روز وہ ماں سے مل کر رخصت ہوئے۔ باہر کھنڈرات کے پاس خانہ بدوشوں کا قافلہ رکا ہوا تھا۔ انہیں خانہ بدوشوں کے حوالے کیا گیا تاکہ وہ انہیں کسی محفوظ مقام تک پہنچا دیں۔ نسوم نے بتایا کہ اس مقصد کے لیے انہیں دو بوری اضافی سونے والی ریت دی گئی تھی۔ ناصر نے خانہ بدوشوں کے سردار سے وعدہ کیا کہ وہ ان کے ذریعے مہذب دنیا تک پہنچے تو ان کو بھاری معاوضہ دیا جائے گا۔ معاملات طے ہوتے ہی خانہ بدوش روانہ ہو گئے۔ وہ رات میں سفر کرتے تھے اور دن میں خیمے لگا کر آرام کیا کرتے تھے۔ مائیکل اور انجیلا پُرجوش تھے۔ ڈاکٹر نے ان سے بات کی تھی کہ فی الحال اس بستی کا کسی سے ذکر نہ کریں مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا۔

''ڈاکٹر کتنی احمقانہ بات ہے...... ہمیں ایک زندہ بستی ملی ہے اور ہم دنیا کو اس کے بارے میں نہ بتائیں؟''

مائیکل نے حقارت سے کہا۔ ''میں اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔''

ڈاکٹر ڈین، صوفیہ اور ناصر ان کے اس رویّے سے پریشان تھے۔ رفیق شروع سے بےچارہ بستر پر تھا۔ ابھی وہ گدھے پر خاص طرح سے بنے بستر پر سفر کرتا تھا، ویسے اس کی حالت بہتر تھی۔ خانہ بدوشوں کا ارادہ چاڈ کے انتہائی جنوبی حصے میں واقع جھیل چاڈ تک جانے کا تھا۔ اس راستے میں کئی صحرائی بستیاں آتی تھیں لیکن وہ کسی جگہ رک نہیں سکتے تھے، البتہ چاڈ میں ان کو ایسے شہر مل جاتے جہاں سے ان لوگوں کو مہذب دنیا تک جانے کے ذرائع مل سکتے تھے۔

ناصر، صوفیہ اور ڈاکٹر اکٹھے مل کر غور کرتے تھے کہ مائیکل اور انجیلا کو کیسے روکا جائے۔ وہ طویل سفر سے پہلے ہی بےزار تھے۔ انہوں نے خانہ بدوشوں کو آگاڈیز جانے پر رضامند کرنے کی پوری کوشش کی تھی مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ ان کے سردار نے بتایا کہ وہ صدیوں سے ان مخصوص راستوں پر سفر کر رہے ہیں اور ان سے انحراف نہیں کر سکتے۔ سفر کے ساتویں دن جب انہوں نے صبح روشنی تیز ہونے پر پڑاؤ ڈالا اور دلیے کے ناشتے سے فارغ ہو کر وہ پانچوں اپنے خیمے میں رکے تو ناصر نے انہیں بتایا۔

''خانہ بدوش بتا رہے ہیں یہ جگہ آگاڈیز سے صرف دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔'' اس نے ہاتھ سے مغرب کی طرف اشارہ کیا۔

مائیکل اور انجیلا نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ ساری رات سفر کے بعد وہ تھک گئے تھے اس لیے جلد سو گئے۔ جب شام کو اٹھے تو مائیکل اور انجیلا ان میں نہیں تھے۔ انہوں نے خانہ بدوشوں سے اس بارے میں پوچھا وہ بھی لاعلم تھے۔ لیکن جلد پتا چل گیا۔ مائیکل اور انجیلا کے ساتھ ایک گدھا اور پانی سے بھرا ایک مشکیزہ بھی غائب ہے۔ ریت پر مغرب کی طرف جانے کے نشانات تھے۔ غالباً گدھے کی وجہ سے خانہ بدوشوں نے اپنے آدمی دوڑائے تھے مگر دو گھنٹے بعد وہ ناکام واپس آئے۔ ''وہ صحرا میں دور نکل گئے ہیں، ہم ان کا پیچھا نہیں کر سکے۔'' انہوں نے اپنے سردار کو بتایا۔

''مغرب کی طرف۔'' ڈاکٹر بولا۔ ''اس کا مطلب ہے وہ آگاڈیز کی طرف گئے ہیں۔''

سردار لفظ آگاڈیز سے سمجھ گیا۔ اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔ اور مشرق کی طرف ہاتھ اٹھا کر کچھ کہا۔ ڈاکٹر نے ناصر سے پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہا ہے۔''

''پتا نہیں...... میں سن نہیں سکا۔'' ناصر معصومیت سے بولا حالانکہ اس نے سن لیا تھا۔ سردار نے کہا تھا۔

''آگاڈیز مشرق میں...... اس طرف تو صرف صحرا ہے اور کچھ نہیں ہے۔''

ایک بھائی کا فسانۂ غیرت۔ غیرت سے بڑھ کر اس کے نزدیک کچھ نہ تھا پھر یکایک وہ ایسے دام میں الجھا کہ اس کی ترجیحات کی اہمیت نہ رہی

بلقیس جہاں

سودا

رات کی سیاہی نے چادر بن کر تمام کائنات کو [illegible] دیا تھا، ہر طرف ایک ہُو کا عالم تھا۔ کبھی کبھی گلی میں [illegible] کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آتی، جو سناٹے کو کچھ کم کرنے [illegible] بجائے اس کی وحشت کو اور بھی بڑھا دیتی تھی۔ وہ محلہ [illegible] کچھ دیر پہلے روشنیاں تھیں اور زندگی کی رونقیں بھرپور [illegible] میں جوان تھیں، اب خاموش اور سنسان پڑا تھا۔ اسی [illegible] محلے کے ایک کچے پکے گھر میں ایک نوعمر سی لڑکی جس کا نام [illegible]انہ تھا، اپنے پلنگ پر بےچین سی آہستہ آہستہ کبھی ایک [illegible] اور کبھی دوسری طرف کروٹ لے رہی تھی۔ وہ اس قدر [illegible] کروٹ لے رہی تھی کہ ٹوٹا ہوا پلنگ ذرا بھی آواز پیدا [illegible] کر رہا تھا۔ رات ذرا گہری ہوئی تو اس نے آہستہ سے اپنا [illegible] پلنگ سے نیچے اتارا، اور کچھ دیر کھڑے، کھڑے ہی اس [illegible] اندازہ کیا کہ گھر کے دوسرے لوگ بھی سو رہے ہیں، [illegible] طرح اطمینان کرنے کے بعد وہ آہستہ سے آگے بڑھی۔ [illegible] رخ گھر کے اس دروازے کی طرف تھا جس کا رخ باہر [illegible] طرف تھا، دروازے کی طرف جا کر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر کی طرف جھانکا، مگر اسے کوئی بھی نظر نہیں [illegible]، وہ مایوس ہو کر پلٹی اور واپس اپنے پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی۔

اس نے تین چار بار ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا، باہر [illegible] اور ہر بار مایوس ہو کر بند کر لیا۔ جیسے اس کی نگاہیں [illegible] تک جھانک کر تلاش کر رہی تھیں، اس کا کہیں دور دور تک [illegible] نہ تھا۔ چھ مہینے میں ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس نے وعدہ کیا [illegible] نہیں آیا۔ ان حالات میں جہاں موت کا خوف دلوں کی [illegible] بن گیا ہو اور رات میں جوان لڑکے اور تجربہ کار مرد بھی [illegible] ہوئے ڈرتے ہوں، وہاں اتنی تاریکی میں ایک جوان [illegible] انداز لڑکی کا بار بار دروازے تک آنا اور دور تک جھانکنا [illegible] سمجھ سے بالاتر سا لگتا ہے۔ مگر ان لوگوں کے لیے [illegible] خلافِ عقل نہیں، جو محبتوں کو دھڑکنوں میں بسا چکے [illegible] پیار کے لبوں کی چاشنی چکھ چکے ہوں۔ چاہتوں [illegible] جانتے ہیں کہ محبت کا جذبہ ہر جذبے پر حاوی ہوتا [illegible] کیاں جو اپنے اندر ایک خوف لے کر، ایک ڈر لے کر [illegible] ہیں اگر محبت کر بیٹھیں تو سخت سے سخت حالات کا [illegible] جرنیل بن کر مقابلہ کرتی ہیں۔

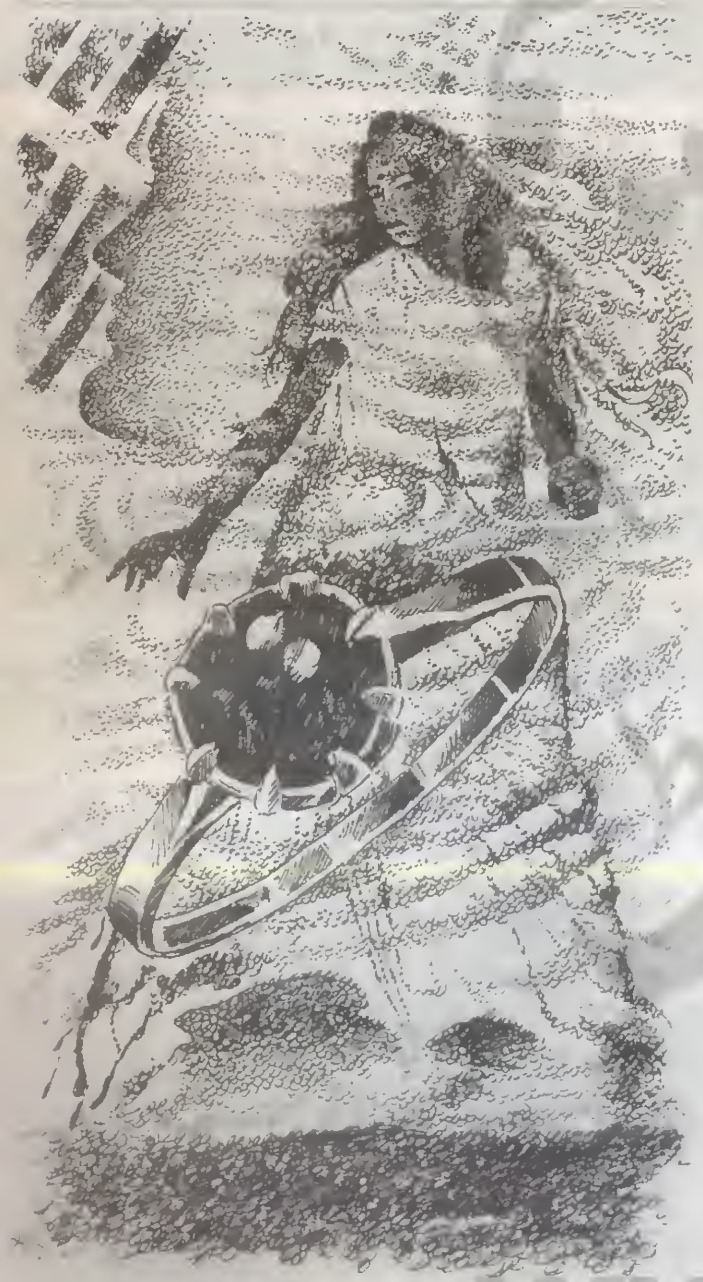

انتظار کے لمحے بڑے کٹھن ہوتے ہیں۔ آنے والے کے انتظار نے ریحانہ کو سخت اعصابی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہر بار وہ اسی امید پر دروازہ کھولتی کہ اس بار وہ ضرور موجود ہوگا مگر ہر بار مایوس ہوتی۔ اس مایوسی نے اسے بری طرح تھکا دیا تھا، آخر کار نڈھال ہو کر وہ بستر پر جا لیٹی۔

''اب شاید وہ نہ آئے۔''

''شاید'' کے احساس نے اس کے دل کو مکمل مایوسی سے بچا لیا تھا۔ لیٹے لیٹے اس کی آنکھ ذرا دیر کو لگ گئی۔ کسی چیز کی ہلکی سی آواز سے اس کی آنکھ کھلی، اس نے سنا، اماں بلی کو ہش ہش کر رہی ہیں، اس نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ بلی کو ہش ہش کر کے اماں دوبارہ سو گئیں۔ اسی وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، تیزی سے اس کا دل دھڑکا، کچھ دیر تک وہ یونہی لیٹی رہی اور کچھ توقف کے بعد وہ بستر سے اٹھی اور آہستہ آہستہ دروازے تک پہنچی، جھری سے جھانکا وہ کھڑا تھا۔

اس وقت گلی میں اندھیرا تھا مگر چاند کی ہلکی سی روشنی نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کا پیار اس سے ملنے کا منتظر ہے۔ اس نے جلدی سے مگر احتیاط کے ساتھ دروازہ کھولا، کنڈی کا ہلکا سا کھٹکا پیدا ہوا۔ ایک منٹ تک وہ اسی طرح کھڑی رہی۔ جب مطمئن ہو گئی کہ یہ کھٹکا کسی اور نے نہیں سنا، تو باہر نکلی، دروازے کو بھیڑ کر وہ اس کے پاس آئی، کچھ دیر تک وہ دونوں یونہی کھڑے رہے اور پھر آخر کار دونوں گلی میں لگے واٹر بورڈ کے نلکے کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

''اتنی دیر کیوں کر دی رضوان؟ پتا ہے میں کب سے انتظار کر رہی تھی۔'' اس نے سچ مچ کے غصے کے ساتھ پوچھا۔

''بتاتا ہوں! بتاتا ہوں!'' آنے والے نے جلدی سے کہا۔ ''دراصل مجھے ایک نیا کام مل گیا ہے، اس میں وقت بھی لگتا ہے اور محنت بھی زیادہ ہے، لیکن پیسا بھی ٹھیک ٹھاک ملے گا۔ تو شادی کی جلدی کرتی تھی نا؟ اب بندے کے پاس چار پیسے جمع ہوں گے تو وہ شادی کرے گا۔''

''تو یہ رات کا کام کون سا ہے جو تجھے ملا ہے؟ رات تو چوروں کی ہوتی ہے۔'' اس نے بدستور ناراضی کے ساتھ کہا۔

نوجوان نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور گویا ہوا۔ ''اچھا! یہ بتا کہ یہ جو تیرے ماموں رات کو بیٹھ کر کرسیاں بُن کر زیادہ سے زیادہ رقم بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور تیرا پڑوسی جو رات کو سبزیاں لے کر آتا ہے اور دن میں فروخت کرتا ہے اور تو اور ابھی پچھلے مہینے ہی تو نے کہا تھا کہ میں رات میں نہ آیا کروں۔ ابا کی فیکٹری میں ٹائم لگ گئی ہے تو کیا یہ سب لوگ ......'' بات کو ادھوری چھوڑ کر اس نے ریحانہ کی طرف دیکھا۔

''اچھا اچھا، میں سمجھ گئی۔'' ریحانہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا اور کسی فلسفی کی طرح رضوان کی طرف اس طرح دیکھا کہ گویا کہہ رہی ہو اگر اتنی سی بات تھی تو پہلے کیوں نہیں بتائی۔

رضوان نے جب دیکھا کہ ریحانہ کی ناراضی دور ہو گئی ہے تو اس نے جیب سے ایک ڈبیا نکالی اور ڈبیا سے چمچماتی سونے کی ایک انگوٹھی نکالی اور ریحانہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اس کے سیدھے ہاتھ کی دوسری انگلی میں پہنا دی۔ اس تمام عرصے میں ریحانہ مسلسل اس کو محبت پاش نظروں سے دیکھتی رہی۔

''کیا یہ سونے کی ہے؟'' اس نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے سوال کیا۔

''اگر میں کہوں کہ ہاں، تو......''

''تو......تو میں پوچھوں گی کہ یہ تمہارے پاس کہاں سے آئی؟''

''میں نے اوور ٹائم لگا کر اسے خریدا ہے۔ دیکھو یہ میرا پہلا تحفہ ہے۔ اسے تم سنبھال کر رکھنا۔'' رضوان نے محبت سے بھرے لہجے میں ریحانہ سے کہا۔

''ہاں میں اس کو اپنی جان سے لگا کر رکھوں گی۔''

''دیکھو تمہارے ہاتھ میں یہ انگوٹھی کتنی خوبصورت لگ رہی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے رضوان نے جھک کر اس کا ہاتھ چوم لیا۔ ریحانہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ وہ جلدی سے اٹھی۔

''اچھا! اب میں چلتی ہوں صبح ہونے والی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر داخل ہوئی، دروازہ بند کرنے سے پہلے اس نے اپنے محبوب رضوان پر ایک الوداعی نگاہ ڈالی۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے آنکھوں آنکھوں میں خدا حافظ کہا اور دروازہ بند کر کے پلٹ گئی۔

صبح سورج چڑھنے تک وہ سوتی رہی۔ اس کا بھائی گھر سے جا چکا تھا، اس کی اماں اس کے اس طرح سونے سے بے زار ہو گئیں اور آخر کار ان سے برداشت نہ ہو سکا، انہوں نے ریحانہ کی چادر کا کونا پکڑ کر ہلا دیا۔ ریحانہ اس قدر نیند میں مدہوش تھی کہ اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا، جس پر اس کی اماں اور بھی چڑ گئیں انہوں نے دوسری بار صرف چادر ہی نہیں ہلائی بلکہ اس کا پاؤں بھی پکڑ کر زوردار طریقے سے ہلا دیا جس پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، چند لمحوں تک اسے سمجھ ہی نہیں آیا کہ ہوا کیا ہے لیکن پھر سامنے ہی اماں کو دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ اس کے دیر تک سونے کی وجہ سے اماں کو چڑ لگی ہے۔

''کیا بات ہے، آج کل تو بہت دن چڑھے تک سوتی رہتی ہے؟'' ماں نے کرخت لہجے میں سوال کیا۔ ''کیا طبیعت خراب ہے؟''

اس نے اماں کی بات کا جواب نہیں دیا، لیکن اسے اس کا اٹھنا بھی اچھا نہیں لگا، ناگواری کا ایک تاثر اس کی جبیں پر لیکن اس کے لبوں سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ ماں کے حکم پر وہ اٹھ کر بیٹھ تو گئی مگر مکمل ہوش میں نہیں آئی محبت کا نشہ شراب کی طرح اس کے لہو کے ساتھ جسم میں دوڑ رہا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، ہر چیز گھر میں بے ترتیب پڑی تھی۔ مگر اس کو اس میں ایک توازن، ایک حسن نظر آ رہا تھا۔ چند منٹ تک وہ اسی پوزیشن میں بیٹھی رہی اور رات کے منظر میں کھوئی رہی۔

''کیا ابھی تک نیند میں ہے ریحانہ کچھ تو خدا کا خوف کر، گھر سے باپ بھائی کام پر چلے گئے مگر تو ہے کہ ابھی تک بستر توڑ رہی ہے، اری کم بخت صبح اٹھ جایا کر، گھر میں برکت ہوتی ہے۔''

''بھائی کب گیا کام پر، اور کب اس کا کام لگ گیا؟'' اس نے جلے بھنے لہجے میں ماں سے سوال کیا۔

''ارے نہیں لگا ہے تو جلد ہی لگ جائے گا پتا نہیں کیسی بہن ہے، بھائی سے نام کو محبت نہیں۔''

''ہاں بھائی تو میرے لیے سونے کے کنگن بنا رہا ہے نا۔'' اس نے اس بار بھی اماں کو تڑخ کر جواب دیا، لیکن اسے اس بار اماں کی طرف سے کوئی جواب سننے کو نہیں ملا۔

کچھ دیر تک وہ بستر پر ہی پڑی رہی، پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بستر سے اٹھنا ہی پڑا۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ باورچی خانے میں آ گئی، سامنے ہی چائے کی پتیلی رکھی ہوئی تھی، اس نے اسے کھول کر دیکھا چائے اس میں رکھی ہوئی تھی، روٹی کی تھال میں روٹی بھی رکھی تھی، اس نے چائے اور روٹی کو گرم کیے بغیر ہی کھا لیا، اسے اب کسی بھی چیز سے کوئی رغبت نہیں رہی تھی، اسے چاہت کی دلفریبی نے بری طرح اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ حسبِ معمول تمام گھر کی صفائی میں لگ گئی۔ گھر کو صاف ستھرا کر کے وہ ماں کے پاس باورچی خانے میں آ گئی تاکہ ان کی کچھ مدد کر سکے۔ ماں نے طنزیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا، لیکن کہا کچھ بھی نہیں، شاید کہ وہ سمجھ گئی تھیں کہ ریحانہ باورچی خانے میں کیوں آئی ہے، وہ یہ بات بھی جانتی تھیں کہ اگر انہوں نے ذرا بھی کچھ کہا تو وہ ناراض ہو کر یہاں سے چلی جائے گی۔ ریحانہ نے باورچی خانے میں نظر ڈالی، ہر چیز پھیلی ہوئی تھی، اس نے باورچی خانے میں پھیلی ہوئی چیزیں سمیٹتے ہوئے اپنی ماں سے کہا۔

''اماں نگینہ کی شادی کب ہو رہی ہے؟''

''اگلے مہینے کی دس تاریخ کو ہے۔'' اس کی ماں نے جواب دیا۔

''یہ مہینا تو ختم ہونے میں صرف آٹھ دن رہ گئے ہیں یعنی اس کی شادی پورے اٹھارہ دن کے بعد ہوگی۔ اف اللہ کس قدر مزہ آئے گا۔ نیا جوڑا ضرور بنوا کر دینا۔''

''کیوں کیا تیری شادی ہے؟'' اس کی ماں نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔ ''چل جلدی سے برتن کو دھو دے تاکہ میں ہانڈی پکا سکوں۔''

اس نے اس بار ماں کی بات کا برا نہیں مانا، وہ سوچ رہی تھی کہ جب اس کی اور رضوان کی شادی ہوگی تو کس قدر مزہ آئے گا، دونوں ایک ہی جگہ پر رہیں گے، نہ وہاں پر اماں کی جھک جھک ہوگی نہ بھائی کی زبردستی ہوگی نہ ابا کا خوف ہوگا، کس قدر مزہ آئے گا۔'' اپنی سوچ پر وہ خود ہی مسکرانے لگی، اس کا موڈ اس قدر اچھا ہو گیا کہ اس نے اماں سے شوخ انداز میں اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ باتیں کرتے ہوئے اس نے سارے برتن دھو لیے اور اماں سے کہا۔ ''اماں میں نے آج برتن خوب چمکائے ہیں، یہ دیکھو پتیلی میں میرا چہرہ نظر آ رہا ہے۔''

پتیلی میں اپنا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ آپ ہی آپ ہنس پڑی۔ ماں نے دھلے ہوئے برتن اس کو دیے تاکہ ہاتھ کے ہاتھ وہ بھی لگ جائیں۔ کمر کے درد نے اماں کو بالکل ہی محتاج بنا دیا تھا۔ بیٹھ جاتیں تو اٹھنا مشکل، اٹھ جاتیں تو ان کے لیے بیٹھنا مشکل ہو جاتا تھا۔ گھر کے کتنے کام تھے جو اس نے اپنے

ذمے لے رکھے تھے۔

ریحانہ کی پیدائش پر اس کے ماں باپ کو کچھ زیادہ خوشی نہ تھی مگر ریحانہ نے آہستہ آہستہ اپنی جگہ بنا ہی لی تھی۔

ماں نے دھلے ہوئے برتن کا آخری حصہ جب اس کی طرف بڑھایا تو ان کی نگاہ ریحانہ کی انگلی میں جگ مگ کرتی انگوٹھی پر جیسے تھم کر رہ گئی۔ اماں کو اچھی طرح یاد تھا کہ کل رات تک اس کے پاس کوئی بھی ایسی انگوٹھی نہیں تھی۔ انگوٹھی کی حقیقت ان کی تجربہ کار نگاہیں پہچان چکی تھیں۔ ریحانہ نے ماں کی آنکھوں کا مفہوم سمجھ لیا اور دل کے چور کو آنکھوں میں آنے سے پہلے ہی اندر دبا دیا۔

''ماں! خوبصورت ہے نا یہ انگوٹھی؟ مجھے نگینہ نے دی ہے پہننے کے لیے، یہ انگوٹھی اسے اس کے منگیتر نے دی ہے، میں ایک دو دن پہن کر اسے واپس کر دوں گی۔ اگر تو کہے تو آج ہی واپس کر دوں؟''

ماں نے مطمئن ہو کر کہا۔ ''نہیں اگر پہننے کے لیے دی ہے تو ضرور پہن لے لیکن گم مت کرنا، بڑی قیمتی لگتی ہے تین چار ہزار سے تو کم نہ ہوگی۔''

اس نے ماں کو تو مطمئن کر دیا تھا مگر اس کا دل خود کے قابو میں نہیں آ رہا تھا وہ جانتی تھی کہ اگر ماں کو اس کے اور رضوان کے رشتے کے متعلق شک بھی ہو جاتا تو شاید وہ اس کو زندہ نہ چھوڑتیں اور اگر اس کے بدمعاش بھائی کو جس کے پاس مفت کی روٹیاں توڑنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا اگر خبر لگتی تو..... !

آگے اس سے سوچا ہی نہیں گیا۔ اب اس کو فکر لگی تھی کہ کسی طرح جا کر نگینہ کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کرے۔ سارے محلے میں صرف نگینہ ہی سے اس کی دوستی تھی۔ وہ لوگ جس محلے میں رہتے تھے وہاں نگینہ کا گھر تمام محلے میں نمایاں تھا۔ نگینہ کے غیر شادی شدہ ماموں جب سے باہر گئے تھے ان کے حالات ہی بدل گئے تھے۔ اسی لیے نگینہ کا رشتہ بھی ایک اچھے کھاتے پیتے خاندان سے آ گیا تھا، اور صرف اٹھارہ دن کے بعد ہی نگینہ کی شادی تھی۔ نگینہ اس کے ہر راز سے واقف تھی۔

اب ریحانہ کو جلد از جلد نگینہ سے ملاقات کی جلدی تھی وہ نہیں چاہتی تھی کہ ماں اس سے پہلے نگینہ سے مل لے۔ اسی اُدھیڑ بُن میں اس نے دوپہر کی روٹیاں پکائیں۔ روٹیاں پکا کر وہ ہاتھ دھو کر ماں کے پاس آئی اور بولی۔ ''اماں وہ کل نگینہ آئی تھی ناں، تو اس کو بخار تھا کہہ رہی تھی کہ میں آج اس کے پاس آ جاؤں تاکہ اس کا دل نہ گھبرائے۔''

ماں نے سوچتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ ''اچھا چلی جا! مگر باپ بھائی کے آنے سے پہلے ہی واپس آ جانا۔ تو یہ بات اچھی طرح جانتی ہے کہ تیرا بھائی کسی بھی حال میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ تو کہیں بھی آئے جائے۔''

''ٹھیک ہے اماں میں گئی اور آئی، بھائی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

ابھی چادر کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ کر وہ دروازے تک پہنچی بھی نہیں تھی کہ اس کا بھائی کریم اندر داخل ہوا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی اس کی روح فنا ہو گئی، اماں بھی گھبرا گئیں کریم کو انہوں نے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا اور اپنی چھاتی سے دودھ پلایا تھا۔ لڑکا ہونے کے ناتے ہمیشہ اسے ریحانہ پر فوقیت دی مگر جوں جوں کریم میں جوانی آ رہی تھی وہ بہن سے ساتھ ساتھ ماں پر بھی اپنا رعب بڑھاتا جا رہا تھا۔ گو ریحانہ کریم سے تین سال بڑی تھی مگر اس سے کسی چوہے کی طرح ڈرتی تھی۔ ریحانہ کو یاد ہے کہ بھائی کی پیدائش پر وہ کتنا خوش ہوئی تھی ماں پڑوس کی عورتوں سے کہہ رہی تھی۔

''بہن! ماں تو میں آج ہی بنی ہوں۔ ورنہ اب تک تو میں خود کو بانجھ ہی سمجھتی تھی۔'' اور پڑوس کی عورتوں نے اس بات پر ایک خوشی سے بھرپور قہقہہ لگایا تھا۔ وہ بھی خوش ہی تھی، اس کا معصوم ذہن اس وقت اس بات کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکا تھا، اسے یاد تھا کہ کس طرح وہ بھائی کو اٹھائے اٹھائے پھرتی تھی۔ ماں کریم کو دودھ کا بھرا پیالہ دیتی اور اس کو نہ ہونے کے برابر سفید چائے اور وہ خوش ہو کر بھائی کو دودھ پیتے ہوئے دیکھتی اور ہنستے ہوئے چائے کا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیتی اور کریم کو ماں باپ کے لاڈ اور سر چڑھتی جوانی نے کس قدر منہ زور بنا دیا تھا وہ اب ہر ایک پر بھونکتا ہے چاہے سامنے ماں ہی کیوں نہ ہو۔

ریحانہ کو کریم کی تیز نگاہیں اپنی روح میں اترتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ آخر اس کی آواز گونجی۔ ''کہاں جا رہی تھی؟''

''وہ..... وہ..... کہیں..... کہیں نہیں جا رہی تھی۔''

''اچھا تو اب گھر پر بھی چادر پہن کر بیٹھتی ہے۔''

اس نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے ماں کی طرف فخریہ انداز سے دیکھا۔ ماں اس کو دیکھ کر گھبرا تو گئی تھی مگر سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے بولی۔ ''ارے! یہ تیرا ہی انتظار کر رہی تھی، اپنی سہیلی نگینہ کی طبیعت کا پوچھنے جانا تھا اس کو۔''

نگینہ کے ذکر پر کریم کے ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ نمودار ہوئی، دل چھن چھن کرنے لگا۔ ''سالی کیا چیز ہے سر سے پیر تک ہری مرچ ہے۔ نہیں سگریٹ سے جلتی ہوگی، اس نے جملہ کی تصحیح کرتے ہوئے سوچا اپنی ریحانہ کی عمر کی ہوگی، مگر سالی لگتی کتنی چھوٹی ہے۔''

اور وہ دل ہی دل میں نگینہ کا محلے کی دوسری لڑکیوں سے موازنہ کرنے لگا، اور پھر بظاہر منہ بناتے ہوئے ریحانہ

سے مخاطب ہوا۔ ''چل آج تو لیے چلتا ہوں مگر آئندہ مت ... کی طرف مجھے تیرا اس سے ملنا جانا قطعی پسند نہیں۔''

... کوئی اور وقت ہوتا وہ کبھی کریم کے ساتھ نہ جاتی مگر ... اپنی جان پر بنی ہوئی تھی لاچار اس کے ساتھ ... نگینہ کتنی ہی بار کریم کی شکایت کر چکی تھی، کہ کریم اس کو ... تنگ کرتا ہے اور وہ بے بسی سے صرف اس کی ... کھ کر رہ جاتی اور نگینہ اس کی مجبوری کو سمجھتے ہوئے جلدی ... کوئی اور بات چھیڑ دیتی، کچھ عرصے سے ریحانہ کو جتنی کریم ... نفرت تھی اس سے کہیں زیادہ نگینہ سے محبت تھی۔

جس وقت ریحانہ نگینہ کے گھر میں داخل ہوئی، نگینہ صحن ... میگزین دیکھ رہی تھی۔ ریحانہ کو دیکھ کر وہ تیزی سے ... اور گلے لگ کر ڈھیروں شکوے شکایات کر ڈالے، وہ تو ... کھڑے ہی کھڑے ریحانہ سے تمام جوابات طلب کر لیتی ... اس کی والدہ دونوں کو بیٹھنے کا نہ کہتیں۔

نگینہ ریحانہ کو لے کر کمرے میں آ گئی ریحانہ نے چادر ... کر ایک طرف رکھی اور جلدی جلدی نگینہ کو انگوٹھی کے متعلق ... تفصیلات بتانا شروع کر دیں۔ نگینہ حیرانی سے تمام باتیں سنتی ... پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ''ٹھیک ہے ریحانہ! خالہ کو ... کہہ دوں گی مگر تم احتیاط کرنا آج کل زمانہ بہت خراب ... کہ جب تک دو چار فلرٹ نہ کر لیں، خود کو دوستوں میں ... تصور کرتے ہیں۔''

''نہیں نگینہ! میں اور رضوان روحوں کے رشتے میں ... بندھے ہوئے ہیں۔ وہ مجھ سے اور میں اس سے کبھی بھی دھوکا ... نہیں کر سکتے، صدیاں گزرتی ہیں تب جا کر روحوں کے ... بندھتے ہیں۔''

''اچھا بھئی ریحانہ ہماری دعا تو تم عاشقوں کے ساتھ ... ہے، ہمیں تو اس کا موقع ہی نہیں ملا، عشق سے پہلے ہی اماں نے رشتہ طے کر دیا۔ اچھا تم بیٹھو میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

نگینہ چائے بنانے چلی گئی، ریحانہ اب اپنے دل میں ایک اطمینان محسوس کر رہی تھی ایک بوجھ سر سے اتر گیا تھا ... آتے ہی اس کو دوبارہ رضوان یاد آ گیا۔ رضوان جو اس ... کچھ نہیں لگتا تھا مگر اس کی کائنات تھا، محبت بھی کیا عجیب چیز ... جسے دنیا غیر کہتی ہے وہ اپنا ہوتا ہے اور جسے اپنا بنانا چاہو وہ دور رہ جاتا ہے، چاہت کی نزاکت نے اس کے تمام ڈر کو ایک نور کے ہالے میں قید کر دیا تھا۔

☆☆☆

جوں جوں وقت گزر رہا تھا، ریحانہ کا پور پور رضوان کی ... میں ڈوب رہا تھا اب وہ اس سے پندرہ دن کے بجائے ہفتے میں ایک بار ملتی تھی۔ دونوں کی بے قراری نے ہفتے میں ایک بار ملنے کو بھی طویل سمجھا اور ملاقاتیں روز روز ہونے لگیں اور اس کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کسی نے ان کی نگرانی شروع کر دی ہے اور جلد ہی کوئی بڑی مصیبت ان سے گلے ملنے کے لیے بے چین ہے۔

جن محلوں میں غربت کا راج ہو وہاں کسی بھی قسم کی صفائی (خواہ وہ ذہنی ہو یا جسمانی یا ماحولیاتی) کی توقع کرنا فضول ہے۔ ریحانہ کے بھائی کے جن لوگوں سے تعلقات تھے، وہ سب ہی ایک رنگ کے تھے کچھ تو لڑکے اسی گلی سے تعلق رکھتے تھے اور کچھ آس پاس کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان لڑکوں سے کریم کی دوستی اتنی زیادہ تھی کہ وہ اکثر و بیشتر ان کو گھر پر بھی بلا لیتا تھا۔ اپنے ان دوستوں پر وہ اس قدر اعتماد کرتا تھا کہ ریحانہ کو ان سے پردے کے لیے کبھی اس نے کبھی نہیں کہا۔ کریم ان دوستوں پر اندھا اعتماد کرتا تھا۔ ان ہی دوستوں میں ایک لڑکا ترنگی تھا، جو کئی بار ریحانہ سے فری ہونے کی کوشش کر چکا تھا مگر ریحانہ کے سخت رویّے نے اس کو مزید آگے نہیں بڑھنے دیا تھا کیونکہ وہ ریحانہ پر کبھی بھی اپنی دسترس نہیں رکھ سکا اس لیے وہ کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھا جب ریحانہ کٹی پتنگ کی طرح اس کے قدموں میں آ گرتی۔

وہ کچھ دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ ترنگی اس سے کوئی خاص بات کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ کریم کے سامنے بھی اسے اشارے کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ پچھلے دس پندرہ دنوں میں اس کی ہمت کافی بڑھ گئی تھی۔

اس دن صبح سے ہی ریحانہ کا دل گھبرا رہا تھا۔ اس کے اندر ایک بے چینی سی تھی، وہ کیا بے چینی تھی یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کسی کام میں بھی اس کا دل نہیں لگ رہا تھا مگر وہ جانتی تھی کہ گھر کے کام صرف دل سے نہیں کیے جاتے۔ اگر وہ دل کا کہا مانتی تو شاید اس گھر میں اسے ایک دن بھی گزارنا مشکل ہو جاتا۔ وہ تو حکمرانی کے خواب دیکھتی تھی جہاں ایک سجا سجایا خوبصورت گھر اس کے لیے تھا، جہاں چاروں طرف پھول تھے۔ آنگن میں پھول، کمروں میں پھول، گلدان میں پھول، سر میں پھول اور اپنے اس تصور کے ساتھ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی، ہنسی کی آواز پر اس کے باپ نے دزدیدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور چیخ نما آواز میں اس کی ماں کو مخاطب کر کے کہا کہ۔

''میرا کھیایا (خیال) ہے کہ اس کو کھواب جیادہ آنے لگے ہیں اور یہ دوپٹا اس کے سر پر کیوں نہیں ٹکتا، جانتی نہیں کہ ہم غیرت مند لوگ ہیں، اگر کوئی محلے کا اسے اس طرح ننگے سر

www.lurtech.com

دیکھے تو کیا سوچے گا، یہی ناں کہ ہم لوگوں میں غیرت نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔''

اور پھر اس کے باپ کے منہ سے گالیوں کا نہ رکنے والا سیلاب امڈ پڑا۔ صبح سے اس کا دل ویسے ہی اداس تھا ذرا دیر کو حسین پھولوں کے تصور نے اس کو ہنسا دیا تھا مگر اب دوبارہ اداسی نے اس کے دل میں ڈیرے جما لیے تھے۔ کمرے کے تمام بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹتے ہوئے وہ بار بار اپنے اداس دل کو پھولوں کی خوشبوؤں سے بہلانا چاہتی تھی مگر دل ٹھکانے پر نہیں آرہا تھا۔ ہفتہ بھر کے میلے کپڑے اکٹھے کر کے وہ دھونے بیٹھی تو صابن نہیں تھا، طاق سے پیسے لے کر وہ دروازے پر کسی بچے کی تلاش میں گئی، مگر دروازہ کھولتے ہی اس کا سانس رک سا گیا۔ دیوار سے چپکا ہوا ترنگی کھڑا تھا۔ ریحانہ پر نظر پڑتے ہی اس کے سلوٹ زدہ چہرے پر مکروہ سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔''

''کبھی ہم پر بھی نظرِ عنایت کر لیا کرو۔'' ترنگی نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بکواس کی ضرورت نہیں ابھی اور اسی وقت دفع ہو جاؤ۔ ورنہ میں اماں کو آواز لگا لوں گی۔'' ریحانہ نے پیچھے ہٹتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''اونہہ! نخرے کیوں کرتی ہے کیا اپنے اس یار سے بھی اتنے نخرے کرتی ہے جو روز آتا ہے یا ہفتہ واری؟'' ترنگی نے اسی دبے دبے سے لہجے میں کہا۔

''میں کہتی ہوں دفع ہو جاؤ۔'' ریحانہ نے زرد چہرے کے ساتھ اس کو جواب دیا۔

''ہاں جاتا ہوں، پر سوچ لے آخر ہمارا بھی تو حق ہے اس منہ زور جوانی پر، یہ تھوڑی کہ کسی اور محلے کے لوگ مزے کریں اور ہم ترستے رہیں۔''

اپنی بات کر کے ترنگی نے ہنسنا شروع کر دیا اور ترنگی کی مکروہ ہنسی اس کے کانوں میں زہر کی طرح اترتی چلی گئی۔

دھلے ہوئے کپڑے پھیلا کر فارغ ہو کر بیٹھی تو اس کو رضوان یاد آ گیا۔ پڑوس میں ٹیپ ریکارڈ چل رہا تھا۔ آواز کی بازگشت اس کو اپنے دل سے نکلتی محسوس ہو رہی تھی، گانے والا بڑے درد بھرے انداز میں اپنے پریمی کو یاد کر رہا تھا۔

اسے رضوان کے جذبے یاد آ گئے وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ رضوان کے لیے ایک مقدس کتاب ہے جس کو صرف اور صرف رضوان نہایت عقیدت و احترام سے پڑھنا چاہتا تھا۔ ریحانہ رضوان کے لیے کتنی معصوم اور پاکیزہ تھی یہ صرف رضوان ہی جانتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا اور ریحانہ کا رشتہ ایک ایسا رشتہ ہے جو دلوں سے راستے بناتا ہے اور روحوں میں اتر جاتا ہے۔

ابھی وہ کچھ دیر اور رضوان کی یاد میں کھوئی رہتی کہ کریم دندناتا ہوا گھر میں داخل نہ ہوتا۔

''ریحانہ! جلدی سے میرے بیگ میں دو چار سوٹ رکھ دے، میں اور ترنگی حیدر آباد جا رہے ہیں کسی کام کے سلسلے میں، تقریباً ایک ہفتہ میں واپسی ہو گی۔''

باقی کی تفصیلات اس نے ماں کو بتائیں، وہ بالکل نہ سن سکی بس اتنا یاد رہا کہ ترنگی کی مصیبت ایک ہفتہ کے لیے اس کے سر سے ٹل رہی ہے۔ اسی دن رضوان کو بھی آنا تھا، ایک ساتھ دو خوشیاں اسے مل گئیں، کہاں وہ صبح سے اداس تھی اور ترنگی کی باتوں نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا اور کہاں اب بھائی اور ترنگی کے ایک ہفتے حیدر آباد جانے کی خبر سے ایک دم خوشی مل گئی۔ بھائی کے سفری بیگ کو اس نے خوشی خوشی تیار کر لیا۔ شام چار بجے کریم اور ترنگی چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد اس نے شام کے کھانے کی تیاری کی۔ وقت اس سے کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد جب اماں اور ابا سو گئے تو وہ دبے پاؤں اپنے بستر سے اٹھی، اس نے اپنے بال سیدھے کیے، اور منہ پر ہلکا سا پوڈر لگایا، اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، وقت اس سے کاٹے نہیں کٹ رہا تھا، اس کے کان رضوان کی ہلکی سی دستک پر لگے ہوئے تھے کہ کب وہ آئے اور اس سے ملاقات ہو۔ اللہ اللہ کر کے آخر انتظار کے لمحے ختم ہوئے اس کے کانوں میں دروازے کی ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی، آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر کی طرف نکل گئی۔ وائر بورڈ کے نکے کے پاس ہی اسے رضوان کھڑا ہوا نظر آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی اس کا دل بھر آیا اور وہ تیزی سے جا کر اس کے گلے لگ گئی۔

''لگتا ہے برسوں بعد ملے ہیں۔''

''ہاں'' رضوان کی بات پر مختصر جواب دے کر وہ اس کے سینے میں دوبارہ سما گئی۔ دونوں کے لب خاموش تھے مگر دل کی دھڑکنیں پیار کے لمحوں کا قرض چکا رہی تھیں۔ کتنی ہی دیر تک وہ لوگ اسی طرح کھڑے رہے ان کو اندازہ ہی نہیں ہوا۔

کچھ آوازیں اردگرد محسوس ہوئیں اور کسی نے اس کے بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا تو وہ ہوش میں آئی، اس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی تو باپ، بھائی، ترنگی اور ماں نظر آئے لیکن وہ نہ جانے کیوں آج گھبرائی نہیں اور جدوجہد کرنے

کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی مگر ناکام رہی۔ ماں نے سختی سے اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا، باپ نے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اس کو دبوچ لیا اور تڑنگی پوری طرح رضوان کو جکڑے ہوئے تھا، کریم کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا۔ خون کا فوارہ ایک چیخ کے ساتھ اس کے منہ پر گرا، اس کے بعد کیا ہوا اسے کچھ ہوش نہیں رضوان نے کب دم توڑا، کتنے گھاؤ اس کے جسم پر آئے، کتنی بے بسی میں اس نے ریحانہ کو پکارا، اسے کچھ یاد نہیں، ہوش میں آئی تو محلے کی چند خواتین اس کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ اس نے ساکن نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا مگر کچھ سمجھ نہ سکی، کچھ ہی دیر میں اس کے کانوں میں آواز آئی۔

''پولیس انسپکٹر آگیا ہے، وہ ریحانہ سے اس کا بیان لے گا، اس لیے سارے لوگ کمرے کو خالی کردیں۔''

انسپکٹر کے آنے پر کمرا خالی کردیا گیا۔ وہ اس سے کیا پوچھ رہا تھا اور وہ کیا جواب دے رہی تھی اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا، اس کے سارے جواب بے خودی میں تھے۔

بیان لے کر انسپکٹر باہر نکلا اور ریحانہ کے باپ کو بلا کر علیحدگی میں اسے ایک طرف لے گیا اور مخاطب ہوا۔

''دیکھو جی! تمہاری دھی نے جو بیان دیا ہے اس میں صاف صاف تمہارے بیٹے کو پھانسی ہوتی ہے، میں کتنا بھی چاہوں اسے پھانسی سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔'' ریحانہ کا باپ یہ سن کر گھبرا گیا۔

''نہیں جی، وہ ہوش میں نہیں، وہ بدمعاش ریحانہ کو چھیڑتا تھا اور اسی کی شکایت پر یہ پھڈا پڑا ہے۔ میں اس کو سمجھاتا ہوں۔''

''تو عقلمند آدمی ہے۔ سچ کیا ہے تجھے بھی پتا ہے اور میں جانتا ہوں، اس لیے جو حقیقت ہے اسے تسلیم کرلے۔''

انسپکٹر نے ریحانہ کے باپ کو ڈراتے ہوئے اپنے انداز کو اور بھی سخت کرلیا۔

''نہیں جی آپ بالکل غلط سمجھے ہو، میں ابھی اپنی بیٹی سے بات کرتا ہوں۔'' یہ کہتا ہوا ریحانہ کا باپ کمرے کی طرف مڑا۔

''ٹھہرو! پولیس والے نے آواز لگائی، وہ جو بیان دے چکی ہے، اس کا میں گواہ ہوں اور اب بیان بدلا نہیں جا سکتا، مجھے معلوم ہے کہ تم اندر جاؤ گے پہلے لڑکی کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کرو گے، مجھے معلوم ہے کہ لڑکی پھر بھی نہیں مانے گی، اس کے بعد تم اسے اپنی محبت کا واسطہ دو گے اس کے سامنے اپنے بیٹے کی بھیک مانگو گے۔ ہے ناں یہی بات؟''

انسپکٹر نے ریحانہ کے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے اپنی بات کو مزید آگے بڑھایا اور کہا۔

''ہاں! البتہ ایک راستہ ہے...... تم چاہو تو اپنے بیٹے کو بچا سکتے ہو۔''

ریحانہ کے باپ نے اس کی بات کا مفہوم اپنی سمجھ کے مطابق سمجھتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''مگر صاحب جی! میں تو بڑا غریب آدمی ہوں، میرے پاس تو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ ہم غریب لوگ روز کا کماتے ہیں اور روز کا کھاتے ہیں۔ میں تو کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ آپ میری بات کا یقین مانو صاحب!''

اپنی بات کہتے ہوئے ریحانہ کا باپ ہچکیوں کے ساتھ رونے لگا، اس کا ایک ہی بیٹا تھا، اور اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ انسپکٹر کسی بھی قسم کی رعایت اسے دینے کو تیار نہیں ہے۔ اپنے بیٹے کے بجائے اسے اپنی بیٹی پر سخت غصہ تھا، وہ سوچ رہا تھا کہ کمبخت نہ مین میکا کرتی نہ اس کا بھائی غیرت میں آتا اور نہ ہی اسے اس طرح تھانے جانا پڑتا۔ دوسری طرف انسپکٹر نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اور لال پیلا ہوتے ہوئے کہا۔

''بڈھے! تو سمجھتا ہے کہ ہم رشوت خور ہیں۔ ایسا مقدمہ بناؤں گا کہ بیٹے کے ساتھ تجھے بھی پھانسی پر لٹکا دوں گا۔''

''میں تو یہ کہہ رہا تھا۔'' اس نے لہجے کو نرم بناتے ہوئے ریحانہ کے باپ کے کان میں کھسر پھسر کی ایک لمحے کو ریحانہ کے باپ کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا مگر دوسرے ہی لمحے کریم کی صورت اس کی نگاہ میں آگئی، جوان بیٹے کی موت اسے کسی صورت قبول نہیں تھی، اسے بچانے کے لیے وہ ہر طرح کی قربانی دینے کے لیے تیار تھا، اس نے چند لمحوں تک اپنی نگاہیں جھکائے رکھیں اور اسی جھکی جھکی نظروں سے انسپکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا صاحب جی میں گھر والی سے مشورہ کرتا ہوں۔''

''بڑے میاں! یہ مشورے کا وقت نہیں، فیصلے کا وقت ہے۔ شام تک جواب دے دینا میں زیادہ انتظار نہیں کرسکتا اور یہ جو تم لوگ غیرت کے ڈرامے کرتے ہو مجھے ان کا اچھی طرح معلوم ہے، کتنی غیرت ہوتی ہے تم میں۔''

انسپکٹر نے یہ کہتے ہوئے اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کو خواہ مخواہ ہی تاؤ دینا شروع کردیا۔ ریحانہ کا باپ ریحانہ کی ماں کے پاس آیا اور انسپکٹر کی بات کو اپنے طور پر مہذب بنا کر بتانے کی کوشش کی۔

مفہوم سمجھ کر کریم کی ماں کئی لمحوں تک سن سی رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کریم کے باپ کو کیا جواب دے۔ آخر کار بڑی ہمت کر کے اس نے اپنے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''کیا کہہ رہے ہو کریم کے ابا! ایک رات کے لیے؟ ایک رات کے لیے وہ ہماری بیٹی کو مانگ رہا ہے، یہ پولیس والا اس قدر بے غیرت ہے، اور میں ایسے ہی کیسے بے غیرت ہو جاؤں، کریم کے ابا تم بھی کم بے غیرت نہیں ہو جو اس طرح عزت کو بیچنے کا سوچ رہے ہو، مجھے حیرت ہے کہ تم نے اتنی بڑی بات کیسے سن لی تم نے اس کا منہ کیوں نہیں نوچ لیا اس کی آنکھیں کیوں نہیں نکال دیں، ارے کچھ نہیں تو کم سے کم ایک تھپڑ ہی اس کمینے کے منہ پر رسید کردیا ہوتا۔''

''غصہ تو مجھے بھی بہت آیا تھا، جو کچھ تو کہہ رہی ہے یہی سب کچھ کرنے کا میرا بھی دل چاہا تھا، میں بھی اس کا منہ نوچ لینا چاہ رہا تھا مگر......''

''مگر کیا... مگر کیا کریم کے ابا کیا تم اس کی وردی سے ڈر گئے تھے یا کوئی اور بات تھی، مجھے بھی تو پتا چلے، ایک لڑکے کو ریحانہ سے ملنے کی پاداش میں تو تم نے اسے کریم کے ہاتھوں قتل کروا دیا اور ایک پولیس والا چھی، چھی...... مجھے تو کہتے ہوئے بھی غیرت آرہی ہے کہ کہیں ڈوب مروں۔''

ریحانہ کی ماں نے اپنے میلے دوپٹے سے اپنی سکڑی ہوئی آنکھوں کو رگڑا اور کہا۔

''میں نے کتنا تمہیں اور کریم کو سمجھایا کہ دیکھو، یہ نہ کرو۔ اگر وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو لڑکے سے کہو کہ وہ اپنے اماں باوا کو بھیج کر ریحانہ کا ہاتھ مانگ لے، مگر نہیں تم باپ بیٹے کے سر پر خون سوار تھا۔''

کریم کا باپ اپنی بیوی کی لعن طعن سن کر کچھ دیر چپکا بیٹھا رہا پھر اس تکلیف دہ خاموشی کو توڑتے ہوئے بولا۔

''کریم کی ماں میری بات کو سمجھنے کی کوشش کر، دیکھ ناں! ہمارا ایک ہی بیٹا ہے اور......''

''اور کیا، کیا میں بیٹے کو بچانے کے لیے اپنی جنم جلی بیٹی کو ایک درندے کے حوالے کردوں، ایک رات کے لیے، اتنا بڑا گناہ، دنیا اور خدا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔''

''کریم کی ماں یہ مت بھول کریم ہمارا اکلوتا لڑکا ہے، میرے منہ میں خاک اگر اسے کچھ ہوگیا تو ہمارا نام بھی لینے والا کوئی نہیں ہوگا، وہ تیری کم ذات بیٹی جس کی وجہ سے یہ دن دیکھنا پڑا بعد میں بھی کسی نہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی۔ اری کم نصیب زیادہ سوچ مت بس فیصلہ کر اس انسپکٹر نے صاف کہہ دیا ہے وہ زیادہ انتظار نہیں کرے گا۔''

''کیسے کریم کے ابا کیسے میں ہاں کردوں، کس دل سے ہاں کردوں؟''

کریم کی ماں نے ایک بار پھر روتے ہوئے کہا تو کریم کا باپ ایک دم غصے میں آگیا اور بولا۔

''ٹھیک ہے پھر تو تیار ہوجا اپنے جوان بیٹے کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھنے کو۔ اس کی لاش پر رونے کو، تیار ہوجا، اس کی میت کو وصول کرنے کو۔''

''خدا کا واسطہ ہے کریم کے ابا کوئی اچھی بات منہ سے نکالو، میں تو یہ کہہ رہی تھی....''

کریم کی ماں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی، کریم کا باپ سمجھ گیا کہ وہ اب نرم ہوگئی ہے اس نے کہا۔

''سوچ ناں کریم ہمارا ایک ہی تو بیٹا ہے۔''

''ہاں یہ تو سچ ہے، کریم ایک ہی تو بیٹا ہے۔ پر کریم کے ابا اگر کسی ماں کے دس بیٹے بھی ہوتے تو بھی وہ اپنے کسی بھی بیٹے کی موت نہیں چاہتی۔''

بیٹی کی ماں بیٹے کی ماں کے آگے ہار گئی، ایک عورت نے دوسری عورت کو بلی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ کریم کی ماں نے اپنے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے ریحانہ کے ابا! مگر کریم سے پوچھ لو.... وہ کیا کہہ رہا ہے۔''

''اچھا، اچھا میں جاتا ہوں کریم کی طرف۔''

کریم کے باپ نے اپنی بیوی کو مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ وہ تھانے پہنچا تو کریم حوالات میں بیٹھا ہوا نظر آیا۔ ایک ہی دن کی مار نے اس کی تمام غیرت کو ختم کردیا تھا۔ تمام جسم پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ کریم کا باپ اس کے پاس گیا اور تمام صورتِ حال بیٹے کو بتائی۔

''ابا! جیسا انسپکٹر کہتا ہے ویسا ہی کرو۔ محلے والوں سے کہہ دینا شک میں پوچھ گچھ کے لیے ایک رات رکھ لیا تھا اور پھر یہ ساری مصیبت بھی تو اسی کی ڈالی ہوئی ہے۔ نہ وہ عشق بازیاں کرتی نہ غیرت کے لیے یہ سب کچھ کرنا پڑتا۔''

''مگر شاید وہ مانے نہ۔'' کریم کے باپ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ابا! تو اس کو آرام سے سمجھانا اس کو بتانا کہ بہنیں ہمیشہ بھائیوں کے لیے قربانیاں دیتی چلی آئی ہیں۔ اسے بھی تو آخر اپنا بھائی پیارا ہوگا۔ تاریخ گواہ ہے کہ بہنیں کبھی بھی بھائیوں کے لیے قربانی دینے سے انکار نہیں کرتیں، پھر یہ کیا انوکھی بہن ہے جو انکار کرے گی؟''

''ہاں یہ تو ہے!'' کریم کا باپ کہتا ہوا مطمئن انداز میں انسپکٹر کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

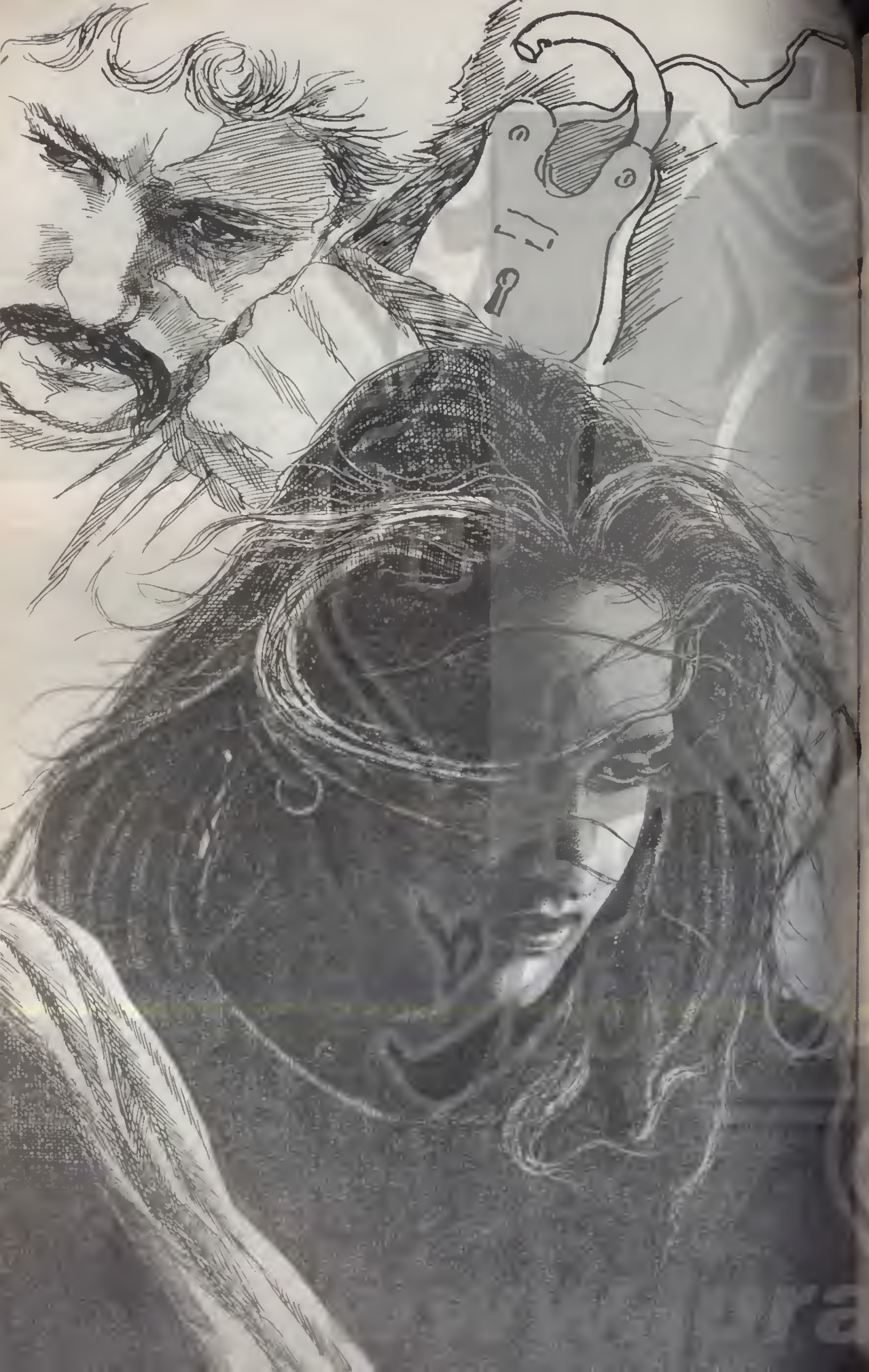

گرہن

ش صغیر ادیب

اپنی زندگی اصول اور ترجیحات کے مطابق گزارنے کے خواہش مند شخص کی کتھا اس کا مقابلہ پورے خاندان اور رسم و رواج سے تھا ... ایک مجبوری اور بھی تھی ...کسی کی آنکھوں میں جلتے امید کے دیے! پھر وہ اٹھا اور اجنبی چہروں کے درمیان پہنچ گیا... لیکن اپنائیت اس کے تعاقب میں تھی

میں نے سر اٹھایا، اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ہکا بکا، مبہوت! یہ کیا ہے؟ ذہن کے صحراؤں میں دھوئیں کے کئی مرغولے بنے اور دور تک پھیلتے چلے گئے۔ نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔ اتفاقات بھی ہوتے ہیں نا۔ عجیب، ناقابلِ فہم... جن کی کوئی توجیہہ ممکن نہیں ہوتی۔ یہ بھی ایسا ہی اتفاق ہے۔ کئی لمحے اسی حالت میں گزرے پھر میں چونکا اور دوبارہ غور سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ مسکرا رہی تھی۔

''ہیلو...''

''ہیلو...'' بوکھلاہٹ میں میرے ہونٹوں سے نکلا۔ ''کہیے؟''

''میں اس دفتر میں نئی ہوں۔ کل آئی تھی مگر آپ چھٹی پر تھے اس لیے ملاقات نہ ہو پائی۔'' اس کی آواز نرم اور میٹھی تھی۔ بات کرنے کے انداز اور آواز سے صاف ہویدا تھا کہ اس کی تربیت شائستہ اور مہذب ماحول میں ہوئی ہے۔ قدرے توقف کے بعد اس نے مزید کہا۔ ''دفتر میں کام کرنے والے سبھی لوگوں سے ملاقات ہو چکی ہے، سوچا آپ سے بھی مل لوں۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' میں نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ''میرا نام تو آپ کو معلوم ہی ہوگا، اکبر علی۔ آپ...؟''

''مجھے عندلیب کہتے ہیں۔'' وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

''عندلیب خاتون۔''

''آپ غالباً گیتھی کی جگہ آئی ہیں؟'' میں نے محض گفتگو جاری رکھنے کی غرض سے کہا۔

''جی ہاں۔ میں یہیں اسی شہر میں رہتی ہوں لیکن اس کمپنی کی بلیک پول برانچ میں کام کرتی تھی۔ آمد و رفت میں بہت پریشانی ہوتی تھی۔ جب گیتھی کا تبادلہ یہاں سے مڈلزبرو ہوا تو میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا۔ شکر ہے، میری درخواست منظور ہوگئی۔ اب بہت آسانی ہوگی۔ میری رہائش یہاں سے قریب ہی ہے اور یونیورسٹی بھی زیادہ دور نہیں۔''

''یونیورسٹی...؟''

''میں یہاں یونیورسٹی میں کورس کر رہی ہوں۔'' وہ رسانیت سے مسکرائی۔ ''پیر کو پورا دن جاتی ہوں۔ باقی چار دن شام کی کلاسیں اٹینڈ کرتی ہوں۔'' وہ رکی پھر قدرے مدھم لہجے میں بولی۔ ''اپنے تعلیمی اور رہائشی اخراجات پورے کرنے کے لیے یہ بندوبست کرنا پڑا۔ ورنہ ملازمت کی ضرورت نہ ہوتی۔''

میں چند لمحے چپ رہا اور بہت غور سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کا کھلتا ہوا گیہواں رنگ، ستواں ناک، گلاب کی پنکھڑی جیسے ہلکے گلابی ہونٹ، بے حد سیاہ بال جو تھوڑے سے گھونگریالے بھی تھے۔ اور اس کی آنکھیں... اس کی آنکھیں! بڑی بڑی ہلکی شربتی مگر بے حد روشن آنکھیں۔ جیسے... جیسے... کسی تاریک صحرا میں دو جگنو جگمگا رہے ہوں۔ یہ آنکھیں... یہ آنکھیں... خدایا، خدایا... ایسی آنکھیں بھلا کسے نصیب ہوتی ہیں۔

وہ یکا یک تھوڑی سی جھینپ گئی اور مسکرا کر بولی۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟''

میں گھبرا گیا۔ سٹپٹا کر بولا۔ ''نن... نہیں، بس وہ کیا ہے...'' پھر ذرا رک کر بات بدل دی۔ ''تو آپ یہیں قریب ہی رہتی ہیں؟''

''جی ہاں...''

''گھر میں اور کون کون ہے؟'' میں نے یونہی رواروی میں پوچھا۔

''اگر آپ کا مطلب فیملی سے ہے، تو کوئی نہیں۔'' اس نے سادگی سے جواب دیا۔ ''میں یہاں ایک ہندوستانی فیملی کے ساتھ بطور لاجر رہتی ہوں۔ وہ لوگ میرے سابق وطن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اچھے لوگ ہیں۔ بالکل گھریلو ماحول ہے۔ اس لیے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔''

''مگر لاجنگ میں کیوں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''اصل میں ایک کورس کرنے کے لیے آئی ہوں۔'' اس نے کرسی پر پہلو بدلا۔ ''میرا گھر کراچی میں ہے۔ چار سال کا کورس کر رہی ہوں۔ دو سال باقی ہیں۔ کورس مکمل ہونے پر انشاء اللہ واپس چلی جاؤں گی۔''

''تعجب ہے۔'' میں نے یونہی ہنس کر کہا۔ ''آپ واقعی واپس چلی جائیں گی؟''

''ہاں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''لیکن آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟''

''بھئی، یہاں تو جو آتا ہے، واپس جانے کا نام ہی نہیں لیتا۔ بس یہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔''

وہ ہنسی۔ ''ہاں، مجھے علم ہے مگر یہ کوئی اچھی بات تو نہیں۔ اپنا گھر، اپنا ملک بہرحال اپنا ہوتا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ میں یہاں رکوں گی۔''

''تو آپ کے ماں باپ کراچی میں ہیں۔ اور کون کون ہے؟''

وہ کافی خوش نظر آرہی تھی۔ چہرے پر روشنی سی تھی، آنکھوں میں چمک اور باریک گلابی ہونٹوں پر ایک شگفتہ مسکراہٹ لیکن میری بات پوری ہوتے ہی معاً اس کا چہرہ بجھ سا گیا۔ ہونٹوں پر ناچتی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور آنکھوں میں ایک واضح کرب کی جھلک نظر آئی۔ مجھے یکایک افسوس بھی ہوا اور پشیمانی بھی۔ شاید میں نے نادانستگی میں ایسی کوئی بات کہہ دی ہے جو نہیں کہنی چاہیے تھی۔ تاہم اس سے قبل کہ میں معذرت کرنے کی کوشش کرتا، اس نے زور سے سانس لی اور گردن جھکا کر مدھم لہجے میں بولی۔

''میرے والد نہیں ہیں۔''

''ارے...'' میرے ہونٹوں سے معاً نکلا۔ ''بہت افسوس ہوا۔ مجھے یہ بات نہیں کہنی چاہیے تھی لیکن...''

''آپ کیوں افسوس کر رہے ہیں۔ آپ کو تو علم ہی نہیں تھا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

''تو کیا آپ کے والد کا انتقال ہو چکا ہے؟''

عندلیب کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی لرزش نظر آئی۔ ایک ہلکی سی کشمکش۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن طے نہیں کر پارہی ہے کہ کہے تو کیا کہے۔ پھر اس نے یکایک ارادہ بدل دیا۔ ''وہاں کراچی میں میری اماں ہیں۔ بھائی بہن کوئی نہیں۔ اماں ایک اسکول میں ٹیچر ہیں۔ انہوں نے ساری زندگی کام کیا ہے۔ صرف اس لیے تاکہ میری زندگی سنوار سکیں۔ اب واپس جاکر میں ساری ذمے داری سنبھالوں گی تاکہ باقی زندگی میں اماں کچھ سکون اور آرام سے لطف اٹھا سکیں۔ اور وہ سارا قرض اتاروں گی جو اماں نے اب تک میری پرورش اور تعلیم پر لیا ہے۔''

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔'' میں نے تحسین آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔ ''یہ آپ کا فرض ہے اور ذمے داری بھی۔'' پھر ذرا رک کر پوچھا۔ ''آپ کی میز کہاں ہے؟''

''یہاں پاس والے کمرے میں۔'' اس نے ہاتھ سے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ ''آپ سے روزانہ ہی سامنا ہوتا رہے گا۔''

''ضرور... ضرور...'' میں نے ہنس کر ذرا مستعدی سے کہا۔ ''آپ کو کبھی کوئی پریشانی ہو یا ضرورت پیش آئے تو تکلف مت کیجیے گا۔ میں حاضر ہوں۔''

''شکریہ...''

وہ مسکرا کر اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ جب وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی تو میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی چال میں اعتماد تھا جیسے اسے زمین پر مضبوطی سے قدم رکھنے کا ہنر معلوم ہو۔ جیسے اسے اپنی ذات پر، اپنے آپ پر پورا یقین ہو۔ اس کی پشت میری جانب تھی۔ اس نے پیازی رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ دوپٹا بھی اسی رنگ کا تھا اور حتیٰ کہ سینڈل بھی۔ میں نے حسرت سے اس کے خوب صورتی سے ترشے اور سلے ہوئے لباس کو دیکھا اور ہولے سے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ پیازی رنگ... میرا پسندیدہ رنگ... خدایا... کیا یہ محض اتفاق ہے... ہاں، اتفاق ہی ہے۔ مگر کتنا انوکھا اتفاق ہے۔ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سگریٹ کی ڈبیا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

☆☆☆

میں جس کمپنی میں کام کرتا ہوں، یہ ایک بڑی بین الاقوامی کمپنی کی چھوٹی سی برانچ ہے۔ کل گیارہ آدمی اس دفتر میں کام کرتے ہیں۔ سات مرد اور چار عورتیں۔ مردوں میں میرے علاوہ دو اور ایشین ہیں۔ ایک صاحب فقیرالدین احمد شاہ ہیں۔ انگریز جب انہیں ''فقیر'' کہہ کر پکارتے تھے تو انہیں بے حد تکلیف ہوتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے خود کو شاہ صاحب کہلوانا شروع کر دیا اور اس نام سے اب اس قدر معروف ہو چکے ہیں کہ بے شمار لوگوں کو ان کا اصلی نام معلوم ہی نہیں۔ سیدھے سادے آدمی ہیں۔ بہت کم گو ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ صبح سے شام تک فائلوں پر سر جھکائے کام کرتے رہتے ہیں۔ اگر کبھی کبھار گفتگو کرنا پڑے تو ان کے ہونٹوں پر ایک مہین اور مسکین سی مسکراہٹ مسلسل ناچتی رہتی تھی۔ دوسرے کی مدد کے لیے ہر وقت مستعد رہتے ہیں۔ اپنی تنخواہ کا ایک حصہ باقاعدگی کے ساتھ اپنی بڑی بیوہ بہن کو بھیجتے ہیں اور ایک حصہ چیریٹی کی نذر کرتے ہیں۔ باقی جو بچتا ہے، اس میں صبر و شکر سے گزارا کر لیتے ہیں۔ چند سال پہلے تک ان کے پاس الیکٹریکل گڈز کی ایک بڑی دکان اور چار بیڈروم کا ایک عمدہ مکان تھا۔ بیوی تھی اور دو بچے۔ لڑکا اور لڑکی، داماد بھی ساتھ ہی رہتا تھا۔ اب وہ ایک کمرے کے چھوٹے سے فلیٹ میں تنہا رہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جب تک ان کی بیوی ملک میں تھی تو نہایت سادہ، گھریلو، فرماں بردار اور بہت حد تک مسکین بھی تھی لیکن انگلستان پہنچی تو بہ قول فقیرالدین احمد شاہ صاحب، چند سال بعد اس نے اس طرح رنگ بدلا کہ گرگٹ بھی کیا بدلے گا۔ بے حد فیشن ایبل، فضول خرچ اور خودسر ہوگئی۔ شاہ صاحب کو

ڈالنا بالکل بند کر دیا۔ پھر اس کا کسی سے ''نین مٹکا''... نہیں، یہ درست نہیں... نین مٹکا تو خیر پہلے سے تھا مگر وہ اپنے ملک میں تھا اور اس کے ساتھ "LOVE NEST" آباد کرنے کے لیے اسے انگلستان لانا ضروری تھا۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ وہ شخص بیوی صاحبہ کا قریبی رشتے دار بھی تھا۔ اسے انگلینڈ بلانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا۔ شادی... چنانچہ بیوی صاحبہ نے لڑ جھگڑ کر شاہ صاحب سے طلاق لی اور انہیں بلاتکلف گھر سے نکال دیا۔ مکان، دکان، کاروبار اور بینک بیلنس پر قبضہ کر لیا کیونکہ بدقسمتی سے ساری چیزیں اسی کے نام تھیں۔ شاہ صاحب خالی ہاتھ گھر سے نکلے۔ کچھ دن ایک دوست کے پاس رہے اور پلاسٹک کی ایک فیکٹری میں مشقت کرتے رہے۔ پھر قسمت نے تھوڑی سی یاوری کی اور انہیں ہمارے آفس میں جگہ مل گئی۔ جب سے شاہ صاحب تنہا رہتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ انہیں پھر بھی اپنی بیوی اور بچوں سے کوئی گلہ نہیں۔ کبھی کبھی کہتے ہیں: ''بھئی اس نے جو کچھ کیا، شاید ٹھیک ہی کیا۔ مجھ میں ہی کوئی خامی ہوگی۔''

اب اگر ان کا کوئی بہی خواہ ان کے سامنے دوسری شادی کی بات کرے تو بے حد مسکینی سے جواب دیتے ہیں۔ ''جب خودکشی کے بارے میں سوچوں گا تو ضرور کروں گا۔''

دوسرے صاحب کا نام رگھونندن ناگ راج واگھورے ہے۔ مگر انہیں اپنا نام پسند نہیں ہے۔ اس لیے خود کو جان کہلواتے ہیں۔ ہندوستانی ہیں۔ غالباً کوکن کے ایک غیر معروف قصبے راجیواڑی کے رہنے والے ہیں۔ مگر انہوں نے کبھی راجیواڑی دیکھا ہے اور نہ ہندوستان... کیونکہ ان کی پیدائش افریقا کے ملک ملاوی میں ہوئی تھی۔ وہیں پلے بڑھے اور تقریباً پانچ سال قبل انگلستان آئے۔ ہندوستان نہ دیکھنے کے باوجود انہیں ہندوستان سے بہت لگاؤ ہے۔ اکثر ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں۔

''بھائی یہ ہندوستان کیسا ہوگا...؟''

''تو کس نے روکا ہے، جاکر دیکھ لو۔''

''جاؤں گا، ضرور جاؤں گا۔'' رگھونندن ناگ راج واگھورے بڑے جذبے سے کہتا ہے۔ ''بے شک میں ملاوی میں پیدا ہوا تھا لیکن یہ طے ہے کہ میری چتا کو آگ راجیواڑی میں ہی دی جائے گی۔''

''اتنا لگاؤ ہے اپنے ملک سے؟''

''ہاں، کیا تمہیں پاکستان سے لگاؤ نہیں ہے...؟''

میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا ہوں اور ایک جوش کے عالم میں کہتا ہوں۔ ''یار! پاکستان تو ہمارے دل میں دھڑکن کی طرح ہر وقت موجود رہتا ہے۔''

رگھونندن ناگ راج واگھورے سر ہلا کر کہتا ہے۔ ''خوشی کی بات ہے، ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اپنا وطن اپنا ہی ہوتا ہے۔ اس سے اچھا کوئی نہیں ہوسکتا۔ اسے دل میں دھڑکن ہی کی طرح بسنا چاہیے۔''

عورتوں میں صرف عندلیب ہے۔ ابتدا میں ذرا تکلف تھا جو قطعی فطری ہے لیکن ایک دفتر میں کام کرنے کی بنا پر روز کا سامنا تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ عندلیب کو دفتر میں نئی ہونے کی وجہ سے اکثر کسی نہ کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑ جاتا تھا۔ ایسی صورت میں مدد کے لیے وہ عموماً میرے پاس آیا کرتی تھی اور میں کھلے دل سے اس کی مدد کر دیا کرتا تھا۔ یوں رفتہ رفتہ ہمارے درمیان سے تکلف کا غیر مرئی پردہ ہٹتا چلا گیا۔ دھیرے دھیرے مجھے اس کے بارے میں کچھ اور جانکاری حاصل ہوئی۔ مثلاً یہ کہ اس کی عمر چھبیس سال ہے۔ شادی نہیں ہوئی ہے۔ حالانکہ رشتے اکثر آئے اور آتے رہتے ہیں۔ لیکن عندلیب نے آنے والے رشتوں پر غور ہی نہیں کیا۔ اس کا بچپن، اس کے بیان کے مطابق بہت عسرت اور محرومی میں گزرا تھا۔ پہلے اس کی ماں اپنے والدین یعنی عندلیب کے نانا نانی کے ساتھ گلشن اقبال کے ایک کشادہ اور خوب صورت مکان میں رہتی تھی۔ نانا اور نانی دونوں اس دنیا سے جلد رخصت ہوگئے۔ پریشانی اور مسائل اتنے بڑھے کہ عندلیب کی ماں کو وہ گھر چھوڑنا پڑا۔ انہوں نے نئی کراچی کے ایک دور دراز اور پسماندہ محلے میں ایک کمرے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہائش اختیار کر لی۔ ''مجھے کچھ کچھ یاد ہے۔'' عندلیب نے بتایا۔ ''حالات ان دنوں اتنے ناگفتہ بہ تھے کہ ہم دونوں ماں بیٹی کو روٹی بھی مشکل سے نصیب ہوتی تھی۔ اماں تھوڑا بہت سلائی کا کام کر لیتی تھیں جو کبھی ملتا تھا، کبھی نہیں ملتا تھا۔ کئی سال یونہی ترستے ہوئے گزرے۔ پھر خوش قسمتی نے دروازے پر دستک دی اور اماں کو بچوں کے ایک اسکول میں جو قریب ہی تھا، استانی کی حیثیت سے نوکری مل گئی اور کم از کم دو وقت کی روٹی کا بندوبست ہوگیا۔ روٹی اور کرائے کی ادائیگی! اور وقت کسی اپاہج کی طرح رینگ رینگ کر گزرنے لگا۔''

''تو پھر تم نے تعلیم کیسے حاصل کی؟''

عندلیب مسکرائی۔ ''آپ جانتے ہیں، بعض مائیں اپنے بچوں کی بہتری اور بھلائی کے لیے سب کچھ کر گزرتی ہیں۔ میری اماں نے بھی فاقے کیے، پیوند لگے کپڑے پہنے لیکن روپیا دو روپیا بچا کر، چھپا کر رکھتی رہیں۔ انہوں نے لوگوں کی خوشامد کر کے میری اسکول اور کالج کی فیس معاف کروائی۔ یوں میں کالج کی تعلیم مکمل کر سکی۔ پھر میرے ایک رشتے کے پھوپا مدد کے لیے

آئے۔ اماں نے ان کی مدد سے میرے انگلینڈ آنے کا بندوبست کیا۔“ عندلیب ٹھنڈی سانس لے کر یکایک چپ ہوگئی۔

”تو گویا تمہاری ماں نے دوسری شادی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا؟“ میں نے مدھم لہجے میں پوچھا۔

میری آواز اور لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ عندلیب نے میری طرف دیکھا اور کچھ لمحے تک دیکھتی رہی پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

”نہیں۔“

”اور تم... تم نے شادی کیوں نہیں کی...؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

عندلیب کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ ابھری جسے کوئی معنی دینا مشکل تھا۔ ”میں شادی ضرور کروں گی۔ یہ ایک فطری بات ہے مگر پہلے میں اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی ہوں۔ میری ماں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ میں ان کا مداوا کرنا چاہتی ہوں تاکہ انہیں کچھ آرام بھی ملے اور... اور خوشی بھی۔ اور میں وہ مکان حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“

”مکان...؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں۔“ عندلیب سر ہلا کر پورے اعتماد سے کہنے لگی۔ ”گلشن اقبال میں ہمارا پرانا مکان۔“ عندلیب کی آواز میں درد کی ایک لہر تھی۔ ”وہ مکان میرے نانا نے خود بنوایا تھا۔ بعدازاں جب برا وقت آیا تو میرے دور رشتے داروں نے مکاری اور کمینے پن سے اس پر قبضہ کرلیا۔ اور گو میری اماں اس مکان کے سامنے سے پھر کبھی گزریں بھی نہیں لیکن میں جانتی ہوں، وہ مکان ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ایک جذباتی لگاؤ ہے انہیں اس سے۔ وہ ہمیشہ اس مکان میں واپس جانے کے سپنے دیکھا کرتی ہیں۔ اور میں... اور میں وہ مکان ان کے لیے دوبارہ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ تم اسے واپس حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گی...؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، مجھے پورا یقین ہے۔“ اس نے بڑے جذبے سے کہا۔ ”کچھ قانونی جھگڑا ہے اور کچھ قرض کا معاملہ ہے۔ ایک بار میرے پاؤں زمین پر اچھی طرح جم جائیں تو پھر...“ وہ یکایک ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہوگئی۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ میں نے تحسین آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ایک دن تم اپنے مقصد میں ضرور کامیابی حاصل کرو گی۔“

”شکریہ!“

چند لمحے ٹھہر کر میں نے دبی آواز میں کہا۔ ”کچھ اپنے باپ کے بارے میں بھی بتاؤ۔“

”باپ کے بارے میں...؟“ اس نے یکلخت چونک کر حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”ہاں۔“

”مم، مگر کیوں...“ اس کی آواز الجھی ہوئی تھی۔

”بھئی اگر کوئی ہرج نہ ہو تو...؟“ میری آواز میں تھوڑا سا تجسس تھا۔

وہ چند لمحے چپ رہی اور عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر پست آواز میں بولی۔ ”مجھے اپنے باپ کے بارے میں باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا...“

”کیوں؟“

وہ چند لمحے پھر چپ رہی پھر قدرے خشک لہجے میں بولی۔ ”ارے چھوڑیں اکبر صاحب! کچھ اور باتیں کریں۔ جس شخص کو میں نے نہیں دیکھا، اس کے بارے میں باتیں کرنے کا فائدہ کیا۔“

’اس کے‘... عندلیب کے لہجے میں باپ کے لیے لگاؤ یا احترام کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ ”لگتا ہے، تمہیں اپنے والد سے کافی شکایتیں ہیں؟“ آخرکار میں نے کہا۔

عندلیب تلخی سے مسکرائی مگر چپ رہی۔

قدرے توقف کے بعد میں نے دبی آواز میں کہا۔ ”تو تم نے اپنے والد کو کبھی نہیں دیکھا؟“

”نہیں۔“

”کیوں، یہ کیسے ہوا؟“

اس نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر چپ رہی اور کھڑکی سے باہر بادلوں سے گھرے آسمان کو دیکھتی رہی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کشمکش میں ہے۔ اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ چند لمحے یونہی گزر گئے۔ پھر اس نے طویل سانس لی اور پست آواز میں بولی۔ ”دراصل میرے باپ کا اس وقت ایک حادثے میں انتقال ہوگیا تھا جب میری عمر دو سال بھی نہیں تھی۔“

”ارے، واقعی؟“ میں نے ایک جھٹکے سے کہا۔ ”یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے۔“

”ہاں، شاید یہ افسوس کی ہی بات ہے۔“ عندلیب نے ایسی آواز میں کہا جس میں رنج اور ملال اور پچھتاوے کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ ”باپ کا ایسے وقت میں ساتھ چھوڑ جانا جب اس کی فیملی کو اس کی زیادہ ضرورت ہو، بہت سی پریشانیوں کو جنم دیتا ہے۔ اور...“ وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر معاً چپ ہوگئی۔

”پھر تمہاری اماں کو وہ مکان چھوڑ کر نئی کراچی منتقل ہونا پڑا؟“ میں نے یونہی روارادی میں کہا۔

”ہاں...“ عندلیب کی آواز میں گہرا دکھ تھا۔ ”میرا ...ان بہت مختصر ہے۔ زیادہ تر رشتے دار ہندوستان میں ... پاکستان میں ہیں، ان کا رویہ بھی تکلیف دہ تھا۔ اکثر ... منہ موڑ لیا جیسے جان پہچان تک نہ ہو۔ باقی لوگ ... نام ملتے تھے۔ لیکن اماں نے ہمت نہیں ہاری۔ یہ ... یہ وصف شاید انہیں نانا سے ورثے میں ملا تھا۔ لڑنا اور ... نے رہنا، کبھی ہمت نہ ہارنا۔ اماں بھی لڑتی رہیں۔ حالات اور مشکلات کے آگے انہوں نے سپر نہیں ڈالی۔ صرف اس ...س کے سہارے کہ اندھیرا کبھی تو چھٹے گا۔ اجالا کبھی تو ...ارے دروازے پر بھی دستک دے گا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ اب وہ وقت قریب آرہا ہے جب روشنی ہمارے گھر کو بھی روشن کرے گی۔ دو سال اور باقی رہتے ہیں۔ پھر میں واپس جاؤں گی اور...“ وہ پھر چپ ہوگئی۔

میں نے ایک سگریٹ سلگائی اور ایک طویل کش بھرا۔ دراصل یہ عمل بھی غیر اختیاری اور غیر ارادی تھا۔ مجھے خود ادراک نہیں تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ چاروں طرف ایک ...اور گہری اداسی طاری ہوگئی تھی جو بتدریج بڑھتی جارہی ...ی۔ میں نے یونہی خوامخواہ گردن موڑ کر گردوپیش میں ...کھا۔ پھر کھڑکی سے باہر نظر ڈالی... دور تک پھیلا ہوا ویران ...ن۔ کہیں کہیں سیاہ بادلوں کے ٹکڑے ٹھہرے ہوئے تھے۔ کتنی اداسی ہے چاروں اور... میں نے یوں ہی سوچا اور عندلیب کی جانب دیکھا۔ خاموشی تھی، ہر طرف خاموشی تھی۔ میں نے سوچا، اس خاموشی کو توڑنا چاہیے، کچھ کہنا چاہیے مگر کیا کہوں؟ پھر میرے لب کھلے اور میں نے ایک ایسی بات کہی جو شاید غیر ضروری تھی۔

”تو تم نے اپنے والد کو کبھی نہیں دیکھا؟“

”نہیں...“ عندلیب نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم اس کی شکل صورت کیسی تھی... یا رنگ روپ کیسا تھا۔ بتایا نا کہ میری عمر دو سال سے بھی کم تھی۔ لہٰذا اسے اگر دیکھا بھی ہوگا تو اس کے نین نقش میرے ذہن میں کیسے محفوظ رہ سکتے تھے؟“

”مگر گھر میں کوئی تصویر تو ہوگی؟“ میں نے غیر ارادی طور پر سوال کیا۔

”نہیں، بھی تھی ہی نہیں۔ اماں کے پاس اگر اس کی کوئی تصویر تھی بھی تو شاید بہ وجوہ انہوں نے ضائع کردی۔“

قدرے توقف کے بعد میں نے پھر ایک ایسا سوال کیا جو شاید غیر ضروری اور غیر مناسب تھا۔ ”تم کبھی اپنے والد کی قبر پر گئی ہو؟“

عندلیب کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔

”نہیں۔“

”کیوں؟“

عندلیب کچھ دیر سوچتی رہی۔ ”اس بارے میں اماں سے کبھی کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ وہ کبھی میرے باپ کی قبر پر گئی ہوں تو مجھے علم نہیں لیکن مجھے کبھی نہیں لے گئیں۔ یہ بات میں محض قیاساً کہہ رہی ہوں۔ ورنہ مجھے یہ بھی شبہ ہے کہ اماں کو خود بھی علم نہیں کہ میرے باپ کی قبر کہاں ہے۔ دراصل کراچی اتنا بڑا شہر ہے۔ کئی قبرستان ہیں۔ انتقال کے بعد میرے باپ کے لواحقین نے ان کو کس قبرستان میں دفنایا تھا... میرا خیال ہے، اماں اس بات سے ناواقف ہیں اور...“ عندلیب غالباً کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر پھر اس نے مناسب نہیں سمجھا اور یکایک چپ ہوگئی۔

☆☆☆

میں نے ایک نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا اور پھر فائل پر جھک گیا تبھی رگھونندن ناگ راج واگھورے عرف جان آگیا۔

”کیا کھا رہے ہو؟“

”گوبھی کے پراٹھے۔“ میں نے جواب دیا۔

”آہا... گوبھی کے پراٹھے۔“ اس نے ہنس کر کہا اور بے تکلفی سے ایک نوالہ توڑ کر منہ میں ڈالا پھر سر ہلا کر بولا۔ ”مزیدار ہیں، بہت مزیدار ہیں۔ موسٹ ونڈرفل۔ میں نے آج تک ایسے مزیدار پراٹھے نہیں کھائے۔“ اس نے ایک اور نوالہ توڑا... ”میری وائف کم بخت کبھی ایسے پراٹھے نہیں بناتی۔“

”کیوں؟“

”ارے بھائی اسے کچھ نہیں آتا۔ بنائے گی کیا۔“

”مگر کچھ تو آتا ہوگا؟“ میں نے ہنس کر اسے چھیڑا۔

”ہاں، آتا ہے۔ میک اپ کرنا اور مجھ میں عیب تلاش کرنا۔ اس کے خیال میں، میں دنیا کا سب سے احمق اور نااہل آدمی ہوں۔ برتن تک دھونا نہیں جانتا۔ جب کھانا پکاتی ہے تو... بس کیا بتاؤں۔ میں تو اکثر ہوٹلوں میں کھا لیتا ہوں اور بیوی سے کہہ دیتا ہوں کہ پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔“

”یہ تو کچھ اچھی بات نہیں۔“ میں نے یونہی رواروی میں کہا۔

”ہاں یہ تو ہے۔ بیوی کو اور کچھ آئے نہ آئے، کھانا بنانا ضرور آنا چاہیے۔“ اس نے ایک اور نوالہ منہ میں رکھا۔ ”شاید عندلیب لائی ہے؟“

”ہاں۔“

”عندلیب اکثر تمہارے لیے کچھ نہ کچھ لاتی رہتی ہے۔ کبھی پراٹھے، کبھی بگھارے بینگن، کبھی سموسے۔ عندلیب کھانا

بنانے کا فن جانتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ٹیسٹ ہے۔'' وہ یکا یک رکا پھر مسکرا کر دبی آواز میں بولا۔ ''مسٹر علی! یہ بچی کیا کچھ زیادہ ہی تمہاری طرف توجہ نہیں دے رہی ہے؟''

جملہ گو سادہ سا تھا مگر واگھورے کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔ میں نے بھنّا کر کہا۔

''بکومت! تمہیں ایسی بات کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔''

''مجھے تو خیر شرم آجائے گی۔'' واگھورے نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''لیکن اس بات میں تھوڑا سا دم ہے ضرور۔''

''بے ہودہ بات ہے۔'' میں نے مزید چڑ کر کہا۔ ''جانتے ہو، میری اور اس کی عمر میں بیس بائیس سال کا فرق ہے۔''

''تو کیا ہوا؟'' واگھورے کے لہجے میں یکا یک تھوڑی سی سنجیدگی آگئی۔ ''یہ سچ ہے اور تم بھی جانتے ہو کہ بعض لڑکیاں زیادہ عمر کے مردوں کو پسند کرتی ہیں۔''

''کرتی ہوں گی۔'' میں نے بہ دستور جھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ ''لیکن اس معاملے میں ایسی کوئی بات نہیں۔ تم خوامخواہ الٹی سیدھی باتیں مت سوچو۔ عندلیب ایک شریف اور نیک لڑکی ہے۔''

''اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ بہت اچھی ہے۔'' واگھورے نے تسلیم کیا۔ ''لیکن تم یہ بتاؤ، کیا وجہ ہے کہ وہ بار بار بھاگ کر تمہارے پاس آتی ہے۔ تمہارے لیے طرح طرح کی چیزیں لاتی ہے۔ اور... اور میں نے سنا ہے کہ وہ چند ایک بار تمہارے فلیٹ پر بھی گئی ہے۔''

میں یکا یک سنجیدہ ہوگیا۔ ''واگھورے مائی ڈیئر! یہ سچ ہے کہ دو چار بار وہ میرے فلیٹ پر گئی ہے لیکن کسی نہ کسی کام سے اور وہ بھی محض چند منٹ کے لیے۔ رہ گئی یہ بات کہ وہ مجھ سے کچھ زیادہ بے تکلف ہے تو اس کی میرے خیال میں دو وجوہ ہیں۔ اول یہ کہ ہم دونوں ہم زبان ہیں اور دوم یہ کہ ہم دونوں ہی تنہا ہیں۔ اس بنا پر وہ میرا خیال کرتی ہے اور بس۔ تم جانتے ہو کہ عورتیں عموماً نرم دل ہوتی ہیں۔''

واگھورے نے مزید کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بڑا نوالہ منہ میں رکھا اور مسکراتا ہوا اپنی میز پر چلا گیا۔

اس شام میں جب دفتر سے نکلا تو ابھی صرف پونے پانچ بجے تھے مگر سڑکوں پر غیر معمولی سناٹا تھا۔ ہر طرف ایک ویرانی سی مسلط تھی۔ آسمان پر گہرے سیاہ بادل گھرے ہونے کی بنا پر دھندلکا بھی معمول سے کچھ زیادہ تھا۔ انگلستان میں یہ ایک بڑی خرابی ہے کہ دھوپ غائب رہتی ہے۔ اور جب تب آسمان گہرے تاریک بادلوں سے ڈھکا رہتا ہے۔ اس بنا پر سڑکیں اور بازار ویران ہو جاتے ہیں۔ ایک ویرانی اور بے کیف اداسی ہر سو چھائی رہتی ہے۔ میں گردن جھکائے، اپنے آپ میں ڈوبا، ان گنت خیالات میں گھرا ہوا ریڈ لائن پب پہنچا۔ یہ شراب خانہ میرے اپارٹمنٹ سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر ہے اور مجھے بہت پسند ہے۔ اس پب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جب آپ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہیں تو یکا یک گزرے زمانے میں پہنچ جاتے ہیں۔ پورے لاؤنج کی بناوٹ اور سجاوٹ پرانے زمانے کی ہے۔ میزیں، کرسیاں، بنچیں، بار کاؤنٹر... حتیٰ کہ گلاس اور اسٹیل کے مگ تک پرانی وضع کے ہیں۔ بار کے مالک مسٹر اور مسز واٹسن بھی اپنے حلیے اور لباس سے اٹھارویں صدی کے میاں بیوی نظر آتے ہیں۔ یہ سارا اہتمام ان دونوں نے خاص طور پر کیا ہے۔ صرف اپنے احساس اور ذوق کی تسکین کے لیے۔ دراصل دونوں میاں بیوی کو جدید انگلستان بالکل پسند نہیں۔ وہ پرانے انگلستان اور پرانی روایات کے دلدادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف پب بلکہ اپنے گھر کو بھی انہوں نے قدیم طرز پر آراستہ کیا ہے۔ ان کے پب میں آمد بھی ان لوگوں کی زیادہ ہوتی ہے جو قدامت پرست ہیں۔ میں بھی ان کے پب میں پابندی سے شاید اسی لیے جاتا ہوں کہ پرانی روایات اور قدریں مجھے بھی زیادہ بھاتی ہیں۔

میں نے میری واٹسن کو ہیلو کہا، خیریت پوچھی اور اسٹیل کے مگ میں بیئر لے کر لاؤنج سے گزرتا ہوا عقبی پارلر میں چلا گیا۔ عقبی پارلر کو خاص طور پر اٹھارویں صدی کی طرز پر آراستہ کیا گیا ہے۔ اسی زمانے کی لمبی لمبی میزیں اور کرسیاں اور بنچیں۔ کھڑکیوں کی بناوٹ بھی پرانی وضع کی ہے۔ حتیٰ کہ فرش پر کوئی لائینو یا قالین تک نہیں۔ ننگا مگر صاف ستھرا فرش ہے۔ میں نے چاروں طرف نظر ڈالی اور مغربی کونے میں ایک کرسی پر جم گیا۔

پارلر میں مجھ سمیت کل سات افراد تھے۔ دائیں جانب ایک عمر رسیدہ میاں بیوی براجمان تھے۔ ان کے سامنے میز پر بیئر کے مگ رکھے تھے اور وہ غالباً کسی اہم معاملے پر گفتگو کرنے میں جٹے ہوئے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی پارلر کے وسط میں پڑی بنچ پر بیٹھا تھا اور مقامی اخبار پڑھنے میں مصروف تھا۔ مشرقی کونے کی بنچ پر ایک مرد اور ایک لڑکی براجمان تھے۔ ان کے ہاتھ ایک دوسرے کی کمر میں حمائل تھے اور ان کے ہونٹ اس طرح ایک دوسرے میں پیوست تھے کہ لگتا تھا اب کسی صورت الگ نہ ہوں گے۔ میں نے ذرا غور سے ان دونوں کو دیکھا۔ لڑکی کی عمر مشکل سے بیس اکیس سال رہی ہوگی جبکہ مرد کی عمر چالیس سے کسی صورت کم نہیں تھی۔ دونوں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر ایک دوسرے میں گم تھے۔ جیسے ان دونوں کی

ت ہی ایک دوسرے کے لیے سب کچھ ہے۔ باقی ساری یا، سارے مظاہر شام و سحر محض بے معنی ہیں۔ یہ کیا ہے؟ کیا ت ہے؟ میں ہکا بکا ہو کر ایک دہشت کے عالم میں چند لمحے اس طرح دیکھتا رہا کہ مجھے اپنے آس پاس کی خبر ہی نہ ۔ پھر میں زور سے چونکا۔ غصے سے گ اٹھا کر ایک بڑا ٹ بھرا اور ایک سگریٹ سلگائی۔

''کیا رگھونندن کم بخت واقعی ٹھیک کہتا ہے؟''

میں نے ایک اور گھونٹ لیا اور قدرے غصے سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

عام طور پر میں دفتر سے چھٹی کے بعد سیدھا گھر جاتا ہوں لیکن اگر کبھی ریڈ لائن پب میں چلا بھی جاؤں تو بھی سات بجے تک گھر ضرور پہنچ جاتا ہوں۔ مگر اس دن غیر معمولی طور پر دیر ہوگئی۔ پب سے نکلتے ہی عابد مل گیا۔ وہ جبراً مجھے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں سے نکلتے نکلتے نو بج گئے۔ جب میں نے اپنے فلیٹ کی سولہ سیڑھیاں چڑھیں، اس وقت ساڑھے نو بج چکے تھے۔ میں اپنے فلیٹ میں داخل ہوا اور واپس آگیا۔

متصل فلیٹ میں مسٹر اور مسز فرحت اللہ رہتے ہیں جو پاکستان کے رہنے والے ہیں۔ ان کے دونوں بچے شہر کے مختلف علاقوں میں رہتے ہیں اور پابندی سے آتے جاتے رہتے ہیں۔ میں نے دستک دی۔ چند منٹ بعد بیگم فرحت اللہ نے دروازہ کھولا۔ مجھے حیرت سے دیکھا اور دوپٹے کے پلّو سے پیشانی پونچھ کر ذرا تعجب سے بولیں۔

''ارے اکبر! تم کب آئے...؟''

''بس ابھی آرہا ہوں۔'' میری سانس شاید پھول رہی تھی۔ ''کیا کوئی آیا تھا؟''

''ہاں۔''

''کون؟''

بیگم فرحت اللہ ہنس کر بولیں۔ ''ارے وہی جو تمہارے دفتر میں کام کرتی ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟ ہاں، عندلیب۔ شاید اسے تم سے کوئی کام تھا۔''

''کیا کام تھا، بتایا تھا کچھ...؟''

''نہیں، کہنے لگی کہ تم سے بعد میں بات کرلے گی۔ بہت اچھی بچی ہے۔ اس کی درخواست پر میں نے چابی اسے دے دی تھی۔''

''کب آئی تھی وہ...؟'' میں نے ذرا تجسس سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے، کوئی سات بجنے والے تھے۔''

''اور گئی کب؟''

''ابھی کوئی آدھا گھنٹا پہلے۔ چابی مجھے دے گئی ہے۔ تم بلاوجہ پریشان مت ہونا۔''

''اچھا...'' میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

پھر میں اپنے فلیٹ میں داخل ہوا۔ راہداری سے گزر کر بیٹھک میں آیا اور حیران و پریشان نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کیا یہ وہی کمرا ہے جسے چھوڑ کر میں صبح دفتر گیا تھا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ کمرا، وہ فلیٹ تو ایک لاابالی، کاہل اور غیر ذمے دار آدمی کا کمرا تھا۔ اجڑا ہوا، بے ترتیب اور بے سلیقہ۔ ہر طرف کوڑا کباڑ۔ کتابیں اور اخبارات میز پر، پلنگ کے نیچے، کھڑکی کی چوکھٹ پر بے تکے پن سے بکھری ہوئی۔ دھلنے والے کپڑے بے پروائی سے اِدھر اُدھر پڑے ہوئے۔ ایک جوتا لکھنے کی میز پر تو دوسرا الماری کے نیچے۔ پھٹے ہوئے اخبار، سگریٹ کے خالی پیکٹ اور کتابوں سے اترنے والے ریپر اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے۔ گرد، ہر طرف گرد... میز پر، کرسیوں اور صوفے پر اور کھڑکیوں پر۔ میرا کمرا کیا تھا، اچھا خاصا کباڑ خانہ تھا۔ فلیٹ کے کونے کونے اور چپّے چپّے سے اس بے سروسامانی کا اظہار ہوتا تھا جس سے میرے صبح و شام، میری زندگی عبارت تھی۔ مگر اب اس وقت جو کمرا میری آنکھوں کے سامنے تھا، وہ میرا نہیں، کسی اور کا تھا۔ ہر شے صاف ستھری اور سلیقے سے اپنی جگہ پر رکھی ہوئی۔ اور ہر شے پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ انہیں نسوانی ہاتھوں نے بڑی لگن اور چاہت سے سجایا سنوارا ہے۔ میں کچھ دیر مہر بہ لب رہا اور ایک ایک شے کو دیکھتا رہا۔ میرے دل میں ایک عجیب سی ہلچل تھی جس میں کچھ ملال اور کچھ شرمندگی کا پہلو بھی تھا۔ میں کیا ہوں؟ میری زندگی کیا ہے؟ کب تک اس طرح رہوں گا؟ میری زندگی کے ان گنت ماہ و سال اس خشک پتّے کی طرح رہے ہیں جو راستے میں پڑا ہے۔ اور پیروں تلے... وقت کے پیروں تلے بار بار کچلا جاتا ہے۔ جب عندلیب ان سب اشیا کو سجا رہی ہوگی، سنوار رہی ہوگی، تب وہ کیا سوچ رہی ہوگی... کیا محسوس کر رہی ہوگی؟ کیسا آدمی ہے؟ میں نے زور سے سانس لی اور گلدان میں سجے خوب صورت پھولوں کو دیکھا۔ میں کتنی چیزوں سے محروم رہا ہوں۔ پھر میں آہستہ سے گھوما۔

بیڈ روم کو دیکھا۔ پھر ایک نظر باتھ روم پر ڈالی۔ اس کے بعد باورچی خانے میں قدم رکھا جو بے حد صاف ستھرا نظر آرہا تھا۔ ایک بھی گندا برتن کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سنک جھلملا رہا تھا۔ میں نے بجلی کی کیتلی کا بٹن دبایا اور یوں ایک کپ چائے تیار کی، گویا مجھے علم نہ ہو کہ کیا کر رہا ہوں پھر مغربی کونے میں کھڑکی کے ساتھ پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کپ میز پر رکھا اور کھڑکی سے باہر دیکھا۔

تبھی اچانک بیگم فرحت اللہ آ گئیں... ''کھانا کھاؤ گے؟''

''نہیں، میں نے کھانا کھالیا ہے۔''

تھوڑی دیر چپ رہیں پھر بولیں۔ ''فرحت صاحب صبح میڈن ہیڈ گئے تھے۔ ابھی تک نہیں آئے ہیں۔ نہ کوئی فون آیا۔ شاید اب آ رہے ہوں...'' وہ کچھ دیر رکیں پھر مزید کہا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''کک... کچھ نہیں...'' میں ذرا سٹپٹا گیا۔

بیگم فرحت نے چاروں طرف نظر ڈالی پھر مسکرا کر کہنے لگیں۔ ''شاید فلیٹ کی صفائی اور سجاوٹ دیکھ کر حیران ہو رہے ہو گے؟ تم نے تو ہر کمرے کو کباڑ خانہ بنا رکھا تھا۔ اب دیکھ لو، کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ صاف ستھرا اور آراستہ۔ وہ بے چاری ایک گھنٹے تک لگی رہی۔ میں نے منع بھی کیا تھا لیکن نہیں مانی۔''

''کون... عندلیب؟'' میں نے یونہی کہا۔

''ہاں۔''

''مگر اس نے ایسا کیوں کیا... کیا ضرورت تھی؟''

''اب یہ تو تم خود ہی اس سے پوچھ لینا۔'' بیگم فرحت کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری۔ ''بہت اچھی لڑکی ہے۔ مشرق کا جیتا جاگتا نمونہ۔ تمہارا بہت خیال کرتی ہے۔''

''جج... جی، میں سمجھا نہیں۔ اگر خیال کرتی ہے تو... میرا مطلب ہے کہ... کہ بھئی وہ تو دفتر میں میرے ساتھ کام کرتی ہے اور بس...''

''تم خود ہی سوچو، ذرا غور کرو...''

بیگم فرحت اللہ مسکراتی ہوئی چلی گئیں... مجھے حیرت اور تذبذب اور بے یقینی کے گرداب میں پھنسا ہوا۔ کیا مطلب ہے ان کا؟ انہوں نے یہ کیوں کہا؟ 'تمہارا بہت خیال کرتی ہے'... آخر اس بات سے ان کا کیا مطلب ہے؟ کس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں وہ؟ نہیں، نہیں... ایسی کوئی بات نہیں۔ ان کا مطلب کچھ اور ہو گا۔ میں ہی سمجھنے میں کچھ غلطی کر رہا ہوں۔ لیکن یہ خیال، یہ جواز دل کو نہیں لگا۔ کوئی بات تھی، کوئی ایسی بات جو یا تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی یا میں لاشعوری طور پر، قصداً اسے دیکھنے سے اور سمجھنے سے احتراز کر رہا تھا۔ میں چپ چاپ لیکن حیرت میں ڈوبا ہوا بیٹھا رہا اور کچن کے کھلے دروازے کو گھورتا رہا۔ خیالات میرے ذہن میں چکراتے رہے۔ ایک گرداب تھا جس میں ڈوب رہا تھا اور ابھر رہا تھا۔ میرے کانوں میں آوازیں گونج رہی تھیں۔ کبھی بیگم فرحت اللہ کی اور کبھی رگھونندن کی آواز!

''کیا رگھونندن کم بخت ٹھیک کہتا ہے...؟''

☆☆☆

''ایک دن آئے گا جب تم پیچھے مڑ کر دیکھو گے تو تمہیں راستے پر... زندگی کے راستے پر کوئی جگنو نظر نہیں آئے گا۔ زندگی کے اندھیرے میں جگنوؤں کی بہت اہمیت ہے، بڑی قیمت ہے۔ کیونکہ اندھیرے میں راستہ نظر نہیں آتا۔ یہ جگنو ہی ہوتے ہیں جو اپنے ننھے ننھے فانوسوں کی مدد سے راستہ دکھاتے ہیں۔ تم کیسے راستہ دیکھو گے؟''

''بعض لوگ اندھیرے میں بھی راستہ تلاش کر لیتے ہیں۔'' میں نے یونہی کہا تھا۔

''ہاں، مگر تم نہیں کر سکتے... اور تم جانتے ہو، کیوں؟''

یہ باتیں برسوں پہلے میرے رشتے کے چچا نے کہی تھیں۔ میں چپ چاپ بیٹھا انہیں دیکھتا رہا تھا۔ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کہوں اور کیسے کہوں۔ یا یہ ہے کہ میں سمجھ تو رہا تھا کہ ان کا کیا مطلب ہے، تاہم یہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ جواب میں کیا کہوں اور کیسے کہوں؟ ان کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں انتظار۔ میرے جواب کا انتظار! مجھے یکا یک سگریٹ کی طلب بڑی شدت سے محسوس ہوئی لیکن چچا صاحب کے سامنے میں سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ ناچار ضبط کرنا پڑا۔ کچھ دیر بعد میں نے آہستہ سے کہا۔

''مگر کچھ لوگ اندھیرے میں بھی راستہ تلاش کر لیتے ہیں۔''

''بے شک! مگر صرف کچھ لوگ۔'' ان کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''مگر تم نہیں۔ تمہیں بہر حال ضرورت ہے۔ جگنو کی ضرورت ہے اور تم یہ بات بہ خوبی جانتے ہو۔''

میں چپ چاپ ان کا چہرہ دیکھتا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد انہوں نے مزید کہا تھا۔ ''دیکھو میاں، جس پرندے کے پر کٹ چکے ہوں وہ نہیں اڑتا۔ اڑنے کے لیے پورے اور صحت مند پروں کا ہونا ضروری ہے۔ کیا تمہارے پاس پر ہیں؟''

میں پھر بھی چپ رہا تھا۔ چچا صاحب کی گفتگو کا پورا مفہوم مجھ پر واضح تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ چچا نصیر الدین خاصے دولت مند تھے۔ کافی جائیداد تھی ان کی۔ پلاسٹک کی ایک فیکٹری تھی جہاں گھریلو استعمال کے لیے انواع و اقسام کی اشیا بنائی جاتی تھیں۔ پھر انہوں نے کئی کامیاب کمپنیوں کے حصص خرید رکھے تھے اور وہ ایک خوب صورت، بیش قیمت مکان میں رہتے تھے۔ تاہم یہ کوئی بہت زیادہ اہم بات نہیں ہے۔ اکثر خاندانوں میں یہ ہوتا ہے کہ چند ایک افراد صاحبِ حیثیت ہوتے ہیں۔ کچھ غریب اور کچھ بہت غریب ہوتے ہیں لیکن مشکل یہ تھی کہ چچا صاحب نے میری اماں کے انتقال کے بعد میرے تعلیمی اخراجات خود اٹھا رکھے تھے۔ کالج کا

ری سال تھا۔ چند ماہ بعد میں یونیورسٹی جانے والا تھا اور ہے کہ یونیورسٹی کے تمام اخراجات بھی چچا صاحب کو ہی شت کرنے تھے۔ تاہم یہ بھی کوئی بہت زیادہ اہم بات تھی۔ اکثر متمول حضرات اپنے کم حیثیت رشتے داروں ادا کرتے ہیں۔ اگر چچا صاحب میری مدد کر رہے تھے تو ی سی انوکھی بات تھی؟ مگر ساری گڑبڑ جس نے مشکل پیدا کی تھی، یہ تھی کہ چچا صاحب کی ایک صاحبزادی بھی تھیں۔ میرے ابا تو خیر پہلے ہی جا چکے تھے۔ جب اماں نے رخصت ر باندھا تو میری عمر مشکل سے پندرہ سال تھی۔ میری دیکھ ں اور کفالت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن اس سے قبل کہ مجبور ہو کر میں اسکول کو خیرباد کہتا، چچا نصیر الدین آگے آئے اور انہوں نے میرے سر پر دستِ شفقت رکھا۔ اس موقع پر چچا کی بہت تعریف و تحسین ہوئی تھی۔ بڑے نیک اور دردمند آدمی ہیں۔ بہت دریا دل ہیں۔ اپنوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ فرشتہ ہیں فرشتہ! انہوں نے ایک بے آسرا اور بے وقعت لڑکے کی زندگی اور مستقبل تباہ ہونے سے بچا لیا۔ ورنہ ا ہو کر یہ لڑکا کیا بنتا؟ آوارہ، بدمعاش...! ہو سکتا ہے، اسمگلر بنتا اور پولیس کو ہمیشہ مطلوب رہتا۔ لیکن چچا نصیر الدین نے یے ہر امکان اور خدشے کو ختم کر دیا تھا۔ اب یہ طے تھا کہ میں چور اچکا بننے کے بجائے ایک شریف اور معزز آدمی بنوں گا اور ایک بہتر زندگی گزاروں گا۔ لیکن ہوا یہ کہ کئی سال بعد یہ بھید کھلا کہ چچا کا ''دستِ شفقت'' اصل دستِ شفقت نہیں ... ایک طویل المیعاد منصوبے کی پہلی کڑی تھی۔ دراصل ہیں ایک گھر داماد چاہیے تھا۔ ان کی ایک ہی اولاد تھی۔ مسماۃ روشن آرا بیگم... جو ماں باپ کو دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ اپنی نورِ نظر، لختِ جگر کو کسی بھی حال میں خود سے جدا کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اور غالباً ان کا یہ منشا بھی تھا کہ گھر ں دولت گھر میں ہی رہے اور یہ مقصد صرف ایک ہی صورت ں حاصل ہو سکتا تھا۔ اس طرح کہ انہیں ایک بے زبان اور ہات فرماں بردار قسم اور غالباً دوسرے الفاظ میں دم ہلانے والا داماد مل جائے جو ان کی نورِ نظر، لختِ جگر کو بیاہ کر لے انے کے بجائے ان کے ساتھ ہی رہے۔ اب ایسا داماد س بھلا مجھ سے بہتر اور کون مل سکتا تھا۔ کیونکہ نہ صرف یہ کہ میرے چچا تھے بلکہ برسوں سے میری کفالت بھی کر رہے تھے۔ اب اگر اسے انویسٹمنٹ تصور کر لیا جائے تو ڈیویڈنڈ صول کرنے کا وقت اب آ چکا تھا۔ کیونکہ ان کی نورِ نظر، لختِ جگہ ماشاء اللہ اب ''ضرورت'' سے زیادہ جوان ہو چکی تھی۔ سب مجھے چچا صاحب کے منصوبے اور ارادے کا علم ہوا تو پہلے تو میرے ہاتھوں کے توتے اڑے پھر پاؤں تلے سے زمین کھسکی۔ میں فوراً خالہ کے پاس پہنچا جو دراصل میری اماں کی خالہ زاد بہن تھیں اور انہیں پوری بات بتائی۔ انہوں نے گھریلو عورتوں کے مخصوص انداز میں ہاتھ ہلا کر کہا۔

''اے ہے! تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑی؟ شادی تو آخر کرنا ہی ہے نا۔''

''مگر... مگر خالہ، روشن کے ساتھ!'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''تو کیا ہوا...'' خالہ نے اطمینان سے کہا۔ ''روشن میں کیا خرابی ہے؟ لڑکی ہے اور شادی لڑکی ہی سے ہوتی ہے۔''

''خالہ آپ جانتی ہیں...'' میں نے غصے سے کہا۔

''تیرا مطلب ہے کہ وہ تجھ سے عمر میں بڑی ہے... ہے نا، تو کیا ہوا؟ تھوڑا ہی سا تو فرق ہے۔''

''تھوڑا سا نہیں۔'' میں مزید جھلایا۔ ''پورے چھ سال بڑی ہے وہ۔''

لیکن خالہ کے اوپر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بے پروائی سے کہنے لگیں۔ ''اے، کیوں بات کا بتنگڑ بنا رہا ہے۔ عمر کے تفاوت سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اکثر بیویاں اپنے شوہروں سے بڑی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی تو دس بارہ سال کا فرق بھی ہوتا ہے۔ یاد ہے تجھے، تیرے ایک پھوپا تھے رشتے کے، جلیل احمد... ان کی بیوی پورے گیارہ سال بڑی ہیں۔''

''مگر خالہ...''

''چپ رہ، اگر مگر مت کر۔'' خالہ کو باقاعدہ غصہ آ گیا۔ ''تجھے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ نصیر میاں کے کتنے احسان ہیں تجھ پر۔ یاد ہے نا۔ اگر وہ تجھے سہارا نہ دیتے تو آج کیا ہوتا۔ جوتیاں چٹخا رہا ہوتا۔ دو کوڑی بھی تیری قیمت نہ ہوتی۔ لیکن آج تو کیا ہے۔ کالج میں پڑھ رہا ہے۔ ایک اچھا مستقبل، ایک کامیاب زندگی تیرے سامنے ہے اور یہ سب کچھ انہی کے طفیل ہے۔ تو کیا یہ اچھا نہیں ہو گا کہ تو ان کے احسانوں کا تھوڑا بہت بدلہ اتارے۔'' انہوں نے چپ ہو کر مجھے گھورا۔

میں ہکا بکا ہو کر خالہ کی شکل دیکھتا رہا۔ ان کے الفاظ بہت سخت اور کافی دل آزار تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ چچا نصیر الدین کے مجھ پر بہت احسانات تھے مگر خالہ کو ایسے الفاظ استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اندر ہی اندر میں گھول کر رہ گیا مگر چپ رہا۔ حالانکہ میرے پاس خالہ کی ہر بات کا جواب تھا اور بہت مدلل جواب تھا۔ لیکن زبان کھولنا لاحاصل ہی ہوتا کہ خالہ اور بپھر جائیں اور ہاتھ ہلا ہلا کر پرانے زمانے کی نانیوں، دادیوں کی طرح ایسی کھری کھری سنائیں کہ مجھ

www.paksociety.com

پر چودہ طبق روشن ہو جاتے۔ جب کچھ دیر میں خاموش رہا تو خالہ نے خود ہی لب کھولے۔

''کیا میں کچھ غلط کہہ رہی ہوں...؟''

''نن...نہیں...'' میں نے آہستہ سے کہا۔

خالہ کچھ دیر مجھے گھورتی رہیں پھر اپنے لہجے میں قدرے نرمی پیدا کر کے کہنے لگیں... ''مانا کہ وہ تجھ سے بڑی ہے اور صورت و شکل بھی بس غنیمت ہے لیکن اکبر! اور کوئی خرابی تو اس میں نہیں ہے۔ ڈھیر ساری دولت ہے، جائیداد ہے۔ سب کچھ آخر تجھے ہی ملے گا نا...'' وہ رکیں پھر بولیں۔ ''بیٹا ایسا ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے تجھ پر احسان کیا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تو ان کی خواہش پوری کر۔ شریف گھرانوں کی یہی ریت ہوتی ہے۔''

''جی!'' میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔

انہوں نے قدرے توقف کے بعد پھر کہا۔ ''ویسے ایک بات اور بھی ہے۔''

''کیا؟''

''آج کل تو جس لڑکی کے چکر میں ہے۔'' وہ ذرا طنزیہ انداز میں مسکرائیں۔ ''میں نے اسے دو ایک بار دیکھا ہے۔ اچھی ہے لیکن تیری شادی اس سے تو نہیں ہو سکتی۔''

''کیوں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

خالہ ایک بار پھر مسکرائیں۔ ''اول تو یہ کہ ذات پات کا مسئلہ ہے۔ ہمارے خاندان میں آج تک پیوند نہیں لگا اور وہ لڑکی دوسری ذات سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے خاندان میں برسوں سے ایک اصول ہے، وہ یہ کہ کوئی شادی خاندان سے باہر نہیں ہو گی۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ خاندان کی غریب اور کم رو لڑکیاں بھی آباد ہو جاتی ہیں... دوسرے خاندان یا ذات پات وغیرہ کا کوئی مسئلہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ باہر شادی کرنے کی اگر کوئی جرأت کرتا ہے تو اسے خاندان سے ہی نکال دیا جاتا ہے۔ تجھے معلوم ہے نا، تیرے رشتے کے ایک بھائی ہیں، شاکر علی۔ اس نے یہی حرکت کی۔ اس کا حقہ پانی بند کر دیا گیا۔ کیا تو چاہتا ہے کہ تیرا بھی یہی حشر ہو؟''

میں چپ چاپ خالہ کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا... تو خالہ بھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں جس میں چند ایک دوسرے لوگ مبتلا ہیں۔ یعنی یہ کہ میں زینت سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ زینت سے میری ملاقات کوئی ایک سال قبل ہوئی تھی۔ شروع کے کچھ دن تو تکلف حائل رہا پھر ہماری قربت بڑھ گئی اور اس حد تک بڑھی کہ ہم نے بعض اخلاقی حدود کا بھی خیال نہیں رکھا۔ ہو سکتا ہے، زینت کے ذہن میں یہی خیال رہا ہو کہ انجام کار ہم دونوں شادی کریں گے اور ایک چھوٹی سی جنت بنائیں گے۔ جس میں انگریزی محاورے کے مطابق ساری زندگی ہنسی خوشی بسر کریں گے۔ اور یہ محض اتفاق تھا کہ ایک دو بار خالہ سے اس کی سرسری ملاقات ہو گئی تھی اور خالہ نے بھی اپنے طور پر سوچ لیا تھا کہ میں زینت کے معاملے میں سنجیدہ ہوں۔ لیکن میں انہیں کیسے بتاتا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

زینت میری منزل نہیں ہے۔ بے شک وہ خوب صورت ہے، سلیقہ مند ہے اور یقیناً ایک اچھی بیوی بننے کی تمام خوبیاں اور صلاحیتیں اس میں موجود ہیں۔ لیکن میرے لیے اس کی حیثیت اس پیڑ سے زیادہ نہیں جس کی چھاؤں میں مسافر کچھ دیر سستاتا ہے اور پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔ میں زینت پر اکتفا نہیں کر سکتا تھا۔ میرا آسمان بہت اونچا تھا۔ میری منزل کچھ اور تھی۔ میں اپنے بارے میں شاید بہت زیادہ خوش گمانی میں مبتلا تھا۔ حالانکہ یہ اور بات ہے کہ میرے ذہن میں یہ بات پوری طرح واضح نہیں تھی کہ میں کیا چاہتا ہوں لیکن پھر بھی میں خوش اور مطمئن تھا۔ ذہن کے کسی گوشے میں یہ احساس، یہ خیال موجود تھا کہ اگر ابھی نہیں تو کل میرے ذہن میں واضح ہو جائے گا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میری منزل کہاں ہے، میرا آسمان کہاں ہے۔ زینت تو محض راستے کی ایک ایسی ساتھی ہے جس کے ساتھ مسافر کچھ دیر چلتا ہے پھر آگے بڑھ جاتا ہے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ سلیقے اور احتیاط کے ساتھ خالہ پر یہ بات واضح کر دوں کہ زینت کے معاملے میں وہ خوش فہمی کا شکار ہیں لیکن پھر ارادہ بدل دیا کہ خالہ مزید برہم ہو جائیں۔ اور بات پھر بھی نہ بنتی۔

کچھ دیر بعد میں نے یونہی کہا۔ ''تو میری شادی اس لڑکی سے نہیں ہو سکتی؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''میں نے ابھی بتایا نا تجھے۔'' انہوں نے گھور کر مجھے دیکھا۔

''مگر خالہ یہ اکیسویں صدی ہے۔'' میں نے خوامخواہ جرح کی۔ ''اب زمانہ بدل گیا ہے۔ لوگوں کی سوچ بدل گئی ہے۔ زندگی کا انداز بدل رہا ہے۔ یہ اصول جس کا آپ نے ذکر کیا، بہت اچھا ہے مگر یہ چالیس پچاس سال پہلے بنایا گیا تھا۔ اب وقت...''

''تو کیا ہوا۔'' خالہ تیز لہجے میں بات کاٹ کر بولیں۔ ''تو شاید یہ کہہ رہا ہے کہ یہ اصول پرانا ہو گیا لہٰذا اسے ترک کر دینا چاہیے۔ لیکن یاد رکھ، آج بھی دونوں ملکوں میں ایسے ہزاروں

خاندان موجود ہیں جو پرانی قدروں اور روایتوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ اچھے رواج ہیں اور اچھی چیز پرانی نہیں جاتی۔ اور ہاں، ایک بات اور بھی یاد رکھ۔ صرف میری خاطر خاندان کا کوئی اصول نہیں توڑا جا سکتا۔''

خالہ غصے میں اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں۔

بے شک خاندان کا کوئی اصول، کوئی ضابطہ خاص طور پر میرے لیے نہیں توڑا جا سکتا۔ لیکن مسئلہ زینت کا نہیں تھا۔ مسئلہ تو میرا تھا۔ کیا خاندان مجھے مجبور کر سکتا ہے؟ نہیں... خاندان کو یہ حق نہیں۔ لیکن میرا ایسا سوچنا میرے کسی کام نہیں آ سکتا تھا۔ میری برہمی، میرا اختلاف، اپنی جگہ... لیکن میں اکیلا ہوں اور پورا خاندان ایک طرف۔ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑتا۔ ہر چند کہ کراچی میں میرے کچھ زیادہ رشتے دار نہیں لیکن جو ہیں، وہ سب کے سب کسی نہ کسی صورت میں، کم یا زیادہ، چچا صیر الدین کے احسان مند ہیں اور کوئی بھی ان کے خلاف جانا پسند نہیں کرے گا۔ تو پھر کیا کروں... کیا کروں؟

ہاں، تو پھر کیا کروں؟ بہ ظاہر کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک صورت تو یہ تھی کہ سر تسلیم خم کر دوں اور بازار میں بک جاؤں۔ لیکن کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ مجھے روشن سے کوئی کد نہیں تھی۔ لیکن بات روشن کی نہیں تھی، بات اصول اور زندگی کی... میری زندگی کی تھی۔ کیا میں خود کو قربان کر سکتا ہوں؟ جتنا زیادہ میں اس سوال پر غور کرتا، مجھے جواب نفی میں ملتا۔ دل سے، احساس سے، دماغ سے۔ نہیں، نہیں، نہیں۔ تو پھر کیا کروں؟

ایک مشکل اور تھی... زینت! ہر بار جب زینت سے ملاقات ہوتی، میں اس کی آنکھوں میں ایک امید کا دیا جلتے ہوئے دیکھتا۔ ایک سوال کو اس کے ہونٹوں پر مچلتے دیکھتا۔ میں جانتا تھا کہ وہ سوال کیا ہے اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ جلد یا بہ دیر وہ اس سوال کو ہونٹوں پر لے آئے گی۔ تاہم ایک اہم سوال یہ ہے کہ میں کیا جواب دوں گا؟ کیا میرے پاس کوئی جواب ہے؟ مشکل ہے، بہت مشکل ہے۔ جو جواب میرے پاس ہے، وہ میں دے نہیں سکتا۔ زینت بے شک خوب صورت ہے، گھر گرہستی سے بھی خوب واقف ہے۔ ملنسار اور خوش اخلاق بھی ہے۔ وہ ایک اچھی بیوی بننے کی تمام صلاحیتیں رکھتی ہے لیکن کیا میں اس کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہوں؟ کبھی تو میری زندگی کی ابتدا ہی ہوئی ہے۔ ابھی میں نے دیکھا ہی کیا ہے؟ یہ دنیا بہت وسیع ہے۔ یہ آسمان بہت اونچا ہے اور یہ جو زندگی ہے، اس کے ہزار رنگ ہیں۔ ابھی میں نے دنیا کہاں دیکھی ہے۔ ابھی میں نے آسمانوں پر پرواز کہاں کی ہے؟ اور یہ جو زندگی ہے، اس کا صرف ایک ہی رنگ دیکھا ہے اور وہ بھی کچھ زیادہ خوب صورت نہیں۔ ابھی تو زندگی کے ان گنت رنگ باقی ہیں۔ تو پھر کیا کروں؟ میں کئی دن تک سوچتا رہا، سوچتا رہا، سوچتا ہی رہا۔

دبئی، کویت، چند دن بروسلز میں اور پھر لندن۔ کسی کو بھی علم نہیں تھا: شبہ تک نہیں تھا کہ میں کہاں ہوں۔ میں نے کسی دوست یا رشتے دار کو ہلکا سا اشارہ بھی نہیں دیا تھا۔ مناسب یہی تھا کہ میں سب کو لاعلم رکھوں۔ تین سال میں نے لندن کی ابر آلود اور سرد فضا میں گزارے پھر برمنگھم چلا گیا۔ چار سال بعد برمنگھم کو خیر باد کہا اور بریڈفورڈ میں تین سال گزارے لیکن بہ وجوہ بریڈفورڈ بھی چھوڑنا پڑا۔ حالانکہ بریڈفورڈ اچھی جگہ ہے۔ پورے شہر میں ہر طرف ایشین نظر آتے ہیں جن میں اکثریت پاکستانیوں کی ہے۔ اسٹوروں میں، دکانوں میں، ہوٹلوں اور چائے خانوں میں اور سرکاری و نیم سرکاری دفاتر میں ہر جگہ پاکستانی دکھائی دیتے ہیں جن سے آپ اردو یا پنجابی میں بات چیت کر سکتے ہیں۔ اجنبیت اور غیریت کا احساس بالکل نہیں ہوتا۔ بعض علاقے تو ایسے ہیں جہاں گھومتے پھرتے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے ہم کراچی یا پنڈی کی سڑک پر گھوم رہے ہیں۔ میں بریڈفورڈ میں رہنا چاہتا تھا۔ مستقل طور پر... لیکن یہ ممکن نہ ہوا اور اس کی وجہ تھی میگی!

میگی کی عمر کوئی پچیس سال تھی۔ قد درمیانہ، بال بھورے رنگ کے، آنکھیں بڑی بڑی اور ہلکی شربتی۔ اس کا باپ آئرش تھا لیکن ماں انگلش تھی۔ بچپن کا کچھ حصہ اس نے ڈبلن میں گزارا تھا لیکن جب اس کے والدین کے درمیان علیحدگی ہوئی تو وہ اپنی ماں کے ساتھ بریڈفورڈ چلی آئی۔ وہ خوب صورت تھی۔ بہت خوب صورت تھی۔ اس کی رنگت، اس کا خرام، اس کی مسکراہٹ اور اس کا پورا سراپا۔ مگر وہ جتنی دل نواز تھی، اتنی ہی پُرفریب اس کی شخصیت تھی۔ کسی کو بھی بہت آسانی سے خوش فہمی میں مبتلا کر سکتی تھی۔ شاید میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ شاید وہ میری جانب ملتفت نہیں تھی مگر اس کے انداز و ادا اور عادات و اطوار نے میرے دل میں ان احساسات کو ہوا دی جنہیں عام طور پر لگاؤ سمجھا اور کہا جاتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اس نے چند ایک اس نوعیت کی باتیں بھی کیں جو شاید میرے دل میں مزید خوش گمانی جگانے کا باعث بنیں۔ خوش گمانی اجازت لے کر نہیں آتی اور سپنوں پر اختیار نہیں ہوتا۔ چنانچہ میں خود بہ خود سپنے دیکھنے لگا۔ اتنی عمر ہو گئی ہے، کب تک بے سروسامان رہوں گا؟ کب تک مارا مارا پھروں گا؟ کب تک سونا، ویران، اندھیرا فلیٹ مجھے بددلی سے دروازے میں داخل ہونے کی اجازت دے گا نہیں،

اب اور نہیں۔ اب زندگی میں جماؤ اور ٹھہراؤ آنا چاہیے۔ میگی بہت اچھی ہے۔ سلیقہ مند ہے۔ وہ ایک بہترین رفیق ثابت ہوگی۔ ہاں، اس کے ساتھ زندگی بہت اچھی گزرے گی۔ میں بریڈفورڈ کے مضافات میں کہیں ایک خوب صورت گھر لے لوں گا جس میں بڑا سا عقبی باغیچہ ہو۔ ہم دونوں ہی کو پھول پھلواری کا بہت شوق ہے۔ گلاب اور جرنیم اور روڈا ڈینڈرن۔ ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ میں نے تصور میں اپنے خیالی گھر کو دیکھا اور خوش ہوا۔

مگر اس سے پہلے کہ سپنے گہرے ہوتے، خوش فہمی مزید بڑھتی اور میری زبان پر میگی کے سامنے حرفِ مدعا آتا، میں نے اسے نیشنل پارٹی کے ایک جلوس میں دیکھ لیا۔

نیشنل پارٹی برطانیہ کی ایک نسل پرست جماعت ہے۔ اس جماعت کے ممبر سیاہ فام اور رنگ دار باشندوں سے سخت نفرت کرتے ہیں۔ برسوں پہلے یہ جماعت صرف ایک ہی نصب العین کو لے کر قائم ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ تمام سیاہ فام اور رنگ دار تارکین وطن کو جبراً برطانیہ سے نکال دینا چاہیے۔ برطانیہ سفید فام ملک ہے اور اسے سفید فام ہی رہنا چاہیے۔ اس پارٹی نے اپنے قیام پر برطانوی عوام سے وعدہ کیا تھا کہ جب بھی انہیں انتخابات میں کامیابی ملی اور وہ برسرِ اقتدار آئے، پہلا کام وہ یہی کریں گے کہ سیاہ فام اور رنگ دار تارکین وطن کو جہازوں میں بھر بھر کر واپس ان کے ملک بھیج دیں گے۔ ابتدا میں نیشنل پارٹی کو کوئی کامیابی نہیں ملی۔ برطانیہ کے مقامی یعنی سفید فام بھی ان پر ہنستے اور ان کی مذمت کرتے تھے۔ لیکن نیشنل پارٹی کے ارکان اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے اور نہ صرف مقامی کونسلوں کے انتخابات میں بلکہ مرکزی پارلیمنٹ کے چناؤ میں بھی وہ اپنے امیدوار کھڑے کرتے رہے۔ دھیرے دھیرے فضا بدلی، ماحول بدلا اور نیشنل پارٹی کی مقبولیت میں اضافہ ہونے لگا۔ گو یہ مقبولیت اب بھی بہت کم ہے۔ اب تک اس پارٹی کا کوئی امیدوار پارلیمنٹ کے لیے منتخب نہیں ہوا ہے مگر ہر الیکشن میں ایک طرف تو ان کے ووٹوں کے تناسب میں اضافہ ہونے لگا ہے، دوسری جانب مقامی کونسلوں کے انتخابات میں ان کے امیدواروں نے کامیابی حاصل کرنی شروع کر دی ہے۔ اس صورتِ حال کو اعتدال پسند انگریز تشویش کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر واقعی نیشنل پارٹی نے قابل لحاظ کامیابی حاصل کرنی شروع کر دی تو کیا ہوگا؟

میں فٹ پاتھ پر چپ چاپ کھڑا تھا اور جلوس کو دیکھ رہا تھا جو ابھی قدرے فاصلے پر تھا۔ جلوس زیادہ بڑا نہیں تھا۔ کوئی ہزار کے قریب افراد رہے ہوں گے۔ دراصل شہر میں مقامی کونسل کے انتخابات منعقد ہونے والے تھے اور یہ جلوس نیشنل پارٹی کے امیدواروں کی حمایت میں نکالا گیا تھا۔ جلوس میں شامل افراد نے اپنے ہاتھوں میں بینرز اور پلے کارڈز اٹھا رکھے تھے جن پر مختلف نعرے درج تھے۔

''بلیکیز گو ہوم۔''

''برطانیہ کو سفید رکھو۔''

میں حیرت سے ان پلے کارڈوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان پر درج عبارتوں کو پڑھ رہا تھا اور نعروں کو سن رہا تھا جو جلوس میں شامل افراد زور زور سے لگا رہے تھے۔ لیکن میری نگاہ میگی پر جمی ہوئی تھی جو جلوس کی اگلی صف میں تھی اور اس کے ہاتھ کے پلے کارڈ پر موٹے موٹے حروف میں درج تھا۔

''کالوں! اپنے گھر واپس جاؤ۔'' میگی بار بار نعرے بھی لگا رہی تھی۔ جوشِ جذبات سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور میں ساکت وصامت کھڑا سوچ رہا تھا۔

'کیا یہ واقعی میگی ہے؟'

جلوس اب بالکل قریب آ گیا تھا اور میرے سامنے سے گزر رہا تھا۔ میرے کانوں میں سنسناہٹ ہو رہی تھی اور آنکھوں میں جلن۔ مگر میری جلتی ہوئی آنکھیں میگی پر مرکوز تھیں جو زور زور سے ہاتھ ہلا کر نعرے لگا رہی تھی اور قدم بہ قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ غنیمت یہ ہوا کہ اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ کچھ دیر میں جلوس آگے بڑھ کر دائیں جانب والی سڑک پر مڑ گیا۔

میں پتھر کی طرح بے جان سا فٹ پاتھ پر کھڑا رہا۔

حیرت... حیرت... یہ میں نے کیا دیکھا ہے؟ کیا جو کچھ دیکھا ہے، واقعی وہی دیکھا ہے؟ وہ عورت واقعی میگی ہی تھی جسے میں کئی برسوں سے جانتا ہوں۔ کیا واقعی جانتا ہوں؟ پہچانتا ہوں... چہروں کے معاملے میں ہم ہمیشہ دھوکا کھاتے ہیں۔ ہم جن کے ساتھ برسوں رہتے ہیں جن سے ہمارے بے حد قریبی روابط ہی نہیں، رشتے بھی ہوتے ہیں اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم انہیں پہچانتے ہیں۔ خوب اچھی طرح جانتے ہیں لیکن پھر یوں ہوتا ہے کہ ایک لمحہ آتا ہے... ایک نازک سا اہم لمحہ! تب اچانک ہم پر منکشف ہوتا ہے کہ ہم بالکل ناواقف تھے، انجان تھے۔ شاید لوگوں کے پاس ایک سے زیادہ چہرے ہوتے ہیں جنہیں وہ وقتِ ضرورت اپنے شانوں پر رکھ لیتے ہیں۔ اجنبی، انجان اور بالکل نئے چہرے! کیا میگی کے پاس بھی ایک ایسا ہی چہرہ تھا جسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا؟

حیرت اور ایک انجان سی بے کسی میرے رگ و پے میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔ میگی تو بہت خوش مزاج نظر آتی تھی۔ لگتا تھا کہ بہت فراغ دل اور روادار ہے۔ رنگ و نسل کے معاملوں پر یقین نہیں رکھتی۔ مگر پھر یہ کیا تھا جو میں نے دیکھا؟

''کالوں! اپنے گھر واپس جاؤ...'' میگی کا یہ روپ بالکل نیا تھا جس سے میں واقف نہیں تھا اور میں اس عورت کے ساتھ زندگی گزارنے کے سپنے دیکھ رہا تھا۔ ایک خوب صورت گھر بناؤں گا جس میں ایک کشادہ عقبی باغیچہ ہوگا جہاں ہم پھول پھلواری لگائیں گے۔ کیونکہ ہم دونوں ہی کو پھولوں کا بہت شوق ہے۔

لیکن اس ایک لمحے میں گلاب، چنبیلی، سورج مکھی اور سیرافینا کے سارے پھول جل کر خاک ہو گئے۔

دو دن بعد فیکٹری میں میگی سے میری ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں کینٹین میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں نے میگی کے شاداب اور دل ربا چہرے کو غور سے دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

''الیکشن ہونے والے ہیں...''

''ہاں!'' میگی نے رواروی میں جواب دیا۔

''لیبر، ٹوری اور لبرل کے علاوہ بھی پانچ امیدوار میدان میں ہیں۔'' میں نے مزید کہا۔

میگی نے چائے کی چسکی لی پھر بولی۔ ''تم تو غالباً لیبر پارٹی کے امیدوار کو ووٹ دو گے، ہے نا؟ تم لوگ عموماً لیبر کو ہی ووٹ دیتے ہو۔''

''خیر ایسا نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بہت سے ایشین لبرل کو بھی ووٹ دیتے ہیں اور اب تو ٹوری کو بھی دینے لگے ہیں۔''

''لیکن اس بار لیبر پارٹی کے جیتنے کا امکان زیادہ نہیں۔ شاید ٹوری امیدوار جیت جائے۔''

میں تھوڑی دیر چپ رہا پھر آہستہ سے کہا۔ ''تم تو غالباً لبرل ڈیموکریٹک پارٹن کو ووٹ دو گی۔'' ڈیرک بارٹن نیشنل پارٹی (نیشنل فرنٹ) کے امیدوار کا نام تھا۔

میگی نے چونک کر مجھے دیکھا۔ چند لمحے دیکھتی رہی پھر ہلکے سے مسکرائی مگر چپ رہی۔

تین ہفتے بعد میں نے اپنا مختصر سا سامان سمیٹا اور بریڈفورڈ کو خیر باد کہہ دیا۔

☆☆☆

میں آہستہ سے اٹھا اور باورچی خانے پر ایک اور نظر ڈال کر دھیرے دھیرے چلتا ہوا سٹنگ روم میں آیا اور وسط میں ٹھہر کر گردوپیش میں ایک نظر ڈالی۔ بجلی کی تیز روشنی میں پورا کمرا جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ ایک ایک شے روشن تھی اور بے حد مسرور نظر آ رہی تھی۔ میری نظر چاروں طرف گھومتی ہوئی یکا یک گلدان پر ٹھہر گئی۔ گلدان میں ڈیفوڈل سجے تھے۔ سرخ، سفید، نارنجی اور نیلے۔ یکا یک سرخ ڈیفوڈل قہقہہ مار کر ہنسا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' ڈیفوڈل نے معاً کہا۔ ''حیران ہو رہے ہو۔ ہے نا... کہ یہ کیا ہوا؟ یہ اس کمرے کی، اس گھر کی کایا پلٹ کیسے ہو گئی؟ یہ اتنی رونق کہاں سے آ گئی؟ ہم ڈیفوڈل، ابھی کچھ دیر پہلے تک فلورسٹ کی دکان پر سجے تھے، اب تمہارے کمرے میں اس گلدان کی زینت ہیں۔ آخر یہ سب ہوا کیسے؟ تم جانتے ہو، خوب جانتے ہو۔ ہمیں یہاں کون لایا ہے۔ کس نے اس کمرے کی ایک ایک شے کو سجایا سنوارا ہے۔ جانتے ہو نا!''

پھر میری نظر کاز اویہ بدلا اور گردوپیش میں گھومتا ہوا، دیوار پر سجی ایک تصویر پر جم گیا۔ تصویر میں ایک باغ کا منظر تھا جہاں ڈھیرے سارے گلاب کھلے ہوئے تھے اور ایک چھوٹی سی بچی ہاتھ بڑھا کر ایک پھول کو چھو رہی تھی۔ یکا یک اس پیاری سی بچی نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور زور سے ہنسی۔

''حیران ہو رہے ہو... ہے نا؟'' بچی کی مترنم آواز میرے کانوں میں گونجی۔ ''لیکن اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ یہی تو ایک کمی ہے، تمہاری زندگی میں۔'' اس نے پھول کی طرف اشارہ کیا۔ ''پھول... تمہارے پاس سب کچھ ہے لیکن پھول نہیں ہے۔''

بچی ایک بار پھر ہنسی۔ ساتھ سارے کے سارے ڈیفوڈل بھی ہنسے۔ پھر دیوار پر آویزاں تصویریں بھی ہنسیں پھر ہر شے ہنسنے لگی۔ پورا کمرا ان کی ہنسی کی گونج سے یوں گونجنے لگا جیسے میرا کمرا ایک بند گنبد ہو۔ ان کی ہنسی کی آواز... بہ تدریج بلند ہوتی گئی۔ اس کی گونج بڑھتی گئی۔ میں حیران و پریشان اور کچھ شکستہ سا، کچھ ہارا ہوا سا ایک ایک شے کو دیکھتا رہا۔ ہاں، یہ گلدان میں نے عرصہ پہلے بڑے شوق سے خریدا تھا لیکن آج تک کبھی توفیق نہ ہوئی کہ میں ان میں پھول بھی سجاتا۔ کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ کیسے جاتا، یہی تو ایک کمی تھی میری زندگی میں۔ میں نے چاروں طرف نظر ڈالی اور آہستہ سے آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

میرے ذہن میں انتشار تھا اور خیالات کا ہجوم اور ایک ناقابلِ فہم کم مائیگی اور محرومی کا احساس...! گو پہلے بھی اکثر احساس ہوا تھا مگر اتنی شدت سے نہیں۔ اس وقت پہلی بار مجھے شدت سے احساس ہوا۔ میں کیا ہوں؟ میری زندگی کیا ہے؟ کب تک اس طرح رہوں گا؟ وہ سارے سپنے جو میں نے اپنے دل میں پال رکھے تھے، ایک ایک کر کے مر گئے۔ آج

تک بھٹکتا رہا ہوں مگر کس جستجو میں؟ اور میری کوئی جستجو ہے بھی یا نہیں؟ میں اس پرندے کی طرح تنہا ہوں، جو ڈار سے بچھڑ گیا ہو اور اکیلا، بے آسرا اڑتا پھر رہا ہو... اور یہ بھی نہ جانتا ہو کہ اسے جانا کہاں ہے؟ اس کی منزل کہاں ہے؟ کوئی منزل ہے بھی یا نہیں؟ میں نے جو یہ زندگی اب تک گزاری ہے، کتنی بے مقصد ہے، کتنی بے مقصد ہے۔ کون ہے میرا؟ روشن اور زینت اور چچا نصیر الدین اور دوسرے رشتے دار... میں ان سب سے دور بھاگا تھا۔ اب وہ سب لوگ جنہوں نے مجھے سہارا دیا تھا، اس بات سے قطعی لاعلم ہیں کہ میں کہاں ہوں... کس حال میں ہوں... لیکن کیا حاصل ہوا؟ کچھ بھی نہیں۔ میں حاصل کی جستجو میں لاحاصل کے پیچھے بھاگتا رہا۔ یہ جانے سمجھے بغیر کہ جس ''حاصل'' کا تصور میرے ذہن میں ہے، وہ ''لاحاصل'' کے سوا کچھ نہیں۔ اور اگر میں اس ڈگر پر یونہی چلتا رہا تو کیا ہوگا۔ آگے چل کر کیا ہوگا، جب میں بوڑھا ہو جاؤں گا؟ اعضا میں اضمحلال آجائے گا۔ قویٰ جواب دینے لگیں گے، تنہائی زہر بن جائے گی، تب کیا ہوگا؟ تب کیا ہوگا؟

یہ خیال بے حد دہشت ناک تھا۔ میں نے اپنے سارے بدن میں ایک جھرجھری سی محسوس کی۔ نہیں، نہیں... ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ بے شک میں جوان نہیں رہا لیکن ابھی بوڑھا بھی نہیں ہوا ہوں۔ چھیالیس سال کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہوتی۔ ابھی اعصاب مضبوط ہیں۔ بدن میں توانائی ہے۔ ابھی بہت وقت ہے میرے پاس۔ مجھے اس تنہائی، اس اکیلے پن کا علاج کر لینا چاہیے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اب وقت آگیا ہے۔ مزید تاخیر مناسب نہیں۔

کیا رگھونندن ٹھیک کہتا ہے؟

''ہاں۔'' میں نے اپنی آواز احساس کے اندر دور تک گونجتی ہوئی سنی۔ وہ غلط نہیں کہتا، شاید ایسا ہوتا ہے۔ پہلے بھی ہوا ہے۔ آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ کچھ لڑکیاں ہوتی ہیں جو بہ وجوہ زیادہ عمر کے مردوں کو پسند کرتی ہیں۔ اگر عندلیب فرض کرو، مجھے پسند کرتی ہے تو یہ کوئی ایسی تعجب کی بات نہیں اور اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ سب کچھ کیوں کرتی؟ دفتر میں وہ جس طرح میرے ساتھ پیش آتی ہے اور پھر یہ میرا فلیٹ... یہ سب اس نے کیوں کیا؟ کیا ضرورت تھی؟ کوئی نہ کوئی سبب تو ضرور ہوگا۔ کیا سبب ہو سکتا ہے؟ رگھونندن کا خیال غلط نہیں ہے اور پھر بیگم فرحت بھی تو یہی کہتی ہیں۔ ہاں، ٹھیک ہے، وہ دونوں غلط نہیں ہو سکتے۔ میں نے طے کر لیا اور یکایک آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے تصور میں دیکھا۔ عندلیب کو اپنے گھر میں چلتے پھرتے دیکھا۔ اس نے شلوار جمپر پہن رکھا ہے۔ دوپٹا بے پروائی سے گلے میں جھول رہا ہے۔ بال کچھ بے ترتیب ہیں۔ وہ جھاڑن ہاتھ میں لیے کمرے کی ایک ایک شے کو صاف کر رہی ہے۔ ایک ذمے دار، گھر گرہست، سگھڑ عورت۔ باورچی خانے سے سالن کی اشتہا انگیز خوشبو آرہی ہے۔ دو پیازہ... اسے معلوم ہے کہ مجھے دو پیازہ بہت پسند ہے۔ میں صوفے پر بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا ہوں اور عندلیب کو دیکھ رہا ہوں۔ دفعتاً عندلیب گردن موڑ کر میری طرف دیکھتی ہے اور مصنوعی غصے سے کہتی ہے۔

''خوامخواہ صوفے پر بیٹھے ہی رہیں گے یا کچھ کام بھی کریں گے؟''

''کیا کام ہے؟'' میں ذرا کاہلی سے کہتا ہوں۔

''چاول ختم ہونے والے ہیں۔ دھنیا پاؤڈر، دہی اور پیاز بھی لانا ہے۔ جا کر لے آئیں۔''

''اچھی بات ہے۔ جاتا ہوں۔'' میں مزید کاہلی سے جواب دیتا ہوں۔

''اور آم اور لیمن کا اچار بھی لے لیجیے گا۔''

''آم اور لیمن کا اچار۔'' میں حیرت کا اظہار کرتا ہوں۔

''وہ کیوں...؟''

''اوں ہوں، پوچھتے کیوں ہیں۔'' عندلیب ذرا شرما کر کہتی ہے۔ ''بس لے آئیں۔''

آم اور لیمن کا اچار... میں ٹھنڈی سانس لیتا ہوں۔

پھر میں نے ایک سگریٹ جلائی اور کمرے میں چاروں طرف نظر ڈالی۔ خاموش اور خالی کمرا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ مگر یہ پورا منظر جو میں نے ابھی ابھی جاگتے میں دیکھا، کتنا خوب صورت ہے۔ کہکشاں کے رنگوں سے معمور، حیات افروز! عندلیب اور میں... اور کیا چاہیے؟ نہیں، نہیں... اور کچھ نہیں چاہیے۔ اس کے بعد اور کسی تمنا کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔

مجھے اس خواب کو پورا کرنا ہے۔

☆☆☆

اگلے کچھ دن بے حد کشمکش کے تھے۔ میں بے حد الجھا ہوا تھا۔ ذہن میں ایک الجھن سی تھی۔ ایک یقین، ایک بے یقینی... ایک شادمانی، ایک مایوسی۔ میں تصور ہی تصور میں نئے نئے منصوبے بھی بنا رہا تھا لیکن ذہن میں، دل میں ایک شک کا شبہ بھی تھا۔ میری حالت اس مسافر کی سی تھی جو دوراہے پر کھڑا ہو اور طے نہ کر پا رہا ہو کہ کدھر جائے۔ دائیں طرف یا بائیں طرف! کچھ ایسی ہی کیفیت میری تھی۔ فرض کرو، داغورے اور بیگم فرحت کا قیاس غلط ہو۔ ہو سکتا ہے، جس لگاؤ اور خوش التفاتی کا مظاہرہ عندلیب کرتی ہے، وہ اس کے مزاج کا حصہ

ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے افراد کے ساتھ بھی اس کا طرزِ عمل یہی ہو۔ تو اس صورت میں اگر میں نے صرف مدعا زبان پر لایا تو کیا ہوگا... کیا کہے گی وہ؟ کتنی ذلت اور شرمندگی کا سامنا ہوگا۔ جب بھی یہ خیال آتا، میرا دل کانپ جاتا۔ دہشت گھیر لیتی۔ اگر ایسا ہوا تو کیا ہوگا؟ میں کیا کروں گا، کیا پھر عندلیب کا سامنا کر سکوں گا؟ تاہم یہ کیفیت چند لمحے رہتی پھر خیال کروٹ لیتا۔ نہیں، میں خوامخواہ ڈر رہا ہوں۔ داغورے کا خیال غلط نہیں۔ یقیناً عندلیب کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ ہے۔ ورنہ اس کا رویہ مختلف ہوتا۔ دفتر میں اور لوگ بھی تو ہیں۔ ان کے ساتھ اس کا طرزِ عمل قطعی مختلف ہے۔ ایک تکلف اور فاصلہ قائم رکھتی ہے۔ اور یہ دوسرا خیال مجھے سہارا دیتا۔ دل میں ایک تقویت سی پیدا کرتا اور شاید یہ اس دوسرے احساس کا ہی نتیجہ تھا کہ میں نے کئی منصوبے بنا ڈالے۔ کئی باتیں دل ہی دل میں طے کر لیں۔ گھر خالی خالی سا ہے۔ متعدد اشیا کی ضرورت ہے۔ وہ سب خریدوں گا۔ ویسے بھی اس فلیٹ میں کچھ ہی دن رکنا ہے۔ کسی مضافاتی علاقے میں اپنا مکان خرید لوں گا۔ میں نے گھر کے ایک پُرسکون اور خوب صورت علاقے کا انتخاب بھی کیا۔ قریبی جیولر کے شوکیس میں سجی ایک خوب صورت انگوٹھی بھی پسند کر لی جو صرف آٹھ سو پونڈ کی تھی مگر عندلیب کے خوب صورت ہاتھ کی مخروطی انگلی کے لیے آٹھ سو پونڈ کچھ بھی نہیں ہیں۔ میں نے طے کیا۔

عندلیب سے پانچ دن ملاقات نہیں ہوئی۔ جن لوگوں کے ساتھ اس کا قیام تھا، ان کے کسی عزیز کے یہاں کوئی اہم تقریب تھی جو کارڈف میں رہتا تھا۔ عندلیب ان کے ساتھ دفتر سے چھٹی لے کر کارڈف چلی گئی۔ چھٹے دن واپس آئی لیکن دفتر نہیں آئی۔ ساتواں دن تھا۔ کہتے ہیں سات کا ہندسہ برکت ہوتا ہے۔ کیا واقعی ایسا ہے؟

شام کا وقت تھا۔ اس دن موسم بہت خراب تھا۔ صبح سے بادل گھرے ہوئے تھے۔ شام ہوتے ہی ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی۔ میں صوفے پر چپ چاپ بیٹھا تھا اور ہر چند کہ ٹیلی ویژن چل رہا تھا اور میری نگاہ بہ ظاہر اسکرین پر ہی جمی ہوئی تھی، ذہن کہیں اور تھا۔ زیادہ سچ یہ ہے کہ عندلیب کی فکر تھا۔ عندلیب... عندلیب... کہاں ہوگی وہ؟ کیا کر رہی ہوگی؟ مختلف خیالات ذہن میں آرہے تھے، جا رہے تھے۔ کتنی دیر تک انتظار کرنا ہوگا؟ کب اس سے سامنا ہوگا؟ اور جب سامنا ہوگا تو میں کیا کروں گا؟ زبان تو کھولنا ہے لیکن کیسے کہوں گا؟ مناسب، موزوں الفاظ کا انتخاب کتنا مشکل کام ہے۔ اس بات کا انکشاف اس وقت پہلی بار مجھ پر ہوا۔

اس وقت معاً دروازے پر دستک ہوئی۔

میں نے دروازہ کھولا۔ سامنے عندلیب کھڑی تھی۔

میں چپ چاپ، مُہم بکم اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

اس نے پیازی رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ دوپٹا بھی اسی رنگ کا تھا۔ اس کے ہلکے سے گھنگریالے بالوں کے دو چار آوارہ بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ آنکھوں کی یہ مسکراہٹ... یہ مسکراہٹ... ایسا لگتا تھا کہ کہیں بہت دور اندھیرے میں ایک جگنو چمک رہا ہے۔ میرے خدا... اور یہ پیازی رنگ... پیازی رنگ... ایسا کیوں ہے؟ ابھی میں گم صم کھڑا ہی تھا کہ وہ ذرا شوخی سے بولی۔

''ہیلو...''

میں یک لخت زور سے چونکا... ''ہیلو۔''

''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ کیا اندر آنے کے لیے نہیں کہیں گے؟''

میں اور بھی سٹپٹا گیا۔ ''اوہ سوری... آؤ، اندر آؤ۔''

عندلیب کمرے میں آئی۔ اس نے ایک حیرت بھری مگر مسرور نظر ڈالی۔ کچن اور باتھ روم میں بھی جھانکا۔ میں اس دوران صوفے پر بیٹھا چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔ واپس آکر اس نے تعجب سے دیکھا۔ ''لگتا ہے آپ نے فلیٹ کا اچھا خاصا خیال رکھا ہے۔''

''ہاں۔'' میں ذرا جھینپ کر ہنسا۔ ''ڈر لگتا تھا۔''

''ڈر! وہ کیوں...؟'' وہ حیرت سے بولی۔

''بھئی...'' میں ذرا گڑبڑا گیا۔ ''میں سوچتا تھا، تم آؤ گی اور چیزیں پھر بے ترتیب پاؤ گی تو...'' میں بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گیا۔

اس نے مسکرا کر ایک بار پھر چاروں طرف نظر ڈالی۔

کچھ دیر ٹھہر کر میں نے کہا۔ ''کارڈف میں تم نے پانچ دن لگا دیے؟''

''ہاں۔'' وہ دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''تقریب تھی نا۔ کئی رسمیں تھیں جن کا پورا کیا جانا ضروری تھا اس لیے رکنا پڑا۔ پھر ایک بات اور بھی ہے۔ ان سے جب تفصیلی باتیں ہوئیں تو پرانی باتیں نکلیں۔ پرانے لوگوں کا ذکر ہوا تو بڑا ہی دلچسپ انکشاف ہوا۔ وہ یہ کہ صاحب خانہ کی اہلیہ سے ہماری کچھ دور کی رشتے داری بھی ہے۔''

''واقعی...؟''

''ہاں، حالانکہ ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میری

اماں نے یا کسی اور رشتے دار نے کبھی ان کا کر بھی نہیں کیا۔ میرے لیے یہ انکشاف بے حد دلچسپ اور حیرت افزا تھا کہ یہاں انگلستان میں میرا دور کا ہی سہی، کوئی رشتے دار بھی موجود ہے۔"

"یہ تو واقعی بڑی دلچسپ بات ہے۔" میں نے یونہی رواروی کے انداز میں کہا۔

قدرے توقف کے بعد عندلیب نے کہا۔ "آج موسم کتنا خراب ہے۔ بارش ہے کہ رکتی ہی نہیں۔" وہ رکی پھر کہنے لگی۔ "میں چائے بناتی ہوں۔ آپ پئیں گے؟"

"نہیں، میں نے ابھی پی ہے۔ تم اپنے لیے بنالو۔"

عندلیب اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میں صوفے پر خاموش بیٹھا ہوا کچن سے آنے والی آوازیں سنتا رہا اور اپنے احساس کی ہلچل پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ چھ دن... چھ دن سے میں اس کا انتظار کررہا ہوں۔ بے قرار ہوں۔ منصوبے بناتا رہا ہوں۔ ان گنت باتیں، کتنے ہی سوالات میرے دل میں مچلتے رہے ہیں۔ لیکن اب وہ آگئی ہے تو میری یہ حالت کیوں ہے؟ دل کیوں بیٹھا جارہا ہے؟ وہ ساری باتیں جو میرے دل میں ہیں، اب کیوں گڈمڈ ہوگئی ہیں۔ کیا کروں... کیا کروں؟ کچھ تو کرنا ہوگا۔ یوں چپ رہنے اور اپنے آپ سے الجھتے رہنے سے تو بات نہیں بنے گی۔ ہاں، مجھے ہمت کرنی چاہیے۔ دل مضبوط کرنا چاہیے۔ میں نے زور زور سے کئی سانسیں لیں۔ اپنے آپ کو دلاسا دینے کی کوشش کی۔ پھر ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا کیونکہ عندلیب واپس آرہی تھی۔

میں نے یونہی خوامخواہ مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

جواب میں عندلیب بھی مسکرائی اور چائے کی چسکی لی۔ پھر سوالیہ انداز میں بولی۔ "کیا سوچ رہے ہیں؟"

"کک... کچھ نہیں۔" میں گڑبڑا گیا۔

"تو پھر یہ پریشان سے کیوں لگ رہے ہیں؟ اگر کوئی بات ہے تو بتائیے۔"

میں خوامخواہ مسکرایا۔ پھر یونہی بات شروع کرنے کی نیّت سے کہا۔ "تمہاری اماں کیسی ہیں...؟"

"اچھی ہیں۔ پچھلے دنوں کچھ نزلہ کھانسی کی شکایت ہوئی تھی مگر اب ٹھیک ہیں۔"

"خط تو آتا ہوگا؟" یہ بات بھی میں نے محض رواروی میں کہی۔

"ارے نہیں۔" وہ ہنس کر بولی۔ "یہ ڈیجیٹل کا زمانہ ہے۔ اب خط کا رواج کم ہورہا ہے۔ لوگ بٹن دبانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ میں ہر تیسرے دن اماں کو فون کرکے خیریت معلوم کرتی ہوں۔" وہ کچھ دیر کے لیے رکی پھر اضافہ کیا۔

"آپ کے پاس تو غالباً خط آتے ہوں گے۔ ہے نا؟"

میرے دل پر معاً ایک گھونسا سا لگا۔ خط... مجھے کون خط لکھے گا؟ میں تو ایک گمشدہ آدمی ہوں۔ برسوں بیت گئے۔ ڈاکیا اکثر آتا ہے لیکن جنک میل یا بلوں کے سوا اور کچھ نہیں لاتا۔ پیچھے وطن میں کسی کو یہ علم ہی نہیں کہ میں کہاں ہوں؟ اور میں نے کبھی کسی دوست تک کو اپنے بارے میں اطلاع نہیں دی، مبادا عزیزوں کو معلوم ہوجائے۔ تو پھر مجھے کون خط لکھے گا؟ کون خیریت پوچھے گا؟ میں پلک جھپکائے بغیر حیرت سے عندلیب کو دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اپنے آپ پر قابو پایا اور ذرا اطمینان سے جھوٹ کا سہارا لیا۔ "ہاں، کبھی کبھار، زیادہ تر تو میں بھی فون ہی کرتا ہوں۔"

عندلیب نے چائے کا ایک گھونٹ لیا پھر کہنے لگی۔ "آپ نے اپنے والدین کے بارے میں تو خیر بتایا تھا لیکن خاندان کے بارے میں کبھی کچھ زیادہ نہیں بتایا۔"

"کیا بتاؤں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ماں باپ تو خیر جلدی چلے گئے تھے۔ رہ گئے رشتے دار تو تمہاری طرح میرے رشتے دار بھی بہت کم ہیں۔ اور ان سے تعلقات بھی بس برائے نام ہیں۔"

"آپ کے والد صاحب کیا کرتے تھے؟" عندلیب نے یہ بات غالباً محض گفتگو جاری رکھنے کے لیے کہی۔

"مجھے کچھ ٹھیک ٹھیک یاد نہیں۔ کیونکہ بہت چھوٹا تھا جب ان کا انتقال ہوا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ غالباً کسی قسم کی نجی ملازمت میں تھے۔" میں رکا پھر ہنس کر اضافہ کیا۔ "اس معاملے میں ہم دونوں ہی کی قسمت ایک جیسی ہے۔"

"کیا مطلب...؟" عندلیب حیرت سے بولی۔

"باپ کے سایۂ شفقت سے ہم دونوں ہی محروم رہے، کم یا زیادہ۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

میں نے دیکھا۔ عندلیب یکایک چونکی۔ اس کا چہرہ جو لحہ بھر پہلے پھول کی طرح شاداب نظر آرہا تھا، معاً بجھ سا گیا۔ اس نے قدرے شکایت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر پست لہجے میں بولی۔ "نہیں، ایسا نہیں ہے۔"

میں زبان سے کچھ کہے بغیر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

کچھ دیر بعد اس نے زبان کھولی۔ اس کی آواز میں تلخی اور شکایت کا عنصر تھا۔ "میں نے تو اپنے باپ کو دیکھا ہی نہیں۔"

کمرا یکایک ایک خاموشی میں ڈوب گیا۔ ایک غم ناک سکوت چاروں طرف مسلط ہوگیا۔ عندلیب نے منہ پھیر لیا اور کھڑکی سے باہر دور تک پھیلی تاریکی کو دیکھ رہی تھی جبکہ میری نظر اس کے نصف نظر آتے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ میرے دل میں ایک پچھتاوا بھی تھا اور احساسِ ندامت بھی۔ میں نے شاید غیر ارادی طور پر ایسی بات کہہ دی تھی جو نہیں کہنی تھی۔ چند لمحے یہی کیفیت رہی۔ پھر میں نے پست آواز میں کہا۔ "عندلیب! مجھے افسوس ہے کہ انجانے میں میں نے تمہارا دل دکھایا، معافی چاہتا ہوں۔ آئندہ احتیاط رکھوں گا۔"

عندلیب نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور پژمردگی سے مسکرائی لیکن کچھ بولی نہیں۔

"تم شاید اپنے باپ کے بارے میں بات کرنا پسند نہیں کرتیں؟" میرا لہجہ نرم اور ہمدردانہ تھا۔

"جس شخص کو میں نے دیکھا ہی نہیں، اس کے بارے میں کیا بات کروں۔"

عندلیب کے لہجے میں کڑواہٹ تھی اور ایک ایسا تاثر جس میں حقارت اور غصے کا ہلکا سا عنصر تھا۔ میں نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو کسی حد تک تاریک ہوگیا تھا۔ آنکھوں سے برہمی جھانک رہی تھی۔ کیا بات ہے؟ آخر ایسا کیا ہے کہ عندلیب اپنے والد کے ذکر پر ناخوش ہوجاتی ہے؟ ایک نفرت اس کے رویّے سے جھانکنے لگتی ہے۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں دیکھا۔ باپ آخر باپ ہوتا ہے۔ بچے اگر اس سے ناخوش بھی ہوں تو بھی اس کے تئیں اچھے احساسات کا اظہار کرتے ہیں لیکن عندلیب کا طرزِ عمل بالکل برعکس ہے۔ آخر کیوں؟ کوئی وجہ تو ہوگی۔ کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ میں انتظار کرتا رہا لیکن عندلیب چپ رہی تو میں نے خود ہی لب کھولے۔

"تم اپنے والد کے بارے میں باتیں کرنا شاید پسند نہیں کرتیں...؟"

عندلیب نے افسردہ نظروں سے میری طرف دیکھا مگر چپ رہی۔

"مگر بھئی ان کا تو انتقال ہوچکا اور وہ بھی اس وقت جب تم بہت چھوٹی تھیں۔ تم نے تو انہیں دیکھا ہی نہیں۔" میں نے مدھم آواز میں کہا۔

عندلیب پھر بھی خاموش رہی۔ قدرے انتظار کے بعد میں نے اضافہ کیا۔

"دیکھو عندلیب، ہمارے یہاں بہت پرانے زمانے سے ایک دستور چلا آرہا ہے کہ مرنے والے کے بارے میں اچھے کلمات استعمال کیے جاتے ہیں اور اس کی برائیوں کو نظرانداز کردیا جاتا ہے لیکن تم..." میں بات ادھوری ہی چھوڑ کر چپ ہوگیا۔

"مگر مجھے یقین نہیں ہے۔" آخرکار عندلیب نے کہا۔ اس کا لہجہ تلخ تھا۔

"کس بات کا یقین نہیں ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"یہی کہ میرے باپ کا انتقال ہوچکا ہے۔"

"کیا؟" میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ "تمہیں یقین نہیں ہے۔ مگر کیوں؟ تم نے تو کہا تھا کہ وہ مرچکے ہیں پھر..." میں نے چپ ہوکر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

عندلیب کچھ دیر خاموش رہی اور سوچتی رہی۔ پھر وہ آہستہ سے اٹھی اور سست قدموں سے چلتی ہوئی کھڑکی تک چلی گئی۔ باہر بہ دستور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ چاروں اور افسردہ، بے کیف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ بہت دور، مکانوں کے دوسری جانب ایستادہ چند بلند درخت کھڑے چپ چاپ بارش میں بھیگ رہے تھے۔ عندلیب چند لمحے خاموشی سے اس اداس، تاریک منظر کو دیکھتی رہی۔ وہ شاید بہت دل گرفتہ ہورہی تھی۔ ماضی ہمیشہ خوب صورت اور خوش کن نہیں ہوتا۔ کہیں کہیں بہت ٹیس بھرا ہوتا ہے۔ شاید اس وقت ایسا ہی ہوا تھا۔ انجانے میں، میں نے اس کے ان زخموں پر نمک چھڑک دیا تھا جو کبھی نہیں بھرتے۔ یہ احساس مجھے شدید پشیمانی میں مبتلا کررہا تھا۔ لیکن اس سے قبل کہ میں زبان کھولتا اور معافی مانگتا، عندلیب یکایک گھومی اور میری طرف دیکھ کر پست آواز میں کہنے لگی۔

"میں ثابت نہیں کرسکتی لیکن بچپن سے میں اپنی اماں سے یہی سنتی آئی ہوں کہ میرے باپ کا ایک حادثے میں انتقال ہوگیا تھا۔ ابتدا میں، میں نے اس پر یقین بھی کرلیا تھا۔ شاید اس احساس کے باعث کہ مجھے اپنے باپ سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ میں نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ زندہ ہو یا مرچکا ہو، مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن جب میں بڑی ہوئی، شعور سنبھالا تو پھر میرے ذہن میں کچھ شکوک و شبہات پیدا ہوئے۔"

"کیوں...؟" میں نے گہرے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

عندلیب چند لمحے چپ رہ کر سوچتی رہی پھر بولی۔ "دراصل میں نے چند ایک پڑوسیوں اور رشتے داروں سے کچھ ایسی باتیں سنیں جو خوشگوار نہیں تھیں اور شبہات پیدا کرتی تھیں۔ پھر چند ایک سوال بھی تھے جو میرے ذہن میں کبھی نہیں ابھرے تھے مگر اب پیدا ہوئے۔ مثلاً یہ کہ میرے باپ کی قبر کہاں ہے؟ کراچی بے شک بڑا شہر ہے اور وہاں کئی قبرستان ہیں لیکن میری اماں کو یا کسی بھی رشتے دار کو یہ علم نہیں کہ میرے باپ کو کہاں دفن کیا گیا تھا۔ اماں کا کہنا تھا کہ میرے باپ کے رشتے داروں نے انہیں بالکل لاعلم رکھا تھا بلکہ زیادہ سچ یہ ہے کہ وہ میرے باپ کے زیادہ رشتے داروں سے واقف ہی نہیں تھیں۔ صرف دو تین کو جانتی تھیں۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ

باپ کا انتقال ہو چکا تھا تو، اول یہ کہ اماں نے دوسری شادی کیوں نہیں کی؟ دوم یہ کہ انہوں نے اپنا گھر کیوں چھوڑا؟ کیوں انہوں نے نئی کراچی کی ایک تقریباً گمنام سی گلی میں سکونت اختیار کی؟ کیونکر رشتے داروں سے ملنا جلنا بند ہوا؟ یہ سوالات ایسے تھے جو میرے ذہن میں الجھن پیدا کرتے تھے لیکن ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ آج بھی میرے پاس کوئی حتمی ثبوت یا دلیل نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے، میرا باپ واقعی مر چکا ہو لیکن نہ جانے کیوں، مجھے یقین کرنے میں کچھ تامل ہے۔''

میرے ذہن میں دو ایک سوال مچلے لیکن میں خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد عندلیب نے خود ہی کہا۔

''میری ماں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں اکبر صاحب۔ آپ جانتے ہیں ہر شخص کے ان گنت سپنے ہوتے ہیں، خاص طور پر نوجوانی میں اور وہ ان کے پھلنے پھولنے کا متمنی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میری ماں کے بھی بہت سارے خواب رہیں ہوں گے۔ ایک اچھا محبت کرنے والا شوہر، پھول جیسے دو تین بچے، ایک اچھا گھر اور ایک خوب صورت، مسرتوں سے معمور زندگی...! لیکن ان کا کوئی خواب پورا نہیں ہوا بلکہ سارے خواب اس وقت مر گئے، جب ان کے پھلنے پھولنے کا وقت بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ اور ایسا صرف ایک شخص کی وجہ سے ہوا۔ صرف ایک شخص جو بدقسمتی سے میرا باپ ہے۔''

''مجھے یہ سب سن کر واقعی افسوس ہوا۔'' میری سمجھ میں نہ آیا کہ اور کیا کہوں۔

عندلیب نے شاید میری بات پر توجہ نہیں دی۔ وہ اپنی رو میں کہتی رہی۔ ''میری اماں ان دنوں کالج میں پڑھ رہی تھیں۔ مجھے جو آدھی ادھوری معلومات حاصل ہوئی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ ان کی ملاقات میرے باپ سے شادی کی ایک تقریب میں ہوئی تھی اور...''

''شادی کی تقریب میں...'' میں نے آہستہ سے پوچھا۔

''ہاں...''

''پھر... پھر کیا ہوا تھا...؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

عندلیب تلخی سے مسکرائی۔ ''ہونا کیا تھا، وہی عام سی کہانی جو اکثر فلموں میں نظر آتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب آئے ہوں گے۔ قربت زیادہ ہی بڑھ گئی ہوگی۔ ان کی ملاقاتیں عام طور پر باہر ہی ہوا کرتی تھیں۔ ہاں، کبھی کبھی جیسا کہ مجھے پتا چلا... کبھی کبھی فردوس کالونی میں بھی ہوا کرتی تھیں۔''

''فردوس کالونی میں... کہاں؟'' میں نے پست آواز میں پوچھا۔

''میری اماں کی ایک دوست ہوا کرتی تھیں، آمنہ خالہ... ان کے گھر میں۔'' عندلیب نے جواب دیا۔

میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور چپ رہا۔

قدرے توقف کے بعد عندلیب نے مزید کہا۔ ''ہاں مگر یہ ضرور ہے کہ اماں اس معاملے میں سنجیدہ تھیں۔ میرا خیال ہے کہ انہیں پورا یقین تھا کہ میرا باپ بھی سنجیدہ ہے اور یہ کہ مناسب وقت پر ان کی شادی ہو جائے گی۔ ورنہ وہ نہ ہوتا، جو ہوا۔ بہرحال پھر جیسا کہ میرا اندازہ ہے کہ وہ وقت جب آیا، جسے اماں مناسب بلکہ ''ضروری'' خیال کرتی تھیں... تو ان کی توقع پوری نہیں ہوئی۔ حالانکہ میرا گمان ہے کہ انہوں نے صرف میرے باپ کو بتایا ہوگا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ روئی ہوں۔ خدا کا واسطہ دیا ہو۔ ہاتھ جوڑے ہوں مگر ہر کوشش رائیگاں گئی ہوگی۔ میرا باپ اگر اماں کے بارے میں سنجیدہ اور مخلص ہوتا تو آج میری زبان پر یہ الفاظ نہ ہوتے مگر وہ تو ایک خود پرست، کائر اور بزدل آدمی تھا۔ اسے نہ اماں سے کوئی ہمدردی تھی اور نہ اس ننھی سی جان سے جو اس دنیا میں آنے کی منتظر تھی۔ جب اس نے دیکھا ہوگا کہ بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے تو اماں کو دھوکا دے کر غائب ہوگیا۔''

''غائب ہوگیا... مگر تم تو کہہ رہی تھیں کہ...'' میں نے تھوک نگل کر بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

''یہ تو محض میرا قیاس ہے کہ وہ غائب ہوگیا۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ مر ہی گیا ہو۔'' عندلیب نے کہا پھر چند لمحے چپ رہ کر بولی۔ ''میں اندازہ کر سکتی ہوں۔ آپ بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ پھر اماں پر کیا گزری ہوگی۔ کتنی دکھی اور بے آسرا ہوگئی ہوں گی۔ مجھے ایک بار سرسری طور پر یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اماں کو اسقاط کا مشورہ بھی دیا گیا تھا۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔'' عندلیب نے رک کر زور سے سانس لی۔ ''اس کے بعد کیا ہوا، یہ میں آپ کو بتا چکی ہوں۔ نانا اور نانی چلے گئے۔ انہیں گھر چھوڑنا پڑا۔ ذلت اور بدنامی سے بچنے کے لیے انہیں تقریباً گمنام سی زندگی گزارنی پڑی...'' عندلیب معاً چپ ہوگئی۔ شاید وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی لیکن امنڈتے ہوئے افسردہ جذبات نے زبان روک لی۔ وہ چپ ہو کر بے چارگی اور بے کسی سے میری طرف دیکھتی رہی۔

میں مہر بہ لب بیٹھا تھا، اپنے آپ سے بے خبر۔ دل و دماغ میں ایک کشمکش تھی۔ کیا کہوں؟ الفاظ کہاں ہیں؟ میری نگاہ عندلیب پر جمی ہوئی تھی۔ اس کا پورا سراپا اور اس کا چہرہ۔ چہرے کی ساخت، ہونٹ اور آنکھیں اور پیشانی اور بال۔ کئی لمحے گزر گئے لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا۔ تب یکایک عندلیب کی آواز کمرے میں گونجی۔

''کیا سوچ رہے ہیں...؟''

میں پژمردگی سے مسکرایا۔ ''میں کیا کہوں عندلیب... الفاظ ...ں میرے پاس۔ مجھے تم سے اور تمہاری ماں سے ہمدردی ...مجھ سکتا ہوں کہ وہ کیسی قیامتوں سے گزری ہوں گی۔ کتنے ...ائے ہوں گے انہوں نے۔ لیکن کیا کیا جائے، یہی زندگی ...ھوپ چھاؤں... آدمی کبھی کبھی بہت لاچار ہو جاتا ہے۔ ...ری اماں واقعی ہمت والی ہیں کہ ہر امتحان سے ثابت قدم ...یں۔ میں... میں انہیں سلام کرتا ہوں۔''

عندلیب کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ قدرے ٹھہر کر میں نے کہا۔ ''تمہاری اماں نے کیا کبھی تمہارے والد کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی...؟''

''ضرور کی ہوگی لیکن مجھے علم نہیں...'' وہ رکی پھر کچھ سوچ کر ...ے لگی۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ انہوں نے یہ جاننے کے بعد کہ میرے باپ کا انتقال ہو چکا ہے، کچھ زیادہ کوشش نہیں کی ہوگی۔''

''تم نے کبھی اپنی اماں سے اس بارے میں بات نہیں کی؟''

''نہیں، مجھے ان کا دل دکھانا بہرحال منظور نہیں تھا۔''

''لیکن تمہیں یقین ہے کہ تمہارے باپ کی موت نہیں ...ئی ہے...؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے، وہ واقعی مر چکا ہو۔ کراچی میں روزانہ ہی حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ بس ایک ...سا دل میں ہے کہ شاید...'' وہ معاً چپ ہوگئی۔

''کیا تم نے کبھی اپنے والد کو تلاش کرنے کی کوشش کی ...؟'' میں نے پست آواز میں پوچھا۔

''نہیں...'' عندلیب نے تلخ آواز میں کہا۔ ''بھلا میں ...س شخص کو کیوں تلاش کروں جس سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔'' ...پل کے لیے وہ رکی پھر یکایک بولی۔ ''ہاں، کبھی کبھی... ...بھی کبھی دل میں ایک خیال ضرور ابھرتا ہے۔ یہ کہ اگر وہ ...زندہ ہے تو ایک بار... صرف ایک بار مجھے مل جائے...''

''کیوں...؟'' میں نے خشک ہوتے ہونٹوں کو زبان سے تر کیا۔

عندلیب نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں جل ...رہی تھیں اور ہونٹ آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے۔ ''تاکہ... ...اسے بتا سکوں کہ میں اس سے کتنی نفرت کرتی ہوں۔''

☆☆☆

...میں پلیٹ فارم کے ایک تقریباً سنسان اور نیم تاریک ...ے میں پڑی چوبی بنچ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ سوٹ کیس اور ...ہینڈ بیگ میرے قریب ہی رکھے ہیں۔ میں ایک تھکی نظر چاروں طرف ڈالتا ہوں۔ پلیٹ فارم پر خلاف ...ل بہت کم چہل پہل ہے۔ کچھ لوگ اِدھر اُدھر کھڑے ہیں جبکہ کچھ لوگ بنچوں پر یا پھر انتظار گاہ میں بیٹھے ہیں۔ ریلوے کے چائے خانے میں بھی زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں۔ محض چند افراد ہیں جو چائے پینے میں مصروف ہیں... اور گو ابھی شام کی ابتدا ہی ہوئی ہے لیکن آسمان پر گہرے سیاہ بادل ٹھہرے ہونے کے سبب خاصا اندھیرا ہوگیا ہے... اور گو بارش نہیں ہو رہی لیکن بہت باریک پھوار مسلسل گر رہی ہے۔ ساری فضا دھواں دھوار اور نم ہے۔ انگلستان کے موسم کا کوئی بھروسا نہیں۔ ابھی دو گھنٹے پہلے فضا بالکل مختلف تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ موسم خاصا گرم اور روشن تھا مگر پھر اچانک شمال سے بادل آنا شروع ہوئے اور دیکھتے دیکھتے سارا ماحول بالکل بدل گیا۔

میں کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتا ہوں اور ٹھنڈی سانس لیتا ہوں۔ ابھی ٹرین کے آنے میں کوئی بیس منٹ باقی ہیں۔ میں نے سارے ضروری انتظامات کر لیے ہیں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہے کہ میں اس وقت کہاں ہوں اور کیا کرنے والا ہوں۔ اپنا استعفیٰ بذریعہ ڈاک دفتر بھیج دیا ہے جو کل صبح انہیں مل جائے گا۔ فلیٹ کی چابی اور بقایاجات مالک مکان کو واپس کر دیے ہیں۔ یہ احتیاط بہت ضروری تھی۔ کسی کو شبہ تک نہیں ہے کہ میں اس شہر کو ہی نہیں بلکہ اس ملک کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

بیس منٹ بعد ٹرین آئے گی جو مجھے مانچسٹر ائرپورٹ پہنچا دے گی۔ میری اگلی منزل ڈنمارک ہے جہاں میرا ایک عزیز دوست رہتا ہے۔ اور گو میں جانتا ہوں کہ جب اچانک میں اس کے دروازے پر دستک دوں گا اور وہ مجھے دیکھے گا تو حیران رہ جائے گا۔ تاہم میں جانتا ہوں، وہ کھلے دل سے مجھے خوش آمدید کہے گا اور میری ہر ممکن مدد کرے گا۔ میں انگلستان چھوڑ کر کیوں جا رہا ہوں؟ جبکہ میں یہاں برسوں سے رہ رہا تھا اور خوش تھا۔ لیکن یہ فیصلہ نہ کرتا تو کیا کرتا۔ مجبوری تھی اور کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ عندلیب اپنے باپ سے شدید نفرت کرتی ہے۔ ٹھیک ہے۔ اسے کرنا بھی چاہیے۔ میں اس کی اس رائے سے پوری طرح متفق ہوں کہ اس کا باپ ایک کائر، بزدل اور خود پرست آدمی تھا... اور دنیا کی تمام نفرتوں کا مستحق بھی۔ تاہم اس کے باوجود عندلیب ایک بار... ہاں صرف ایک بار اپنے باپ سے ملنا چاہتی ہے تاکہ اسے بتا سکے کہ وہ اس سے کتنی نفرت کرتی ہے۔ لیکن کیا اسے کبھی یہ موقع ملے گا؟

میں یکایک زور سے ایک سانس لیتا ہوں۔

''کیا میں اسے یہ موقع کبھی دے سکوں گا...؟''

☆

پہلا رنگ

پوراسچ

کاشف زبیر

حالیہ ممبئی ڈرامے کے پس پردہ کار فرما حقائق کی جھلک لیے، ایک انکشاف انگیز تحریر ممبئی ... جس کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ دو کروڑ کی آبادی والے اس شہر میں دو لاکھ بھکاری، ایک لاکھ طوائفیں، **20** تا **30** ہزار مسلح دہشتگرد اور سو سے زائد مافیاز سرگرم عمل ہیں. ان مافیاز میں سرفہرست ہندو انتہا پسند تنظیمیں ہیں جن کے سامنے صوبائی اور مرکزی حکومتیں بھی بے بس رہتی ہیں... اور ان کی حاشیہ بردار بھی! بھارت کے یہ سب سے طاقتور ہندو، ملک کے کسی بھی حصے میں، اقلیتوں کی خوں ریزی میں پیش پیش رہتے ہیں. ممبئی کے ماڈل فیس کی وجہ سے یہ اپنے شہر میں کارروائیوں سے گریز کرتے تھے لیکن اس بار ایک بڑے مقصد کی خاطر انہوں نے ممبئی کو ہی اپنے ڈرامے کا اسٹیج بنایا. آیئے، اس ڈرامے کے مزید ایکٹ ملاحظہ کیجیے.

فادر مکھ پانڈے نے شفقت سے مریم سائمن کو دیکھا۔ ''میری بچی... کیا تم آج رات رک نہیں سکتیں؟ کتنے دن بعد میں نے تمہیں دیکھا ہے۔ تمہاری ماما بھی تمہیں یاد کرتی ہے۔''

مریم نے فادر کے سامنے سر جھکا دیا۔ ''فادر! اوپر والے کے بعد آپ اور ماما ہی ہیں جن کی محبت اور شفقت نے جس نے مجھے زندہ رکھا اور اس مقام تک پہنچایا۔''

فادر جوزف مکھ پانڈے کو آج سے بائیس برس پہلے کا وہ وقت یاد آیا جب انہوں نے آسام کی ریاست کے علاقے ناگ پور میں عیسائیوں کی اس جلی ہوئی بستی کے ایک کھنڈر مکان سے اس بچی کو اٹھایا تھا جس میں سوائے اس بچی کے سب کچھ خاکستر ہو گیا تھا۔ بچی کے پالنے تک پہنچتے پہنچتے آگ بجھ گئی تھی۔ سب قدرت کے اس معجزے پر حیران اور آب دیدہ تھے۔ بچی بھوکی اور بے تاب تھی۔ جب فادر نے اسے اٹھایا تو وہ بے تابی سے اس کا انگوٹھا چوسنے لگی تھی۔ اس بستی پر انتہا پسند ہندوؤں نے حملہ کیا تھا اور انہوں نے پہلے تلواروں اور نیزوں سے حملہ کر کے اس بستی کے سوا سو باشندوں کا قتل عام کیا، اس کے بعد ثبوت مٹانے کے لیے تمام لاشوں اور زندہ بچ جانے والے افراد کو گھروں میں بند کر کے اس میں آگ لگا دی تھی۔

آسام کی ریاست میں مسلمان اور نچلی ذات کے ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ یہاں پر غربت اور بیماریاں عام ہیں۔ انگریزوں کے زمانے سے یہ علاقہ عیسائی مشنریوں کا گڑھ رہا ہے اور یہاں پر ان کو خاصی کامیابی بھی ملی ہے۔ عیسائی مشنری دعوے کے مطابق اس ریاست کی تیس فیصد آبادی عیسائی ہے مگر سرکار کے ذرائع کے مطابق عیسائی صرف آٹھ فیصد ہیں۔ اندرا گاندھی کے دور میں انتہا پسند ہندو... را اور دوسرے سیکیورٹی کے اداروں میں داخل ہونے لگے تھے اور ان کی نظروں میں وہ ریاستیں کھٹکنے لگی تھیں جہاں پر غیر ہندو آبادی بڑھ رہی تھی۔

سیکولرازم کے نام پر بھارت میں ڈھائی ہزار سال پرانا ذات پات کا نظام دوبارہ رائج کیا جا رہا تھا جس میں تمام مراعات صرف اعلیٰ ذاتوں کے لیے مخصوص تھیں اور نچلی ذاتوں کے پاس سوائے ذلت کے ساتھ غلام بن کر رہنے کے اور کوئی راستہ نہ ہوتا۔ مگر اب اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے لیے یہ کام آسان نہیں تھا کیونکہ اب نچلی ذات کے ہندوؤں کے پاس متبادل راستے تھے۔ وہ ہندو برادری کے دائرے سے نکل کر عیسائی اور مسلمان ہو سکتے تھے۔ اس طرح دو...

پات کے مکروہ نظام سے بچ سکتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آسام اور اس سے ملحق ریاستوں میں عیسائیت پھیل رہی تھی۔

نامساعد حالات، ہندوؤں کی دھمکیوں اور حملوں کے باوجود ان علاقوں میں عیسائیت کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔ بدقسمتی سے مسلمان نہ صرف دفاعی رویہ اپنا چکے تھے بلکہ پاکستان کے قیام کو ان کا جرم بتا بتا کر مسلم ذہنوں کو مفلوج کر دیا گیا تھا۔ ان حالات میں انہوں نے مقابلہ کرنے کے بجائے شترمرغ کے انداز میں سر ریت میں ڈال دیا تھا۔ اس لیے نچلی ذات کے ہندو عیسائی مشنریوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے تھے۔ صدیوں سے آباد شودروں کی اس بستی کے باشندوں نے کچھ عرصے پہلے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے مظالم سے تنگ آ کر علم بغاوت بلند کیا اور فادر مکھ پانڈے (جو خود ہندو سے عیسائی ہوئے تھے) کے سامنے عیسائیت قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ یہ سوا سو افراد تھے۔

اس اعلان پر اعلیٰ ذات کے ہندو تلملا اٹھے تھے۔ انہوں نے ریاستی طاقت استعمال کر کے تبدیلی مذہب کے اس عمل کو روکنا چاہا مگر اب نچلی ذات کے ہندو فیصلہ کر چکے تھے۔ انہوں نے اجتماعی طور پر عیسائیت قبول کر لی۔ یہ سب اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی غلامی کرنے والے تھے اور ان کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ اس کے باوجود کہ ان کے ہاتھ سے اگائے اناج سے پیٹ بھرنے اور ان کی عورتوں کو بلاتکلف اپنی خواب گاہوں میں لے جانے والے اونچی ذات کے ہندو... ان لوگوں کو نہ تو اپنی بستی میں آنے دیتے تھے اور نہ ہی ان کو اپنے کنوؤں سے پانی لینے دیتے تھے۔

عیسائیت قبول کرتے ہی ان لوگوں کی زندگی میں تغیر آ گیا تھا۔ مشن چرچ کی جانب سے ان کے لیے روزگار کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ان کی صدیوں سے آباد غلیظ بستی کی ازسرنو ترتیب اور تعمیر کی گئی۔ جن بچوں کے آباواجداد نے کبھی تعلیم اور اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا، ان کے سارے بچے مشنری اسکول میں داخل کر لیے گئے تھے۔ گھروں میں کھڈی کا کپڑا اور دستکاریاں بنانے کی صنعت ایک سال کے اندر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی تھی۔ ان دستکاریوں کی گلگت تک رسائی تھی۔ مشنری ادارے ایک نظم کے تحت یہ سارا کام کرتے ہیں اور ان کو مالی لحاظ سے ساری عیسائی دنیا کی مدد حاصل رہی ہے۔

دو سال میں غربت، جہالت اور تاریکی میں ڈوبی یہ بستی خوش حال، تعلیم یافتہ اور روشنی سے جگمگانے لگی تھی۔ چرچ نے بالغ افراد کے لیے تعلیمی پروگرام چلا کر ان کو لکھنے پڑھنے کے قابل بنا دیا تھا اور یہ ساری ترقی انتہا پسند ہندوؤں کو ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی جو ان لوگوں کو اب بھی اپنا غلام سمجھتے تھے۔ ان دنوں بہار اور آسام کے صوبے مسلم کش فسادات کی لپیٹ میں تھے۔ مسلمانوں کے خون کے پیاسے سرکاری سرپرستی میں سارے بھارت سے یہاں جمع ہو رہے تھے۔ کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ عیسائی بھی اس کی لپیٹ میں آ جائیں گے۔

ایک رات بستی کے لوگ بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ دو دن بعد کرسمس تھا۔ بعض گھروں میں ابھی سے اس کی تیاری شروع کر دی گئی تھی۔ وہ خطرے سے بے نیاز تھے حالانکہ اس بستی سے محض دس میل دور ایک گاؤں میں رہنے والے مسلمان گھرانوں کو چن چن کر نشانہ بنایا گیا تھا اور جب ان کے گھروں کو آگ لگائی تھی تو اس کا دھواں بستی میں دیکھا گیا تھا۔ اس وقت کسی نے سوچا نہیں تھا کہ اگلے روز یہ دھواں ان کی بستی سے اٹھ رہا ہوگا اور اسے دیکھنے کے لیے کوئی متنفس زندہ نہیں ہوگا۔

نصف رات کے بعد دو سو سے زائد مسلح افراد بستی میں گھس آئے۔ انہوں نے گھروں میں گھس گھس کر لوگوں کو نکالنا شروع کر دیا۔ آدھے گھنٹے میں انہوں نے سب کو بستی کے چوک پر جمع کر لیا۔ اس کے بعد وحشی مردوں پر ٹوٹ پڑے اور ان کو تلواروں اور نیزوں سے مارنا شروع کر دیا۔ پچاس ساٹھ افراد دیکھتے ہی دیکھتے خاک و خون میں لوٹنے لگے۔ اس کے بعد بوڑھی عورتوں کو بھی اسی انداز میں موت کے گھاٹ اتارا گیا اور آخر میں بچ جانے والی عورتوں اور کمسن لڑکیوں کی اجتماعی آبروریزی کی گئی۔ ان کو زندہ درگور کرنے کے بعد انتہا پسند ہندوؤں نے اپنی گھناؤنی کارروائی کا سراغ مٹانے کے لیے عورتوں اور بچوں کو ان کے گھروں میں بند کیا، مارے جانے والے افراد کے ٹکڑے بھی گھروں میں ڈال دیے اور پھر اس پوری بستی کو مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔ جب تک یہ شعلے مشن چرچ کی عمارت میں دکھائی دیتے قاتل وہاں سے جا چکے تھے۔

☆☆☆

فادر مکھ پانڈے... ایک کانتھ برہمن تھے۔ ہندوؤں میں یہ واحد طبقہ ہے جس کی زبان، لباس اور رہن سہن مسلمانوں جیسا ہے۔ بے شمار کانتھ عربی اور فارسی کے عالم گزرے ہیں۔ ان کو دیکھ اور سن کر ان کو ہندو سمجھنا دشوار ہے۔ دیش مکھ پانڈے بھی بچپن سے فارسی اور اردو پڑھتا آیا تھا۔ جوانی میں اس نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں ماسٹرز کیا اور ایک مشن چرچ اسکول میں استاد بن گیا۔ یہ مشن چرچ اسکول کیونکہ مسلم اکثریت کے علاقے میں تھا اس لیے وہاں نصاب میں اردو بھی شامل کی گئی تھی۔

اسکول میں دیش مکھ کی ملاقات ماریا سے ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ مگر ماریا کرسچین تھی اور دیش مکھ عیسائی نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس کشمکش میں وہ نازک سی چاہت کی زنجیر ٹوٹ گئی جو ان کے درمیان پروان چڑھ رہی تھی۔ دیش مکھ نے دل برداشتہ ہو کر اسکول چھوڑ دیا اور واپس الٰہ آباد چلا آیا۔ یہاں ماں باپ نے اس کی شادی خاندان میں کر دی اور وہ اپنی زمین کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ ایک دن اچانک اسے خیال آیا کہ کیا وجہ ہے کہ کوئی دوسرے مذہب کا شخص ہندو نہیں ہوتا ہے جبکہ ہندو مسلمان، کرسچین یا بدھسٹ ہو جاتے ہیں۔

دیش مکھ نے مذاہب کا مطالعہ شروع کر دیا۔ وہ تقابلی مذاہب پر کتابیں تلاش کر کے لاتا اور دن رات ان کے مطالعے میں مگن رہنے لگا۔ رفتہ رفتہ ماں باپ اور دوسرے اہل خانہ کو اس کی سرگرمیوں پر اعتراض ہونے لگا۔ وہ نادان نہیں تھے، سمجھ رہے تھے کہ دیش مکھ مذہب سے بےزار ہو رہا ہے مگر اس نے کسی کے اعتراض کی پروا نہیں کی اور آخر اس فیصلے پر پہنچا کہ اس کے لیے ہندو رہنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے سامنے دو راستے تھے... اسلام اور عیسائیت! فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس نے اپنے باپ اور بھائیوں سے بات کی۔

''میں ہندو نہیں رہ سکتا۔''

''تمہارا دماغ درست ہے؟'' بھائی اس پر چڑھ دوڑے اگر باپ انہیں نہ روکتا تو وہ مار پیٹ بھی کرتے۔

''دیش تو ہوش میں ہے؟''

''ہاں بابو! یہ میرا فیصلہ ہے۔ میں نے ہندو مت چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''تو مسلمان ہونا چاہتا ہے؟''

''نہیں، میں نے ابھی یہ فیصلہ نہیں کیا ہے کہ مسلمان ہونا ہے یا عیسائی۔''

بھائیوں اور باپ نے ہر ممکن کوشش کر لی تھی مگر جب وہ اپنی بات پر قائم رہا تو انہوں نے اس شرط پر اس کی بات مان لی کہ وہ مسلمان نہیں ہوگا، عیسائی ہو جائے۔ دیش مکھ بھائیوں اور رشتے داروں کے تیور دیکھ کر مجبور ہو گیا۔ اس نے یہ بات مان لی کہ وہ مسلمان نہیں ہوگا۔ عیسائیت قبول کر کے اس نے پادری بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے کورس کیا اور تین سال بعد اس مشن چرچ میں بہ طور پادری تعینات کیا گیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سمانتا کو بھی عیسائیت قبول کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔ اسے چرچ اور اسکول سے متصل ایک چھوٹے سے بنگلے میں رہائش ملی تھی۔

☆☆☆

جوزف مکھ پانڈے کی سب سے بڑی کامیابی اس شودر بستی کو عیسائی بننے پر آمادہ کرنا تھا۔ وہ بےحد خوش تھا۔ اس کی کوشش سے تقریباً چالیس گھرانے نہ صرف جہالت اور غربت سے نکلے تھے بلکہ ان کی آنے والی نسلیں بھی تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ مگر یہ سب ایک رات میں ملیامیٹ ہو گیا۔ چرچ کے رات کے نگران چارلی نے اسے بدحواسی میں بیدار کیا۔ ''جناب! بستی کی طرف سے شعلے اٹھ رہے ہیں۔''

''کیا کہہ رہے ہو؟'' جوزف پاجامے کرتے میں باہر نکل آیا۔

جب وہ بستی تک پہنچے تو شعلوں نے پوری بستی کو اس طرح لپیٹ میں لے لیا تھا کہ اس کے نزدیک جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ فادر جوزف نے فوری طور پر فون کر کے فائر بریگیڈ کو اطلاع دی مگر اول تو شہر سے یہ بستی کئی گھنٹے کی مسافت پر تھی اور دوسرے جو آگ سرکار نے لگائی تھی اسے بجھانے کی اجازت کیوں دیتی، اس لیے فائر بریگیڈ یا سرکار کی طرف سے کوئی مدد نہیں آئی۔ صبح تک بستی کے شعلے بجھنے لگے تھے کیونکہ جلنے کے لائق ہر شے جل چکی تھی۔ آگ بجھنے پر جوزف مکھ پانڈے اور چرچ کے دوسرے لوگ بستی میں داخل ہوئے۔ وہاں جس قسم کی تباہی پھیلی تھی اس سے کسی کا زندہ بچنا ناممکن ہی لگ رہا تھا مگر جب اس جلے گھر کے کھنڈرات سے بچے کے رونے کی آواز آئی تو وہ دنگ رہ گئے۔

بچہ بلکہ بچی گھر کے اندر پالنے میں محفوظ تھی۔ آگ نے اس کا پالنا نہیں چھوا تھا۔ وہ اس منظر کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جوزف مکھ پانڈے نے پالنے سے بچی کو اٹھایا تو وہ بےتابی سے اس کا انگوٹھا چوسنے لگی۔ وہ بھوکی تھی۔ فادر جوزف اسے اپنے گھر لے آئے اور بیوی سمانتا کے حوالے کر دیا۔ ''یہ کون ہے؟'' سمانتا نے پوچھا۔

''ایک بدنصیب بچی ہے۔ اس کے ماں باپ بستی میں مارے جا چکے ہیں۔'' فادر جوزف دکھ سے بولے۔ ''ظالموں نے پوری بستی اجاڑ دی۔ خدا ان سے سمجھے... خیر! تم بچی کو دیکھو... یہ بھوکی ہے۔''

خدا نے جوزف اور سمانتا کو اولاد نہیں دی تھی۔ ان کو بچے

پالنے کا تجربہ نہیں تھا۔ بچی ماں کا دودھ پیتی تھی۔ سانتا نے... بہ مشکل اسے بوتل سے دودھ پینے پر آمادہ کیا تھا۔

☆☆☆☆

عارف اور رادھا آپس میں محبت کرتے تھے۔ دونوں گوہاٹی کے رہنے والے تھے اور ایک ہی محلے میں پل بڑھ کر جوان ہوئے تھے۔ نہ جانے کب محبت کے پودے نے ان کے دلوں میں جڑ پکڑی اور کب یہ پودا تناور درخت بن کر ان کے حواسوں پر چھا گیا۔ ان کو پتا ہی نہیں چلا اور جب بات اقرار و پیار سے گزر کر مستقبل پر آئی تو ان دونوں کو صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ رادھا ایک ایسے کٹر ہندو گھرانے سے تعلق رکھتی تھی جہاں مسلمان کا نام لینا بھی پاپ .... سمجھا جاتا تھا۔ ایسے میں اس گھرانے کی لڑکی کسی مسلمان سے محبت کرے تو وہاں قیامت ہی آجاتی۔

عارف نے بیالوجی میں گریجویشن کیا تھا اور ایک مقامی اسکول میں پڑھاتا تھا۔ اس نے رادھا سے کہا۔ ''اس طرح ہمارا ملن ناممکن ہے... ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔''

''گھر سے بھاگ کر؟'' رادھا نے سوال کیا۔

''ہاں... ورنہ یہ ہمیں مار دیں گے۔''

''لیکن ہم کہاں جائیں گے؟''

''ایک جگہ ہے میرے ذہن میں... شاید وہاں ہمیں پناہ مل جائے۔''

چرچ اسکول میں اساتذہ کی اسامی کے جواب میں عارف نے بھی درخواست بھیجی تھی مگر انٹرویو کرنے کے لیے جب اسے چرچ تک جانا پڑا تو اسے یہ دوری کھلی تھی اور اس نے پیشکش ہونے کے باوجود انکار کر دیا تھا۔ اس وقت فادر جوزف نے اس سے کہا تھا۔ ''بیٹے! تم جب چاہو... یہاں آجاؤ۔ میں تمہارے لیے ملازمت رکھوں گا۔'' فادر جوزف کو عارف کی قابلیت نے متاثر کیا تھا۔

''ہمیں اس جگہ پناہ مل سکتی ہے۔'' عارف نے رادھا کو بتایا۔

''اور انہوں نے انکار کر دیا تو؟'' رادھا لرزتی آواز میں بولی۔

''تب بھی خدا کی زمین وسیع ہے۔'' عارف نے کہا۔ ''کہیں نہ کہیں پناہ مل جائے گی۔''

ان کا نکل جانا یوں بھی ضروری تھا کہ رادھا کے گھر والوں کو اس پر شک ہو گیا تھا اور وہ اس پر کڑی نظر رکھنے لگے تھے۔ رادھا بڑی مشکل سے عارف سے ملنے کا موقع نکالتی تھی۔ عارف کو خدشہ تھا کہ اس پر باہر آنے جانے پر پابندی نہ لگ جائے۔ اس سے پہلے ان کا نکل جانا ضروری تھا۔ ایک رات وہ خاموشی سے اپنے شہر کو الوداع کہہ کر نکلے اور سیدھے فادر جوزف کے چرچ اسکول آگئے۔ عارف نے ان کو ساری بات بتائی اور پناہ کی درخواست کی۔ ''فادر! ہمیں یقین ہے اگر ہم واپس گئے یا ان کے ہاتھ آگئے تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''میرے بھائی شیو سینا کے آدمی ہیں۔'' رادھا نے بتایا۔

''تم دونوں کو میں عارضی پناہ دے سکتا ہوں... لیکن مستقل پناہ...''

''فادر! ہم آپ کے پاس بہت امید سے آئے ہیں۔'' عارف نے کہا۔

''اچھا، میں سوچوں گا۔''

فادر جوزف نے ان کو اپنے گھر میں پناہ دے دی.... فی الحال اس نے یہ معاملہ چرچ انتظامیہ اور دوسروں سے چھپا لیا تھا۔ تیسرے دن فادر جوزف نے ان دونوں کے سامنے تجویز رکھی۔

''میرے پاس ایک حل ہے... اگر تم دونوں مان جاؤ۔''

''ہمیں قبول ہوگا فادر!'' عارف نے جلدی سے کہا۔

''نہیں، پہلے سن لو... تمہیں دنیا دکھاوے کے لیے عیسائیت قبول کرنا ہوگی، اس کے بعد میں تمہیں چرچ میں پناہ دے سکوں گا۔''

''عیسائیت!'' رادھا اور عارف کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

''ہاں، میرے ذہن میں واحد یہی حل آرہا ہے۔''

''فادر! کیا ہم سوچ سکتے ہیں؟'' عارف نے ہچکچا کر کہا۔

''کیوں نہیں... اور تم جب تک چاہو... میرے مہمان کے طور پر یہاں رہ سکتے ہو۔'' فادر جوزف بولے۔

تنہائی ملتے ہی رادھا نے عارف سے کہا۔ ''یہ اچھی تجویز ہے... ہمیں فادر کی بات مان لینی چاہیے۔''

''مگر میرا عیسائی ہونے کو دل نہیں مانتا۔'' عارف بولا۔

''تم نے غور نہیں کیا کہ وہ ہمیں صرف دنیا دکھاوے کو عیسائی ہونے کو کہہ رہے ہیں... سچ مچ عیسائی ہونے کو نہیں کہہ رہے۔''

''پھر بھی میرا دل...''

''عارف! اگر ہم انکار کرتے ہیں تو ہمارے پاس یہاں رہ جانے کا کیا جواز ہے؟'' رادھا بولی اور اس نے بالآخر اسے راضی کر لیا کہ مذہب کی یہ تبدیلی حقیقی نہیں صرف دکھاوے کے طور پر ہے۔

دو دن بعد انہوں نے چرچ میں فادر کے سامنے

عیسائیت قبول کی اور ان کی شادی عیسائی رواج کے مطابق کی گئی۔ عارف اور رادھا اس سے پہلے نکاح کر چکے تھے۔ فادر جوزف نے ان کو نو عیسائیوں کی بستی میں جگہ دلوا دی تھی اور عارف چرچ اسکول میں پڑھانے لگا تھا۔

☆☆☆

عیسائیوں کی اس بستی کو جلانے پر پریس اور میڈیا میں بڑا معمولی سا ردعمل دیکھنے میں آیا تھا۔ خاص طور سے بڑے پیمانے پر پڑھے جانے والے اخبارات نے اس معاملے کو اتنا سرسری سا پیش کیا تھا کہ جیسے ہوا سو انسان نہیں بلکہ جانور مارے گئے تھے۔ سرکاری سطح پر واقعے کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن بنایا گیا تھا جس نے بالآخر رپورٹ دی کہ بعض شرپسند عناصر نے بستی کو آگ لگا دی اور وہاں سونے والے بے خبری میں جل کر ہلاک ہو گئے۔ یہ سراسر جانب دارانہ رپورٹ تھی۔ حالانکہ لاشوں کے جلے ہوئے ٹکڑے خود چرچ انتظامیہ نے دفنائے تھے۔

مارے جانے والوں میں رادھا اور عارف بھی شامل تھے۔ فادر جوزف نے ان کا راز چھپائے رکھا تھا۔ یہ ان کی ساکھ کا بھی معاملہ تھا۔ اس لیے جب وہ مر گئے تو ان کی چند مہینے کی بچی کو بہ طور عیسائی چرچ کی تحویل میں لے لیا گیا اور فادر جوزف کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ اسے اپنے گھر میں رکھ کر اس کی پرورش کر سکتے ہیں۔ عارف اور رادھا نے بچی کا نام مریم رکھا تھا۔ فادر جوزف نے بھی اس کا یہ نام برقرار رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ مقدس نام حضرت عیسیٰؑ کی والدہ کا ہے۔

مریم جب ذرا سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گئی تو فادر جوزف نے اسے بتا دیا کہ وہ ان کی اولاد نہیں ہے بلکہ اس کے ماں باپ ایک حادثے میں مر گئے تھے (بالآخر سرکاری سطح پر اس سانحے کو حادثہ قرار دے دیا گیا تھا) اور وہ اس کے گارجین ہیں مگر اولاد سے محروم جوزف اور سانتا نے مریم کو اتنی محبت دی تھی کہ حقیقت جاننے کے باوجود اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ دونوں سے اپنے ماں باپ جیسا پیار اور لاڈ کرتی رہی۔ مریم کے آنے سے پہلے فادر جوزف گھر کو کم وقت دیتے تھے مگر جب وہ آئی تو وہ کوشش کر کے زیادہ وقت نکالا کرتے تھے۔ سانتا بھی خوش تھی۔

''مریم! تیرے آنے سے تیرے بابا بھی جلدی آجاتے ہیں۔ ورنہ میں تو رات کو ان کی صورت دیکھتی تھی۔''

مریم تھوڑے دنوں میں ان کی زندگی کا ایسا حصہ بن گئی تھی جسے خود سے جدا کرنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

جب مریم تین سال کی ہوئی تو وہ چرچ میں گیت گانے والی بچیوں میں شامل کر لی گئی۔ وہ روز صبح فادر کے ساتھ جاتی تھی۔ چار سال کی عمر میں اسے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ تعلیم کے معاملے میں وہ بچپن سے تیز تھی وہ جیسے جیسے تعلیمی مدارج طے کر رہی تھی، اس کی ذہانت اور متجسس طبیعت سامنے آتی جا رہی تھی۔ اسکول کے کام سے فارغ ہو کر وہ کتابیں پڑھتی تھی۔ میٹرک سے پہلے اس نے اسکول لائبریری کی بیشتر کتابیں پڑھ ڈالی تھیں۔ فادر جوزف بھی اسے کتابیں منگوا کر دیتے تھے۔ ان کی ذاتی لائبریری کی کتابیں مریم نے ابتدائی چند سالوں میں پڑھ ڈالی تھیں۔ اسے تعجب ہوا کہ اس لائبریری میں اسلام اور بدھ مت کے بارے میں بھی بے شمار کتب تھیں حتیٰ کہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ اور تفسیر بھی تھی۔

''فادر... آپ نے دوسرے مذاہب کی کتب کیوں رکھی ہیں؟'' مریم نے ایک دن پوچھ لیا۔

''کیونکہ تمام مذاہب امن و آشتی کی تعلیم دیتے ہیں۔ ہر مذہب انسان کا مذہب ہے اس لیے انسانیت کا مذہب بھی ہے۔''

چودہ سالہ مریم اس وقت میٹرک میں تھی اور اسے اپنے ماحول کا گہرا شعور تھا۔ ''فادر! پھر اتنے جھگڑے اور فساد مذہب کے نام پر کیوں ہوتے ہیں؟''

''وہ اس لیے کہ انسان اپنے نفس کی آرزو مذہب کی آڑ میں پوری کرتا ہے۔''

''مگر فادر!'' مریم ہچکچائی۔ ''ان جھگڑوں میں زیادہ نقصان مسلمانوں، عیسائیوں اور سکھوں کا ہی کیوں ہوتا ہے؟''

''شاید اس لیے کہ ہندو اکثریت میں ہیں۔ وہ ملک کے حاکم اور طاقت کے مالک ہیں۔''

''یا شاید اس لیے کہ ہندوؤں میں برداشت نہیں ہے۔''

''ممکن ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو میری بچی...''

''فادر! اس کا حل کیا ہے؟''

''میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ انسان صبر اور قوتِ ارادی سے اپنا کام کرتا رہے، اپنی شخصیت کو ترقی دیتا رہے۔ بالآخر یہ جھگڑے خود ختم ہو جائیں گے۔''

فادر جوزف گھر کے بہت سارے کام خود کرتے تھے۔ ان کے مکان کے آنگن میں چند درخت تھے۔ جب خزاں کا موسم آتا تو ان کے پتے پیلے ہو کر جھڑنے لگتے تھے۔ فادر روزانہ چرچ سے آنے کے بعد جھاڑو سے یہ پتے سمیٹ کر

کچرے دان میں ڈالتے تھے۔ ایک روز مریم ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ اس نے سوال کیا۔

''فادر! آپ روز پتے سمیٹتے ہیں... ایک بار سارے پتے گر جانے دیں تاکہ ہم ان کو ایک ساتھ ہی سمیٹ لیں؟''

''نہیں میری بچی... اس طرح تو کام بڑھ جائے گا اور کافی دن تک صفائی بھی نہیں ہوگی۔''

اس پر مریم نے انوکھا سوال کیا۔ ''فادر! جب ہم اتنا سا کام بھی مستقبل کے حوالے نہیں کر سکتے تو قوموں کے اختلافات کو ہم کس طرح نظر انداز کر سکتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں یہ مسئلے خود بہ خود حل ہو جائیں گے؟''

اس بات پر فادر جوزف دم بہ خود رہ گئے۔

☆☆☆

مریم نے اپنی کتابیں سوٹ کیس میں رکھیں اور اسے بند کر دیا۔ فادر جوزف دستک دے کر کمرے میں آئے۔

''میری بچی! تم تیار ہو؟''

''جی فادر!'' مریم نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ وقت گزرنے اور بچپن بیت جانے کے بعد فادر جوزف سے لاڈ آمیز محبت کا جذبہ ایک گہرے احترام آمیز محبت کے جذبے میں بدل چکا تھا۔

''تمہارے پاس وقت کم ہے... لیکن میں جانے سے پہلے تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ میرے ساتھ آؤ میری بچی۔''

مریم فرماں برداری سے ان کے ساتھ چل پڑی۔ فادر اسے چرچ سے متصل قبرستان میں لائے۔ ''میری بچی! اب تم جوان ہو اور پختہ سوچ رکھتی ہو... اس لیے اب تمہیں اپنے ماضی کے بارے میں جان لینا چاہیے۔''

وہ سائمن اور لارا کی قبروں کے سامنے رکے۔ یہ مریم کے ماں باپ کی قبریں تھیں۔ ان کو مرنے کے بعد ان کے عیسائی ناموں والے کتبے دیے گئے تھے۔ مریم نے ایک نظر ماں باپ کی قبروں پر ڈالی۔

''میں سن رہی ہوں فادر!''

''یہ تمہارے ماں باپ...'' فادر جوزف نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''اصل میں یہ عیسائی نہیں تھے۔''

مریم نے تعجب سے ان کو دیکھا۔ ''وہ عیسائی نہیں تھے؟''

''ظاہری طور پر تھے... ان کے اصل نام بھی یہ نہیں تھے۔''

''پھر وہ کون تھے؟'' مریم بے چین ہو گئی۔

''میری بچی! تمہیں تحمل سے سننا اور صبر سے برداشت کرنا ہوگا۔'' فادر جوزف نے نرمی سے کہا اور مناسب الفاظ میں اسے عارف اور رادھا کے بارے میں بتا دیا۔ ''میری بچی... یہ راز صرف میرے سینے میں ہے کہ انہوں نے اپنا مذہب ترک نہیں کیا تھا۔ میں نے ان کی جان بچانے اور ان کو پناہ دینے کے لیے یہ کام کیا تھا۔ اور خدا گواہ ہے، اس سے میرا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ میں موقع سے فائدہ اٹھا کر ان کا مذہب تبدیل کرا لوں۔''

''فادر! میں آپ کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔'' مریم نے سنجیدگی سے کہا۔

''شکریہ میری بچی۔'' فادر جوزف بولے۔ ''دوسرے میں نے تمہیں شروع میں یہ سب اس لیے نہیں بتایا کہ تم ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتیں۔ میں چاہتا تھا کہ تم ایک مضبوط شخصیت بنو... اپنے بارے میں خود کوئی فیصلہ کرنے کے قابل ہو جاؤ۔ میرے خیال میں آج تم اس قابل ہو کہ تم پر آگہی کا یہ بوجھ ڈالا جا سکے۔ تم اپنے اور اپنے مستقبل کے بارے میں خود فیصلہ کر سکتی ہو۔''

''کیا میرا فیصلہ آپ کو قبول ہوگا؟'' مریم نے دبے لفظوں میں پوچھا۔

''کیوں نہیں میری بچی۔'' فادر جوزف پادری سے باپ بن گئے تھے۔ ''پادری ہونا میرا منصب ہے لیکن تمہارا باپ ہونا ایک ایسی ذمے داری ہے جسے میں کسی صورت نہیں چھوڑ سکتا۔ میں تمہارا ہر فیصلہ سب کے سامنے قبول کرنے اور تمہارا مکمل ساتھ دینے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔''

''شکریہ فادر!''

''میری بچی... تم جو بھی فیصلہ کرو گی، اپنے ماں باپ کو اس میں شامل پاؤ گی۔''

مریم نے میٹرک کے دوران میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ صحافت پڑھے گی اور صحافی بنے گی۔ اس نے فادر جوزف کو اس فیصلے سے آگاہ کیا تو وہ بے حد خوش ہوئے۔ ''میری بھی یہی خواہش ہے کہ تم کوئی منفرد کام کرو لیکن اس کے لیے تمہیں انٹرنس میں اچھے نمبر لانے ہوں گے۔''

''میں پوری تیاری کروں گی۔'' مریم نے اجازت ملنے پر خوش ہو کر کہا۔

انٹرنس کا امتحان اس نے چرچ اسکول کی جانب سے ہی دیا تھا اور اسے اتنے اچھے نمبروں سے کامیابی ملی تھی کہ اسے کلکتہ کے ایک جرنلزم کے ادارے میں داخلہ مل گیا تھا اور وہ کلکتہ کے لیے روانہ ہو رہی تھی۔ فادر جوزف اور مریم واپس گھر میں آئے۔ سانتا نے شروع سے مریم کے فیصلے کی مخالفت کی تھی کیونکہ وہ اسے اپنی نظروں سے دور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ حالانکہ فادر جوزف اسے سمجھاتے رہتے تھے۔

''یہ اس کے مستقبل کا سوال ہے۔''

''یہ یہاں رہ کر بھی پڑھ سکتی ہے۔''

''یہاں کون سا کالج یا انسٹی ٹیوٹ ہے جہاں یہ پڑھ سکے؟''

''تو پڑھنا ضروری ہے؟''

''بالکل ضروری ہے۔ اس دیش کی فرسودہ روایات کا ساتھ اسی طرح ہوگا کہ یہاں کا ہر بچہ تعلیم حاصل کرے۔''

سانتا رونے لگی۔ ''میں اس کے بغیر کیسے رہوں گی؟''

''سانتا! وہ ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہی ہے، صرف تین سال کی بات ہے۔ دوسرے تم نے یہ سوچا کہ اس نے ایک روز ہمیشہ کے لیے اس گھر سے چلے جانا ہے۔''

''ہمیشہ کے لیے... کیوں؟''

''کیسی ماں ہو؟'' فادر جوزف نے ملامت سے کہا۔ ''کیا بیٹی کا بیاہ نہیں کرنا؟''

''وہ اور بات ہے۔''

''اس میں بھی اس کی بہتری ہے اور تعلیم کے لیے جانے میں بھی اس کی بہتری ہے... ماں باپ کو اولاد کے بہتر مستقبل کی راہ میں رکاوٹ بننے کا حق نہیں ہونا چاہیے۔''

سانتا مشکل سے مانی تھی اور اس صبح جب مریم جا رہی تھی تو وہ مستقل آنسو بہا رہی تھی۔ مریم اس کے گلے لگ گئی۔

''ماما... میں سال میں دو بار آؤں گی۔ ایک دفعہ دس دن کے لیے اور ایک بار دو مہینے کے لیے۔''

''میں تیرے بغیر کیسے رہوں گی؟''

''ماما! میں مر جاؤں تو بھی میرے بغیر رہو گی۔''

''خدا نہ کرے۔'' سانتا دہشت زدہ ہو گئی۔ ''کیسی باتیں زبان سے نکال رہی ہو۔''

باہر رکشا آ گیا تھا۔ وہ سب اس میں سوار ہوئے۔ چرچ اسکول سے نزدیک ریلوے اسٹیشن بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ مریم ریل کے ذریعے کلکتہ تک جاتی۔ فادر جوزف نے وہاں اس کے داخلے کے ساتھ ہاسٹل میں رہائش کا بندوبست بھی کیا تھا۔ وہاں ایک بینک اکاؤنٹ کھلوا کر اس کے نام سے ایک معقول رقم اس میں جمع کرا دی تھی۔ انسٹی ٹیوٹ کے ایک پروفیسر پرکاش سمیر جوزف کے اچھے دوست تھے۔ انہوں نے فادر جوزف کو یقین دلایا تھا کہ وہ مریم کا پورا خیال رکھیں گے۔ پروفیسر سمیر پڑھانے کے ساتھ ایک اخبار بھی چلا رہے تھے اور اس کی مدد سے طلبا کو صحافت کا سبق دیتے تھے۔

☆☆☆

مریم کے ساتھ کلاس میں کل بائیس طلبا تھے جبکہ پورے انسٹی ٹیوٹ میں ستاسی ہندو، بارہ عیسائی اور صرف تین مسلمان تھے۔ ان میں ایک لڑکا ریاض احمد سینئرز میں سے تھا اور اپنی ذہانت کی وجہ سے پروفیسر سمیر کے پسندیدہ شاگردوں میں سے ایک تھا۔ وہ پڑھاتا بھی تھا۔ اس کی خاص دلچسپی تحقیقی صحافت تھی اور وہ ماسٹرز کر رہا تھا۔ مریم نے اس کی پہلی کلاس لی۔ وہ تحقیقی صحافت کے مختلف پہلوؤں پر بات کر رہا تھا۔

''انویسٹی گیشن جرنلزم... اس شعبے کا سب سے مشکل میدان ہے۔ یوں سمجھ لیں، آپ بارودی سرنگوں سے بھرے ایک میدان میں فصل کاشت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''سر! اس کے باوجود میں سمجھتی ہوں... ایک صحافی کا اصل کام یہی ہے۔'' مریم نے کھڑے ہو کر کہا۔

''ہر صحافی کا نہیں... کیونکہ ہر صحافی اس کی شرائط پوری نہیں کر سکتا۔ تمہاری بات سے لگ رہا ہے کہ تمہیں اس شعبے سے خصوصی دلچسپی ہے... کیا تم بتا سکتی ہو کہ اس نوعیت کے جرنلزم میں ایک صحافی کے لیے کیا چیز بنیادی حیثیت رکھتی ہے؟''

''ایمان داری اور حوصلہ!''

''یہ تو ہے... اس کے بغیر تو کوئی صحافی بنتا ہی نہیں ہے۔''

''ذہانت!''

''نہیں۔'' ریاض مسکرایا۔ ''ایک صحافی کے لیے... جو تحقیقی صحافت سے وابستہ ہو، سب سے اہم چیز رازداری ہے۔ جب تک وہ اپنا مقصد حاصل نہ کر لے، اپنا راز اپنے سائے سے بھی چھپا کر رکھے۔''

''سر! میں ابھی نئی ہوں۔ تجربہ مجھے سکھائے گا۔'' مریم نے متاثر ہو کر کہا۔

سترہ سال ایک چھوٹے سے گاؤں میں گزارنے کے بعد کلکتہ جیسے میگا سٹی میں اسے آغاز میں کچھ عجیب سا لگا تھا۔ ایک پُرہجوم اور پُرشور شہر جو رات کو بھی نہیں سوتا تھا۔ جس کی فقط ایک چھوٹی سی گلی میں اتنے لوگ رہتے تھے جتنے کہ پورے شانتی نگر میں آباد تھے۔ (خاکستر کر دیے جانے والے قصبے کو ازسرنو تعمیر کیا گیا تھا اور اس میں خاص طور سے ان نو عیسائیوں کو آباد کیا گیا تھا جنہیں ہندو سے عیسائی بن جانے پر انتہا پسند ہندوؤں کی جانب سے دھمکیوں اور معاشرتی مقاطعے کا سامنا تھا۔ گزشتہ سولہ سال میں اس بستی کی آبادی چار ہزار سے تجاوز کر گئی تھی اور اس کا نیا نام شانتی نگر رکھا گیا تھا)۔ مریم نے یہاں سے فادر جوزف کو اولین خط میں لکھا۔

''میں یہاں آرام سے ہوں اور پوری توجہ سے تعلیم حاصل کر رہی ہوں... بس آپ دونوں کی یاد مجھے بہت ستاتی ہے۔ فادر! میں نے یہاں آ کر جو پہلی بات سیکھی ہے، وہ یہ ہے کہ میرا دیش بھارت ایک چہرہ نہیں رکھتا ہے... اس کے بے شمار

چہرے ہیں۔''

شانتی نگر کی پُرسکون فضا کے مقابلے میں کلکتہ ایک بھاگتا دوڑتا اور ہانپتا کانپتا شہر تھا۔ دولت مند مزید دولت کے لیے دوڑ رہے تھے اور غریب روٹی کے لیے دوڑ رہا تھا۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، بدھسٹ اور بے شمار لادین افراد اس شہر کا حصہ تھے۔ یہاں سو سے زائد مختلف بولیاں بولنے والے موجود ہیں اور دو درجن زبانیں رائج تھیں۔ پورے بھارت کا چالیس فیصد پریس اور میڈیا اسی شہر سے تعلق رکھتا ہے۔ کلکتہ کے صحافی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جو وہ آج سوچتا ہے، وہ بات کل پورا بھارت سوچ رہا ہوگا۔

پروفیسر سمیر کا اخبار مارکسی خیالات رکھتا تھا۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری کا مخالف... مگر اسے اشتہار انہی دو طبقات کی طرف سے ملتے تھے۔ مریم عملی صحافت کی یہ دوعملی دیکھ رہی تھی۔ آج کی دنیا میں صحافی سچ چھاپنے کے لیے بھی ان طبقات کا محتاج ہے جن کے خلاف اسے یہ سچ چھاپنا ہوتا ہے۔ مریم جب چھ مہینے بعد دس دن کے لیے شانتی نگر واپس گئی تو وہ نہ صرف صحافت بلکہ بیرونی دنیا کے بارے میں بھی بہت کچھ جان چکی تھی۔ اس نے ریل کے راستے میں آنے والے قصبات اور شہروں کو، انسانوں اور کھیتوں کو صحافی کی نظر سے دیکھا تھا۔ اسے تعجب تھا کہ جس سرزمین کی ایک انچ جگہ سبزے سے خالی نہیں ہے، اس کا باشندہ آج بھی بھوکا ہے۔

جوزف اور سانتا اسے دیکھ کر خوشی سے دیوانے ہو گئے تھے۔ فادر جوزف نے موقع پاتے ہی اکیلے میں مریم سے دریافت کیا۔ ''میری بچی! تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے؟''

مریم ان کا مفہوم سمجھ گئی۔ ''فادر! ابھی میں نے اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ میں نے فی الحال اپنی ساری توجہ تعلیم پر رکھی ہے۔''

''یہ ٹھیک ہے لیکن مذہبی اعتقاد کے معاملے میں انسان کو ہمیشہ یکسو ہونا چاہیے۔ مذہب کے بارے میں ابہام ہی انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔''

''آپ بے فکر رہیں فادر... میرے خیالات میں آپ ایسی کوئی گمراہی نہیں پائیں گے کیونکہ میں نے آپ جیسے اچھے انسان کے زیرِ سایہ پرورش پائی ہے۔''

فادر جوزف چونک گئے کیونکہ مریم نے پہلی بار مذہب کے حوالے کے بغیر ان سے بات کی تھی اور اپنی اچھائی کی خصوصیت مذہب کے بجائے ان سے منسوب کی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئے کہ کیا مریم کا رجحان اب مذہب کی طرف نہیں رہا تھا؟ پھر اس نے آنے والے اتوار کو عبادت میں بھی شرکت نہیں کی تھی۔ اسے چرچ میں نہ پا کر نہ صرف فادر جوزف بلکہ دوسرے افراد کو بھی حیرت ہوئی تھی۔ سروس کے فوراً بعد فادر جوزف سانتا کے ہمراہ گھر آئے تھے۔ مریم اپنے کمرے میں تھی۔ فادر جوزف اس کے پاس آئے۔

''میری بچی... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''جی فادر!'' اس نے ادب سے جواب دیا۔

''پھر تم سنڈے سروس میں کیوں نہیں آئیں؟''

''فادر... میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک میں اپنے بارے میں ایک فیصلہ نہ کرلوں... کسی عبادت میں شریک نہیں ہوں گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے میری بچی۔'' فادر جوزف مضطرب لہجے میں بولے۔ ''لیکن یہاں کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ فادر جوزف کی بیٹی سنڈے سروس میں نہیں ہے۔''

مریم نے غور سے ان کو دیکھا۔ ''فادر! کیا آپ ان کے سوال کا جواب نہیں دے سکتے؟''

''دے تو سکتا ہوں مگر...''

''ادب کے ساتھ... فادر میں آپ کی بات کاٹ رہی ہوں... اگر میں کل اسلام یا ہندومت قبول کرلیتی ہوں تو آپ ان لوگوں کو کیا جواب دیں گے؟''

''میری بچی! اس وقت کسی کے سوال کا بہترین جواب میرا استعفا ہو سکتا ہے۔'' فادر جوزف نے نرمی سے کہا۔ ''فی الحال میں چاہتا ہوں کہ تم کسی پر اس بات کو ظاہر نہ کرو۔ یہ میرا اور تمہارا راز ہے۔''

مریم کچھ دیر خاموش رہی۔ ''فادر! میں آپ کی خاطر ایسا کرنے کو تیار ہوں... لیکن کیا یہ منافقت نہیں ہوگی... جو میں خود سے بھی روا رکھوں گی؟''

''نہیں میری بچی... انسان کو بعض اوقات فساد ٹالنے کے لیے اپنے جذبات کا الٹ کرنا پڑتا ہے، اسے بھی تم ایسا ہی سمجھو۔''

''جی فادر!'' مریم نے بادلِ ناخواستہ کہا۔ وہ اندر سے خود کو مطمئن نہیں کر پائی تھی۔ مگر اگلا اتوار آنے سے پہلے وہ واپسی کے لیے روانہ ہوگئی۔

مریم اور اس کے کولیگز کا ممبئی کا دورہ تھا۔ یہ ان کا مطالعاتی سفر تھا۔ اس دوران میں وہ ممبئی میں ایک جرنلسٹ کانفرنس میں شرکت کرتے اور مختلف اخبارات کے دفاتر جاتے۔ اس سفر کے دوران مریم نے شدت سے محسوس کیا کہ

ممبئی کی دنیا کلکتہ سے بہت مختلف تھی۔ وہاں خوف تھا، تناؤ تھا، تعصب اور نفرت تھی۔ چند ایک معقول صحافیوں کو چھوڑ کر باقی صحافی بھی اسی رنگ میں رنگے تھے۔ وہاں انتہا پسند ہندوؤں کے خیالات کو اجاگر کیا جاتا تھا۔ مریم کو اس کے نام کی وجہ سے کئی بار غلط سلوک کا نشانہ بنایا گیا۔ البتہ جب وہ اپنا پورا نام مریم سائمن بتاتی تھی تو سب ٹھیک رہتا تھا۔

ان دنوں انڈیا میں آزاد ٹی وی چینلز کا آغاز ہو رہا تھا۔ پروفیسر سمیر نے اس سفر کے دوران ان کو اس شعبے کے بارے میں بھی بتایا۔ اس وقت مریم کو خیال آیا کہ وہ ٹی وی چینل پر صحافی بنے گی۔ اس نے فادر جوزف کو اس بارے میں لکھا۔

''یہ نیا شعبہ ہے مگر مغرب میں نصف صدی سے کام کر رہا ہے... پروفیسر سمیر کا کہنا ہے کہ جب بھارت میں نجی ٹی وی میڈیا عام ہوگا تو اس ملک کے بہت سارے مسائل اجاگر ہو کر سامنے آئیں گے اور تب ان کو حل کیا جا سکے گا۔''

فادر جوزف نے جوابی خط میں لکھا۔ ''میری بچی... کسی بھی ممکنہ شعبے کے ماڈرنائز ہونے سے مسائل کے حل میں صرف اسی صورت میں مدد ملتی ہے جب لوگوں کے ذہنی رجحانات بھی ترقی پسند ہوں۔ ورنہ ماڈرنائزیشن کا عمل ایسا ہی ہے جیسے کسی قاتل کے ہاتھ میں تلوار کے بجائے آتشیں ہتھیار دے دیے جائیں۔'' مریم نے غور کیا۔ واقعی جدید میڈیا میں بھی تو وہی لوگ سامنے آئے جو پہلے سے صحافت کی دنیا میں تھے اور ان کے ذہنوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

بھارتی پریس و میڈیا کے بارے میں پروفیسر سمیر کا کہنا تھا۔ ''ہمارا میڈیا قومی اور بین الاقوامی مسائل میں ایک مخصوص طبقے کے خیالات کی عکاسی کرتا ہے۔''

''سر! آپ کھل کر بات کریں۔'' مریم نے کہا۔

''نائس گرل... تم جانتی ہو۔ بہرحال' یہ اعلیٰ ہندو طبقے کے مفادات ہیں جن کے گرد ہمارا پریس و میڈیا گھومتا ہے اور یہی... بھارت کے دوسرے مسائل کو... خاص طور سے جن کا تعلق اقلیتوں یا نچلے طبقے کے ہندوؤں سے ہو، نظر انداز کر دیتا ہے۔''

''سر! یہی بھارت کا اصل مسئلہ ہے۔''

''میں تم سے اتفاق کرتا ہوں نائس گرل... مگر یہ ہم چند لوگوں کا خیال ہے۔ ہمارے شعبے سے وابستہ ایک بہت بڑی اکثریت اسے درست سمجھتی ہے جسے ہم غلط سمجھتے ہیں۔''

☆☆☆

ریاض سے ملاقاتیں رفتہ رفتہ نجی ہوتی چلی گئی تھیں۔ ریاض ماسٹرز کر کے ایک معروف اخبار سے منسلک ہو گیا تھا مگر ساتھ ہی وہ انسٹی ٹیوٹ میں پڑھاتا بھی تھا۔ اس نے بائیک لی تھی اور کبھی کبھی جب وہ ایک ساتھ انسٹی ٹیوٹ سے نکلتے تھے تو ریاض اسے ہاسٹل تک لفٹ دے دیا کرتا تھا۔ ایک دن اس کی بائیک خراب ہو گئی۔ ریاض نے اسے درست ہونے کے لیے فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھے مکینک کے حوالے کیا اور مریم کے ساتھ نزدیک واقع کیفے میں آ گیا۔ اس روز انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کے بارے میں بات کی۔ ریاض کا تعلق مرشد آباد کے ایک پرانے نواب خاندان سے تھا جو اب زبوں حالی سے گزر رہا تھا۔ جو کچھ انگریزوں سے بچ گیا تھا، وہ آزادی کے بعد بنیوں نے چھین لیا تھا۔ ریاض نے بچپن سے محنت کی تھی اور اپنی محنت سے اس مقام تک پہنچا تھا۔ وہ اپنے گھر کا واحد کفیل تھا۔

مریم نے اسے اپنے بارے میں سب بتا دیا حتیٰ کہ یہ بھی کہ وہ مسلمان باپ اور ہندو ماں کی اولاد تھی جو جنونی ہندوؤں سے خود کو بچانے کے لیے بہ ظاہر عیسائی ہو گئے تھے۔ ریاض حیران رہ گیا تھا۔ ''میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تم مسلمان باپ کی اولاد ہو۔''

''اس راز سے واقف تم تیسرے فرد ہو۔'' مریم بولی۔ ''حتیٰ کہ میرے پالنے والی ماما بھی اس راز سے ناواقف ہیں۔''

''میں اس اعتماد پر تمہارا شکر گزار ہوں۔'' ریاض نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن تمہارے ماں باپ الگ مذہب کے تھے اور تم عیسائی ہو۔''

''نہیں... جب سے میرے علم میں یہ بات آئی ہے، میں نے مذہبی اعتقاد ترک کر دیے ہیں۔ اب میرا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

ریاض ہچکچایا۔ ''یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

مریم مسکرائی۔ ''تم نے فادر والی بات کی ہے مگر میں اندر سے مطمئن ہوں۔''

''تمہارے فادر ذہین آدمی ہیں۔''

''اچھا، تمہارا کیا خیال ہے... مجھے ان تینوں میں سے کس مذہب کا انتخاب کرنا چاہیے؟''

مریم کے اس اچانک سوال پر ریاض ذرا دیر کے لیے بوکھلا گیا پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ ''میں یہ فیصلہ کیسے کر سکتا ہوں؟''

''اور یہی کیفیت میں اپنے اندر پاتی ہوں۔ میرے پاس کوئی دلیل نہیں ہے جس کی مدد سے میں خود کو کسی ایک مذہب کی پیروی پر آمادہ کر سکوں۔''

''سوری... میں نے تمہارے ایک ذاتی معاملے میں دخل دیا۔''

''نہیں، سوری کی ضرورت نہیں ہے... میں نے خود تمہیں بتایا ہے اس لیے یہ میری ذاتی بات نہیں رہی ہے۔'' مریم نے رسانیت سے کہا۔ ''ویسے اگر تم پھر بھی مجھے کسی ایک مذہب کا کہتے تو وہ کون سا مذہب ہوتا؟''

''ظاہر ہے، میں مسلمان ہوں اور اسے دنیا کا بہترین مذہب تصور کرتا ہوں۔ دوسرے تم ایک مسلمان باپ کی بیٹی ہو اس لیے میں مسلمان ہونے کو کہتا۔''

مریم مسکرائی۔ ''کچھ ایسے ہی خیالات فادر کے ہیں اگرچہ انہوں نے مجھے حقیقت بتا کر سب کچھ مجھ پر چھوڑ دیا ہے مگر میں جانتی ہوں... ان کی اندر سے ایک ہی خواہش ہے کہ میں کرسچین رہوں۔''

''یہ تو زیادتی ہے۔'' ریاض نے بے ساختہ کہا پھر شرمندہ ہو گیا۔ ''سوری!''

''یہ تو تم نے اپنے نقطۂ نظر سے کہا ہے... ذرا فادر کے انداز سے سوچو تو وہ بھی اپنی جگہ حق بہ جانب ہیں۔ آج میرا وجود ان کا مرہونِ منت ہے۔ اگر وہ میرے ماں باپ کو اتنے خلوص سے پناہ نہ دیتے جن کی خاطر انہوں نے اپنا منصب تک داؤ پر لگا دیا اور پھر اتنے پیار سے میری پرورش نہ کرتے تو میں کہاں ہوتی؟''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

''شکریہ! تم نے میری بات سمجھ لی۔''

''تمہارا آخری سال ہے۔ تم نے کچھ سوچا اپنے کیریئر کے بارے میں؟''

''ہاں، فی الحال تو میں کسی اخبار سے وابستہ ہو جاؤں گی مگر میرا ارادہ ٹی وی جرنلزم کا ہے۔''

ریاض مسکرایا۔ ''تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔''

''شکریہ!'' مریم مسکرا کر شرما گئی۔

وہ کیفے سے باہر آئے تو ایک خوانچہ لگانے والا بچہ مصنوعی زیورات فروخت کر رہا تھا۔ مریم اس کے پاس سے گزرنے لگی تو ریاض رک گیا۔ اس نے ایک لاکٹ اٹھایا۔ انوکھی وضع کا تھا۔ یہ اردو رسم الخط میں تھا اور مریم اس سے ناواقف تھی۔ اس نے ریاض سے کہا۔ ''یہ کیا لکھا ہے؟''

''تم جانتی ہو یہ کس زبان میں لکھا ہے؟''

''کسی حد تک... فادر کی لائبریری میں اردو اور عربی کی کتابیں بھی ہیں۔ ان کو کئی بار دیکھا ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ عربی یا اردو میں کچھ لکھا ہے۔''

''ہاں مگر یہ خاصا انوکھا سا نقش ہے۔ میں اسے نقش ہی کہوں گا۔''

''تمہارا مطلب ہے کیمیو؟''

''نہیں، وہ تو تصویری نقش ہوتا ہے... یہ رسم الخط میں نقش ہے۔ انگریزی میں اسے کیلی گرافی کہتے ہیں۔''

''مجھے اس کے بارے میں بتاؤ۔'' مریم نے اسے ہاتھ میں لیا۔

''یہ دیکھو... یہ اس کے وسط میں جو تین سیدھی شاخیں ہیں... یہ لفظ اللہ بنا رہی ہیں۔''

''اللہ... یعنی مسلمانوں کا خدا!''

''ہمارے اعتقاد کے مطابق وہ سب کا خدا ہے' جو اسے مانتے ہیں ان کا بھی اور جو اسے نہیں مانتے ان کا بھی... اچھا خیر! یہ اس کے ساتھ جو حصہ مل رہا ہے اس سے لفظ اوم بن رہا ہے۔''

''اوم... ہندوؤں کا مذہبی نشان؟''

''درست...! اور یہ ذرا اوپر دیکھو... غور سے تمہیں صلیب کا نشان ملے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ لاکٹ تینوں ہی مذاہب کی علامت ہے۔''

''میں اسے لوں گی۔'' مریم بولی۔ اسے یہ لاکٹ اچھا لگا تھا۔

مریم نے پرس کھولنا چاہا مگر اس سے پہلے ریاض نے لڑکے سے قیمت معلوم کر کے اسے ادائیگی کر دی۔ مریم نے احتجاج کیا۔ ''تم نے کیوں پیسے دیے... یہ تو میں نے خود خریدنے کا سوچا ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔'' ریاض مسکرایا۔ ''میری طرف سے تحفہ سمجھ لو... ہمارا اتنا تعلق تو بنتا ہے کہ میں تمہیں کچھ گفٹ کر سکوں۔''

مریم نے اس کا شکریہ ادا کر کے لاکٹ اپنے گلے میں پہن لیا۔ وہ اس کی نازک سی گردن میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ریاض کی موٹر سائیکل ٹھیک ہو گئی تھی اس لیے وہ روانہ ہو گئے۔ ہاسٹل میں اپنے کمرے میں آ کر اس نے دیوار کے سامنے لگے آئینے میں خود کو دیکھا۔ لاکٹ واقعی اس کی گردن میں جچ رہا تھا۔ عجیب بات تھی کہ اس کے وجود میں یہ تینوں مذہب شامل تھے۔ باپ مسلمان، ماں ہندو اور اس نے کرسچین گھرانے میں پرورش پائی تھی۔

مریم آخری سال میں تھی۔ آخری امتحان سے پہلے وہ چند دن کے لیے گھر آئی تھی۔ اس نے فادر جوزف کو خوش خبری سنائی کہ اسے کلکتہ کے ایک اچھے انگریزی اخبار میں... بہ حیثیت رپورٹر جاب مل گئی ہے مگر اس نے یہ خبر سمانتا کو سنانے سے منع کیا تھا جو پوری امید لگائے بیٹھی تھی کہ امتحان دیتے ہی مریم ہمیشہ کے لیے شانتی نگر لوٹ آئے گی۔ اس نے فادر

جوزف سے کہا۔ ”میں اسی وجہ سے چند دن کے لیے آئی ہوں... ایگزام کے فوراً بعد مجھے جوائن کرنا ہے۔“

”اخبار کیسا ہے... وہاں کے لوگ کیسے ہیں؟“

”اچھے ہیں... پچھلی چھٹیوں میں ایک مہینا وہاں تربیت بھی حاصل کی تھی۔ لوگ جانے پہچانے ہیں۔ اخبار کا گروپ ایڈیٹر پروفیسر صاحب کا جاننے والا ہے۔“

”شکر ہے... یعنی تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

”فادر! اگر پریشانی ہوئی بھی تو میں اس کا حل نکال لوں گی۔“

فادر جوزف نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ ابھی بیس سال کی تھی مگر اپنی عمر سے کہیں زیادہ پُراعتماد تھی۔

”مجھے یقین ہے میری بچی... تم ایسا کرسکو گی۔“

سمانتا اور فادر جوزف کے اصرار کے باوجود وہ روانہ ہو گئی۔ وہ بس تین دن رک سکی تھی جس کا اسے بھی افسوس تھا۔

☆☆☆

تعلیمی زندگی اور عملی زندگی میں وہی فرق ہے جو سوئمنگ پول اور سمندر میں تیراکی کرنے میں ہوتا ہے۔ مریم تعلیم کے دوران عملی تربیت بھی لیتی رہی تھی مگر یہ تربیت بھی کچھ اس قسم کی تھی کہ جیسے انسان ایک دن پکنک منانے سمندر کے کنارے چلا جائے۔ اخبار اچھا تھا اور عملہ بھی اچھا ہی تھا مگر اسے جس معاشرے میں کام کرنا تھا اس میں بہت زیادہ پیچیدگیاں اور ناہمواریاں تھیں۔ رفتہ رفتہ اسے ان مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جن سے ہر نوآموز کو گزرنا پڑتا ہے۔ دوسرے مہینے اسے ایک نزدیکی علاقے میں ہونے والی کسانوں کی بغاوت کی کوریج کے لیے سینئر صحافی کے ہمراہ بھیجا گیا۔ کسان ان بڑے زمین داروں کے خلاف احتجاج کر رہے تھے جو اپنی مرضی سے دھان کی قیمت مقرر کر کے ان کی محنت پر ڈاکا ڈال رہے تھے۔ بیوپاری ان کے آدمی تھے اور سارا چاول ان کے گوداموں میں جا رہا تھا۔ خود کسانوں کی اتنی استطاعت نہیں تھی کہ اپنا چاول خود منڈی تک لا سکتے۔

جب مریم وہاں پہنچی تو ہزاروں مشتعل کسان موجود تھے۔ ان سے نمٹنے کے لیے پولیس آ گئی تھی اور دوسری جانب بڑے زمین داروں کے پالتو غنڈے بھی تیار تھے۔ کسانوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر ان پر تشدد کیا گیا تو وہ دھان کی کھڑی فصل کو آگ لگا دیں گے۔ مریم وہاں دو دن رہی۔ اس نے غور سے سارے معاملے کو دیکھا اور اس نے محسوس کیا کہ حکومت سراسر بڑے جاگیرداروں کا ساتھ دے رہی ہے کیونکہ پولیس کی کوشش تھی کہ کسی طرح ڈرا دھمکا کر کسانوں کو احتجاج سے روک دیا جائے۔ دوسرے دن کسانوں کو منتشر کرنے کے لیے پولیس نے لاٹھی چارج شروع کیا اور ادھر کسانوں نے اپنی تیار فصل کو آگ دکھا دی۔ شام تک کھیتوں میں سوائے راکھ کے اور کچھ نہیں تھا۔ آسمان پر دھوئیں کے بادل تھے۔ بڑے جاگیرداروں نے ہوشیاری سے کام لے کر تھریشر کی مدد سے راتوں رات اپنی فصلیں کاٹ لی تھیں اور اس کے بعد ان کے اشارے پر پولیس نے کارروائی شروع کی۔

مریم نے بھوک کے باعث... روتے بلکتے بچوں کو دیکھا۔ عورتیں غم سے ادھ موئی ہو رہی تھیں اور کسان اب اجتماعی خودکشی کی باتیں کر رہے تھے۔ ایک نوجوان کسان نے بے حد تلخ لہجے میں کہا۔ ”ہمارے پاس اب خودکشی کے سوا اور راستہ بھی کون سا ہے؟“

کسان سب نچلی ذات کے ہندو اور مسلمان تھے۔ ان میں سے کسی کے پاس چند ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں تھی جبکہ اعلیٰ ذات کے ہندو جاگیرداروں کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین تھی۔ صرف ایک درجن بڑے زمین داروں کے پاس کُل ملا کر ساڑھے چار ہزار ایکڑ زمین تھی جبکہ سات سو چھوٹے کاشت کاروں کے پاس سترہ سو ایکڑ زمین تھی۔ زرعی اصلاحات کا حال واضح تھا۔ بنگال جو ہمیشہ سے کمیونسٹ پارٹی کا گڑھ رہا ہے، جہاں حکمران کمیونسٹ پارٹی ہے... اس کے باوجود جاگیرداروں کی طاقت کا یہ عالم تھا۔ انہوں نے اپنے مفاد کی خاطر ان سات سو خاندانوں کو بھوک کے دائرے میں دھکیل دیا تھا۔ مریم حیران تھی کہ اس صوبے کے حکمران الیکشن کے دنوں میں جن کسانوں سے ووٹ مانگتے تھے اور ان کو سوشلزم کے سنہری خواب دکھاتے تھے، اقتدار میں آنے کے بعد وہ صرف اور صرف ان بڑے جاگیرداروں کے مفادات کے ضامن بن کر رہ جاتے تھے۔

اخبارات اور رسائل کسانوں کے حامی تھے اور ان کے حق میں رپورٹنگ کر رہے تھے مگر ساتھ ہی وہ بڑے زمین داروں کے خلاف لکھتے ہوئے محتاط تھے۔ واپسی پر مریم نے اس سارے معاملے پر ایک رپورٹ بنا کر اپنے مدیر کے حوالے کی۔ اس نے اپنے احساسات حقائق کے ساتھ بیان کر دیے تھے۔ اس کا سینئر ساتھی صرف نیوز رپورٹر تھا۔ اس میں مضمون نگاری کی صلاحیت نہیں تھی۔ مدیر نے مریم کو طلب کر لیا۔

”مس سائمن... یہ آپ نے کیا لکھا ہے؟“ اس نے کاغذات اس کے سامنے پھینک دیے۔

”سر! جو دیکھا اور محسوس کیا۔“

”اخبار پالیسی کے مطابق چھپتا ہے... آپ کے

احساسات کے مطابق نہیں... یہ رپورٹ اس لائق نہیں ہے۔“

”مگر کیوں سر! میں نے تو ایک لفظ بھی سچ سے ہٹ کر نہیں لکھا ہے۔“ اس نے احتجاج کیا۔

”مس سائمن... سمجھنے کی کوشش کریں... ہم ایک حد سے زیادہ کسی کے خلاف نہیں لکھ سکتے۔“

”سر! سچ میں کوئی حد نہیں ہوتی۔“

”ہوتی ہے۔ نشتر کا احتیاط سے استعمال آپریشن کہلاتا ہے... اور بے احتیاطی سے قتل یا خودکشی!“

مریم کچھ دیر چپ رہی پھر اس نے تلخی سے کہا۔ ”میں سمجھ گئی سر... ہمارے ہاتھ میں جو قلم کا نشتر ہے، اس سے ہم نے جسم کے صحت مند حصوں کو کچوکے لگانے ہیں مگر اس سے پھوڑے کو نہیں چھیڑنا ہے۔“

☆☆☆

”فادر! سچ بولنا اتنا دشوار کیوں بنا دیا گیا ہے؟“ مریم نے اداسی سے کہا۔ وہ پورے سات مہینے بعد گھر آئی تھی۔ سمانتا کی دائیں آنکھ کا موتیے کا آپریشن ہوا تھا۔ آپریشن کامیاب رہا تھا مگر ابھی اسے دو ہفتے تک احتیاط کرنا تھی اس لیے مریم دو ہفتے کی چھٹی لے کر آئی تھی۔

”میری بچی... سچ بولنا اس لیے دشوار ہے کہ سچ سننا اور اسے کھلے دل سے برداشت کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار ہے۔ سچا آدمی ہمیشہ مشکل میں ہوتا ہے۔ جتنا سچا... اتنا ہی مشکل میں... یہی وجہ ہے کہ خدا کے پیغمبر سب سے زیادہ مشکل اور تکلیف میں رہا کرتے تھے۔“

”آج کل سچ بولنا کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے؟“

”نہیں میری بچی... سچ بولنا ہمیشہ سے دشوار تھا اور ہمیشہ دشوار رہے گا۔“

”میں نے ایک اور اخبار جوائن کیا ہے مگر حالات وہاں پر بھی ایسے ہی ہیں۔“

”ایسا ہوتا ہے کیونکہ انسان خطا کا پتلا ہے... فرشتے ہی انسانوں سے الگ ہوتے ہیں۔ تم کسی بھی انسان سے یہ توقع مت رکھو کہ وہ تمہارے معیار پر پورا اترے گا۔“

اس نے بے بسی سے فادر جوزف کی طرف دیکھا۔ ”نہ جانے کیوں مجھ سے انسانوں میں منافقت برداشت نہیں ہوتی۔ ہم زبان سے کہتے کچھ ہیں اور عمل کچھ اور کرتے ہیں۔“

”اسی کا نام دنیا ہے۔“ فادر جوزف نے سرد آہ بھری۔ ”تمہیں اس سے سمجھوتا کرنا پڑے گا۔“

”یہ آپ کہہ رہے ہیں فادر... جس نے مجھے سچائی کا درس دیا ہے؟“

”ہاں... وہ علم کی اور اصول کی بات تھی۔ علم اور اصول ہمارے لیے معیار ہیں۔ ان پر عمل کی کوشش ہماری خوبی ہے... سو فیصد عمل تو کوئی بھی نہیں کر پاتا... کر بھی نہیں سکتا مگر اصول کو ماننا بھی لازمی ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے کہ کوئی شخص صرف سچائی کو مانتا رہے تو اس کے عملاً سچا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؟“

”میں نے کہا نا میری بچی... اصول سچ ہوتے ہیں... معیار ہوتے ہیں۔ آدمی کمزور ہے تو اس کی اچھائی کا معیار یہی ہے کہ وہ اصولوں پر کس حد تک عمل کرتا ہے۔ بعض اوقات کنفیوژن بھی آدمی کو درست فیصلہ کرنے نہیں دیتی ہے۔“

”آپ شاید میری بات کر رہے ہیں۔“

”یہ بھی ہے... تمہاری طرف سے فیصلے میں بہت تاخیر ہو رہی ہے۔“

”فادر! میں نے ابھی تک اس بارے میں نہیں سوچا ہے۔“

”تو سوچو میری بچی... تم ایک فیصلہ کرلو کیونکہ اس کے بعد تمہاری زندگی کا ایک دور اور شروع ہوگا۔ تمہاری ماما کی خواہش ہے کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔“

”میرے فیصلے کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟“

”دیکھو... تمہارا شوہر کس مذہب سے ہو، اس کا فیصلہ تم نے کرنا ہے۔“

”فادر! یہ بھارت ہے۔ یہاں بہت سارے لوگ اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ ان کے لائف پارٹنر کا مذہب کیا ہے۔“

”یہ فلمی بات ہے۔ عام لوگ جو مذہب کی زنجیر میں بندھے ہیں، ان کے لیے یہ کام آسان نہیں ہے۔“

”ابھی میں نے اس بارے میں نہیں سوچا۔“

فادر جوزف ہچکچائے۔ ”اچھا ٹھیک ہے... یہ بتاؤ کوئی لڑکا... پسند کیا ہے تم نے؟“

مریم کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا مگر اس نے سر ہلا دیا۔ ”فادر! ایک لڑکا ہے... مسلمان ہے۔ ریاض نام ہے... مگر ابھی میں اس کے بارے میں پوری طرح آمادہ نہیں ہوں۔“

”کیا کرتا ہے؟“ فادر جوزف چونکے۔ مسلمان کے لفظ پر ان کا چہرہ ایک لمحے کے لیے بدلا تھا۔

مریم نے انہیں ریاض کے بارے میں بتایا۔ فادر جوزف خاموشی سے سنتے رہے۔ آخر میں مریم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”فادر! آپ ناراض تو نہیں ہیں... میں نے آپ سے جھوٹ نہیں بولا۔ سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہے۔ میں اس سے گھر سے باہر ملتی ہوں... مگر ہمارا تعلق بس اسی حد تک ہے۔“

''نہیں میری بچی!'' فادر جوزف زبردستی مسکرائے۔
''میں اپنے اوپر شک کرسکتا ہوں لیکن تم پر نہیں۔ ہاں، میں اس خیال سے پریشان ہوں... جب اسے تمہارے بارے میں علم ہوگا۔''
''میں اسے اپنے بارے میں سب بتا چکی ہوں۔'' مریم نے انہیں آگاہ کیا۔
''اس کا خاندان بھی ہوگا؟''
''فادر! میں نے کہا نا... میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔''
''کیا تم ہماری رضامندی چاہتی ہو؟''
''جی... یہ بات بھی ہے۔'' مریم جھینپ گئی۔
فادر جوزف سوچتے رہے پھر کہا۔ ''ایسا کرو، اس سے کہو کہ مجھ سے آکر ملے۔''
''جی فادر!'' مریم خوش ہوگئی پھر اسے سانتا کا خیال آیا۔ ''پر ماما...''
''اس کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔''
''تھینک یو فادر!'' مریم ممنونیت سے بولی۔
ریاض ان دنوں زی ٹی وی سے منسلک ہوگیا تھا جو اپنا نیوز چینل شروع کرنے جارہا تھا۔ ریاض اس کا کلکتہ کا بیورو چیف تھا۔ مریم نے شانتی نگر سے واپسی پر اس سے فون پر بات کی۔ ''میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔''
ریاض نے اس کے لہجے میں کوئی خاص بات محسوس کی تھی۔ ''میں آرہا ہوں... تم تیار رہنا۔ ہم ڈنر باہر کریں گے۔''
ریاض نے اسے دفتر سے لیا تھا۔ بیورو چیف کی حیثیت سے اسے نئی کار ملی تھی اور اس کی تنخواہ بھی خاصی معقول تھی۔ ملازمت کا پروانہ ملتے ہی اس نے مریم کو پرپوز کردیا تھا مگر مریم نے اسے ابھی تک جواب نہیں دیا تھا۔ ڈنر کے بعد مریم نے اسے فادر جوزف کی طلبی سے آگاہ کیا۔ ریاض نے اسے غور سے دیکھا۔ ''اگر انہوں نے مجھے مسترد کردیا؟''
''ایسا نہیں ہوگا۔ میں فادر سے بات کرچکی ہوں۔ وہ میری خوشی کو دیکھیں گے۔''
''پھر بھی انہوں نے مجھ ریجیکٹ کردیا تو؟'' ریاض نے اصرار کیا۔
''تو بات ختم ہوجائے گی۔'' مریم نے آہستہ سے جواب دیا۔
''اتنی آسانی سے؟'' ریاض تڑپ گیا۔ ''وہ تمہارے سگے ماں باپ...''
''پلیز! وہ میرے لیے سگے ہی ہیں اور تم بے فکر ہوکر جاؤ... یہ مریم کا وعدہ ہے... اگر فادر نے انکار کیا تو مریم اس پر احتجاج نہیں کرے گی لیکن اس کے بعد کبھی شادی نہیں کرے گی۔''
ریاض ہچکچاتا ہوا شانتی نگر جانے پر رضامند ہوا تھا اور اس کی توقع کے خلاف فادر جوزف نے رشتے کی ہامی بھرلی تھی۔ انہوں نے ایک شرط لگائی تھی کہ نکاح بے شک اسلامی طریقے سے ہو مگر وہ کورٹ میرج بھی کریں گے۔ ریاض کو اس شرط پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس نے شرط مان لی۔

☆☆☆

شادی کے دو سال بعد ان کی زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔ مریم نے اخبار کی جاب ترک کرکے ایک آزاد فری لانس جرنلسٹ گروپ میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔ صحافیوں کا یہ گروپ ایک محدود اشاعت والا رسالہ نکالنے کے ساتھ اپنی ویب سائٹ پر رپورٹس شائع کرتا تھا۔ ان صحافیوں میں ایک قدر مشترک تھی... یہ پورا سچ چھاپنا چاہتے تھے، جس کی دوسرے اخبارات اور رسائل کے مالکان اجازت نہیں دیتے تھے۔ اس لیے یہ افراد اس گروپ میں جمع ہونے لگے.....

.... ان دنوں گجرات کے فسادات ہوئے تھے۔ مریم نے ان فسادات کی کوریج کی تھی۔ ہندو یاتریوں کی ٹرین کو آگ لگانے سے حسب معمول بھارتی میڈیا اور حکومت میں ایک جنون پیدا ہوگیا تھا اور بلاتکلف اس کا الزام پاکستان اور مسلمانوں پر رکھ دیا گیا تھا۔

مریم نے اس کے فوراً بعد ہونے والے فسادات میں گجرات کے متاثرہ علاقوں کا دورہ کیا۔ اس نے وہاں رونگٹے کھڑے کردینے والے مناظر دیکھے اور لوگوں سے انٹرویو لیے۔ اس نے عرق ریزی سے ایسے ثبوت جمع کیے جن کے مطابق ان سارے فسادات کے پسِ پشت بی جے پی سرکار پوری طرح ملوث تھی۔ ٹرین جلائے جانے کے چند گھنٹے کے اندر بڑے پیمانے پر مسلمانوں کا قتلِ عام ظاہر کرتا تھا جیسے ساری تیاریاں پہلے سے مکمل تھیں۔ اس سے لگ رہا تھا کہ ٹرین میں لگنے والی آگ بھی سرکار کی سازش تھی۔ جب مریم نے رپورٹ اس اخبار کو بھیجی جس سے وہ منسلک تھی تو خلافِ توقع رپورٹ شائع نہیں ہوئی۔ اس نے واپس کلکتہ جاکر اس بارے میں معلوم کیا اور جب اسے بتایا گیا کہ رپورٹ بعض وجوہات کی بنا پر شائع نہیں کی جارہی ہے تو اس نے استعفا دے دیا۔

جب اس نے ریاض کو یہ خبر سنائی تو اس نے سپاٹ لہجے

میں کہا۔ ''تم نے استعفا کیوں دیا؟''
مریم نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''ریاض! میں نے اتنی محنت سے حقائق ڈھونڈے... اس ملک میں فرقہ واریت پھیلانے والوں کو بے نقاب کیا اور انہوں نے اسے شائع کرنے سے انکار کردیا۔''
''تم نے بے کار میں اتنی محنت کی اور بے کار میں استعفا دیا۔ اول تو اس ملک میں سب جانتے ہیں کہ کون مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کا دشمن ہے۔ اس لیے انکشاف بے کار ہے۔ دوسرے تم نے اتنی اچھی سرکولیشن والے اخبار سے استعفا دے دیا... کسی کا کیا گیا؟ تمہاری جگہ کوئی دوسرا صحافی آجائے گا۔ نقصان تو تمہارا ہوا نا۔''
''ریاض! تمہارا مطلب ہے مجھے یہ سب نہیں کرنا چاہیے۔ ہم سچائی کے علم بردار...''
''خدا کے لیے... بند کرو یہ باتیں... یہ سن سن کر میرے کان پک گئے ہیں... اس بے حس ملک اور معاشرے میں ان لفظوں کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں پر وہی کرو جو اس ملک کے اربابِ اختیار چاہتے ہیں۔ جھوٹ بولو اور کیش کماؤ۔''
مریم بہت عرصے سے محسوس کررہی تھی۔ خاص طور سے ریاض کی پیدائش کے بعد سے... ریاض کے اندر ایک خاص تبدیلی آرہی تھی۔ وہ مادہ پرست اور صرف اپنا مفاد دیکھنے والا بنتا جارہا تھا۔ اس نے ٹی وی رپورٹنگ کا شعبہ جوائن کرلیا تھا اور انڈین پارلیمنٹ پر حملے کے بعد اس کی تیار کی ہوئی ایک رپورٹ کی سرکار سے لے کر عوام تک خاصی واہ واہ ہوئی تھی۔ اس میں اس نے بعض نام نہاد شواہد کی مدد سے اس حملے کا تعلق پاکستان اور آئی ایس آئی سے جوڑا تھا۔ جب مریم نے یہ رپورٹ آن ایئر دیکھی تو اسے بہت حیرت ہوئی تھی۔ اس نے شام کو گھر آتے ہی ریاض سے اس بارے میں پوچھا۔
''ریاض! یہ رپورٹ تم نے بنائی ہے؟''
''ہاں۔'' اس نے ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔ ''کیسی لگی؟''
''تم جانتے ہو... میں صحافی ہوں اور اس دستاویزی فلم کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔''
''جب سمجھی ہو تو مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟''
''اس لیے کہ ہم صحافی ہیں... کیا تمہارے ضمیر نے ملامت نہیں کی؟ سب جانتے ہیں کہ بھارتی پارلیمنٹ پر حملہ محض ایک ڈراما ہے۔''
''تو اس سے کس کو غرض ہے؟ ہماری حکومت چاہتی ہے اس کا الزام پاکستان پر آئے۔''
''محض اس لیے تم نے یہ مووی بنادی؟'' مریم کا لہجہ تلخ ہوگیا تھا۔
''نہیں... مجھے اس پر شان دار بونس ملا ہے۔'' ریاض نے اسے ایک چیک تھمادیا۔
مریم نے افسوس سے کہا۔ ''ریاض! مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے کمزور آدمی نکلو گے۔ محض ایک لاکھ کی خاطر تم اپنا ضمیر بیچ دو گے۔''
''اگر تمہیں پتا ہوتا تو تم کیا کرتیں؟'' ریاض کا لہجہ تمسخرانہ ہوگیا۔
''تب میں یہ سب پوچھنے کے لیے یہاں نہ ہوتی۔''
''تمہارے پاس راستہ اب بھی کھلا ہے۔'' ریاض نے بیڈروم میں جاتے ہوئے کہا۔
مریم نے اپنے چند مہینے کے بیٹے کو دیکھا اور سوچا... کیا اب اس کے پاس کوئی راستہ ہے؟
اور اب ریاض اس پر معترض تھا کہ اس نے اتنی اچھی جاب کیوں چھوڑ دی جس میں اسے اتنی اچھی تنخواہ اور دوسری سہولتیں مل رہی تھیں۔ اس نے جواب دیا۔ ''ریاض! میرے لیے پیسا یا سہولیات کبھی اہم نہیں رہیں... میں اپنے کام سے مخلص ہوں۔ ورنہ بات پیسے کی ہوتی تو تم جانتے ہو، مجھے کتنی بار ٹی وی پروگراموں کی پیشکش ہوچکی ہے۔''
''میرا خیال ہے کہ تم یہی کام کرو... اخبار تو تم ویسے بھی چھوڑ چکی ہو۔''
''نہیں... میرے لیے یہ کام نہیں مشن ہے... میرے ماں باپ ایک ایسے حادثے میں مارے گئے جو سرے سے حادثہ نہیں تھا۔ وہ انتہا پسند ہندوؤں کی جانب سے ایک طے شدہ حملہ تھا۔ اگر اس ملک میں سچ بولنے والے ہوتے جو شروع میں ان کے مکروہ چہرے بے نقاب کرتے تو آج یہ ملک بہت سارے سانحات سے بچ جاتا۔''
''تب ہم کیا کریں... ریاست سے لڑیں؟'' ریاض نے چڑ کر کہا۔
''نہیں، بلکہ ان لوگوں کو بے نقاب کریں جو درِ پردہ اس ملک پر قابض ہیں اور اسے تباہی کی طرف لے جارہے ہیں۔''
''وہ بہت طاقتور ہیں۔ ہم ان کو بے نقاب کرنا تو ایک طرف رہا، اس کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ ان کے مقابلے میں ہماری کوئی حیثیت نہیں ہے۔''
''غلط... جھوٹ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو... ایک سچ کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔''
''مریم! خدا کے لیے یہ کتابی باتیں مت کرو... یہ بتاؤ

www.paksociety.com

اب تم نے کیا کرنا ہے... ہاؤس وائف بن کر رہو گی؟''

''نہیں... مجھے فریڈم کی طرف سے آفر ہے، ان کے لیے کام کرتے ہوئے مجھے گھر میں زیادہ رہنے کا موقع ملے گا۔ اب میں فیاض کو زیادہ وقت دے سکوں گی۔''

''وہ کنگلے!'' ریاض نے حقارت سے کہا۔ ''وہ تمہیں کیا دیں گے؟''

''ان کے بارے میں انڈر اسٹیمیٹ مت کرو۔ فی الحال وہ مالی لحاظ سے کمزور ہیں مگر جلد وہ دولت والے ہوں گے۔ انٹرنیٹ پر بے حساب پیسا آنے والا ہے اور نیٹ پر انکشاف سے زیادہ کوئی بھارتی رسالہ نہیں پڑھا جاتا۔''

''انہوں نے سوائے چند معمولی معاملات اور ایشوز کو کھوجنے کے اور کیا کیا ہے؟''

''میرے نزدیک ان کی سب سے بڑی خوبی ان کا سچ ہے اور میرے لیے یہی ایک وجہ کافی ہے۔'' مریم نے حتمی لہجے میں کہا۔

''او کے! جیسی تمہاری مرضی... میرے لیے تو یہ اچھی بات ہے کہ تم فیاض کو وقت دو گی۔''

فریڈم گروپ مریم کے اندازے سے بڑا اور مضبوط ثابت ہوا۔ اس میں چھ مشہور صحافی کام کر رہے تھے اور ان کے ساتھ دو درجن افراد کا عملہ تھا۔ یہ سب وہ لوگ تھے جن کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت سچائی کی تھی اور وہ اس کے لیے کوئی بھی قدم اٹھانے کو تیار تھے۔ ویب سائٹ سے اور رسالے سے ان کو جو آمدنی ہوتی تھی، وہ اخراجات نکال کر سب میں مساوی تقسیم کر دی جاتی تھی۔ یعنی جو رقم فریڈم کے بانی ممبر گوپال سندر کو ملتی تھی وہی چپراسی کو دی جاتی تھی۔ ادارے کا مرکزی دفتر بنگلور میں تھا مگر اس کے ذیلی دفاتر کلکتہ، دہلی، ممبئی اور مدراس میں تھے۔ مریم کو کلکتہ آفس کا چیف مقرر کیا گیا تھا مگر اس نے گھر میں رہ کر کام کرنے کو ترجیح دی تھی۔

☆☆☆

گوپال سندر ایک نامور سیاسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا دادا بھارت کے اولین وزیراعظم نہرو کے قریبی ساتھیوں میں سے تھا۔ اس کا باپ سیاست سے صحافت کی طرف آیا تھا اور اس نے گوپال کی نظریاتی تربیت ایک سیکولر کے طور پر کی تھی۔ گوپال کا باپ ملک کے تبدیل ہوتے تشخص کے سخت خلاف تھا۔ اس نے اپنے باپ سے کہا تھا۔ ''نہرو جی نے سب سے بڑا جرم کانگریس میں انتہا پسند ہندو عناصر کو شامل کر کے کیا ہے۔ یاد رکھیے... آگے چل کر یہی لوگ بھارت ورش کی تباہی کی وجہ بنیں گے۔''

آکاش سندر کا نظریاتی جھکاؤ بائیں بازو کی طرف تھا مگر کمیونسٹوں کی قلابازیاں دیکھ کر اس نے ان سے بھی قطع تعلق کر لیا تھا۔ اندرا گاندھی کی کرپشن اور خاص طور سے راے کے لیے مختص کیے جانے والے فنڈز کی تحقیق نے آکاش سندر کو ملک گیر سطح پر ایک بااصول صحافی کے طور پر شہرت دی تھی مگر یہی اصول پسندی اس کی موت کی وجہ بنی۔ دہلی سے بنگلور جاتے ہوئے کسی نے چلتی ٹرین میں اس کا گلا دبا کر اسے مار ڈالا تھا اور اس کا الزام پولیس نے نامعلوم لٹیرے کے سر پر رکھ دیا تھا۔ یہ الزام مضحکہ خیز تھا کیونکہ آکاش کے پاس سے کوئی شے غائب نہیں ہوئی تھی۔ اس قتل کے دو مہینے بعد اندرا گاندھی کو اس کے سکھ باڈی گارڈ نے فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا تو گوپال نے نظریاتی طور پر کمیونسٹ ہونے کے ناتے اسے مکافاتِ عمل قرار دیا تھا۔

کالج سے فارغ ہونے کے بعد گوپال عملی صحافت میں آیا۔ برسوں سچ بولنے کے جرم میں متعدد جگہوں سے نکالا اور نکالا گیا تھا۔ آخر اس نے فریڈم کی بنیاد رکھی۔ گوپال ذہین آدمی تھا۔ اسے انوکھا خیال آیا کہ سچ شائع کرنے یا بولنے کے لیے وہ میڈیا کا سہارا کیوں لے؟ آنے والا دور انٹرنیٹ کا تھا۔ اس نے ایک رسالے کا ڈیکلریشن لیا اور اس نام سے ایک ویب سائٹ کا اجرا کیا۔ رفتہ رفتہ ہم خیال صحافی اس کے گرد جمع ہوتے گئے۔ گوپال نے ان کو خفیہ طریقے سے صحافت کرنے کی تربیت دی اور اپنے محدود وسائل کے باوجود ان کے لیے جاسوسی کے آلات حاصل کیے۔

بھارتی فوج میں ایک مالیاتی اسکینڈل کے انکشاف نے بہت شہرت حاصل کی۔ فوج کو وردی اور جوتوں کی سپلائی کے آرڈرز میں بڑے پیمانے پر کمیشن کھایا گیا۔ یہ خاص جوتے اور لباس سیاچن کے علاقے میں لڑنے والے فوجیوں کو مہیا کیے گئے تھے اور ناقص کوالٹی کی وجہ سے بے شمار فوجی فراسٹ بائٹ کا شکار ہو کر اپنے ہاتھ پیروں سے ہاتھ دھو چکے تھے اور سردی نے بے شمار فوجیوں کی جان لے لی تھی کیونکہ لباس سردی روکنے میں ناکام رہے تھے۔ انکشاف ڈاٹ کام کے انکشافات نے کھلبلی مچا دی اور پانچ اعلیٰ بھارتی فوجی افسران کو استعفے دینا پڑے اور ان کا کورٹ مارشل ہوا۔ اس اسکینڈل نے راتوں رات گوپال کو بین الاقوامی شہرت دے دی تھی۔

گوپال نے مزید جرأت سے کام لے کر پورے بھارت میں جاری آزادی کی تحریکوں کے رہنماؤں اور کارکنوں کے انٹرویوز کیے تاکہ بھارتی عوام تصویر کا دوسرا رخ

دیکھ سکیں۔ اس نے جن سنگینوں کی بدعنوانی کی خبریں دیں... کشمیر میں بھارتی سرکار اور فوج کے مظالم بے نقاب کیے تو رفتہ رفتہ انکشاف ڈاٹ کام ایک ایسا نام بن گیا جو معاشرے میں پلنے والے ناسوروں کی نقاب کشائی کر رہا تھا۔ گوپال اور اس کے ساتھیوں کو فرقہ پرستوں اور مافیاؤں کی جانب سے دھمکیوں اور حملوں کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر وہ اپنے سچائی کے مشن سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

مریم پہلی بار انکشاف اور فریڈم کے دفتر پہنچی تو گوپال اور اس کے ساتھیوں نے گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔

''ہمیں امید تھی کہ بالآخر تم ہمارے پاس آؤ گی۔'' انکشاف کی ایڈیٹر سونیا نے کہا۔

اچھا... وہ کیوں؟''

''کیونکہ تم بھی سو فیصد سچ پر اصرار کرتی ہو اور ہمارا بھی یہی مشن ہے۔''

مریم نے اپنی رپورٹ گوپال کو بھیجی تھی اور اس نے فوری طور پر اسے انکشاف میں شائع کیا تھا۔ اس رپورٹ نے پہلی بار بھارت کے لوگوں کو ان فسادات کے بارے میں حقائق دکھائے تھے ورنہ پورا بھارتی میڈیا بی جے پی کی... نوائی کرتے ہوئے مسلمانوں پر ٹوٹنے والی قیامت کو چھپا رہا تھا اور بے گھر کیے جانے والے دو لاکھ مسلمان بے سروسامان کھلے آسمان تلے پڑے تھے۔

''مریم! ہم تمہیں اس گروپ میں خوش آمدید کہتے ہیں... مگر تم ایک نظر ان دو نوجوانوں کو دیکھ لو۔'' گوپال نے اپنے دفتر کی دیوار پر دو تصویروں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ ہمارے پُرجوش صحافی تھے اور ایک انڈر کروشن کے دوران غائب ہو گئے... یہ بابری مسجد کی سائٹ پر گئے تھے جہاں عدالتی احکامات کے باوجود خفیہ طور پر رام مندر کی تعمیر جاری ہے۔ یہ دونوں وہاں سے غائب ہوئے اور بعد میں ان کی لاشیں دریائے جمنا سے ملی تھیں۔ بڑی مشکل سے ان کی شناخت ہوئی تھی۔ تو مریم... ہمارے ساتھ کام کرنے والے آدمی کو کسی بھی وقت اس انجام کے لیے تیار رہنا چاہیے۔''

مریم مسکرائی۔ ''میں صرف تیار ہی نہیں ہوں... بلکہ بھگت بھی چکی ہوں۔'' اس نے بائیں ہاتھ کی آستین اوپر کی۔ اس بازو پر کہنی سے اوپر ایک گھاؤ کا نشان تھا۔ ''ایک شخص نے میرے دل پر وار کرنے کی کوشش کی تھی مگر بازو سامنے آنے کی وجہ سے میں بچ گئی۔ ان دنوں میں بعض سیاست دانوں کے بارے میں تحقیق کر رہی تھی۔''

''یعنی تم پہلے ہی فریڈم میں شامل ہو۔'' گوپال ہنسا۔

''سنا ہے کہ تمہارا ایک بیٹا بھی ہے؟''

''ہاں، اسے میں اپنی ماما کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔'' بیٹے کے ذکر پر مریم خوش ہو گئی تھی۔

''تمہیں اس کے حوالے سے ہوشیار رہنا ہوگا۔'' گوپال نے اس کی خوشی پر بم گرا دیا۔ ''کیونکہ ہم جن لوگوں کے خلاف صف آرا ہیں، ان میں انسانیت نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ اگر میں کسی مذہب کا پیروکار ہوتا تو کہتا کہ ان کا مذہب شیطانیت ہے۔''

''تم مجھے ڈرا رہے ہو؟''

''میں صرف خبردار کر رہا ہوں۔''

ریاض اس کے انکشاف میں جاب کرنے سے فکرمند تھا مگر اس نے مخالفت بھی نہیں کی تھی۔ البتہ فادر جوزف یہ سن کر خوش ہوئے تھے۔ مریم ایک ہفتے کے لیے ان کے پاس آئی تھی، فیاض اس کے ساتھ تھا۔

''یہ بہادر لوگ ہیں... تم نے ان کا ساتھ دے کر نیک کام کیا ہے۔''

''جی فادر... لیکن میں نے ان آدمیوں کا نہیں بلکہ اس ادارے کے اصول اور سچائی کا ساتھ دیا ہے۔''

کمزور اور بے اولاد مریض

مردانہ صحت کی مکمل بحالی، مردانہ جرثوموں کی کمی و کمزوری اور خوشگوار ازدواجی زندگی کے لئے

15 اپریل 2008 سے کلینک کے لئے نئے اوقات کار نوٹ فرمالیں

صبح 9 بجے تا 3 بجے دوپہر

دوسرے شہروں کے رہنے والے مریض فون پر رابطہ کر سکتے ہیں

ڈاکٹر محمد لطیف شاہین
ایم بی بی ایس، بی ایس سی (آنرز)
معالج امراض مخصوصہ و بانجھ پن

شاہین ملٹی سسٹم کلینک
نزد ریلوے کراسنگ
گوجرہ روڈ جھنگ صدر
موبائل 0321-6528001
فون 047-7625822

''اس میں خطرات بھی ہیں۔'' فادر جوزف فکرمند ہو گئے۔
مریم مسکرائی۔ ''فادر! آپ خود تو کہتے ہیں... سچائی کی راہ پر چلنا سب سے مشکل کام ہے اور ایسا کرنے والوں کو سب سے زیادہ دشواری ہوتی ہے۔''
''یہ درست ہے۔'' فادر جوزف نے تسلیم کیا۔ ''میں ایک پادری ہوں... سچائی کی تلقین کرنا میرا کام ہے مگر میں ایک باپ بھی ہوں... میں اور تمہاری ماں تمہارے لیے فکرمند رہتے ہیں۔''
''فادر! جب تک آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہیں، میں محفوظ رہوں گی۔'' اس نے یقین سے کہا۔
''میری بچی... تم خود اپنے لیے کب دعا کرو گی؟''
مریم ان کی بات کا مفہوم سمجھ رہی تھی۔ ''فادر! آپ میرے لیے دعا کریں۔''
''میں تمہارے لیے دعا کرتا ہوں... وہ تمہیں سیدھا راستہ دکھائے۔''
''مجھے اس کی ضرورت ہے۔'' اس نے کہا۔ ''فادر! میں اگلے مہینے پاکستان جا رہی ہوں... جرنلسٹ کی ایک کانفرنس ہے۔ مجھے اس میں شرکت کی دعوت ملی ہے۔ واپس جا کر ویزے کے لیے اپلائی کروں گی۔''
''خدا تمہاری حفاظت کرے گا۔''

☆☆☆

وفد میں کُل بارہ صحافی تھے اور یہ سب بھارت کے سرکردہ اخبارات کے نمائندے تھے۔ اسلام آباد میں ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا تھا۔ پاکستانی حکومت کا رویہ اچھا تھا۔ وہ ان کا ہر ممکن خیال رکھ رہے تھے جبکہ مریم نے محسوس کیا کہ اس کے ساتھیوں کا رویہ کسی قدر روکھا تھا۔ مقامی جرنلسٹوں کی ایسوسی ایشن کی جانب سے دیے گئے ڈنر میں بھی وہ لیے دیے رہے تھے اور انہوں نے اس ڈنر اور پذیرائی کا شکریہ ادا بھی نہیں کیا تھا۔ جب وفد کے سربراہ نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا تو مریم نے اپنی باری پر اس کے ازالے کی کوشش کی۔
''میں اس بہترین میزبانی اور پُرخلوص ڈنر پر آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔''
ہوٹل واپسی پر وفد کے سربراہ مکرجی کا منہ بنا ہوا تھا۔
''مریم! تمہیں ان کا شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''
''کیونکہ یہ ایتھکس کا تقاضا تھا۔''
''میرا ایک مشورہ ہے۔ یہاں پاکستانیوں سے ایک فاصلہ رکھو... ورنہ واپس جا کر دشواری نہ ہو۔''
''کیسی دشواری مکرجی؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
''تم جانتی ہو... صحافیوں کی بھی نگرانی ہوتی ہے۔''
''مجھ سے زیادہ بہتر کون جان سکتا ہے۔ میں پہلے بھی سرکار کی گڈ بک میں نہیں ہوں۔''
''میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں... پاکستان میں بہت محتاط ہو کر بات کرنا... میرے علم میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو یہاں سے واپس سیدھا جیل گئے۔''
''مکرجی... میں صحافی ہوں، کوئی ڈپلومیٹ نہیں جو جھوٹ بولوں... میں جس بات کو سچ سمجھوں گی، اسے کھل کر کہوں گی۔''
دوسرے دن کانفرنس کے بعد تمام صحافی اور مندوبین ریفریشمنٹ ہال میں آ گئے۔ وہاں مریم کی ملاقات چند مقامی صحافیوں سے ہوئی اور ان سے باتوں کے دوران مسئلہ کشمیر زیر بحث آ گیا۔ مریم نے اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا... یہ سوچے بغیر کہ اس کے لیے کوئی مشکل بھی ہو سکتی ہے۔ اس سے اگلے روز ان کی واپسی تھی۔

☆☆☆

''مسز ریاض!'' سامنے بیٹھے کرخت صورت والے شخص نے کہا۔ ''تم نے پاکستان میں ایک بیان دیا ہے جس سے بین الاقوامی سطح پر ہماری سبکی ہوئی ہے۔''
''میں نے ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔'' مریم نے بے خوفی سے کہا۔
''ہمارے پاس سارے ثبوت ہیں... تم نے زبانی بیان دیا پھر ٹی وی پر اس کی تصدیق کی۔''
''ہاں، میں نے بات کی اور اس کی تصدیق کر دی تھی۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''
''تم نے کہا کہ کشمیر پاکستان کا ہے؟''
''میں نے کشمیریوں کی بات کی تھی... وہ جس کے حق میں فیصلہ کریں۔''
''تم نے ریفرنڈم کی بات کی تھی؟''
''ہاں، اقوام متحدہ کی ریزولیوشن کی بات کی تھی۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''نہرو جی خود لے کر گئے تھے یو این او اس مسئلے کو۔''
''مسز ریاض!'' اس شخص کا لہجہ دھمکی آمیز ہو گیا۔ ''یہ بہت سیریس معاملہ ہے۔''
''میں بھی سنجیدہ ہوں۔''
''تم جانتی ہو ہماری پالیسی؟''
''اچھی طرح... اور یہ ضروری نہیں ہے کہ میں اس سے اتفاق کروں۔''

احتساب

ایک بار سلطان محمود غزنوی نے تمام رات اپنے خواص اور ندیموں کے ساتھ جام لنڈھانے میں صرف کر دی۔ اس بزم ساغر و مینا میں محمود کا سپہ سالار علی نوشتگین اور محمد عربی بھی حاضر تھے۔ ساری رات کی بیداری اور مے نوشی، نوشتگین پر اثر ڈال رہی تھی۔ محمود نے اس کو مشورہ دیا کہ ظہر کے وقت تک تم یہیں ٹھہرو اور جب نشے کی کیفیت زائل ہو جائے تو چلے جانا اس لیے کہ اگر محتسب نے تمہیں اس حال میں دیکھ لیا تو شرعی حد لگا دے گا۔ سپہ سالار نوشتگین نے سوچا کہ محتسب اس کے ساتھ یقیناً نرمی سے پیش آئے گا۔ چنانچہ وہ سلطان کی بات ٹال کر باہر نکل گیا۔ ادھر سے محتسب ایک سو سواروں اور پیادوں کے ساتھ آ رہا تھا۔ اس نے سپہ سالار کو جو نشے کی حالت میں دیکھا تو گھوڑے سے اتر گیا اور بہ طور حد شرعی اسے اپنے ہاتھوں سے بری طرح مارنا شروع کر دیا۔ سپہ سالار کو اپنے پچاس ہزار سپاہیوں کا غرور اور خود اپنی دلاوری پر بڑا ناز تھا۔ اس نے مار کھانے کے بعد خاک چاٹنا شروع کر دی۔ یہ منظر سپہ سالار کے ساتھی اور کچھ سپاہی سب ہی دیکھتے رہ گئے اور پھر سزا مکمل ہونے کے بعد لوگ زخمی سپہ سالار کو اٹھا کر گھر لے گئے۔

(سیاست نامہ از خواجہ نظام الملک طوسی)

انتخاب: ڈاکٹر اے آر بھٹی راجپوت

''یہ ملک کی پالیسی ہے۔''
''ہاں مگر آئین کا حصہ نہیں ہے اور جو چیز آئین کا حصہ نہ ہو اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔''
''بحث مت کرو۔ تمہارے اس بیان سے پاکستان کے موقف کو تقویت ملی ہے۔ وہ پہلے ہی ہمارے خلاف پروپیگنڈا کر رہا ہے۔''
''ہمارا میڈیا بھی سفید جھوٹ بولنے میں کسی سے کم نہیں ہے۔''
وہ شخص کچھ دیر اسے گھورتا رہا۔ ''مسز ریاض! تمہیں وارننگ دی جا رہی ہے۔''
''مجھے اس کی پروا نہیں ہے... تم چاہو تو مجھے کورٹ میں لے جاؤ۔''
وہ پہلی بار مسکرایا۔ ''نہیں... ہمارے پاس کچھ حربے اور بھی ہیں۔''

☆☆☆

مریم گھر میں آئی تو ریاض سخت اشتعال کے عالم میں منتظر تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اس پر برس پڑا۔ ''دیکھ لیا کرتوتوں کا نتیجہ؟ مجھے نوکری سے نکال دیا گیا ہے۔''
''کیوں؟'' مریم حیران رہ گئی۔
''بہ ظاہر تو وجہ کچھ اور ہے... مجھ پر غیر ذمے داری کا الزام ہے... لیکن تم نے پاکستان جا کر جو گل کھلائے ہیں، یہ ان کا نتیجہ ہے۔''
''مائنڈ یور لینگویج!'' مریم نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں ایک ذمے داری پر گئی تھی۔ اور تم ڈیوٹی کے بہانے باہر کیا کرتے ہو... مجھے اس کا علم ہے۔''
''تم جھوٹ بول رہی ہو۔''
''ہاں، میں جھوٹی اور تم سچے ہو۔''
''مریم! اب میں اس کنڈیشن میں نہیں رہ سکتا۔ تم نے میرا کیریئر تباہ کر دیا ہے۔ میں چینل میں اوپر کی طرف جا رہا تھا۔''
''خوش فہمی ہے تمہاری... اور نہیں رہ سکتے تو نہ رہو۔''
''ہاں، میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ کل تک تمہیں میرے وکیل کی طرف سے طلاق کے کاغذات مل جائیں گے۔''
ریاض نے باہر جاتے ہوئے کہا۔ مریم دھم سے بستر پر بیٹھ گئی۔ اسے کچھ عرصے سے لگ رہا تھا کہ اس کی زندگی میں یہ مرحلہ آنے والا ہے اور وہ خود کو ذہنی طور پر اس کے لیے تیار بھی کر رہی تھی مگر ریاض کے الفاظ سن کر اس کے دل کو دھکا لگا تھا۔ اس نے سوچا۔
''تو یہ سب چھ سال میں ختم ہو گیا۔ میں اسی مقام پر ہوں جہاں سے چھ سال پہلے چلی تھی۔'' لیکن ایک تبدیلی آئی تھی۔ اس نے فیاض کی طرف دیکھا تھا۔

☆☆☆

ممتا اسے سینے سے لگا کر رو دی۔ مگر وہ پُرسکون رہی۔
''ماما! آپ کیوں روتی ہیں۔ ایک کم ظرف اور منافق آدمی سے میری جان چھوٹ گئی ہے۔''

''یہ مسلمان ہوتے ہی ایسے ہیں۔'' سمانتا نے آنسو صاف کیے۔
''نہیں ماما... میرا باپ بھی ایک مسلمان تھا۔ اس نے میری ماں کے ساتھ جان دے دی۔'' مریم نے اسی لہجے میں کہا۔ ''کوئی مذہب برا نہیں ہوتا۔ انسان برا یا اچھا ہوتا ہے۔''
''اب میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔''
''آئی ایم سوری ماما... مگر میں ایک بار پھر جانے کے لیے آئی ہوں۔ میں نے ممبئی جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اب میں کلکتہ میں نہیں رہوں گی۔''
''ممبئی... وہ دور نہیں ہے؟'' سمانتا فکرمند ہوگئی۔
''نہیں ماما... گوہاٹی تک ڈیڑھ گھنٹے کی فلائٹ ہے اور گوہاٹی سے یہاں تک کل تین گھنٹے کا سفر ہے۔ میں پانچ گھنٹے سے بھی پہلے آپ کے پاس ہوں گی۔''
''پھر تم اتنی جلدی کہاں آؤ گی۔''
''نہیں... یہ وعدہ رہا چھ مہینے میں ایک چکر ضرور لگے گا۔''
فادر جوزف کے لیے بھی یہ صدمے کی بات تھی۔ ان کو امید نہیں تھی کہ ریاض اس قسم کا آدمی نکلے گا۔ جب انہوں نے مریم سے اکیلے میں اس موضوع پر بات کرنی چاہی تو اس نے پہلے ہی کہہ دیا۔
''پلیز فادر... میں اس شخص کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔''
''ٹھیک ہے میری بچی! مگر اب تم کیا کرو گی؟ فیاض کی پرورش اکیلے کیسے کرو گی؟''
''فادر! مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں خود کو اور فیاض کو بھی سنبھال لوں۔''
''تمہیں فیاض کی تحویل کے معاملے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟''
''نہیں... ریاض نے مجھ سے کہا ہے کہ میں فیاض کو ہمیشہ کے لیے رکھ سکتی ہوں۔ اس نے تحریری دست برداری دے دی ہے۔ ویسے بھی ماں ہونے کے ناتے یہ میرا حق ہے۔''
''مسلم پرسنل لاء اس بارے میں مختلف ہے۔ ایک مسلمان باپ کا بچہ اپنی غیر مسلم ماں کے پاس نہیں رہ سکتا... جبکہ ماں باپ میں علیحدگی ہوگئی ہو۔''
''میں جانتی ہوں فادر... مگر ریاض نے تحریری رضامندی دے کر یہ مسئلہ حل کر دیا ہے۔''
''وہ بعد میں تمہارے لیے مسئلہ کھڑا کرسکتا ہے۔''
یہ خدشہ مریم کے ذہن میں بھی تھا مگر اس نے فی الحال اسے اہمیت نہیں دی۔ ''اگر اس نے ایسی کوئی حرکت کی تو دیکھا جائے گا۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ ریاض دبئی جارہا ہے۔ وہاں سے اسے کوئی آفر ہوئی ہے۔''
''مجھے اس شخص پر قطعی اعتماد نہیں ہے۔ جو ایک بار دباؤ بڑھانے پر تمہیں طلاق دے سکتا ہے اس پر پھر دباؤ آیا تو وہ تمہیں تنگ کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔''
''فادر! میں اس کا مقابلہ کرسکتی ہوں۔''
''تم نے خود ممبئی جانے کا فیصلہ کیا ہے؟''
''جی فادر... میں محسوس کرتی ہوں کہ ممبئی اور اس کے آس پاس بڑی کہانیاں ہیں اور مجھے جا کر ان کہانیوں کو کھوجنا ہے۔''
''وہاں خطرات بھی بڑے ہیں۔''
''میں جانتی ہوں اور میں اسے چیلنج کے طور پر لے رہی ہوں۔''
''میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' فادر جوزف نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
''مجھے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے... میرے لیے یہ دعا بھی کریں کہ میرے اندر جو بے چینی ہے وہ ختم ہو جائے اور مجھے ایک سیدھا راستہ مل جائے۔''
فادر جوزف ہچکچائے۔ ''میری بچی! سیدھا راستہ تمہارے سامنے ہے۔''
''نہیں فادر... مجھے خود فیصلہ کرنے دیں۔ میں نے آپ کو مذہب سے ہٹ کر دیکھا ہے۔ جب میں آپ کو فادر کہتی ہوں تو اس سے مراد آپ کا منصب نہیں بلکہ میرے لیے آپ کسی باپ کی سی شخصیت ہیں۔ آپ میرے لیے مہربان آسمان جیسے ہیں۔''
فادر جوزف اس کی بات سمجھ گئے تھے۔ ''خدا تمہاری مشکل آسان کرے میری بچی۔'' انہوں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

☆☆☆

''مس مریم... آپ کو ممبئی آفس میں ویلکم۔'' انکشاف اور فریڈم کے ممبئی چیف شیام لال جی نے کہا۔
''اس جگہ کو صحافیوں کے لیے اور خاص طور سے ہم جیسے صحافیوں کے لیے کالا پانی کہتے ہیں۔''
''میں جانتی ہوں۔''
''میں پھر بھی ممبئی کا مختصر تعارف کرا دوں۔ کم سے کم دو لاکھ بھکاری، ایک لاکھ طوائفیں، بیس سے تیس ہزار مسلح دہشت گرد اور مافیا مین اور دو کروڑ جنتا... اس کا نام ممبئی ہے۔ یہاں مختلف اقسام کی سو سے زائد مافیا میں سرگرم ہیں... جن میں سرفہرست ہندو انتہا پسند گروپس ہیں۔ یہ اتنے

احوال لاہور کا

لاہور قدیمی ایک شہر ہے دریائے راوی کے کنارے پر۔ تواریخ سے ایسا ثابت ہوتا ہے کہ لورا جا رام چندر کے بیٹے نے اول اس شہر کو آباد کیا اور نام اس کا بعضوں کے نزدیک لہور اور بعضوں کے نزدیک لہاور۔ قدرت الٰہی سے بہ موجب گردش زمانہ کے بعد کئی برسوں کے یہ آبادی ایسی ویران ہوئی کہ کہیں کہیں نشان عمارت کا رہ گیا اور بالکل کھنڈر ہو گیا۔ اس حالت میں دارالسلطنت اس ملک کا سیالکوٹ ٹھہرا۔ بعد اس کے جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان کو فتح کیا تو ملک ایاز کہ اس کا منظور نظر تھا' اس شہر کی آبادی پر متوجہ ہوا۔ کہتے ہیں کہ یہ شخص خدا دوست تھا اور اس پر بادشاہ نظر نوازش یہاں تک رکھتا تھا کہ اکثر مصنف عاشقی و معشوقی کا نام درمیان میں لاتے ہیں۔ مزار اس کا لاہور کے ٹکسال بازار میں' جو متصل مشن اسکول کے واقع ہے' موجود ہے۔ اب تک وہاں ہر روز چراغ جلتا ہے اور جمعرات کی رات کو چراغاں ہوتا ہے اور سال بھر میں ایک روز وہاں میلا ہوتا ہے۔ اکثر کنچنیں ناچ کو رات بھر حاضر رہتی ہیں اور دوسرے دن پر مجلس بھی ہوتی ہے اور جہلا لوگ منت بھی مانتے ہیں۔

اقتباس: ''یادگار چشتی'' از نور احمد چشتی
مرسلہ: محمد عثمان علی' راولپنڈی

تور ہیں کہ مہاراشٹر کا وزیراعلیٰ ہمیشہ ان کا آدمی ہوتا ہے۔ ھی کبھی فیڈرل والے بھی ان کے سامنے بے بس ہو جاتے یں۔ یہ بھارت کے سب سے طاقتور ہندو ہیں مگر ممبئی کے ں فیس کی وجہ سے یہاں پر کارروائیوں سے گریز کرتے یں۔ اس کی کسر یہ ملک کے دوسرے حصوں میں پوری کر لیتے ہیں۔ جب کہیں ہندو مسلم یا دوسری اقلیتوں سے فساد ہوں، ممبئی کے دہشت گرد قتل و غارت گری میں پیش پیش تے ہیں۔''
''مجھ سے یہ سب چھپا نہیں ہے۔''
شیام لال جی گجراتی تھا اور ہنسنے ہنسانے والا آدمی تھا۔ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اس پر میں ایک بار پھر آپ کو ممبئی میں ویلکم کرتا ہوں۔''
مریم نے ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لیا تھا۔ یہ ایک ہی کالونی میں تھا۔ اب اسے فریڈم کی جانب سے اچھی تنخواہ ملتی تھی۔ مگر وہ زیادہ اخراجات سے گریز کررہی تھی۔ اس نے ال کے فیاض کو ایک ایسے اسکول میں داخل کرا دیا تھا س اس کی چھٹی چار بجے ہوتی اور وہ اسے اسکول چھوڑتی روالپسی میں اپنے ساتھ لے آتی۔ اسکول انتظامیہ کو اس نے سے ہدایت کر دی تھی کہ اس کے بغیر فیاض کو اسکول سے جانے دیا جائے اور نہ ہی کسی اور کے حوالے کیا جائے۔
مریم نے ممبئی آنے کا فیصلہ سوچ سمجھ کر ایک خاص مقصد تحت کیا تھا۔ آسام کی ایک مزاحمتی تحریک کے لیڈر سے یو کے دوران لیڈر نے انکشاف کیا تھا کہ انتہا پسند ہندو ت کے پرانے ہو جانے والے ایٹمی ہتھیاروں تک کی کوشش کررہے ہیں جنہیں فرسودہ ڈیزائن کی وجہ سے متروک قرار دے کر ڈمپ کر دیا گیا تھا مگر فی الحال ان کو ناکارہ نہیں بنایا گیا تھا۔ ایسے ایٹمی ہتھیاروں کی تعداد بیس سے تیس کے درمیان تھی اور یہ ممبئی کے آس پاس کسی فوجی تنصیب میں رکھے گئے تھے۔ بھارت کا ایٹمی پروگرام روزِ اول سے ایٹمی ہتھیار تیار کرنے کے لیے تھا۔ اولین بھارتی وزیراعظم جواہر لال نہرو نے اس شعبے کو اپنے پاس رکھا تھا۔
1974ء میں اولین ایٹمی دھماکے کے بعد عجلت میں سوویت ڈیزائن کے مطابق کئی اقسام کے ایٹم بم بنائے گئے تھے۔ ان میں سے کوئی بم میزائل سے نہیں پھینکا جاسکتا تھا کیونکہ ان کا حجم بہت زیادہ تھا۔ اس لیے ایٹم بم گرانے کے لیے خاص طور سے برطانیہ سے جیگوار طیارے حاصل کیے گئے تھے مگر پانچ سال بعد پاکستان نے ایف سولہ طیارے حاصل کر کے جیگوار طیاروں کو روکنے کی صلاحیت حاصل کرلی تھی۔ اس کے بعد ان طیاروں اور فرسودہ ایٹم بموں کی افادیت ختم ہوگئی تھی۔ اس دور میں بھارت نے ایک قابلِ اعتماد ڈیلیوری سسٹم کے لیے میزائل سازی شروع کی اور ان کے لیے جدید قسم کے چھوٹے ایٹم بموں کی تیاری شروع کی۔ بی جے پی کے دور کے آخر میں ان فرسودہ ایٹم بموں کو ڈمپ کر دیا گیا تھا۔
مریم نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ جاننے کی کوشش کرے گی۔ کیا واقعی بھارت کے انتہا پسند ہندو گروپ ان ایٹم بموں کے حصول کی کوشش کررہے تھے؟ اگر ایسا تھا تو اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ برصغیر ایک بہت بڑی تباہی کے دہانے پر تھا۔ مریم کو کچھ دن یہاں کی روٹین میں سیٹ ہونے میں لگے تھے۔ اس نے کسی کو بھی اپنے عزائم کی ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ ایک

مہینے بعد اس نے پانڈے راؤ نامی ایک انتہا پسند ہندو لیڈر سے انٹرویو کے لیے وقت مانگا۔ اس نے فوراً آمادگی ظاہر کر دی۔ وہ چوپاٹی کے علاقے میں ایک عالی شان بنگلے میں رہتا تھا اور اندر سے باہر تک درجنوں مسلح افراد اس کی حفاظت پر مامور تھے۔ پانڈے راؤ نے گزشتہ دنوں ممبئی میں کام کرنے والے پاکستانی فنکاروں کو کھلی وارننگ دی تھی کہ وہ جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں ورنہ ان کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی ہے۔ مریم نے پہلا سوال اسی بارے میں کیا۔

''بالی ووڈ ایک بین الاقوامی فلم انڈسٹری بننے جا رہا ہے... ایسے میں غیر ملکی فنکاروں کو یہاں سے جانے کے لیے کہنا کچھ عجیب سا نہیں ہے؟''

''غیر ملکی نہیں صرف پاکستانی... ہمیں کوئی پاکستانی برداشت نہیں ہے۔''

''صرف پاکستانی کیوں؟''

''پاکستان ہمارا دشمن ہے۔ وہ ہم سے تین جنگیں لڑ چکا ہے۔''

''پاکستانی فنکار خود نہیں آئے، ان کو بلایا گیا ہے۔''

''ہم یہاں کے لوگوں کو بھی معاف نہیں کریں گے۔ جو پاکستان یا پاکستانیوں سے دوستی کرے گا، وہ بھارت کا غدار ہے۔''

پانڈے راؤ کے علاوہ بھی مریم نے کئی اور انتہا پسند ہندو لیڈروں سے انٹرویو کیے تھے اور ان کی باتوں سے اس نے محسوس کیا کہ وہ سب جنگی جنون میں مبتلا تھے اور اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ عنقریب ایک جنگ میں پاکستان کو ختم کر کے اکھنڈ بھارت کی تکمیل کر لی جائے گی۔ مریم کی چھٹی حس خبردار کرنے لگی۔ کیا واقعی بھارت کے ایٹمی ہتھیار ان انتہا پسندوں کے ہاتھ لگنے والے تھے جو پاکستان اور مسلمان دشمنی میں اتنے اندھے ہو چکے تھے کہ ان کو بھارت کی سلامتی کی فکر بھی نہیں تھی؟ وہ اس حقیقت کو فراموش کر رہے تھے کہ پاکستان کے پاس جدید ساخت کے ایٹم بم ہیں جنہیں میزائلوں سے نشانے پر پھینکا جا سکتا ہے اور مختلف فاصلے تک مار کرنے والے میزائلوں کی وسیع رینج بھی ہے۔ کلکتہ سمیت بھارت کا کوئی شہر ان کی زد سے باہر نہیں ہے۔ مریم نے یہی سوال ایک ہندو لیڈر سے کیا۔

''جنگ کی صورت میں بھارت کے ہندو بھی نہیں بچیں گے۔''

''نہیں، ہم نے پوری تیاری کر لی ہے... مارے جانے والے دوسرے لوگ ہوں گے۔ ہم جنگ کے بعد بھی محفوظ رہیں گے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں جواب دیا تھا۔

مریم نے ان سارے انٹرویوز کو انکشاف میں ''کچھ ہونے والا ہے'' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ ان کو پڑھ کر گوپال خود اس سے ملنے چلا آیا تھا۔ وہ نہایت فکرمند تھا۔

''مریم! تم نے شہد کی مکھیوں کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے۔''

وہ مسکرائی۔ ''ہمارا کام یہی ہے۔'' پھر وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ''میں محسوس کر رہی ہوں کہ اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک رہی ہے۔ بی جے پی اور دوسری انتہا پسند ہندو تنظیمیں ہندو ووٹ حاصل کرنے کے لیے انتخابات کے دنوں میں کوئی نہ کوئی ڈراما کرتی ہیں اور اس بار یہ شاید ایسا ڈراما کریں جو نہ صرف بھارت بلکہ ساری دنیا کو ہلا کر رکھ دے۔''

''میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں... خاص طور سے بی جے پی اور وی ایچ پی اپنے دہشت گردوں کے کرتوت منظرِ عام پر آنے سے اشتعال میں ہیں۔ ان کی پوری کوشش ہے کہ تحقیقات کسی طرح روک دی جائے اور بات کورٹ تک نہ جائے۔''

''کانگریس میں بھی انتہا پسند ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ ان کی مدد کر رہے ہیں۔''

''مریم! بات سیاسی جماعتوں کی نہیں ہے، مسئلہ اداروں کا ہے۔ انتہا پسند فوج، پولیس اور انٹیلی جنس کے اداروں میں کس قدر گھس چکے ہیں، اس کا ہمیں درست طور سے اندازہ نہیں ہے۔ جب 2002ء میں دونوں ملکوں کی فوجیں آمنے سامنے تھیں تو بعض واقعات میں ان لوگوں نے جنگ کرانے کی پوری کوشش کی تھی مگر اس وقت یہ اتنے مضبوط نہیں تھے۔''

''اور آج مضبوط ہیں؟'' مریم نے غور سے اسے دیکھا۔

''ہاں، بی جے پی نے اپنے دورِ حکومت میں بے تحاشہ انتہا پسند ہندو ان اداروں میں داخل کیے ہیں۔ سب سے بڑا خطرہ یہ ہے کہ وہ اسٹریٹجک ہتھیاروں تک رسائی نہ حاصل کر لیں۔''

''ایٹمی ہتھیاروں تک!''

''کانگریس اس معاملے میں سنگینی کی سطح کا اندازہ نہیں لگا پا رہی ہے اور ملک ان دہشت گردوں کے ہاتھوں یرغمال بنتا جا رہا ہے۔ یہ اپنی راہ میں آنے والے ہر شخص کو اڑا رہے ہیں... چاہے وہ ان کی طرح ہندو کیوں نہ ہو۔''

''دہشت گردوں کی تعریف دنیا کے صدر نے بتا دی ہے۔'' مریم مسکرائی۔ ''جو ان کے ساتھ نہیں ہے، وہ ان کا دشمن ہے۔''

''یہی حال ہمارے انتہا پسندوں کا ہے۔ ان کے

ایک ہر وہ شخص دشمن ہے جو ان کے ساتھ نہیں ہے۔''

مریم ہچکچائی پھر اس نے گوپال سے پوچھا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے... بھارت کے ایٹمی ہتھیار مقامی دہشت گردوں کے ہاتھ لگے تو وہ کیا کریں گے؟''

''بھگوان نہ کرے۔'' گوپال نے بے ساختہ کہا۔ ''اگر ایسا ہوا تو سمجھ لو... دونوں ملکوں میں ایٹمی جنگ چھڑ جائے گی۔''

''کیا ملک کے ذمے داروں کو اس کا احساس نہیں ہے؟''

''وہ ان لوگوں کے ہاتھوں یرغمال بنے ہیں۔'' گوپال نے تلخی سے کہا۔ ''ہندوتوا کا نعرہ اس ملک میں بھگوان سے زیادہ مقدس ہو گیا ہے۔ کوئی شخص خود پر اس کی مخالفت کا الزام نہیں لے سکتا اس لیے دہشت گرد جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔''

مریم کو خیال آیا کہ وہ گوپال کو اپنی اسٹوری کے بارے میں بتا دے مگر وہ چپ رہی۔ رازداری انویسٹی گیشن جرنلزم کی بنیاد ہے۔

☆☆☆

مریم نے اپنی کار سڑک کے کنارے پارک کی تھی کہ کانسٹیبل اس کی طرف لپکا۔ ''ادھر عام لوگوں کو کار کھڑی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''وہ کون سے خاص لوگ ہیں جن کو یہ اجازت ہے؟'' مریم اترتے ہوئے بولی۔

''ادھر ریلوے افسران کی گاڑیاں پارک ہوتی ہیں۔'' اس نے کہا۔

مریم نے اسے اپنا پریس کارڈ دکھایا۔ ''اب تو میں وی آئی پی ہو گئی۔''

کانسٹیبل نے دانت نکالے۔ ''جی مس! آپ جائیں... میں کار دیکھتا رہوں گا۔''

مریم ریلوے میں ٹکٹ بک کرانے آئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ سردی شدید ہونے سے پہلے ایک بار فادر اور ماما سے مل آئے۔ شانتی نگر میں دسمبر بے حد سرد ہو جاتا تھا۔ مریم کی ضد تھی کہ اس بار وہ ٹرین سے جائیں گے۔ مریم آج بے حد مصروف رہی تھی۔ اس لیے اسے آٹھ بجے فرصت ملی تھی کہ جا کر بکنگ کرا سکے۔ ابھی وہ ریلوے اسٹیشن میں داخل ہونے جا رہی تھی کہ اس نے بے تحاشا فائرنگ اور لوگوں کی چیخوں کی آواز سنی۔ مریم اندر کی طرف لپکی تھی کہ اس نے مین انٹرنس سے چند مسلح افراد کو بھاگ کر باہر آتے دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں جدید ترین ہتھیار تھے۔ انہوں نے پتلون اور قمیص کے اوپر بلٹ پروف جیکٹس پہن رکھی تھیں اور ان کی پشتوں پر بھاری بیگز تھے۔ ان کا انداز اور ڈیل ڈول پیشہ ور آرمی کمانڈوز جیسا تھا اور وہ راہ میں آنے والے ہر شخص پر فائرنگ کر رہے تھے۔ مریم نے تیزی سے اپنے موبائل کیمرے سے ان کی ویڈیو بنانی شروع کی، وہ ایک درخت کی آڑ میں ہو گئی تھی۔

مریم کے پاس جدید قسم کا موبائل تھا جو اچھی کوالٹی کی ویڈیو بنانے کے ساتھ آوازیں بھی ریکارڈ کرتا تھا۔ مریم نے دیکھا کہ یہ کُل پانچ افراد تھے۔ وہ پارکنگ میں کھڑی ایک بڑی گاڑی میں گھسے اور اسے تیز رفتاری سے نکالا۔ مریم اپنی کار کی طرف لپکی۔ اس نے بھی تیزی سے کار نکالی۔ اس کی کار دیکھنے میں پرانی مگر چلنے میں اچھی تھی۔ ریلوے کی عمارت کے سامنے بے شمار افراد زمین پر ساکت پڑے تھے۔ نہ جانے وہ زندہ تھے یا موت کے خوف سے ساکت پڑے تھے۔ فائرنگ اور چیخوں سے لگ رہا تھا اندر کافی افراد فائرنگ کی زد میں آئے تھے۔

مریم کو حیرت تھی کہ ریلوے کی اپنی سیکیورٹی تھی اور وہاں خاصی تعداد میں پولیس بھی تھی مگر کسی نے ان کو روکنے کی کوشش نہیں کی تھی اور وہ مزے سے فائرنگ کرتے ہوئے نکلتے چلے گئے تھے۔ ان کا رخ ممبئی کے پوش ترین علاقے کی طرف تھا جو وی آئی پی علاقہ شمار ہوتا تھا۔ یہاں بے شمار ہوٹلز تھے اور عالی شان عمارتیں تھیں جن میں زیادہ تر غیر ملکی ٹھہرتے تھے۔ اس نے جلدی سے ایک پولیس افسر کا نمبر ملایا۔

''شرما جی... میں انکشاف کی رپورٹر مریم ممائمن بات کر رہی ہوں۔''

''حکم کریں دیوی جی!''

''میرے سامنے ریلوے اسٹیشن سے پانچ مسلح افراد فائرنگ کرتے ہوئے نکلے اور ممبئی کے مرکز کی طرف جا رہے ہیں جہاں ہوٹلز ہیں۔''

''مجھے اطلاع ملی ہے۔''

''آپ پیٹرول کارز کو انہیں روکنے کو کہیں۔ وہ سیاہ رنگ کی وین میں سوار ہیں۔ نمبر ایکس ایل آر فور تھری ٹو نائن ہے۔''

''میں انفارم کرتا ہوں... آپ مجھ سے رابطے میں رہیں۔''

''سوری! میں اس وقت ان کے پیچھے ہوں اور... میرے خدا... وین سے راہ چلتے لوگوں پر فائرنگ ہو رہی ہے۔'' اس نے چلا کر کہا۔ ''ان کو روکنے کے لیے کچھ کریں۔''

''میں پولیس کو الرٹ کر رہا ہوں۔''

مریم کے لیے یہ سب ناقابلِ یقین تھا۔ وہ کتنی آسانی

سے شہر کے حساس ترین علاقے میں دندناتے پھر رہے تھے۔ عام لوگوں پر فائرنگ کر رہے تھے اور کوئی ان کو روکنے والا نہیں تھا۔ پولیس اور سیکیورٹی والے غائب تھے۔ جبکہ عام حالات میں یہ ناممکن تھا کہ کوئی اس طرح کھلے عام فائرنگ کرتا پھرے... وہ بھی اتنے حساس علاقے میں۔ اس نے کوشش کر کے کئی بار وڈیو بنائی مگر ڈرائیونگ کے دوران یہ آسان کام نہیں تھا۔ البتہ اس نے کال کر کے شیام کو اس سانحے کی اطلاع دے دی جو ہنوز جاری تھا۔

''میں ان کا تعاقب کر رہی ہوں۔''

''ویری گڈ... میں بھی آ رہا ہوں۔'' اس نے جوش سے کہا۔ ''مریم! تم زیادہ سے زیادہ مووی بنانے اور تصویریں لینے کی کوشش کرو۔''

''تو اور کیا کر رہی ہوں۔''

مریم وین سے ذرا فاصلے پر تعاقب کر رہی تھی مگر اتنی دور بھی نہیں کہ اپنے موبائل کیمرے سے مووی نہ بنا سکے۔ اس کے سامنے ایک پُرہجوم چوک سے گزرتے ہوئے وین کی چاروں کھڑکیوں سے برسٹ مارے گئے تھے۔ بے شمار لوگ گرے تھے اور باقی ڈر کر جہاں تھے وہیں گر گئے۔ جب وین آگے نکلی اور مریم کی کار چوک تک پہنچی تو بے شمار زخمی چلّا رہے تھے اور مر جانے والے یا بے ہوش ہو جانے والے افراد ساکت تھے۔ مریم نے ایک آدمی کا بھیجا باہر پڑا دیکھا۔ وہ سڑک پر اوندھے منہ پڑا تھا اور اس کے گرد خون ہی خون پھیلا تھا۔ مریم دکھی ہو گئی۔

وین اب بے حد تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ ابھی تک نہ تو پولیس کا نام و نشان دکھائی دیا تھا اور نہ ہی پولیس کار کا سائرن سنائی دے رہا تھا۔ حد یہ کہ عام طور سے ان سڑکوں پر موجود رہنے والی پولیس کی گاڑیاں بھی غائب تھیں۔ یہ غیر معمولی بات تھی۔ مریم کی چھٹی حس خبردار کرنے لگی۔ کوئی بہت بڑا سانحہ ہونے والا تھا۔ اس نے کار کی رفتار تیز کی کیونکہ وین اب دور جا رہی تھی۔ اچانک اس نے وین کو ایک مشہور ہوٹل کے سامنے رکتے دیکھا۔ اس سے پانچوں مسلح افراد اترے اور دوڑتے ہوئے ہوٹل کے اندر چلے گئے۔ مریم نے کار ذرا دور روکی اور وہ اتر کر ہوٹل کی عقبی گلی کی طرف لپکی۔ اسے معلوم تھا کہ ہوٹل کے عقبی طرف بھی ایک راستہ ہے۔

اس طرف بھی نگران تھے، انہوں نے مریم کو روکا۔ ''میڈم! یہ سروس ایریا ہے... غیر متعلقہ افراد کا داخلہ بند ہے۔ آپ سامنے کی طرف سے آیئے۔''

''میں صحافی ہوں۔'' مریم نے سپروائزر کو اپنا کارڈ دکھایا۔ ''ہوٹل کے سامنے والے حصے میں کچھ مسلح افراد گھس آئے ہیں۔''

''مسلح افراد؟'' سپروائزر پریشان ہو گیا تھا۔ ''پھر تم کیوں اندر جا رہی ہو؟''

''میں خاصی دیر سے ان کا تعاقب کر رہی ہوں۔'' مریم نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ ''تم فوری طور پر ہوٹل سیکیورٹی کو الرٹ کر دو اور ممکن ہو تو پولیس کو کال کر دو۔''

مریم اندر آئی۔ یہ سروس ایریا تھا۔ مریم مختلف راہداریوں سے ہوتی ہوئی رہائشی حصے کی طرف آئی تو اسے فائرنگ اور چیخوں کی آواز سنائی دی۔ وہ بدحواسی میں جلدی سے سیڑھیوں پر چڑھ گئی کیونکہ فائرنگ کی آواز پاس سے آ رہی تھی۔ پھر دو ویٹرز نمودار ہوئے وہ فرار ہو رہے تھے۔ ان کے عقب میں ایک مسلح نوجوان نمودار ہوا اور اس نے ایک ہی برسٹ میں دونوں کو گرا دیا۔ وہ سیڑھیوں کے عین سامنے گرے اور تڑپنے لگے۔ مریم ان کی مووی بناتے ہوئے اوپر جانے لگی کیونکہ مسلح جوان اسی طرف آ رہا تھا۔

مریم گھوم کر سیڑھیوں سے اوپر آئی۔ اس نے ایک اور موبائل نکالا۔ یہ خاص موبائل صرف کسی سے رابطے کے لیے تھا۔ یہ لمبی بیٹری والا موبائل تھا۔ اوپر والی منزل پر آنے کے بعد اس نے اردگرد دیکھا۔ اسے چھپنے کے لیے کوئی جگہ درکار تھی۔ نیچے سے فائرنگ اور شور کی آواز نمایاں سنائی دینے لگی تھی۔ آوازیں سن کر کمروں میں موجود لوگ نکل آئے تھے۔ وہ پریشان تھے۔

''ہوٹل میں مسلح افراد گھس آئے ہیں۔ آپ سب اپنے کمرے میں رہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اوپر بھی آئیں گے۔''

''مسلح لوگ... میرے پاپا نیچے ہیں۔'' ایک نوعمر لڑکی چیخی۔ وہ سیڑھیوں کی طرف جانے لگی تو مریم نے اسے پکڑ لیا۔ ''چھوڑ دو مجھے۔'' اس نے مچل کر کہا۔ ''چھوڑ دو مجھے۔''

''پاگل مت بنو... نیچے وہ قتلِ عام کر رہے ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے دو ویٹرز کو شوٹ کیا گیا ہے، اندر چلو۔''

''میرے پاپا!'' لڑکی ڈر گئی۔

''وہ محفوظ ہو سکتے ہیں... ممکن ہے کسی کام سے ہوٹل سے باہر گئے ہوں... لیکن تم نیچے گئیں تو ضرور ماری جاؤ گی۔'' مریم نے کہا پھر مسافروں سے بولی۔ ''آپ سب بھی اندر جائیں۔ دروازے بند کر لیں اور پولیس کو کال کریں۔''

سب تیزی سے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ مریم لڑکی کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گئی۔ اس نے دروازہ اندر سے

لٹ کر کے موبائل نکالا اور شیام سے رابطہ کیا۔ ''میں... ہوٹل کے اندر ہوں۔ یہاں مسلح افراد گھس کر لوگوں کو مار رہے ہیں۔''

''اوہ! تم نے کسی کی مووی بنائی ہے؟''

''نہیں، میں کلوز اپ نہیں لے سکی مگر میرے پاس کئی سنسنی خیز ویڈیوز بن چکی ہیں۔''

''ان کے کلوز اپ لینے کی کوشش کرو۔ ممکن ہے سب سے پہلے ہم ان کے بارے میں خبر دیں۔''

''مجھے معاملات مشکوک لگ رہے ہیں۔ مسلح افراد ریلوے اسٹیشن سے یہاں تک کھلے عام فائرنگ کرتے رہے اور کسی نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے تو معمول کی پولیس بھی نظر نہیں آئی۔ اسی طرح یہ پانچ مسلح افراد بڑی آسانی سے ہوٹل میں گھس آئے ہیں اور نچلی منزل پر قتلِ عام کر رہے ہیں۔''

''مائی گاڈ... تمہارے سامنے کوئی مارا گیا؟''

''راستے میں تو میں نے بے شمار لوگوں کو ان کی اندھا دھند فائرنگ کا نشانہ بنتے دیکھا ہے مگر یہاں میرے سامنے دو ویٹرز مارے گئے ہیں، میں نے ان کی مختصر ویڈیو بنائی ہے۔''

''یہ ویڈیوز فوری طور پر مجھے بھیج دو۔ اس سے پہلے کہ موبائل بند ہو جائے یا سروس مسئلہ کر جائے۔'' شیام نے اضطراب سے کہا۔

''میں بھیج رہی ہوں۔'' مریم نے کہا اور ویڈیوز ایم ایم ایس کرنے لگی۔ لڑکی اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ ''میں نے بھیج دی ہیں۔''

''میں بھی آنے کی کوشش کر رہا ہوں... ایک منٹ رکو... ٹی وی پر خبریں آ رہی ہیں۔ آتنک وادیوں نے اور جگہوں پر بھی حملہ کیا ہے۔''

''مجھے یقین ہے کہ یہ کوئی ڈراما ہے۔'' مریم اضطراب سے بولی۔ ''میں گوپال کو کال کرنے جا رہی ہوں۔''

''مجھ سے رابطے میں رہو اور کسی سے مت کہنا کہ تم کہاں ہو۔''

''میں سمجھ رہی ہوں۔'' مریم نے فون بند کر دیا۔

''تم جرنلسٹ ہو؟'' لڑکی نے پوچھا۔ وہ سولہ سترہ برس کی حسین نقوش والی لڑکی تھی۔

''ہاں۔'' مریم نے کہا۔ اسی لمحے باہر سے فائرنگ اور لوگوں کے چلّانے کی آوازیں آئیں۔ ''لگتا ہے کہ وہ یہاں بھی آ گئے ہیں۔'' اس نے لپک کر دروازے کے سارے بولٹ چڑھا دیے اور روشنیاں بجھا دیں۔

''تم نے لائٹ کیوں بند کی ہے؟'' لڑکی سہمے ہوئے انداز میں بولی۔

''شش... ان کو پتا نہ چلے کہ اس کمرے میں کوئی ہے۔'' مریم نے سرگوشی کی۔ ''ورنہ وہ اندر آ کر ہمیں مار دیں گے۔''

اب فائرنگ اور شور کی آوازوں سے لگ رہا تھا کہ مسلح دہشت گرد کمروں میں گھس کر لوگوں کو ہلاک کر رہے تھے اور کچھ دیر بعد ان کے کمرے کی باری تھی۔ مریم کو اس موقع پر رہ رہ کر فیاض کا خیال آ رہا تھا۔ وہ مر جاتی تو اس کا کیا ہوتا۔ پھر اسے اپنا خیال آیا، وہ بھی تو پل گئی تھی جبکہ اس کے ماں باپ دونوں مر چکے تھے۔ اگر وہ مر جاتی تب بھی فیاض کا باپ زندہ تھا۔ وہ اسے دیکھ سکتا تھا۔ اسی لمحے کسی نے ان کے کمرے کے دروازے پر ہاتھ مارا اور عجیب سے لہجے میں بولا۔

''ادھر بھی کوئی ہے؟''

''نہیں۔'' شاید کسی نے کی ہول سے جھانکا۔ ''اندر اندھیرا ہے۔''

''دھوکا بھی ہو سکتا ہے... لاک توڑ دے۔'' پہلے والے نے کہا۔

مریم کے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اسے ان لوگوں کا لہجہ مرہٹ لگ رہا تھا۔ جنوبی ہند میں رہنے والے اسی طرح بات کرتے ہیں مگر اس سے پہلے کہ وہ دروازے پر فائر کرتے، اچانک بپ کی آواز آئی اور کسی نے واکی ٹاکی پر کال ریسیو کی۔ ''او کے باس... ہم آ رہے ہیں۔'' مرہٹ لہجے والا بولا۔ اس نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''نیچے چلو... ادھر مسئلہ ہے... ان سے بعد میں آ کر نمٹیں گے۔''

وہ کمرے کے سامنے سے چلے گئے۔ مریم اور لڑکی نے نہ جانے کب سے دبا سانس خارج کیا۔ مریم نے جلدی سے گوپال کو کال کی اور اسے صورتِ حال بتانے لگی۔ گوپال اس کے ہوٹل میں پھنس جانے کا سن کر پریشان ہو گیا تھا۔ ''مریم! تم نکل جاؤ... میرا خیال ہے کہ تم نکل سکتی ہو۔ ابھی ان کا ہوٹل پر مکمل قبضہ نہیں ہوا ہے۔''

''نہیں گوپال! میرے خیال میں یہ اچھا موقع ہے۔ میں اندر رہ کر ان کے بارے میں بہتر طور پر جان سکتی ہوں... مجھے چانس لینا ہوگا۔''

''ان کے بارے میں بتاؤ... چہرے، لباس اور زبان سے یہ کہاں کے باشندے لگتے ہیں۔''

''جنوبی ہند کے۔'' مریم نے کہا۔ ''ان کی تعداد پانچ تھی مگر ان کے ساتھی اندر بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ آپس میں واکی ٹاکی استعمال کر رہے ہیں۔''

''واکی ٹاکی...'' گوپال چونکا۔ ''تمہارے پاس ایف

ایم ریڈیو ہے؟''

''ہاں، موبائل میں ہے۔''

''اسے آن کر کے چیک کرو۔ شاید ان لوگوں کی گفتگو سنائی دے... اسے ریکارڈ کر لینا۔''

''میں کوشش کرتی ہوں... باہر کیا کنڈیشن ہے؟''

''آگ لگی ہے۔'' گوپال نے بتایا۔ ''بے شمار افراد مارے جا چکے ہیں... ان میں درجن بھر سے بھی زیادہ پولیس والے ہیں اور عجیب بات ہے کہ ان میں وہ چار اعلیٰ افسران بھی ہیں جو انتہا پسندوں کے خلاف تحقیقات کر رہے تھے۔''

''گوپال! یہ کوئی ڈراما ہے۔ ہمیں اپنی تمام ریسورس استعمال کرنا ہوں گی۔''

مریم نے پہلے الیف ایم استعمال کرنے کا سوچا مگر پھر اس نے پہلے اس لڑکی اور یہاں موجود دوسرے افراد کو باہر نکالنے کا فیصلہ کیا۔ وہ لڑکی کے ہمراہ باہر آئی۔ اس طرف کی راہداری میں نصف کمرے کھلے تھے اور اندر بے شمار لاشیں اور زخمی افراد تھے۔ صحیح سلامت چند ایک ہی تھے جنہوں نے چھپ کر جان بچائی تھی۔ مریم نے ان میں سے ایک نسبتاً ہوشیار نظر آنے والے شخص کو ہوٹل سے باہر جانے والا عقبی راستہ سمجھایا۔ ''تم سب اس طرف سے نکل جاؤ... دیر مت کرو، کہیں وہ راستہ بھی بند نہ ہو جائے۔''

یہ سنتے ہی وہ سب افراتفری میں بھاگے۔ زخمی عقب میں چلا رہے تھے مگر کوئی ان کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ سب کو اپنی پڑی تھی۔

مریم واپس آئی اور اس سے اوپر والی منزل کی طرف آئی۔ اسی لمحے اوپر کی طرف سے دھماکے سنائی دیے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ دہشت گرد اوپر بھی پہنچ گئے تھے۔ ظاہر ہے، اوپر جانے کے لیے کئی لفٹس اور سیڑھیاں تھیں۔ وہ واپس پہلی منزل پر آئی۔ ابھی راہداری میں تھی کہ اسے نچلی منزل کے زینوں کی طرف سے دو افراد کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ تیزی سے ایک کمرے میں داخل ہو گئی جہاں دو ادھیڑ عمر مرد اور عورت کی لاشیں پڑی تھیں۔ وہ جلدی سے اس کمرے میں پڑی مسہری کے نیچے گھس گئی۔ بولنے والے اوپر آ رہے تھے۔

''سارے رومز دیکھنے ہیں مگر غیر ملکی کو نہیں مارنا ہے۔''

''نیچے دو درجن غیر ملکی تو ہیں۔''

''آرڈر از آرڈر۔'' اس نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ وہ اس کمرے کے سامنے سے گزرے، چونکہ یہاں پر وہ کارروائی کر چکے تھے اس لیے انہوں نے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اگلے بند کمروں کی طرف جا رہے تھے۔

مریم نے دم سادھ لیا۔ اس نے پرس سے ہینڈ سیٹ نکالا اور موبائل سے منسلک کر کے الیف ایم ٹیون کرنے لگی۔ یہ صبر آزما کام تھا کیونکہ دہشت گرد ہمہ وقت آپس میں بات نہیں کرتے تھے اور یہ کام خطرناک بھی ہو سکتا تھا کیونکہ پولیس بھی ان کی باتیں سن سکتی تھی۔ وہ ریڈیو کو بار بار ٹیون کرتی رہی۔ اس کے کانوں پر ہیڈ فون تھا، اس لیے وہ نگرانی کے لیے آنکھیں استعمال کر رہی تھی۔ اس نے دونوں موبائلز کو وائبریٹ پر کر لیا تھا۔ وہ ذرا سی غلطی سے پکڑی جا سکتی تھی اور پھر اس کا انجام یہاں موجود لاشوں جیسا ہی ہوتا۔

وہ بار بار ریڈیو ٹیون کر رہی تھی۔ اچانک اسے ایک جگہ ہلکی سی آواز سنائی دی۔ اس نے اسے فائن ٹیون کیا۔ آواز مدھم مگر واضح ہو گئی تھی۔ ''ہمارے پاس بائیس غیر ملکی ہو گئے ہیں۔ پچاس سے زیادہ کو ہم نے مار دیا ہے۔''

''ادھر بھی ہم نے ٹیک اوور کر لیا ہے۔''

''ہمارا نقصان؟''

''کوئی نہیں... سب ٹھیک ہے۔''

''گڈ... کل تک ہمیں یہاں رہنا ہے۔''

''اور اس کے بعد؟''

''ہم وا کی ٹا کی پر بات کر رہے ہیں اس لیے محتاط رہو۔''

''او کے... اشوک اور مہتا...''

''احمق آدمی!'' دوسرے نے بھنا کر کہا۔ ''میں نے کیا کہا ہے کہ محتاط رہو۔''

''ہماری باتیں کون سن رہا ہوگا؟''

''کوئی سن بھی سکتا ہے۔ اب تمام ہوٹل کلیئر کرو... بم لگاؤ اور یرغمالیوں کو درمیانی منزل پر لے آؤ۔''

''یس کمانڈر!'' احمق نے کہا اور رابطہ ختم ہو گیا۔ مریم کو فریکوئنسی مل گئی۔ اس کے موبائل میں وائس الیف ایم ریکارڈنگ کی سہولت بھی تھی۔ اس نے یہ گفتگو ریکارڈ کر لی تھی پھر اس نے یہ گفتگو بھی شیام کو ایم ایس کر دی۔ اس نے لاشوں کی تصویریں بھی لیں۔ اس دوران میں موبائل نے چار جنگ کا اشارہ دینا شروع کیا۔ بیٹری ختم ہو رہی تھی۔ مریم کے پاس چارجر تھا۔ اس نے مسہری کے نزدیک ہی سے ساکٹ میں چارجر لگا کر موبائل چارج کرنا شروع کر دیا۔ راہداری میں جھانک کر اس نے دہشت گردوں کو دیکھنا چاہا مگر وہ اس طرف سے جا چکے تھے۔ اس نے گوپال سے رابطہ کیا۔

''کیا صورتِ حال ہے؟''

''دہشت گردوں نے دو ہوٹلوں سمیت کئی مقام پر قبضہ

کر رکھا ہے۔''

''پولیس... حکومت کیا کر رہی ہے؟''

''پولیس کے بس کی بات نہیں ہے۔ اپنے چار اعلیٰ افسران کے مارے جانے کے بعد اس نے ہاتھ اٹھا لیے ہیں۔ سنا ہے کہ آرمی کمانڈوز آ رہے ہیں۔''

''انہوں نے ہوٹل کے داخلی راستوں پر بم لگا دیے ہیں۔''

''میرا ریاستی حکام سے رابطہ ہے مگر وہ بدحواس ہیں۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے کہ کیا کریں۔''

''یہ ان کے بس کی بات بھی نہیں ہے۔'' مریم نے طنز کیا۔ ''جن ملکوں کی سیکیورٹی آرگنائزیشنز اپنے شہریوں کے خلاف کارروائی میں مصروف ہوں، ان کی توجہ اس قسم کے حملوں کی طرف کہاں رہتی ہے۔''

''درست کہا... میرا خیال ہے کہ اب تم وہاں سے نکل آؤ۔''

''نہیں... میں نے ان کی جو باتیں سنی ہیں، مجھے شبہ ہے کہ یہ ہندو ہیں... انہوں نے کسی اشوک اور مہتا کا نام لیا ہے۔''

''پھر بھی... تم خطرے میں ہو۔''

''ہمارا کام ہی خطرے والا ہے... اچھا، کوئی آ رہا ہے۔'' مریم نے کہا اور موبائل بند کر کے پھرتی سے چارجر لیتی بستر کے نیچے گھس گئی۔ سچ مچ ایک شخص کمرے کے سامنے آیا۔ اس کے فوجی ٹائپ جوتوں سے مریم نے اندازہ لگا لیا کہ وہ انہی میں سے ایک ہے۔ اس نے شاید مریم کی آواز سن لی تھی ورنہ وہ اس طرف کیوں آتا! اندر آ کر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ باتھ روم میں جھانکا۔ پھر... الماری کھولی اور اس کے بعد مسہری کی طرف آیا۔ جب وہ گھٹنوں کے بل جھکا تو مریم نے خود کو ذہنی طور پر مرنے کے لیے تیار کر لیا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ نیچے جھانکتا، قالین پر پڑے مرد کے منہ سے کراہ نکلی۔ مسلح شخص اس کی طرف گھوما اور اس نے مرہٹی زبان میں کچھ کہا اور مرد کو گولی مار دی۔ مریم نے بے ساختہ چیخ روکی۔ ممکن ہے اس کے منہ سے کوئی آواز نکلی ہو مگر وہ فائر کی آواز میں دب گئی تھی۔ گولی مارنے والا شخص کمرے سے چلا گیا تھا۔ مریم نے بے شمار لاشیں دیکھی تھیں اور موت اس کے لیے کوئی اجنبی شے نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس موت نے اسے دہلا دیا تھا۔ اس کے منہ سے سسکیاں نکلنے کے لیے بے تاب تھیں جنہیں اس نے بہ مشکل روک رکھا تھا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ اسے رہ رہ کر فیاض کا خیال آنے لگا تھا۔ جب اسے یقین آ گیا کہ آس پاس کوئی نہیں ہے تو اس نے گھر کے نمبر پر کال کی۔ اس نے فیاض کے لیے ایک آیا کا بندوبست کر رکھا تھا۔ وہ مستقل گھر میں رہا کرتی تھی۔ کھانا بنانے کے علاوہ وہ فیاض کی دیکھ بھال بھی کرتی تھی۔ ''ماما... فیاض کہاں ہے؟''

''بڑی مشکل سے سلایا ہے... تم کہاں ہو... شہر کے حالات خراب ہیں۔''

''میں ڈیوٹی پر ہوں۔'' مریم نے جھوٹ بولا۔ ''میں کل صبح آؤں گی... آپ فیاض کا خیال رکھیں۔''

''تم بچے کی فکر مت کرو۔ اپنا خیال رکھنا۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ اسے بیٹری بچانی تھی۔ کیمرے والا موبائل اس نے پھر چارج پر لگا دیا۔ وہ دم سادھے لیٹی ہوئی تھی۔ وقفے وقفے سے فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مریم حیران تھی کہ یہ کتنے افراد تھے جو اس طرح پورے ہوٹل میں آزادی سے دندناتے پھر رہے تھے... لوگوں کو قتل کر رہے تھے اور بم دھماکے کر رہے تھے۔ ہوٹل سیکیورٹی تو شروع میں ناکام رہی تھی۔ پولیس والے بھی کچھ نہیں کر سکے تھے مگر فوجی کمانڈوز کیا کر رہے تھے؟ ان کو آنے میں اتنی دیر ہو چکی تھی۔ اب تک تو ہوٹل میں موجود بیشتر افراد مارے جا چکے تھے۔ جب یہاں لاشیں رہ جاتیں تو یہ نام نہاد کمانڈوز کسے بچانے آتے؟

اس نے ایس پی شرما جی کا نمبر ملایا۔ وہ انگیج تھا۔ اس نے شیام سے رابطہ کیا۔ وہ بے حد پُرجوش تھا۔

''مریم! تم نے کمال کر دیا۔ ایسی تصویریں اور ویڈیوز... میں نے فوری طور پر ان کو ایک رپورٹ کی صورت میں ویب سائٹ پر ڈال دیا ہے۔ تم یقین کرو گی کہ ایک گھنٹے میں ایک لاکھ افراد نے ویب سائٹ کھولی ہے۔ ہمارا سرور جواب دینے لگا ہے... ہمارا ویب ماسٹر ویب پیج کے مزید لنکس بنا رہا ہے تاکہ زیادہ لوگ وزٹ کر سکیں۔''

''شہر کی کیا صورتِ حال ہے؟''

''بہت بری ہے... کم سے کم سو افراد مارے جا چکے ہیں۔''

''یہ تعداد کم ہے... اتنے تو صرف اس ہوٹل میں مارے جا چکے ہیں... یہ چن چن کر مقامی افراد کو مار رہے ہیں اور غیر ملکیوں کو یرغمال بنا رہے ہیں... ان کے پاس بائیس غیر ملکی ہیں۔''

''ان کے عزائم کیا ہیں؟''

''کچھ پتا نہیں ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ یہ صرف قتل و غارت گری کرنے آئے ہیں۔''

''میڈیا پر بعض ٹی وی چینلز ان کے بارے میں ایک رپورٹ دکھا رہے ہیں۔ یہ خود کو مجاہدین کہہ رہے ہیں۔''

''بکواس کرتے ہیں... مجھے ان میں مسلمانوں والی کوئی بات نظر نہیں آئی ہے۔ یہ خالص ہندو لہجے میں مرہٹ زبان

بول رہے ہیں۔''

''تم یقین سے کہہ سکتی ہو؟''

''سو فیصد... میں نے جن چار افراد کو بولتے سنا ہے، وہ سب اسی لہجے میں بات کررہے تھے۔ میں نے ایف ایم پر جن کی آواز ریکارڈ کی ہے، تم وہ ریکارڈنگ سن سکتے ہو۔''

''میں نے سنی ہے۔''

''اس کے باوجود تم ان کو مسلمان سمجھ رہے ہو؟''

''دیکھو، ابھی معاملہ کلیئر نہیں ہے۔''

''مجھے یقین ہے، میں جو دیکھ اور سن رہی ہوں، وہی درست ہے۔ اور سنو! میرے بارے میں یہ بات تم دونوں سے آگے نہ جائے کہ میں اس ہوٹل میں ہوں۔ ورنہ مجھے یقین ہے کہ یہ مجھے تلاش کرکے مار دیں گے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ یہ کوئی سرکاری ڈراما ہے۔''

''زیادہ امکان ہے... ہماری سرکار اس قسم کے بھونڈے ڈرامے کرتی رہتی ہے جو ہمیشہ فلاپ ہو جاتے ہیں۔ او کے... بائے!''

دو بجے تک اس نے دونوں موبائل چارج کر لیے تھے۔ اسے فائر بریگیڈ گاڑیوں کے سائرن کی آوازیں سنائی دیتی رہی تھیں۔ اس نے محتاط ہو کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اسے ایک طرف فائر بریگیڈ والے اسنارکل لگا کر ہوٹل میں لگی آگ بجھاتے دکھائی دیے۔ اسے حیرت ہوئی کہ ممبئی کے فائر بریگیڈ والے اتنے جیالے ہو گئے کہ ایک ہوٹل میں مسلح دہشت گردوں کی موجودگی سے بے پروا ہو کر آگ بجھا رہے تھے جبکہ اندر وہ خود ہتھیاروں اور بموں سے قتلِ عام کرتے پھر رہے تھے۔ نیچے پولیس والے بھی کسی آڑ کے بغیر یوں کھڑے تھے جیسے ان کو اندر سے کوئی خطرہ نہ ہو۔ اگر مریم ان دہشت گردوں کی ساتھی ہوتی تو بہ آسانی تین چار افراد کو نشانہ بنا سکتی تھی۔

جس وقت فائر بریگیڈ کا عملہ آگ بجھانے کی کوشش کر رہا تھا اس وقت بھی ہوٹل کی مختلف منزلوں سے فائرنگ کی آوازیں آرہی تھیں۔ مریم کے اندر احساس بڑھتا جا رہا تھا کہ جو بھی ہو رہا ہے بڑے ہی بھونڈے پن سے ہو رہا ہے۔ اسے یہ حیرت بھی تھی کہ اب تک ہوٹل کی بجلی منقطع نہیں کی گئی تھی اور اندر موجود لوگوں کو پوری سہولت دی جا رہی تھی کہ وہ مسافروں کو بے فکری سے قتل کریں۔ حالانکہ روشنی بند کر دی جاتی تو بے شمار لوگ چھپ سکتے تھے اور فرار ہو سکتے تھے۔ مریم بجلی جانے کا انتظار کرتی رہی تاکہ باہر نکل سکے مگر جب دو بجے بھی بجلی بند نہیں ہوئی تو وہ جرأت کرکے باہر آئی۔ اس نے نیچے جانے کے بجائے اوپر کا رخ کیا۔ دوسری منزل کے وسطی ہال میں کم سے کم بارہ افراد کی لاشیں بکھری تھیں۔ مریم نے ان کی تصویریں لیں اور مختلف کمروں میں جھانکنے لگی۔ کمرے خالی تھے یا ان میں لاشیں پڑی تھیں۔

تین بجے مریم نے واکی ٹاکی پر کی جانے والی ایک اور گفتگو ریکارڈ کی۔ ''کمانڈوز آگئے ہیں۔'' ایک آدمی نے کسی سے کہا۔

''فکر مت کرو... ہمیں ان سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔'' دوسرے نے جواب دیا۔

''کہیں ہم مارے نہ جائیں؟''

''ہم سے وعدہ کیا گیا ہے کہ...''

''حرامجادوں...'' کوئی تیسرا شخص گرجا۔ ''تم بکواس کر رہے ہو... کوئی سن رہا ہوگا۔''

''سوری کمانڈر!'' پہلے والے نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

مگر دوسرا کسی قدر جرأت مند تھا۔ ''ہمیں خدشہ ہے کہ یہ ہمیں مار دیں گے۔''

''لگتا ہے تو مرنا ہی چاہتا ہے۔'' ڈانٹنے والے نے دانت پیسے۔

اس کے بعد کوئی نہیں بولا تھا۔ اس گفتگو سے مریم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان لوگوں سے کسی نے وعدہ کیا تھا کہ ان کو بچا لیا جائے گا اور یہ اب خدشات کا شکار تھے۔ ایسے وعدے ان سے کون کر سکتا تھا؟ ظاہر ہے، وہی جو اس معاملے میں بااختیار تھا یعنی سرکار... مگر کیا سرکار ان دہشت گردوں کو چھوڑ سکتی تھی؟ ان لوگوں سے ایسا وعدہ کیوں کیا گیا تھا؟ مریم نے سارے واقعات جو اس کے سامنے ہو رہے تھے، ترتیب وار وقت اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ اپنی نوٹ بک میں درج کر لیے تھے۔ یہ بعد میں تفصیلی رپورٹ بناتے ہوئے اس کے کام آتے۔ اس کے پاس ایک مختصر سا ڈیجیٹل وائس ریکارڈر تھا جو چار گھنٹے کی ریکارڈنگ کر سکتا تھا۔ وہ وقفے وقفے سے اپنے تاثرات اس میں بھی ریکارڈ کر رہی تھی۔

اس نے اوپری منزلوں میں سرگرم عمل مسلح افراد کی تصویریں لیں اور اپنی جان خطرے میں ڈال کر مووی بھی بنائی تھی۔ صبح چار بجے تک وہ یہی کرتی رہی۔ اس دوران میں اس کا گوپال اور شیام سے برابر رابطہ رہا تھا۔ وہ ان کو تصویریں اور مووی بھجوانے کے علاوہ رپورٹ بھی لکھوا رہی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ وہ کسی وقت بھی پکڑی جا سکتی تھی اور اسے مار دیا جاتا تو یہ ساری چیزیں بے کار رہ جاتیں یا ضائع

کر دی جاتیں۔

پانچ بجے وہ نیچے آئی تو اس نے یہ دیکھ کر سکون کا سانس لیا کہ نچلی منزلوں کی روشنی بند تھی مگر یہ انتظامیہ یا سرکار کا کام نہیں تھا بلکہ کسی فنی خرابی یا کسی دھماکے کی وجہ سے بجلی بند ہوئی تھی۔ حیرت انگیز طور پر ہوٹل کے باہر کا سارا علاقہ بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ میڈیا اور سیکیورٹی والے کھلے عام بغیر کسی آڑ کے گھوم پھر رہے تھے۔ مریم سوچ رہی تھی کہ یہ کس قسم کے دہشت گرد تھے جو صرف ہوٹل میں موجود افراد کو مار رہے تھے اور باہر موجود افراد سے... جن میں ان کے دشمن کمانڈوز بھی تھے، ان سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ یہ سب واضح طور پر مصنوعی لگ رہا تھا۔

مریم اس کمرے میں آئی جہاں وہ پہلے بھی چھپی تھی۔ اسے امید تھی کہ صبح سے پہلے آرمی کمانڈوز حملہ کرکے ہوٹل کو ان دہشت گردوں کے قبضے سے چھڑا لیں گے مگر صبح ہو گئی... اور باہر سے کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ اس کے برخلاف اندر دہشت گرد دھماکے کرتے اور گولیاں چلاتے رہے تھے۔ مریم کئی بار ادھر سے ادھر چھپتی رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر ان لوگوں نے اسے پالیا تو قتل کر دیں گے۔ ساتھ ہی وہ ان کی تصویریں اور ویڈیو بنا کر ارسال کرتی رہی تھی۔ اس نے کئی بار ان لوگوں کی آواز بھی ریکارڈ کی۔

ہوٹل کے تین فلورز پر کم سے کم ستر لاشیں تھیں اور یہ سب عام بے گناہ لوگ تھے۔ ان میں کوئی درجن بھر غیر ملکی تھے۔ دھماکوں کی وجہ سے بجلی اور پانی کی لائنیں متاثر ہوئی تھیں۔ کبھی بجلی چلی جاتی تھی اور کبھی آجاتی تھی۔ البتہ پانی مستقل طور پر بند ہو گیا تھا۔ مریم سوچ رہی تھی کہ وہ یہاں سے زندہ جا سکے گی یا نہیں؟

☆☆☆

گزشتہ پانچ ہفتوں میں حالات اتنی تیزی سے اور اتنی بار بدلے کہ خود مریم بھی حیران رہ گئی تھی۔ پہلے تو میڈیا اور حکومت نے مل کر ان واقعات کا سارا الزام پاکستان پر تھوپ دیا اور اس بارے میں اتنی مضحکہ خیز خبریں اور ڈاکومینٹریز بنائیں جن کا اپنے ملک میں مضحکہ اڑنے لگا تھا۔ اس کے بعد جب مریم کی رپورٹس مع تصاویر، ویڈیوز اور ریکارڈ آوازوں کے ساتھ سامنے آئیں تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ سرکاری حلقوں اور شاؤنسٹ ہندو پریس و میڈیا نے اس پر سخت ردعمل ظاہر کیا اور اس کی رپورٹ کو جعلی قرار دیا گیا۔ عوام میں بھی ایک خاص لہر دوڑ گئی۔ اس لیے گوپال کو گالیوں اور ملامتوں سے بھرے خطوط اور ای میلز آنے لگی تھیں۔ مگر اس کا تھوڑا بہت اثر یہ ہوا تھا کہ سرحد پار الزام لگانے والے اچانک دفاعی پوزیشن میں آگئے تھے۔

مگر دو ہفتے بعد سرکار نے اچانک قلابازی کھائی اور تمام حملہ آوروں کو پاکستانی قرار دے کر ان کے نام بھی شائع کر دیے تھے۔ مریم حیران تھی۔ اس نے جن چھ سات افراد کو دیکھا تھا، وہ سب مقامی لوگ تھے اور خالص ہندو لگ رہے تھے اور وہ مرہٹی زبان میں بات کر رہے تھے۔ جب وہ اردو بولتے تو بھی ان کا لہجہ مرہٹی ہوتا مگر تمام بھارتی میڈیا اور سرکار و سیاست دان ایک زبان ہو کر پاکستان کو موردِ الزام ٹھہرا رہے تھے۔ مریم اس وقت بہت زیادہ حیران ہوئی جب پاکستان کی حکومت نے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا تھا اور یہ الزام تسلیم کرنے کے مترادف تھا۔ اس کے بعد مریم کی رپورٹ اور اس کے پیش کردہ ثبوتوں کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی۔

اس کے بعد اسے دھمکی آمیز کالز آنے لگیں۔ ستائیس دسمبر کے دن وہ آفس سے واپس آئی تو اسے اپنے فلیٹ کے دروازے پر ایک پارسل نظر آیا۔ اس نے ڈر کر پولیس کو کال کر دی۔ پولیس والے بم ڈسپوزل اسکواڈ کے ساتھ آئے اور دو منٹ میں انہوں نے پارسل کو کلیئر قرار دے دیا۔ اندر سے صرف ایک سربریدہ گڑیا نکلی تھی جس کے سینے پر مار کر سے ایم لکھا تھا۔ مریم خوف زدہ ہو گئی تھی۔ کیا یہ اسے اور اس کے بچے کے لیے دھمکی تھی کیونکہ ایم کے آخر میں دو ڈنڈیاں لگا کر اسے اس طرح MF الیف بھی بنا دیا تھا۔

اس نے گوپال سے بات کی۔ ''مجھے یہاں اپنی جان خطرے میں لگ رہی ہے۔ میں چند دن کے لیے منظرِ عام سے ہٹنا چاہتی ہوں۔''

''تم گھبرا رہی ہو۔'' گوپال نے اسے تسلی دی۔ ''یہ ایسے ہی گرجنے والے بادل ہیں۔''

''نہیں، اس ملک میں انتہا پسند اتنے طاقتور ہو گئے ہیں کہ اعلیٰ پولیس افسران کو بے دھڑک قتل کر سکتے ہیں تو ان کے لیے مجھے مارنا کیا مشکل ہے۔''

''او کے... تم کہاں جانا چاہ رہی ہو؟''

''بے ایک جگہ... جہاں میں پورے سکون اور اطمینان سے رہ سکتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''ممکن ہے، میں ایک ہفتے میں لوٹ آؤں۔''

''نہیں، تم... آرام سے آنا... اس وقت تک اس معاملے کی گرد بھی بیٹھ جائے گی۔''

''ہاں... شاید!'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

''تمہیں کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک مجھ سے

رابطہ کرلینا۔''
''تھینک یو گوپال!'' اس نے کہا اور فون رکھ دیا۔
''ماما! ہم کہاں جارہے ہیں؟'' فیاض نے اس سے پوچھا۔
''آپ کے نانا ابو کے گھر۔''
''سچ ماما!'' فیاض خوش ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆

''مریم... میری بچی!'' فادر اسے دیکھ کر خوش ہو گئے تھے، وہ عہد نامہ پڑھ رہے تھے۔
''فادر!'' مریم ان کے سینے سے لگ گئی۔ وہ سیدھی چرچ میں آئی تھی۔
''کیسی ہو تم؟'' انہوں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''پریشان ہو؟''
''جی فادر!'' اس نے کہا اور فیاض سے بولی۔ ''آپ نانو کے پاس جاؤ۔''
''جی ماما!'' اس نے فرماں برداری سے کہا اور چلا گیا۔
''فادر! آپ حالات سے واقف ہیں۔'' اس نے کہا اور آہستہ آہستہ انہیں تمام واقعات بتائے اور اپنے آنے کی وجہ بھی بتادی۔
فادر جوزف نے گہری سانس لی۔ ''مجھے اس کا خطرہ تھا۔ میں سب دیکھ رہا تھا۔ بات یہ ہے میری بچی کہ ہم سچائی برداشت کرنے کے قابل نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ ہم جھوٹ کی تاریکی میں جارہے ہیں۔ ہم خود کو بربادی کی طرف لے جارہے ہیں۔''
''اس سے بھی زیادہ بری بات یہ ہے کہ ہم اس کے بارے میں سچ سننا بھی نہیں چاہتے۔''
''بس خدا ہی ہمارے حال پر رحم کرے۔''
''فادر! میں کچھ دن آپ کے پاس رہوں گی۔''
''مریم! میری خواہش ہے کہ تم میرے پاس آجاؤ۔''
''فادر! یہ کس طرح ممکن ہے۔''
''ممکن ہے میری بچی... مالی طور پر کوئی مسئلہ نہیں ہے... تم یہاں رہ کر بھی کام کرسکتی ہو۔ فیاض اسکول میں پڑھ سکتا ہے۔''
مریم ہچکچائی۔ ''ممکن ہے... اس کا باپ... مسلم کمیونٹی اس بات کو پسند نہ کرے کہ ایک مسلم بچہ مشن چرچ اسکول میں رہے اور تعلیم حاصل کرے۔''
''ہم اس معاملے میں ضمانت دے سکتے ہیں... فیاض مسلمان بچہ ہے اور اس کی پرورش ایک مسلمان کے طور پر کی جائے گی۔''
''فادر... یہ معاملہ بہت پیچیدہ ہے۔''
''ہم اسے سلجھا تو سکتے ہیں۔''
''فادر! مجھے ڈر ہے کہ اس بہانے ریاض... میرا بچہ مجھ سے نہ چھین لے۔''
''جیسی تمہاری مرضی!'' فادر نے سرد آہ بھری۔
''تمہارے جانے کے بعد ہمارا گھر سُونا ہو گیا تھا۔ سچ پوچھو تو میں اور سمانتا دن گن گن کر گزارتے ہیں کہ تم کب آؤ گی۔''
''مجھے آپ کی محبت پر ناز ہے۔''
''آؤ چلو... تمہاری ماں انتظار کر رہی ہو گی۔'' فادر کھڑے ہو گئے۔
چند دن بعد مریم کسی قدر اطمینان محسوس کرنے لگی تھی۔ شانتی نگر اس کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ تھی۔ یہاں آکر اسے ہمیشہ تحفظ اور اطمینان کا احساس ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ صرف احساسات کی بات ہے۔ جس جگہ سے ہماری اچھی یادیں اور ہمارے پیارے منسلک ہوں، اس جگہ ہمیں تحفظ کا احساس ہوتا ہے اور ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ موت سے کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔ وہ تو ماؤں کی گود سے بچے چھین کر لے جاتی ہے۔
شانتی نگر ذرا بلندی اور ہمالیہ سے نزدیک ہونے کی وجہ سے سرد علاقہ تھا۔ یہاں گرمیوں میں بھی موسم خوش گوار رہتا تھا اور سردیوں میں خاصی سردی پڑتی تھی۔ کبھی کبھار تو برف باری بھی ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی موسم بے حد سرد تھا۔ درخت پتوں سے محروم تھے اور سبزہ مرجھایا ہوا تھا۔ یہ موسم اداس کرنے والا تھا۔ اس کے باوجود مریم کو اچھا لگتا تھا۔ وہ اکثر شام کو باہر نکل جاتی تھی۔ کبھی اکیلے... اور کبھی کسی کے ساتھ! فیاض کو وہ شام کے وقت باہر لانے سے گریز کرتی تھی کہ کہیں اسے ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ اکثر فادر اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ اس شام بھی فادر اس کے ساتھ تھے۔ وہ ٹہلتے ہوئے عقبی قبرستان کی طرف آنکلے تھے۔
''فادر! یہاں کتنا سکون ہے۔'' اس نے شال اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔
''ہاں... کیونکہ یہاں موجود لوگ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے اور نہ ایذا دیتے ہیں۔''
''فادر! میرا دل چاہتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے یہاں آ جاؤں مگر...'' اس نے سرد آہ بھری۔
''میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں میری بچی۔'' فادر نے اسے شفقت سے دیکھا۔ ''میں نے تم پر کبھی کسی معاملے میں زور نہیں دیا۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے بارے میں بہتر فیصلہ کرسکتی ہو۔''

''شکریہ فادر... مجھے بھی یقین ہے... آپ سے زیادہ س اور شفیق شخصیت میرے لیے کوئی اور نہیں ہے۔ اس آپ میری بہتر... راہنمائی کریں گے۔ فادر! آج میں سے مشورہ لینا چاہتی ہوں۔''
''کس سلسلے میں میری بچی؟''
''اس معاملے میں... جس نے مجھے گزشتہ دس سال سے بے سکون رکھا ہے... فادر! میں کیا ہوں؟''
''اوہ... تم اس معاملے میں مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''
''فادر! میں چاہتی ہوں... آپ مجھے...''
مریم کی بات ادھوری رہ گئی۔ اسے شدید جھٹکا لگا اور جب وہ پشت کے بل زمین پر گر رہی تھی تو اس نے فائر کی آواز سنی۔ فادر اسے سنبھالنے کے لیے لپک رہے تھے اور اسے یہ سب سلوموشن میں نظر آرہا تھا۔ زمین پر گرنے سے پہلے فادر نے اسے تھام لیا تھا۔ وہ گھبرائے ہوئے اور خوف زدہ تھے۔
''یہ کیا ہوا ہے؟''
مریم نے شال ہٹائی، تب اس نے زخم دیکھا جو بائیں پسلو پر دل کے مقام سے ذرا ہی نیچے تھا اور اس سے خون ابل تھا۔ اسے گولی لگی تھی۔ وہ جان گئی تھی کہ اسے مارنے والے کون تھے۔ اس لیے یہ بات بے کار تھی کہ گولی چلانے ہاتھ کس کا تھا۔ گولی قبرستان کے ساتھ جنگل سے چلائی گئی تھی۔ فادر جوزف نے اس کا زخم دیکھا اور جان گئے کہ وقت بے حد کم ہے۔ انہوں نے اسے زمین پر لٹایا۔
''میں ایمبولینس کے لیے کال کر کے آتا ہوں۔'' ان کا لہجہ گلوگیر ہو رہا تھا۔
مگر مریم بھی جان گئی تھی۔ اس نے فادر کو روک لیا۔ ''نہیں فادر... وقت کم ہے... میری بات سنیں... ایسا نہ ہو وقت نکل جائے۔''
''میری بچی...'' فادر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور اس کا سر زانوں پر رکھ لیا۔
''فادر... مجھے بتائیں... میں کیا کروں؟'' مریم نے پوچھا۔
''میں کیسے بتاؤں میری بچی!''
''فادر! اگر آپ میری جگہ ہوتے... اور آپ نے دیر بعد خدا کے پاس جانا ہوتا تو آپ کس حیثیت سے پسند کرتے؟'' مریم ہمت کر کے جلدی جلدی بول رہی
''میری بچی... یہ تم نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا ہے؟''
''فادر پلیز! میرے پاس وقت کم ہے۔''
فادر جوزف نے اس کا ہاتھ لے کر ہونٹوں سے لگایا۔ ''میری بچی... تمہیں اپنی اصل شناخت کی طرف لوٹ جانا چاہیے... یہی سب سے بڑی اور پوری سچائی ہے۔''
''شکریہ فادر...'' اس نے کہا اور آہستہ سے کلمہ پڑھا۔ ''فادر آپ گواہ ہیں نا؟''
''ہاں میری بچی... مجھے نہیں معلوم... اس دنیا میں میری کیا حیثیت ہو گی... لیکن میں تیرے لیے گواہی ضرور دوں گا۔''
''شکریہ فادر... میری آخری خواہش ہے کہ فیاض آپ کے زیرِ سایہ پرورش پائے... میں اسے پورا سچا انسان بنانا چاہتی ہوں۔''
''میں تمہاری خواہش پوری کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔''
''مجھے یقین ہے فادر!'' مریم نے مدھم ہوتے ہوئے لہجے میں کہا اور اچانک چپ ہو گئی۔
''مریم!'' فادر نے اسے خوف زدہ ہو کر آواز دی۔ مگر وہ کچھ کہنے اور سننے کی حد سے دور جا چکی تھی۔ فادر نے اس کی سرد پڑتی پیشانی چومی اور اس کا سر نیچے رکھ دیا۔ ''میری بچی... تم نے اپنے کمزور باپ پر بہت زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے۔ وہ اتنا سچا آدمی نہیں ہے۔ وہ بزدل ہے... اس لیے جھوٹ کی پناہ لے لی۔ سچ کی طرف نہ آسکا۔''
وہ تھکے قدموں سے چرچ کی طرف جانے لگے۔

☆☆☆☆

دس سال بعد

نوجوان اور تر و تازہ فیاض جانے کے لیے تیار تھا۔ اس نے بوڑھے فادر جوزف کو گلے سے لگایا۔ ''میں جلد آؤں گا۔''
''نہیں میرے بچے... تم آنے کے لیے نہیں، اپنے مستقبل کے بارے میں سوچو۔''
''فادر! آپ میری زمین ہیں اور کوئی اپنی زمین سے ناتا نہیں توڑ سکتا۔ آپ نے مجھے سچائی کی تعلیم دی ہے۔ میں اس پر عمل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔''
''اپنی ماں کی طرح!'' فادر جوزف نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
فیاض کے جانے کے بعد اس نے خود سے کہا۔ ''وہ بہادر تھی اور میں بزدل ہوں۔ ابھی تک ادھورے سچ کے ساتھ جی رہا ہوں۔''

www.urdutech.com

دوسرا رنگ

بازگشت

حسام بٹ

محبت میں مبتلا چند افراد کا فسانۂ سود و زیاں۔ رنگ اور عکس کی دنیا کے وہ باسی تصنع سے قطع نظر کچھ حقیقی احساسات بھی رکھتے تھے!

کمرے کی فضا بڑی خاموش اور پُرسکون تھی لیکن اس سکوت اور سکون کے اندر ایک عجیب سی گمبھیرتا پائی جاتی تھی، ماحول میں اداسی اور دل شکستگی شامل تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سب کچھ موجود ہونے کے باوجود بھی کہیں کچھ دکھائی نہ دیتا ہو... اور یہ سوگوار سی کیفیت نوید کے اندر باہر ہر طرف طاری تھی۔ نوید کمرے کے اندر تھا اور اس کے اندر مایوسی کا دھواں بھرتا چلا جا رہا تھا...!

نوید کا تعلق شوبزنس سے تھا۔ اس نے اس دنیا کے مختلف شعبوں میں نہ صرف کام کیا تھا بلکہ بعض شعبوں میں اس نے مہارت بھی حاصل کر رکھی تھی۔ وہ اس وقت ایک پروڈکشن ہاؤس سے وابستہ تھا اور بہ طور ایڈیٹر ڈائریکٹر کام کر رہا تھا۔ ایڈیٹنگ روم اس کے لیے کسی گوشہ تنہائی سے کم نہیں تھا۔ وہ جب اس کمرے میں بند ہوتا تو گویا باہر کی دنیا کی ہر شے سے بے نیاز ہو جاتا تھا۔

وہ اس وقت بھی ایڈیٹنگ روم میں موجود تھا لیکن بے نیازی سے بہت دور... پیچ و تابی کی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ اسے خود پر غصہ آرہا تھا، اپنے کام پر غصہ آرہا تھا، اپنے باس یعنی پروڈکشن ہاؤس کے مالک ہمایوں اختر پر غصہ آرہا تھا اور سب سے بڑھ کر موجودہ حالات پر اس کا دل جل رہا تھا، وہ حالات جنہوں نے پاکستان اور انڈیا کے بین الاقوامی تعلقات میں اچھی خاصی کشیدگی پیدا کر دی تھی۔ اس ماحول اور فضا میں اس سیریل پر مزید کام نہیں ہو سکتا تھا جس کا بیڑا نوید نے اٹھایا تھا۔ وہ اس سیریل کا پائلٹ اپی سوڈ تیار کر چکا تھا جو سپر ہٹ گردانا گیا تھا لیکن پاک بھارت کشیدگی کے پیشِ نظر اس پراجیکٹ کی پروڈکشن کھٹائی میں پڑ گئی تھی اور اس کا سبب سیریل کا کانسپٹ تھا۔ پروڈکشن ہاؤس کے مالک ہمایوں اختر صاحب بہت محتاط آدمی تھے۔ ان کے خیال میں، موجودہ حالات میں اس سیریل کا آن ائر جانا گویا بھُس کے ڈھیر میں چنگاری پھینکنے کے مترادف تھا۔ سیریل کی ہیروئن بنیادی طور پر ایک مسلمان لڑکی تھی لیکن اس کا تعلق معاشرے کے اتنے بلند طبقے سے تھا کہ جہاں مذہب وغیرہ کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ تاہم اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں تھا۔ وہ اپنے ہی طبقے میں بسنے والے ایک ہندو لڑکے کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ اپنی محبت کے کھیل میں وہ بار بار اللہ اور اوم میں الجھ کر رہ جاتی تھی۔ اس سیریل کا اینڈ اگرچہ بڑا مثبت اور منطقی تھا لیکن اینڈ تک پہنچنے سے پہلے ہی لوگوں کے جذبات بڑے روایتی انداز میں اپنا ''کام'' دکھا چکے ہوتے... جبھی ہمایوں اختر نے اس پراجیکٹ پر ہاتھ روک دیا تھا۔

نوید کو ''نوٹان پروڈکشنز'' میں کام کرتے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ خود کو خاصا بے بس اور مجبور محسوس کر رہا تھا۔ وہ ایڈیٹنگ مشین کے سامنے بیٹھا اس سیریل کے ٹائٹل کو، ایل سی ڈی پر دیکھ رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

نوید نے ایل سی ڈی پر سے نگاہ ہٹا کر ٹیلے فون سیٹ کی جانب دیکھا۔ اس نے خود سے متعلق تمام افراد کو یہ ہدایت کر رکھی تھی کہ ایڈیٹنگ پراسس کے دوران میں کوئی اسے ڈسٹرب نہ کرے۔ اس فون کال کا مطلب یہی تھا کہ کوئی بہت ہی اہم معاملہ ہے۔ تیسری گھنٹی پر اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا اور بوجھل آواز میں کہا۔

''ہیلو...!''

☆☆☆

شام کے آٹھ بجے تھے۔ عارف اپنے کمرے میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا کچھ ضروری کام کر رہا تھا۔ وہ نوٹان پروڈکشنز میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔

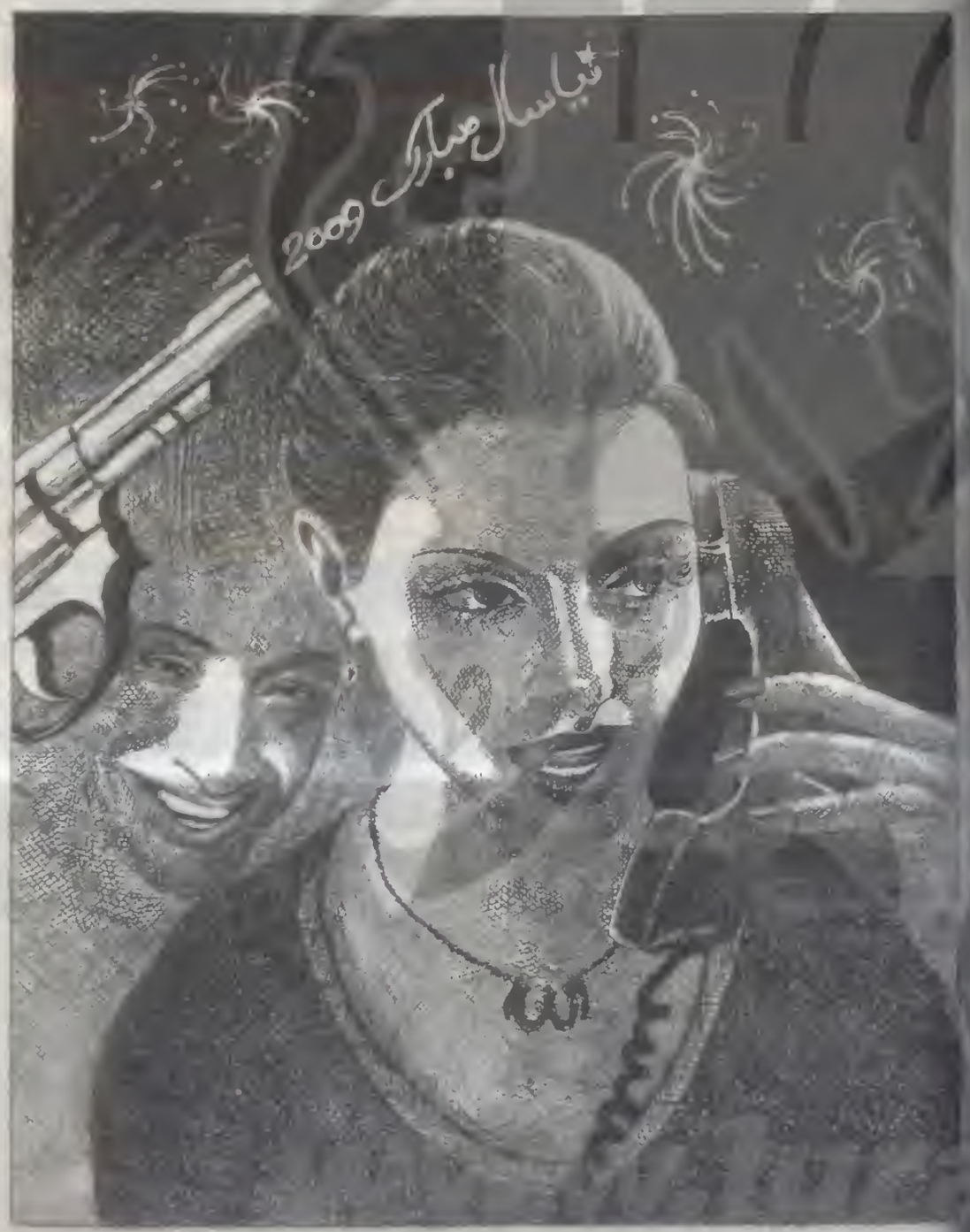

...ں کی ڈیوٹی ایڈیٹر ڈائریکٹر نوید کے ساتھ تھی۔ عارف کو نوید ...ساتھ کام کرتے ہوئے بہت کچھ سیکھنے کا موقع مل رہا تھا۔ ...وران میں وہ اتنا اعتماد حاصل کر چکا تھا کہ اپنے بل ...پر اکیلا بھی ڈائریکشن دے سکتا تھا۔ نوید اس کے اعتماد ...صلے کو بڑھانے کے لیے اس سے چھوٹے موٹے انڈی...ٹ کام لیتا رہتا تھا۔

...دروازے پر ہونے والی ہلکی دستک نے عارف کو چونکا... اس نے کمپیوٹر ڈسپلے سے نظر ہٹا کر دروازے کی طرف ...۔ آفس بوائے، نوید اور اسٹاف کے دیگر افراد دستک ...بغیر اس کے کمرے میں آجایا کرتے تھے۔ دستک کا مطلب یہی سمجھ میں آتا تھا کہ کوئی باہر سے آیا ہے۔

''آجائیں بھئی... کون ہے؟'' عارف نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

اگلے ہی لمحے مخصوص آواز کے ساتھ دروازہ کھلا اور ایک حسین چہرہ وہاں نمودار ہوا۔

''میڈم... آپ!'' بے ساختہ عارف کے منہ سے نکلا اور وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا..... ''آپ کو دستک دینے کی کیا ضرورت ہے... پلیز، تشریف لے آئیں۔''

عارف نے جس دلکش شخصیت کو ''میڈم'' کہا تھا، اس کا نام ماریا تھا۔ ماریا کا تعلق بھی پروڈکشن وغیرہ ہی سے تھا۔ کچھ

عرصہ پہلے وہ فوٹان پروڈکشنز ہی کا حصہ تھی لیکن اب اس نے پروڈکشن ہاؤس کو چھوڑ کر ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل جوائن کرلیا تھا۔ ماریا بہرحال، ہر لحاظ سے عارف سے کہیں سینئر تھی لہٰذا وہ اس کا بے حد احترام کرتا تھا اور اس احترام میں ماریا کے رعب حسن کا بھی غالب ہاتھ تھا۔ بلاشبہ وہ عارف کو بہت اچھی لگتی تھی۔

ماریا شان بے نیازی سے چلتے ہوئے کمرے کے اندر پہنچی پھر بہ آہستگی ایک آرام دہ نشست پر بیٹھ گئی۔ عارف کا کمرا کسی میٹنگ روم کا منظر پیش کرتا تھا۔ ایک کونے میں اس کی ٹیبل چیئر لگی تھی۔ دائیں ہاتھ پر ایک خوب صورت ریک سسٹم بنا ہوا تھا جہاں متعلقہ استعمال کی مختلف اشیا رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے باقی ماندہ حصے میں وزیٹرز کے لیے آرام دہ سیٹنگ بنائی گئی تھی۔ نوید کے ملاقاتی یہیں آتے تھے اور ابتدائی طور پر عارف ہی انہیں اٹینڈ کرتا تھا۔ نوید تک صرف وہی لوگ پہنچتے تھے جن سے ملنا وہ ضروری خیال کرتا تھا۔ باقی لوگوں کو عارف ہی بھگتا دیا کرتا تھا۔

ماریا کا شمار ان افراد میں ہوتا تھا جنہیں فوٹان پروڈکشنز کے اکثر لوگ بڑی اہمیت دیتے تھے۔ وہ ایک طویل عرصے تک ان کی کولیگ رہی تھی۔ عارف اس وقت تک اپنی سیٹ پر بیٹھ نہیں گیا جب تک ماریا نے نشست نہیں سنبھالی۔ ماریا نے گہری سنجیدگی سے عارف سے استفسار کیا۔

''آپ کے صاحب اسٹوڈیوز میں موجود ہیں؟''

عارف نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''جی میڈم... وہ ایڈیٹنگ روم میں ہیں۔''

بات ختم کرتے ہی عارف نے ٹیلے فون سیٹ کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ ماریا یہی سمجھی کہ وہ نوید کو اس کی آمد کی اطلاع دینے جا رہا ہے۔ وہ گہری نظر سے عارف کو دیکھنے لگی۔

عارف نے نمبر ڈائل کرنے سے پہلے بہ صد احترام پوچھا۔ ''میڈم! چائے چلے گی یا کافی...؟''

''کچھ نہیں...'' وہ سادگی سے بولی۔ ''میں جلدی میں ہوں۔ بس، آپ کے صاحب سے مل کر واپس چلی جاؤں گی۔''

عارف نے ریسیور کو ہاتھ میں تھامے تھامے ماریا سے دریافت کیا۔ ''میڈم! خیریت تو ہے نا...؟''

''سب خیریت ہے۔'' وہ سرسری لہجے میں بولی۔ ''آپ کو کیا لگ رہا ہے عارف...؟''

وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا کر رہ گیا پھر متذبذب لہجے میں بولا۔ ''مجھے آج بڑا عجیب سا محسوس ہو رہا ہے...!''

''عجیب سا کیا...؟'' وہ بڑی توجہ سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

عارف، ماریا کی خوب صورتی اور بے باکی سے ذہنی طور پر پہلے ہی متاثر تھا۔ اس بے دھڑک سوال نے اسے الجھا کر رکھ دیا۔ تاہم جواب دینا بھی ضروری تھا۔ وہ سنبھالا لیتے ہوئے بولا۔

''میڈم! آج آپ ناک کر کے میرے کمرے میں آئیں، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ میں نے چائے کافی کی پیشکش کی، آپ نے بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا... اور سب سے بڑی بات یہ کہ آج آپ کے چہرے پر اور آنکھوں میں وہ رعنائی اور توانائی دکھائی نہیں دے رہی جو آپ کا خاصہ ہے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ کوئی گڑبڑ ہے، آپ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہیں...'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر ماریا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

''میڈم! کیا میں غلط کہہ رہا ہوں...؟''

''نہیں...'' وہ پوری قطعیت سے بولی۔ ''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے عارف صاحب!''

''میڈم... آپ کسی معاملے پر پریشان ہیں؟'' عارف نے ہمدردی بھرے انداز میں دریافت کیا۔

''میں پریشان نہیں، بلکہ الجھن کا شکار ہوں...'' وہ متاسفانہ لہجے میں بولی۔

عارف نے بے ساختہ کہا۔ ''ایک ہی بات...!''

ماریا چونک کر عارف کو دیکھنے لگی۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''میڈم! میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟''

''ہاں...!'' ماریا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ایک بوجھل سانس خارج کی۔

''کک... کیا...؟'' وہ کنفیوزڈ انداز میں مستفسر ہوا۔

''آپ مجھے میڈم کہنا چھوڑ دیں...!'' ماریا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جیسے دوسرے لوگ پکارتے ہیں، ایسے آپ بھی مجھے ماریا ہی کہا کریں۔''

''جی میڈم... میرا مطلب ہے، جی ماریا...'' وہ گڑبڑا کر بولا۔

''شاباش!'' ماریا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ ''عارف صاحب! اب آپ نوید صاحب کو بتائیں کہ میں ان سے ملنے آئی ہوں۔ وہ یہاں آئیں گے یا مجھے ان کے پاس جانا ہوگا...!''

''ٹھیک ہے۔'' عارف نے فرماں برداری سے کہا اور ایڈیٹنگ روم کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

ماریا ایک ٹک اسے دیکھنے لگی۔

برجستگی

دلی سے مشہور شاعر انور صابری کراچی آئے ہوئے تھے۔ ان کا قیام زاہر قاسمی کے ہاں تھا۔ ایک روز دوپہر کا کھانا ہو رہا تھا۔ مہمان، میزبان اور کئی ملاقاتی دسترخوان پر موجود تھے۔ کھانے کے ساتھ پورا انصاف کیا جا رہا تھا۔ اتنے میں ایک صاحب اور آ گئے۔ میزبان نے ان سے کہا ''آ جائیے، کچھ تناول فرمالیجیے۔''

وہ صاحب کہنے لگے ''بھوک تو نہیں ہے لیکن تھوڑا بہت کھالوں گا تاکہ آپ کا نمک خوار ہو جاؤں۔'' قاری زاہر قاسمی نے برجستہ کہا۔

''ہمارے ہاں کھانے میں نمک نہیں پڑتا آپ خوار ہی خوار ہوں گے۔''

تلاش: ڈاکٹر اے آر بھٹی راجپوت

☆☆☆

''ہیلو... نوید بھائی!'' عارف کی مخصوص آواز نوید کی سماعت سے ٹکرائی۔

''ہاں عارف بولو... کوئی خاص بات؟'' نوید نے سرسری انداز میں کہا۔

عارف جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''نوید بھائی! میڈم ماریا آئی ہیں...!''

جملہ مکمل کرتے ہی عارف نے معذرت خواہانہ انداز میں ماریا کی طرف دیکھا۔ مطلب یہ کہ وہ اسے ''میڈم'' کہنے کی غلطی دوبارہ کر چکا تھا حالانکہ چند لمحے پہلے اس نے ماریا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے میڈم نہیں کہے گا۔ عارف کے چہرے پر ابھرنے والے خفت آمیز تاثرات کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد ماریا معنی خیز انداز میں مسکرا دی تاہم اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔

نوید نے کہا۔ ''ٹھیک ہے عارف... ماریا کو میرے پاس بھیج دو...!''

''جی نوید بھائی...'' یہ کہتے ہوئے عارف نے ریسیور کریڈل کر دیا۔

ماریا نے سوالیہ نظر سے عارف کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''نوید بھائی آپ کو ایڈیٹنگ روم میں بلا رہے ہیں۔'' عارف نے جواب دیا پھر اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''آئیں... میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔''

وہ جلدی سے بولی۔ ''عارف! آپ زحمت نہ کریں، میں خود ہی چلی جاؤں گی۔'' اس نے پرس سنبھالا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔ ''میں نے اس پروڈکشن ہاؤس کا ایک ایک کونا، ایک ایک راستہ دیکھ رکھا ہے... تھینک یو عارف!''

عارف نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ وہ ماریا سے کسی قسم کی بحث نہیں کر سکتا تھا۔ وہ حسرت بھری نگاہ سے، اس سراپا حسن و جمال کو جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

☆☆☆

نوید نے ریسیور کریڈل کرنے کے بعد اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ گھڑی آٹھ، دس کا وقت بتا رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر تفکر کی لکیریں نمودار ہوگئیں۔ ماریا کی اس وقت آمد نے نوید کو گہری تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ رات آٹھ، سوا آٹھ کوئی زیادہ وقت نہیں تھا۔ ماریا جب فوٹان پروڈکشنز سے وابستہ تھی تو وہ لوگ عموماً آٹھ نو بجے تک اسٹوڈیوز میں رکا کرتے تھے لیکن جب سے ماریا نے چینل جوائن کیا تھا، وہ سہ پہر ہی میں ادھر کا چکر لگایا کرتی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی نوید کا ذہن یہ سوچنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ ماریا کے ساتھ یقیناً کوئی گڑبڑ ہے۔ کیا گڑبڑ ہے... یہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا!

ماریا نے کم و بیش ایک سال فوٹان پروڈکشنز میں گزارا تھا اور یہ ایک سال بڑا سنسنی خیز اور ہنگامہ پرور ثابت ہوا تھا۔ اس کی زندگی میں اتنے ٹوئسٹ آئے کہ کولیگز کو یہی محسوس ہوتا تھا کہ ماریا کوئی جیتا جاگتا کردار نہیں بلکہ کسی چست اسکرپٹ کے عین مطابق لاجواب اداکاری کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ اس کی دلچسپ اور ولولہ انگیز کہانی فوٹان پروڈکشنز ہی تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ جب اس نے پرائیویٹ چینل جوائن کیا تو یہ رومینٹک اور گرما گرم کہانی وہاں بھی پہنچ گئی تھی۔ نوید چونکہ ماریا کے بہت قریب رہا تھا، بلکہ اس ڈرامے کا ایک کردار بھی رہا تھا لہٰذا اس سے زیادہ ماریا کے بارے میں اور کوئی نہیں جانتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ ماریا کے حوالے سے تشویش بھرے انداز میں سوچ رہا تھا... وہ کہانی جو فوٹان پروڈکشن ہاؤس سے نکل کر پرائیویٹ چینل تک پہنچی تھی اور جس کا انجام

www.lurntech.com

سب پر واضح ہو چکا تھا... کہیں اینڈ میں، اس میں کوئی اور ٹوئسٹ تو نہیں آ گیا تھا...؟

یہی خدشات... نوید کو الجھن میں ڈال رہے تھے۔

وہ ایڈیٹنگ روم کے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے بڑے گمبھیر انداز میں ماریا کے بارے میں سوچنے لگا۔

ماریا نے فوٹان پروڈکشن ہاؤس ایک بیوٹیشن کے طور پر جوائن کیا تھا۔ وہ ان تمام اداکاروں کا میک اپ کرتی تھی جنہیں کیمرے کا سامنا ہوتا تھا۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ وہ اس فن میں بڑی گہری مہارت رکھتی تھی۔ اس کی کاوشوں سے بعض ایسے چہرے بھی ٹی وی اسکرین پر خوب صورت بن کر ابھرتے تھے جو حقیقی زندگی میں نک سک سے فارغ اور حسن و رعنائی سے پیدل ہوتے تھے۔ ہاؤس کے انچارج صاحب عرفان شمسی ماریا کی صلاحیتوں کے بہت زیادہ معترف تھے اور اس کے کام کی تعریف کرنے کا کوئی موقع خالی نہیں جانے دیتے تھے بلکہ بعض اوقات تو وہ اس ''کام'' کے لیے موقع نکال بھی لیا کرتے تھے!

فوٹان پروڈکشن ہاؤس کا مالک تو ہمایوں اختر تھا لیکن اس نے اسٹوڈیوز کے انتظام و انصرام کے لیے ایک تجربہ کار اور ٹیکنیکل شخص عرفان شمسی کو فوٹان پروڈکشنز میں متعین کر رکھا تھا جو ''پروڈکشن ہیڈ'' کے عہدے پر فائز تھا۔ باقی تمام اسٹاف اس کی مرضی اور اشارے پر کام کرتا تھا.... عرفان شمسی، براہِ راست ہمایوں اختر کو جواب دہ تھا۔ ہمایوں اختر کی اپنے اسٹاف سے بہت کم ملاقات ہوتی تھی تاہم اس کے احکامات عرفان شمسی کے توسط سے ان لوگوں تک پہنچتے رہتے۔ یہ حکم بھی شمسی ہی کے ذریعے نوید تک پہنچا تھا کہ ''دو دل دیوانے'' کی مزید پروڈکشن کو فی الحال روک دیا جائے۔ جب تک پاک بھارت معاملات معمول پر نہیں آ جاتے، زمینی اور فضائی کشیدگی ختم نہیں ہو جاتی، اس سیریل کو آن ائر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پچھلے کچھ عرصے سے پاکستانی پرائیویٹ چینلز پر انڈین کمرشلز کی بھرمار نظر آنے لگی تھی اور بعض بولڈ چینل تو بالی ووڈ کی فلمیں بھی دکھانے لگے تھے، مختلف میوزیکل نائٹ کے پروگرام اس کے علاوہ تھے۔ کو پروڈکشن بھی شروع ہو چکی تھی۔ اسی ٹرینڈ اور فضا نے ہمایوں اختر کی حوصلہ افزائی کی تھی اور اس نے شمسی سے باہمی مشاورت کے بعد ''دو دل دیوانے'' کی پروڈکشن کا لائحہ عمل ترتیب دیا تھا۔ خیال یہی تھا کہ پرائیویٹ چینلز اور انڈین چینلز دیکھ دیکھ کر عوام کا ذہن اس قدر ہموار ہو چکا ہے کہ وہ دو دل دیوانے کو بہ آسانی ہضم کر لیں گے لیکن ممبئی والے واقعات اور اس کے بعد، پاکستان پر عائد کردہ بھارت کے بے بنیاد الزامات نے یہاں کے عوام کے دل و دماغ میں ایک آگ سی بھر دی تھی۔ ان خطرناک حالات میں اگر دو دل دیوانے کی ٹیلی کاسٹنگ شروع ہو جاتی تو پروڈکشن سمیت متعلقہ چینل کو بھی لینے کے دینے پڑ جاتے...!

دروازے پر ہونے والی دستک نے نوید کو چونکا دیا۔ غالباً ماریا وہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے ''دو دل دیوانے'' کے مایوس کن خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور ماریا کے استقبال کے لیے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

ماریا گویا کمرے سے جاتے ہوئے، عارف کی توجہ اور انہماک بھی ساتھ لے گئی تھی۔ اس کی آمد سے پہلے وہ اپنے کام میں مگن تھا۔ دو روز بعد ایک ٹیلی فلم کی شوٹنگ شروع ہونے والی تھی۔ عارف اسی کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اسکرپٹ فائنل ہو چکا تھا۔ اس کی لوکیشن اور سین ڈسٹری بیوشن اینڈ ڈویژن باقی تھی۔ نوّے منٹ دورانیے کی، اڑتالیس سین پر مشتمل یہ ٹیلی فلم ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور تھی۔ عارف کو سین اِلائن اپ کرنے کے بعد دارڈ روب وغیرہ کے معاملات بھی فائنل کرنا تھے۔ شوٹنگ کا تمام تر شیڈول اس کے کمپیوٹر میں محفوظ تھا۔ بہ حیثیت اسسٹنٹ ڈائریکٹر یہ سارے کام اس کی ذمے داری میں شامل تھے لیکن ماریا کی آمد کے بعد یہ ذمے داری نبھانا اسے خاصا مشکل نظر آ رہا تھا۔

اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ ماریا اسے اچھی لگتی تھی۔ وہ کیا... ماریا وہاں کام کرنے والے سبھی لوگوں کو اچھی لگتی تھی۔ دلکش اور دل ربائی کے لیے ہر کسی کا جی مچلتا ہے اور... ماریا کی دلکشی و دل ربائی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ عارف گہری گہری سانسیں لے کر ماریا کے سراپا کی خوشبو کو اپنے پھیپھڑوں میں اتارنے لگا جو وہ چند لمحے پہلے اس کے کمرے میں چھوڑ گئی تھی!

بھرپور توجہ اور انہماک کے ساتھ کام چونکہ ممکن نہیں رہا تھا لہٰذا وہ محمد رفیع کا ایک مشہورِ زمانہ گانا سنتے ہوئے ماریا کے بارے میں سوچنے لگا۔

ماریا نے فوٹان پروڈکشنز میں جو ایک سال گزارا تھا وہ بڑا ہی تہلکہ خیز اور سنسنی آمیز تھا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے بیوٹیشن تھی لیکن پروڈکشن ہیڈ کی نظر میں سمانے کے بعد اس کے پروفیشن میں پے در پے تبدیلیاں آنے لگیں۔ یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ پروڈکشن ہیڈ عرفان شمسی، ماریا

میں خصوصی دلچسپی لے رہا تھا۔ کسی کو اس بات پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا کیونکہ دیکھنے میں یہی آیا تھا کہ ماریا بھی شمسی کی جانب پوری طرح مائل تھی۔ مثل مشہور ہے نا... جب لڑکا لڑکی راضی، تو کیا کرے گا قاضی۔ پھر شوبز کی دنیا میں تو ایسے معاملات کے لیے ویسے بھی بہت آسانیاں مہیا و میسر ہوتی ہیں۔ عارف اس کھیل کا دور ہی دور سے نظارہ کر رہا تھا کہ ایک روز اس کے ''صاحب'' نوید نے اس سے پوچھا۔

''عارف! کوئی اچھی بیوٹیشن ہے تمہاری نظر میں؟''

عارف نے چونک کر نوید کی طرف دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے جواب دیا۔ ''نوید بھائی! بیوٹیشنز تو بہت مل جائیں گی۔ میں...''

''میں نے اچھی بیوٹیشن کے بارے میں پوچھا ہے عارف!'' نوید نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

''جی نوید بھائی! مل جائے گی اچھی بیوٹیشن بھی...!'' وہ سنبھلتے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے، تمہاری نظر میں جو بھی اچھی بیوٹیشن ہے اسے کل سہ پہر میں چار بجے بلوا لو۔'' نوید نے حتمی انداز میں کہا۔ ''اس سے بات کر کے دیکھ لیتے ہیں۔''

نوید کی سنجیدگی اور لہجے کی پراسراریت نے عارف کے کان کھڑے کر دیے۔ وہ اندرونی تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''نوید بھائی! یہ بیوٹیشن آپ کس کے لیے ارینج کر رہے ہیں؟''

''فوٹان پروڈکشن کے لیے...!'' نوید نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

''فوٹان...!'' عارف نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔ ''لیکن ہمارے پاس تو ایک ایکسپرٹ بیوٹیشن موجود ہے!''

''موجود ہے نہیں... تھی کہو!'' نوید نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔

عارف کی حیرت دوچند ہو گئی۔ اس نے بے یقینی سے اپنے ڈائریکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''کیا ماریا فوٹان پروڈکشنز کو چھوڑ کر کہیں اور جا رہی ہیں؟''

''نہیں... ایسی کوئی بات نہیں۔'' نوید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بتایا۔

''پھر... ماریا کی موجودگی میں کسی دوسری بیوٹیشن کی گنجائش کہاں نکلتی ہے۔'' عارف نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''فوٹان تو اس محدود اسٹاف کی تنخواہیں بھی اٹکا کر دیتا ہے۔ ایک آدمی دو دو، تین تین افراد کا کام کر رہا ہے۔ شمسی صاحب ہمیشہ بجٹ کا رونا روتے رہتے ہیں۔ آپ خود کو دیکھ لیں، پچھلے دو ماہ سے آپ کو تنخواہ نہیں ملی۔ ہم نے میٹھی عید پر جو تین پروگرام شوٹ کر کے دیے تھے، فوٹان نے وہ مختلف پرائیویٹ چینلز کو فروخت کر کے پیسے کھرے کر لیے لیکن آرٹسٹوں کو ابھی تک ان کا معاوضہ ادا نہیں کیا گیا۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''نوید بھائی! آپ جانتے ہیں، میں نے جن پروگرامز کا حوالہ دیا ہے ان کی کاسٹ کو میں نے ہی ارینج کیا تھا۔ آپ نے تو اپنا سیل فون بند کر رکھا ہے۔ وہ تمام آرٹسٹ مجھے فون کر کر کے معاوضے کا مطالبہ کرتے ہیں اور میں انہیں مختلف حیلوں بہانوں سے ٹال رہا ہوں۔ دو ڈھائی ماہ گزر گئے ہیں نوید بھائی اور اب بقرعید سر پر کھڑی ہے... ہم کس منہ سے آرٹسٹوں سے رابطہ کریں۔ جب معاملات کی بات ہوتی ہے تو شمسی صاحب ہمیں آگے کر دیتے ہیں کہ ہم ٹیکنیکل لوگ ہیں، آرٹسٹوں سے بہتر انداز میں ڈیل کر لیں گے اور جب پے منٹ کا وقت آتا ہے تو قربانی کا بکرا بنا کر ہمیں ہی سامنے کر دیا جاتا ہے۔ یہ بھلا کیا بات ہوئی...!''

عارف نے عید، بقرعید کے حوالے سے جن واقعات کا ذکر کیا تھا انہیں اب ایک سال ہونے کو آ رہا تھا۔ وہ ماریا کا ابتدائی دور تھا اور یہ گفتگو بھی ایک سال پہلے ہی عارف اور نوید کے درمیان ہوئی تھی۔ عارف کی لمبی چوڑی تقریر بہ الفاظِ دیگر جذبات کے گرما گرم اظہار کے جواب میں نوید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''عارف! یہ بتاؤ، تم نے ابھی فوٹان پروڈکشنز کے حوالے سے جو بیان کیا ہے، وہ مجھ سے چھپا ہوا ہے کیا؟''

''آپ سے کیسے چھپ سکتا ہے نوید بھائی!'' وہ قدرے شرمندہ ہو کر بولا۔

''تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ فوٹان کے معاملات کے فیصلے کون کرتا ہے؟''

''ظاہر ہے... شمسی صاحب!'' عارف نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔

''تو پھر جان لو کہ نئی بیوٹیشن کو ارینج کرنے کا حکم بھی شمسی صاحب ہی نے دیا ہے۔'' نوید نے ٹھوس لہجے میں واضح کر دیا۔

''لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ اس صورتِ حالات میں ماریا کیا کرے گی؟'' عارف کے لہجے کی الجھن دور ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

نوید نے قدرے تلخ انداز میں کہا۔ ''شمسی صاحب کی دلداری... اور کیا!''

عارف نے آنکھیں سکیڑ کر اپنے استادِ محترم کی طرف دیکھا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تو پھر ماریا کی تنخواہ بھی شمسی صاحب کی جیب ہی سے جائے گی۔ فوٹان کا بجٹ تو اس عیاشی کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ ہمایوں صاحب اس بات کے لیے قطعاً تیار نہیں ہوں گے نوید بھائی...!''

''نوید بھائی کے چھوٹے بھائی، تم بھی بڑے سادہ دل ہو...!'' نوید نے ہونٹ سکوڑ کر نفی میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''ہمایوں صاحب کو اصل کہانی کی خبر ہی کیسے ہوگی؟''

''جی... کیا مطلب!'' عارف نے حیرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمایوں صاحب کی نظر سے یہ معاملہ چھپا رہے۔ ٹھیک ہے، وہ فوٹان کے داخلی اور خارجی معاملات میں براہِ راست کوئی دخل نہیں دیتے لیکن انہیں یہاں کے حالات کی پوری خبر رہتی ہے۔ ہمارا اکاؤنٹنٹ ان کا خاص آدمی ہے۔''

''تمہارا کہنا بالکل درست ہے۔'' نوید نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''اور اس وضاحت کے اندر ہی تمہارے سوال کا جواب چھپا ہوا ہے۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں نوید بھائی!'' عارف نے متاملانہ انداز میں پلکیں جھپکائیں۔

''میں سمجھتا ہوں۔'' نوید نے بڑی رسان سے کہا پھر پوچھا۔ ''عارف! یہ بتاؤ، جب ہمارے پروڈکشن ہاؤس میں کوئی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو اس کے حل کے لیے ہمایوں صاحب، شمسی صاحب سے کیا کہتے ہیں؟''

''مینیج کرو۔'' عارف کی زبان سے بے دھڑک نکلا۔ ''ایسی کسی بھی سچویشن میں ہمایوں صاحب، شمسی صاحب کو ''مینیج'' کرنے کی ہدایت دیتے ہیں۔ وہ شمسی صاحب کو ایک لاکھ سے اوپر تنخواہ اسی بات کی دیتے ہیں کہ پروڈکشن ہاؤس سے متعلق کوئی فکر اور پریشانی ان تک نہ پہنچے۔''

''اور تم یہ بھی مانتے ہو کہ شمسی بڑا اکائیاں آدمی ہے۔'' نوید نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''وہ جب سے یہاں ہے، اس نے کبھی ہمایوں صاحب کو شکایت کا موقع نہیں دیا...؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں نوید بھائی!'' عارف نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''واقعی، یہ تو حقیقت ہے۔''

''بس تو سمجھ لو... کہ شمسی صاحب نے... ماریا کو مینیج کر لیا ہے!''

''نوید بھائی... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

نوید نے کہا۔ ''ہمارے پروڈکشن ہاؤس میں ماریا اب بیوٹیشن کے طور پر نہیں، بلکہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرے گی۔ تم جلد از جلد نئی بیوٹیشن ارینج کرلو بیٹا!''

''وہ تو... میں کر ہی لوں گا... نوید بھائی!'' وہ رک رک کر بولا۔ ''لیکن ماریا اپنا اچھا خاصا پروفیشن چھوڑ کر اسسٹنٹ ڈائریکٹر بننے پر کیونکر تیار ہوگئی؟''

''بھئی... شمسی صاحب نے ماریا کے اندر ڈائریکشن کا ٹیلنٹ تلاش کیا ہے اور وہ راضی خوشی آمادہ ہے تو پھر اعتراض کرنے والے ہم کون ہوتے ہیں؟'' نوید نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد عارف نے جھجکتے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔ ''نوید بھائی! کیا ماریا آپ کو اسسٹ کرے گی؟''

''ارے یار... تمہیں تو اپنی فکر لگ گئی۔'' نوید نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں۔''

''پھر...؟'' عارف کی آنکھوں میں معنی خیز سوال تھا۔

نوید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''ماریا کو ضیا کے ساتھ لگایا جارہا ہے۔''

''ضیا کے ساتھ...!'' عارف نے بے یقینی سے نوید کی طرف دیکھا۔ ''لیکن شمسی صاحب تو ضیا کو بالکل پسند نہیں کرتے...!''

''جبھی تو...!'' نوید نے بھوئیں اچکادیں۔

عارف سوچتی ہوئی، گہری نظر سے اپنے گرو کو تکنے لگا۔

☆☆☆

نوید نے دروازہ کھولا اور ماریا کی طرف دیکھا، ماریا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام!'' نوید نے اس کے سلام کا جواب دینے کے بعد راستہ چھوڑتے ہوئے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اندر آجاؤ ماریا!''

وہ اندر آگئی اور بہ آہستگی ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

نوید نے دروازہ بند کیا اور واپس اسی نشست پر براجمان ہوگیا، ماریا کی آمد سے پہلے وہ جہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ماریا نے رسمی انداز میں پوچھا۔

''نوید! کیسے ہو... کیا ہو رہا ہے؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' نوید نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔ ''اور ہو تو وہی رہا ہے جو نصیب میں لکھا ہے.. کام، کام، کام... اور بس کام!''

ماریا، نوید کے پہلو میں موجود، ایل سی ڈی کی طرف دیکھتے ہوئے مستفسر ہوئی۔ ''یہ تمہارے نئے سیریل کا ٹائٹل ہے نا... دو دل دیوانے؟''

''ہاں...!'' اس نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے اثبات میں گردن ہلادی۔

ماریا بڑی دلچسپی اور محویت سے روشن ایل سی ڈی کو دیکھنے لگی جہاں ''دو دل دیوانے'' کا ٹائٹل چمک رہا تھا۔ سیریل کی ہیروئن ٹیلی فون کا ریسیور اٹھائے کسی سے باتیں کررہی تھی۔ اس کے چہرے سے پھوٹنے والی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے محبوب یعنی اس سیریل کے ہیرو ہندو لڑکے سے بات کررہی ہے۔ محبت کے رنگ کو اجاگر کرنے کے لیے سرخ رنگ کے ٹیلی فون سیٹ کو استعمال کیا گیا تھا۔ ہیروئن نے اپنے گلے میں ایک خوب صورت مگر متنازع نیکلس پہن رکھا تھا۔ اس نیکلس میں اللہ اور اوم بہ یک وقت، بہ یک مقام موجود تھے۔ دراصل یہ نیکلس ہیروئن کی نفسیاتی اور ذہنی کیفیت کا غماز تھا۔ ہیروئن... سیریل کی کہانی کے مطابق ایک مسلمان لڑکی تھی اور اس کا ہیرو ہندو تھا۔ دونوں میں بڑی طوفانی قسم کی محبت پائی جاتی تھی۔ دوسری جانب ہیروئن کا کزن بھی اس میں گہری دلچسپی لے رہا ہوتا ہے اور لگتا ہے کہ وہ ہیروئن کو مذہب کے حوالے سے سمجھاتا رہتا ہے۔ ہیروئن اس حقیقت سے تو آگاہ ہے کہ ایک ہندو لڑکے سے اس کی محبت بہت خطرناک نتائج لائے گی لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ کس طرح محبت سے باز آجائے۔ نہ تو ہندو لڑکے کو چھوڑنا اس کے بس میں ہے اور نہ ہی اپنے کزن سے محبت کرنا اس کے اختیار میں۔ وہ ایک ایسی سچویشن میں بندھی ہوئی ہے کہ جہاں کچھ بھی اس کے ہاتھ میں نہیں۔

ماریا نے بہ دستور ایل سی ڈی کی طرف دیکھتے ہوئے نوید سے پوچھا۔ ''اس سیریل کا کانسیپٹ تو میرے علم میں ہے اور ہیروئن کا نیکلس اس کانسیپٹ کو کلیئر بھی کرتا ہے لیکن ٹائٹل کے بیک گراؤنڈ میں جو کچھ نظر آرہا ہے، وہ میری سمجھ میں نہیں آیا؟''

مذکورہ ٹائٹل کے پس منظر میں ایک مسکراتے ہوئے چہرے والے مرد کا سایہ نظر آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ریوالور دکھائی دیتا تھا جس کی نال میں سے چمکیلی روشنی کی ایک دھار سی نکل رہی تھی اور یہ دھار ''نیا سال مبارک ہو'' اور ''2009ء'' کے الفاظ کو بڑی خوبصورتی سے جنم دے رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس ریوالور سے فائر کر کے نئے سال کی مبارک باد دی جارہی ہو۔ پس منظر میں آتش بازی بھی دیکھی جاسکتی تھی۔

نوید نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ماریا کے استفسار کے جواب میں بتانے لگا۔ ''ہمارا پروگرام تو یہی تھا کہ اس سیریل کو نئے سال سے آن ائر کیا جائے۔ جیسا کہ تمہیں معلوم ہے، ہیروئن کا مسلمان کزن اسے سمجھانے اور متاثر کرنے کی کوشش میں مصروف نظر آتا ہے۔ جبکہ ہیروئن کا جھکاؤ لڑکے کی طرف ہے۔ اسی رسّاکشی کے دوران میں کزن کو ایک اچھوتا آئیڈیا سوجھتا ہے۔ وہ سیریل کی ہیروئن کو ''ہیپی نیو ائر'' وش کرنے کے لیے یہ ڈراما رچاتا ہے اور اس کام کے لیے وہ خاص طور پر ایک ایسی گن حاصل کرتا ہے جس سے فائر کرنے پر رنگ برنگی چمک دار شعاعیں خارج ہوتی ہیں اور فضا میں ''نیا سال مبارک ہو'' وغیرہ کے الفاظ ابھر آتے ہیں...''

''لیکن اس اسٹنٹ کے باوجود بھی ہیروئن اس کی طرف مائل نہیں ہوتی...!'' ماریا نے ایل سی ڈی سے نگاہ چرا کر نوید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں...'' نوید نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''سیریل کی کہانی میں تو یہی سچویشن ہے لیکن...!''

''لیکن کیا نوید...؟'' نوید کے ادھورے جملے پر ماریا نے سوال کیا۔

''لیکن یہ کہ... اس سیریل کی مزید شوٹ کے معاملات اب کھٹائی میں پڑ گئے ہیں۔'' نوید نے مایوسی بھرے لہجے میں جواب دیا۔

ماریا نے الجھن بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''ایسا کیوں؟''

''تم جانتی ہو نا، ہمایوں صاحب کتنے محتاط آدمی ہیں؟'' نوید نے سوالیہ انداز میں ماریا کی طرف دیکھا۔

''ہاں، ہاں... وہ تو ہے!'' ماریا نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

نوید نے گہری سنجیدگی سے اضافہ کیا۔ ''اور پاک بھارت موجودہ صورتِ حال بھی تمہارے سامنے ہے۔ ہر لمحے یوں محسوس ہوتا ہے، جنگ سر پر کھڑی ہو۔ اس فضا میں کسی ایسے سیریل کی لانچنگ جس میں کوئی مسلمان لڑکی کسی ہندو لڑکے کی محبت میں گرفتار ہو... کیا قیامت ڈھا سکتی ہے، اس کا اندازہ تم بھی لگا سکتی ہو ماریا!''

''لیکن نوید... میری معلومات کے مطابق تو اس سیریل کا انجام بڑا مثبت اور پیپی ہے۔'' ماریا نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''سیریل کا ہیرو، ہیروئن کی محبت میں اپنا مذہب تبدیل کرلیتا ہے۔ اس طرح وہ دونوں، عین اسلامی طریقے سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوجاتے ہیں۔''

www.luratech.com

''ہاں، ایسا ہی ہے...'' نوید نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن یہ انجام سیریل کے اختتام پر کئی ماہ کے بعد سامنے آئے گا اور جب تک ناظرین، ناقدین اور مبصرین ہمارے پروڈکشن ہاؤس اور اس پرائیویٹ چینل کا سوا ستیاناس ماردیں گے جہاں سے یہ سیریل ٹیلی کاسٹ کیا جائے گا...!''

ماریا کے چہرے پر تشویش کے تاثرات نمودار ہوئے، گمبھیر لہجے میں بولی۔ ''ہاں نوید... یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو!''

''خیر... اس سیریل کے ذکر کو چھوڑو اور یہ بتاؤ...'' نوید نے معتدل لہجے میں پوچھا۔ ''کیا چلے گا... کافی، چائے یا گرین ٹی؟''

''کچھ بھی نہیں...!'' ماریا نے سرسری انداز میں کہا۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے ماریا...!'' نوید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کچھ تو لینا ہی ہوگا... انکار کیوں کررہی ہو؟''

''بس، موڈ نہیں ہورہا...'' وہ نگاہ چراتے ہوئے بولی۔

''وہ تو تمہارے چہرے ہی سے نظر آرہا ہے...!''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ... تم اس وقت خاصی پریشان دکھائی دے رہی ہو۔'' نوید نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ ''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''ہاں...!'' وہ اضطراری انداز میں بولی۔ ''تمہارا آبزرویشن غلط نہیں۔''

نوید یک دم بے حد سنجیدہ نظر آنے لگا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''میرا شمسی سے جھگڑا ہوگیا ہے...!'' وہ برہمی سے بولی۔

''ہوں...!'' نوید گہری سوچ میں ڈوب گیا، چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ ''تمہارا موڈ ٹھیک نہیں اور میں بھی یہاں رنجیدگی کے عالم میں بیٹھا ہوا ہوں... ایک کام کرتے ہیں یار...!''

ماریا نے چونک کر سوالیہ نظر سے نوید کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کون سا کام؟''

''تم جانتی ہو، فوٹان پروڈکشنز کا آفس بوائے دل جما کر کافی گھوٹتا ہے۔'' نوید نے بڑی سادگی سے کہا۔ ''اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی کافی پیتے ہیں تاکہ دونوں کا موڈ ٹھیک ہوجائے۔ باقی باتیں بعد میں کریں گے... ہوں؟''

''او کے...!'' ماریا نے رضامندی ظاہر کردی۔

☆☆☆☆

صرف عارف ہی نہیں... بلکہ پروڈکشن ہاؤس میں جس نے بھی ماریا کے بارے میں سنا، تعجب اور حیرت کا اظہار کیا۔ یہ بات کسی کو ہضم نہیں ہورہی تھی کہ ماریا اچھا خاصا اپنا کام چھوڑ کر ڈائریکشن کی طرف کیوں جارہی ہے۔ اسٹاف کے بیچ جب بھی اس موضوع پر بات ہوتی، معنی خیز انداز میں سب کا اشارہ عرفان شمسی کی طرف چلا جاتا۔ سب کو یہ معلوم تھا کہ شمسی کے حکم پر ہی یہ تبدیلی لائی جارہی ہے۔ وہ تمام لوگ شمسی کی روز بہ روز ماریا میں بڑھتی ہوئی دلچسپی... کو بھی دیکھ اور محسوس کررہے تھے۔ میک اپ کے علاوہ، ماریا کے پاس جتنا بھی وقت ہوتا وہ شمسی کے کمرے میں گزارتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، شمسی کے کمرے میں کوئی طاقت ور مقناطیس نصب ہو جو ماریا کو بری طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہو، حالانکہ کچھ عرصہ پہلے تک ایسا نہیں تھا۔ ماریا فارغ وقت میں ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز کے ساتھ ہی بیٹھتی تھی۔ پروڈکشن ہاؤس کے فرسٹ فلور پر پوسٹ پروڈکشن کے کام ہوتے تھے۔ وہیں پر ایک کمرا میٹنگ روم کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔ جہاں پروڈکشن سے متعلق اسٹاف بیٹھ کر باہمی گفتگو کرتے تھے اور مختلف امور پر تبادلہ خیالات کرتے تھے۔

اس وقت بھی میٹنگ روم کی فضا خاصی گرم تھی۔ تین چار افراد بیٹھے گفت وشنید میں مصروف تھے۔ ان کی گفتگو کا موضوع بھی ''ماریا'' ہی تھا۔ اسد اللہ نے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں، شمسی صاحب کوئی بھی اسٹیپ خوامخواہ نہیں لیتے۔ ان کے اس اقدام کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی حکمت چھپی ہوگی...!''

اسد اللہ بنیادی طور پر کیمرا مین تھا اور زیادہ تر ٹاک شوز کو کوریج کرتا تھا جو کہ اسی اسٹوڈیوز میں شوٹ کیے جاتے تھے۔ اسد اللہ طبعاً ایک سنجیدہ اور بردبار شخص تھا۔ اس کے تبصرے پر فرید پاشا خاموش نہ رہ سکا، معنی خیز لہجے میں بولا۔

''ہاں بالکل... شمسی صاحب کے فیصلے میں حکمت تو ہے... اور یہ حکمت سب کو نظر بھی آرہی ہے... سوائے ضیا کے!''

فرید پاشا کا تعلق بھی شوبز ہی سے تھا لیکن اس کام کو وہ پارٹ ٹائم کے طور پر کرتا تھا۔ بنیادی طور پر وہ بینکر تھا اور ایک اعلیٰ عہدے پر کام کررہا تھا۔ شام میں وہ پروڈکشن ہاؤس آجایا کرتا تھا۔ شوبز اس کا شوق تھا۔ اس نے دو، تین ''رٹ کام'' ڈراموں میں بڑی بھرپور اداکاری کی تھی۔ فرید کی آواز میں بڑا جادو تھا۔ کئی کمرشلز میں اس کی آواز کو وائس اوور کیا گیا تھا۔ وہ ضیا کا گہرا دوست بھی تھا۔ ضیا کی ایک آؤٹ ڈور شوٹ تھی لہٰذا وہ ان لوگوں کے بیچ اس وقت موجود نہیں تھا۔

اسد اللہ کی بات پر چونکہ فرید پاشا نے گرہ لگائی تھی لہٰذا اسد نے اسی سے پوچھ لیا۔ ''پاشا صاحب! اگر آپ اس حکمت سے واقف ہیں تو ہمیں بھی بتائیں۔''

''اس کا مطلب ہے...'' پاشا نے گھور کر اسد اللہ کو دیکھا۔ ''آپ اس بارے میں کچھ نہیں جانتے؟''

''نہیں...'' اسد نے بڑی سادگی سے نفی میں گردن ہلادی۔

''تو پھر یہ کہیں اسد صاحب کہ... مجھے بتائیں۔'' پاشا نے بہ دستور اسد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''باقی لوگوں کو تو پوری خبر ہے۔''

''ٹھیک ہے، آپ مجھے ہی بتادیں۔'' اسد اللہ نے بڑی معصومیت سے کہا۔

اس میں کسی شک وشبے کی بات نہیں کہ اسد اللہ نہایت ہی سادہ طبیعت کا مالک ایک شریف النفس انسان تھا، اپنے کام میں مگن رہنے والا۔ اسے اسٹوڈیوز کی سیاست وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بعض لوگ اسے بے وقوف فوٹوگرافر بھی کہا کرتے تھے۔ اسد اللہ کا شمار ان فنکاروں میں ہوتا تھا جو اپنے کام میں ڈوب کر مکر وہاتِ زمانہ سے بہت دور ہوجاتے ہیں لہٰذا وہ عام لوگوں کی بہ نسبت بہت کم باخبر ہوتے ہیں۔

فرید پاشا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سیدھی سی بات ہے، شمسی صاحب آج کل ماریا پر بہت مہربان نظر آتے ہیں اور ماریا بھی زیادہ تر وقت انہی کے کمرے میں گزارتی ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی ڈھکی چھپی نہیں کہ شمسی صاحب، ضیا کو پسند نہیں کرتے۔ ضیا اپنے کام سے کام رکھنے والا فنکار ہے۔ چاپلوسی اور خوشامد اسے چھو کر نہیں گزری۔ وہ اپنے سامنے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ اسی وجہ سے شمسی صاحب اس کے لیے اپنے دل میں اچھے جذبات نہیں رکھتے اور...!''

''ایک منٹ...!'' سہیل احمد نے ہاتھ کھڑا کرکے پاشا کو مزید بولنے سے روک دیا اور خفگی آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''پاشا صاحب! آپ کی وضاحت سے تو یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ضیا کے علاوہ ہم سب خوشامدی اور چاپلوسی میں جو شمسی صاحب ہمیں ناپسند نہیں کرتے؟''

''میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا یار...'' فرید پاشا جلدی سے سنبھالا لیتے ہوئے بولا۔ اسے صورتِ حال کی نزاکت کا احساس ہوگیا تھا۔ ''آپ خوامخواہ پرسنل ہورہے ہیں۔''

سہیل احمد بہت تیز طرار اور چلتا پرزہ قسم کا شخص تھا۔ الیکٹرانک میڈیا میں آنے سے پہلے وہ پرنٹ میڈیا سے وابستہ تھا۔ پہلے وہ ایک اخبار میں کرائم رپورٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ پروڈکشن ہاؤس میں وہ مختلف نوعیت کے کام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ آج کل وہ ایک پرائیویٹ چینل جوائن کرنے کے لیے پرتول رہا تھا۔ اسے ایک نیوز چینل سے کوآرڈی نیٹر کی آفر تھی۔ عنقریب وہ کرنٹ افیئرز کے شعبے میں جانے والا تھا۔ اس کے گرما گرم اعتراض کے جواب میں فرید پاشا نے جو لنگڑی وضاحت پیش کی تھی، سہیل کی اس سے تسلی نہیں ہوسکی تھی لہٰذا اس نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

''فرید صاحب! میں خوامخواہ پرسنل نہیں ہورہا... آپ نے بات ہی ایسی کی ہے!''

پاشا قدرے نرمی سے بولا۔ ''یار... میں نے کہا ہے نا، میرا وہ مطلب نہیں تھا جیسا آپ سمجھ رہے ہو!''

''پھر یہ بھی بتادیں، آپ کا مطلب کیا تھا...؟'' سہیل جان چھوڑنے کے موڈ میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔

اس موقع پر اسد اللہ نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا۔ وہ فرید پاشا سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''پاشا صاحب! آپ لوگوں کی باہمی تکرار میں میرا سوال تو لٹک کر رہ گیا۔ آپ مجھے شمسی صاحب کی کسی حکمتِ عملی کے بارے میں بتانے والے تھے...!''

پاشا نے جواب دیا۔ ''اسد صاحب! سادہ سی بات ہے، شمسی صاحب ضیا کو پسند نہیں کرتے۔ وہ ماریا کو اس کے برابر کھڑا کرکے، اس کی چھٹی کرنے کے موڈ میں نظر آتے ہیں۔''

''اس کام کے لیے انہیں اتنا کھٹ راگ پھیلانے کی کیا ضرورت ہے؟'' اسد اللہ نے حیرت آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''وہ براہِ راست بھی ضیا کو پروانۂ رخصت پکڑا سکتے ہیں۔ ماریا کو اس کے اصل کام سے ہٹانے کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی۔''

فرید پاشا نے معنی خیز انداز میں آواز دبا کر کہا۔ ''دراصل، پچھلے دنوں کی بہت زیادہ ملاقاتوں میں شمسی صاحب پر یہ انکشاف ہوا ہے کہ ماریا کے اندر ایک عظیم ڈائریکٹر چھپا ہوا ہے۔ بس، اسے بنیادی ٹیکنیکل چیزیں سکھانا ہوں گی، اس کے بعد ماریا ڈائریکشن کے میدان میں اسپیل برگ کو بہت پیچھے چھوڑ دے گی...''

''اسپیل برگ...!'' سہیل احمد نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''پاشا صاحب! آپ کیا بات کررہے ہیں۔ اسپیل برگ کی گرد کو چھونا بھی ہما شما کے بس کی بات نہیں...!''

''یار! آپ تو ذرا ذرا سی بات پر فوراً جذباتی ہوجاتے ہو۔'' پاشا نے بڑے شریر انداز میں سہیل احمد کے چٹکی لی۔ ''میں نے ہما شما کی نہیں، ماریا کی بات کی ہے پیارے

www.lurtech.com

صاحب۔ ہما اور ماریا میں کچھ تو فرق ہے نا...!''

''کچھ نہیں... بلکہ زمین آسمان کا فرق ہے جناب!''

سہیل نے طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک اجلا دن ہے تو دوسری تاریک رات... لیکن میں سمجھتا ہوں۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر ایک گمبھیر سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''شمسی صاحب بھلے ایڑی چوٹی کا زور لگالیں۔ وہ ماریا کو نہ تو اسپیل برگ بنا سکتے ہیں اور نہ ہی کل بل...!''

ہما نامی ایک کو اسٹار لڑکی بھی اکثر فوتان پروڈکشنز میں آیا کرتی تھی۔ اس نے دو تین ہٹ کام (سچویشن کامیڈی) ڈراموں میں بھی کام کیا تھا۔ اداکاری وہ اچھی کرتی تھی تاہم اس کے نقوش بھدے اور رنگت شب دیجور ایسی تھی۔ میک اپ کی لیپا پوتی اور کیمرے کا کمال ہما کے بہت سے عیبوں پر پردہ ڈال دیتا تھا۔ سہیل نے اسی پس منظر کی بنا پر ماریا کے مقابلے میں رات اور دن کی مثال دی تھی۔ ناواقف قارئین کی معلومات کے لیے یہ بھی بتاتا چلوں کہ اسٹیون اسپیل برگ ہالی ووڈ فلم انڈسٹری کا ایک مانا ہوا، اعلیٰ پائے کا ہدایت کار ہے جس کے کریڈٹ پر کئی سپرہٹ فلمیں ہیں جبکہ کل بل مار دھاڑ سے بھرپور شاہ کار دو لڑکیوں کی تھرلنگ اسٹوری ہے۔

سہیل کے تبصرے پر پاشا نے کہا۔ ''یار! تم پھر پٹری سے اتر رہے ہو۔ جب شمسی صاحب کی چوٹی ہے ہی نہیں تو وہ اس کا زور کیسے لگائیں گے۔''

''آرڈر... آرڈر...!'' اسد اللہ نے چوبی میز کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''پلیز... آپ لوگ آپس میں نہ الجھو۔'' پھر وہ فرید پاشا کی طرف دیکھتے ہوئے درخواست آمیز انداز میں بولا۔ ''پاشا صاحب! آپ اپنی بات مکمل کریں اور مجھے بتائیں، اگر ماریا اپنے ٹریک سے اتر گئی تو اس کی ہیومیٹیشن اسکل کا کیا ہوگا۔ شمسی صاحب خواہ مخواہ اسے قربانی کا بکرا کیوں بنا رہے ہیں...؟''

''میں اپنی عادت سے مجبور ہو کر اور موقع محل کی مناسبت سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں...'' سہیل نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''اگر اجازت ہو تو؟''

اسد اللہ سٹپٹاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ارشاد...!''

''اسد صاحب!'' سہیل نے بہ دستور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ماریا کے لیے ''قربانی کا بکرا'' ایسے الفاظ مناسب نہیں لگتے۔ اگر آپ سنگ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس بے چاری کی قربانی کا ذکر کرنا ہی چاہتے ہیں تو پھر اسے قربانی کی بکری کہیں تاکہ ہر حال میں اس کی نسوانیت برقرار رہے۔''

اسد اللہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا، بس خفگی آمیز نظر سے سہیل کو گھور کر رہ گیا۔

فرید پاشا نے اسد اللہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اسد صاحب! آپ نے بچپن میں سائیکل وغیرہ تو چلائی ہوگی؟''

اس غیر متوقع اور عجیب سے سوال پر اسد نے استعجابیہ انداز میں چونک کر پاشا کو دیکھا اور الجھن زدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''ہاں، بہت چلائی تھی... اس زمانے میں تو کرائے پر فی گھنٹا کے حساب سے سائیکلیں ملا کرتی تھیں اور ہم اپنی پاکٹ منی سے پیسے بچا کر سائیکل کرائے پر لیا کرتے تھے۔ سائیکل چلانا بچوں کا پسندیدہ مشغلہ اور کھیل ہوا کرتا تھا۔''

''کیا آج کل بھی آپ سائیکل چلاتے ہیں؟'' پاشا نے استفسار کی سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' اسد نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آج کل تو بائیک اور کار کا زمانہ ہے۔ سائیکل چلائے ہوئے تو ایک عرصہ ہو گیا۔''

''اندازاً کتنا عرصہ؟'' پاشا نے سوال کیا۔

''پندرہ سے بیس سال...!'' اسد نے جواب دیا۔

''اگر آج آپ کو سائیکل چلانے کو کہا جائے تو آپ یہ کام کر لیں گے؟''

''کیوں نہیں۔'' اسد نے پورے وثوق سے کہا۔ ''یہ بھی کوئی بھولنے والا کام ہے بھلا...!''

فرید پاشا نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اسد صاحب! اگر پندرہ بیس سال گزر جانے کے باوجود بھی آپ کی سائیکل چلانے کی اسکل کو کچھ نہیں ہوا تو ماریا کی اسکل کے حوالے سے آپ کو فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس نے تو چند ماہ ضیا کے ساتھ لگانا ہیں اور پھر اڑن چھو...''

''اڑن چھو... کیا مطلب؟'' اسد نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

فرید پاشا نے آواز دبا کر انکشاف انگیز لہجے میں بڑے فخر سے کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے، شمسی صاحب اندر ہی اندر ایک گیم کھیل رہے ہیں...!''

فرید پاشا جب جذبات میں ہوتا تھا تو اکثر احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا تھا۔ لوگ اسے جوش دلا کر بہت سی راز کی باتیں اگلوالیا کرتے تھے اور یہ بھی ایک ایسا ہی موقع تھا۔ فرید کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے سہیل نے گہری سنجیدگی

سے پوچھ لیا۔

''پاشا صاحب! آپ شمسی صاحب کے کون سے گیم کی بات کر رہے ہیں؟''

وہ میٹنگ روم میں موجود، ایک ایک شخص کے چہرے کو غور سے دیکھنے کے بعد رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے باخبر ذرائع سے پتا چلا ہے کہ شمسی صاحب جلد ہی اپنا ذاتی پروڈکشن ہاؤس کھولنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ پچھلے دنوں میں اپنے ایک دوست سے ملنے اس کے بینک گیا ہوا تھا۔ میرا وہ دوست برانچ منیجر ہے۔ وہ فوتان پروڈکشنز کے اکثر معاملات سے واقف ہے۔ ہمارے درمیان اس سلسلے میں بات ہوتی رہتی ہے۔ اسی دوست نے مجھے بتایا ہے کہ شمسی صاحب کا اکاؤنٹ اس کی برانچ میں ہے اور وہ منیجر سے مل کر ایک بھاری لون لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میرے دوست کے مطابق، شمسی صاحب ایک پروڈکشن ہاؤس کھولنے کے لیے لون لینا چاہتے ہیں۔''

''ہوں...!'' سہیل احمد نے معنی خیز انداز میں ہنکارا بھرا۔ ''تو اس کا مطلب ہے، شمسی صاحب اپنی ٹیم بنا رہے ہیں... وہ ماریا کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی توڑنے کی کوشش کریں گے!''

''یہ تو بڑی خطرناک بات ہے...!'' اسد اللہ نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

سہیل احمد نے فرید پاشا کو مخاطب کرتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''پاشا صاحب! شمسی صاحب تو اپنا پروڈکشن ہاؤس جب بنائیں گے، سو بنائیں گے۔ ابھی تو آپ کے دوست پر تلوار لٹک رہی ہے۔''

''آپ ضیا کو سمجھانے کی کوشش کریں پاشا صاحب!'' اسد اللہ نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ ''اسے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔''

''سمجھانے کی کوشش کی تو ہے...'' فرید پاشا نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''دیکھیں، کیا ہوتا ہے... وہ بڑا ابدد ماغ ہے!''

''ہاں... یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' سہیل احمد تائیدی انداز میں بولا۔

اس کے بعد، وہ تینوں ضیا کی ذات اور ڈائریکشن کو موضوع بنا کر باتیں کرنے لگے۔

☆☆☆

''شمسی سے تمہارا کس بات پر جھگڑا ہوا ہے؟'' نوید نے کافی کی چسکی لیتے ہوئے ماریا سے پوچھا۔

''نوید...!'' ماریا نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''بس، سمجھ لو کہ تمہارے سیریل کا لاسٹ ایپی (ایپی سوڈ) چل رہا ہے...''

نوید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تم کس سیریل کا ذکر کر رہی ہو؟''

''اس سیریل کا...'' ماریا نے روشن ایل سی ڈی کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دل دیوانے...!''

''مگر ابھی تو اس سیریل کا پائلٹ ایپی سوڈ تیار ہوا ہے۔'' نوید کے لہجے سے الجھن جھلکتی تھی۔ ''اور تم آخری ایپی سوڈ کی بات کر رہی ہو... یہ کیا بے وقوفی ہے؟''

''جب تک میں تمہیں پوری بات نہیں بتاؤں گی۔'' ماریا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''تم میری ہر حرکت کو دیوانگی اور بے وقوفی کے کھاتے میں ڈالتے جاؤ گے نوید...!''

''تو تمہیں منع کس نے کیا ہے...!'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولا۔ ''میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔ بتاؤ، کیا بات ہے؟''

ماریا بتانے لگی۔ ''نوید! تم میرے اور شمسی کے معاملے سے اچھی طرح واقف ہو۔ میں نے شمسی کی محبت میں بے حساب قربانیاں دی ہیں۔ تم میرے بے لوث دوست ہو۔ تم سے کچھ چھپا ہوا تو نہیں ہے۔ تم نے ہر مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا ہے اسی لیے میں تمہارے پاس آگئی ہوں اور...''

''اس تمہید اور تفصیل کی کیا ضرورت ہے ماریا۔'' نوید نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم گہرے دوست ہیں اور ہمیشہ دوست رہیں گے۔''

''مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے نوید...!'' ماریا نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔

نوید حیرت اور فکرمندی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ اپنے سامنے بیٹھی ماریا کو دیکھنے لگا۔ اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں تھی کہ ماریا اس کی ایک اچھی دوست تھی۔ وہ اس کی ہر مشکل اور پریشانی میں کام آتا رہا تھا اور آئندہ بھی کام آنے کا حوصلہ اور جذبہ رکھتا تھا۔ وہ ماریا اور شمسی کے درمیان پلنے والے محبت کے ہر معاملے سے اچھی طرح واقف تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ نوید کو ماریا کا شمسی پر فریفتہ اور فدا ہونا بالکل پسند نہیں آیا تھا۔ وہ عرفان شمسی کو ماریا کے قابل نہیں سمجھتا تھا اور ایک مخلص اور خیرخواہ سچا دوست ہونے کے ناتے ابتدا میں اس نے یہ نکتہ ماریا کو سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی۔ ماریا کو سیاہ و سفید اور اچھے برے کی پہچان

www.urdutech.com

کرانا اس کا فرض بنتا تھا اور نوید نے اپنا یہ فرض نبھانے کی حتی الامکان کوشش کی تھی، یہ الگ بات کہ اس سلسلے میں اس کی کوئی کوشش بارآور نہیں ہوسکی تھی۔ شمسی کے لیے، ماریا کی دیوانگی ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی دیکھ کر نوید نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا کہ شمسی کی حقیقت ہی صحیح معنوں میں ماریا کی آنکھیں کھول سکتی تھی اور... اس وقت نوید کو محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے شمسی کی اصلیت ماریا پر آشکار ہو چکی ہے۔ وہ شدید ترین ذہنی دباؤ کا شکار دکھائی دیتی تھی۔ وہ چونکہ ماریا کا سچا اور بے لوث دوست تھا لہٰذا اس کے دل کا بوجھ ہلکا کرنے اور حقیقتِ حال تک پہنچنے کے لیے وہ بڑی سمجھ داری سے اس کا نفسیاتی ٹریٹ منٹ کرنے لگا۔

ماریا کے جذباتی اظہارِ دوستی پر اس نے کہا۔ ''دیکھو ماریا! ہماری دوستی کس درجے اور مرتبے کی ہے، یہ بات ہم دونوں ہی بڑی اچھی طرح جانتے ہیں... میں تمہاری بپتا تو سن ہی رہا ہوں لیکن تم اس دوران میں اپنا ہاتھ مت روکو...!''

''ہاتھ مت روکوں...!'' نوید کے معنی خیز جملے کے جواب میں ماریا نے حیرت بھرے انداز میں کہا۔ ''اس کا کیا مطلب ہوا نوید؟''

''بہت ہی سادہ اور آسان مطلب ہے۔'' وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''یہ کافی بڑی سکون آور اور فرحت بخش ہے۔ اس کی مسلسل چسکیاں تمہارے اعصاب کو بڑا سہارا دیں گی لیکن میں دیکھ رہا ہوں۔ کافی دیر سے تم نے سپ نہیں لیا، تمہارا ہاتھ گویا رکا ہوا ہے...!''

''نوید...!'' وہ اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے بولی۔ ''تمہارے کولیگز، تمہارے بارے میں سچ ہی کہتے ہیں۔''

''کیا کہتے ہیں میرے کولیگز؟'' نوید نے سرسری انداز میں استفسار کیا۔

وہ بولی۔ ''یہی کہ تمہیں ایڈیٹر اور ڈائریکٹر کے علاوہ اسکرپٹ رائٹر بھی ہونا چاہیے۔ تم لائنیں اچھی لکھ لیتے ہو...''

''اس کے بعد تم سمیت سب یہ کہو گے کہ میں اداکاری بھی اچھی کر لیتا ہوں لہٰذا...''

''اس میں آخر شک ہی کیا ہے!'' ماریا اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ''میں جانتی ہوں، تمہارے اندر ایک آن مول آرٹسٹ چھپا ہوا ہے۔''

نوید نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''میرے اندر چھپے ہوئے آرٹسٹ کو ہم سب مل جل کر بعد میں، باہر نکال لیں گے کیونکہ یہ ایک دو آدمیوں کے بس کا کام نہیں۔ اس لاش میں سے کچھ برآمد کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا... فی الحال، تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ... اور ہاں، ساتھ ساتھ کافی سے بھی انصاف ہونا چاہیے۔ یہ اگر مگ ہی میں ٹھنڈی ہوگئی تو بنانے والے کی محنت کو ستائش نہیں مل سکے گی۔ تم جانتی ہو نا، معدہ اچھے کھانے اور کھانا پکانے والے کے حق میں خصوصی دعا کرتا ہے!''

''نوید... معدے اور معدے کے معاملات کو تم سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے!'' ماریا نے ذومعنی انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔'' نوید نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اب تم شروع ہو جاؤ... شاباش!''

نوید خاصے بھاری بھرکم وجود کا مالک تھا۔ اس کے بے تکلف دوست اور وہ خود بھی اپنے آپ کو ڈھائی من کی لاش کہا کرتا تھا۔ اس قدر وزن کا سبب بسیار خوری کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ نوید کو کھانا کھانے، کھانا کھلانے اور کھانا پکانے کا بے حد شوق تھا۔ اس کا منہ ہر وقت چلتا رہتا تھا۔ پروڈکشن ہاؤس کے علاوہ اگر وہ گھر پر نہیں ہوتا تھا تو پھر اپنے دوستوں کے ہمراہ کسی ریسٹورنٹ ہی میں بیٹھا دکھائی دیتا تھا۔ کھانے کے معاملے میں وہ خوش ذوق ہونے کے ساتھ ساتھ خوش خوراک بھی تھا۔

نوید کی ہدایت پر ماریا نے کافی کا ایک بڑا گھونٹ لیا پھر دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں جانے کی جلدی تو نہیں؟''

''ہرگز نہیں!'' وہ پوری قطعیت سے بولا۔ ''تمہارے لیے میرے پاس ٹائم ہی ٹائم ہے...'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے گہری سانس خارج کی پھر بوجھل لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ویسے بھی گھر میں کون ہے، میرے بیوی بچے بیٹھے انتظار کر رہے ہیں!''

ماریا نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''نوید! تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ ماشاء اللہ! تم عاقل ہو، بالغ ہو، تمہارے پاس پیسا ہے، پروفیشن ہے، شہرت ہے اور...''

''میری شادی، ہمارا موضوع نہیں ہے ماریا!'' نوید نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال تم مجھے اپنے اور شمسی کے جھگڑے کے بارے میں بتا رہی ہو... اور ہاں، بات وہیں سے شروع کرنا جہاں سلسلہ ٹوٹا تھا۔ تم نے بڑے دکھی انداز میں بتایا تھا نا کہ تمہارے اور شمسی کے بیچ میں ''دوول دیوانے'' کا لاسٹ اپی چل رہا ہے...؟''

''ہاں نوید... لاسٹ اپی۔'' وہ گمبھیر انداز میں بولی۔

''ذرا وضاحت کرو...'' نوید نے کافی کا آخری سپ لینے کے بعد مگ کو ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

ماریا ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگی۔ ''دوول دیوانے کے لاسٹ اپی میں، سیریل کی کہانی کے مطابق، ہیرو، ہیروئن کی محبت کی خاطر اپنا مذہب تبدیل کر کے مسلمان ہو جاتا ہے۔ ہیں نا...؟''

''ہاں...'' نوید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''تو...؟''

''تو یہ کہ ہماری کہانی کے لاسٹ اپی میں شمسی ایسا کرنے سے انکاری ہے۔'' ماریا نے سنسناتے ہوئے لہجے میں انکشاف کیا۔

''کیا کہہ رہی ہو ماریا...!'' نوید سٹپٹا کر رہ گیا۔

وہ اصراری لہجے میں بولی۔ ''میں سچ کہہ رہی ہوں نوید!''

''تو... تو... تم یہ کہنا چاہ رہی ہو... کہ عرفان شمسی ہندو ہے...؟'' نوید نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں وہ طنز بھرے، معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔

☆☆☆☆

عارف نے دو تین دن ہی میں ایک ماہر بیوٹیشن کو ارینج کر لیا تھا اور وہ پچھلے ایک ماہ سے کام بھی کر رہی تھی۔ دوسری جانب ماریا نے ضیا کی معیت میں ڈائریکشن سیکھنا بھی شروع کر دی تھی۔ اسی دوران میں ایک ناخوشگوار واقعہ بھی پیش آ گیا تھا اور یہ واقعہ اس میٹنگ کے چند روز بعد کا تھا جو اسد اللہ، سہیل احمد اور فرید پاشا کے درمیان ہوئی تھی۔ اس وقت عارف اور اس کا گرو نوید بیٹھے اسی موضوع پر بات کر رہے تھے۔

''نوید بھائی! پاشا صاحب اچھے آدمی تھے۔ انہیں کیوں فائر کیا گیا؟''

''فیلڈ میں کام کرنے کے لیے انسان کا اچھا ہونا ہی کافی نہیں ہوتا۔'' نوید نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے اپنے جذبات اور احساسات پر بھی کنٹرول ہونا چاہیے اور تم یہ تو جانتے ہی ہو، پاشا صاحب جب جوش میں آ کر بولنا شروع کرتے تھے تو انہیں مطلق یہ ہوش نہیں رہتا تھا کہ وہ کس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں۔ بے قابو زبان کو بہادری کا نام نہیں دیا جا سکتا اور... پاشا صاحب کی برطرفی کا سبب بھی یہی ہے۔''

''آخر اس میٹنگ میں پاشا صاحب نے ایسا کیا بول دیا تھا کہ شمسی صاحب نے انہیں فائر کر دیا۔'' عارف کا ذہن اور سوچ الجھن کا شکار تھے۔ ''اور پھر اگر کچھ کہہ بھی دیا تھا تو وہ شمسی صاحب تک کیسے پہنچ گیا؟''

نوید نے پہلے عارف کو اس میٹنگ کا احوال سنایا جو فرید پاشا، اسد اللہ اور سہیل احمد کے درمیان پچھلے دنوں ہوئی تھی پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''ہمارے پروڈکشن ہاؤس کی ذرا ذرا سی بات ہمایوں اختر کے پاس کیسے پہنچ جاتی ہے؟''

''ہمایوں صاحب کا ایک جاسوس ہمارے درمیان موجود ہے... اکاؤنٹنٹ رحمان۔'' عارف نے نوید کے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''وہی حقِ نمک ادا کرتے ہوئے ہمایوں صاحب کو رپورٹنگ کرتا ہے حالانکہ ہمایوں صاحب تو مہینے میں ادھر ایک آدھ چکر ہی لگاتے ہیں۔''

''یہی نکتے کی بات ہے عارف!'' نوید نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''انسان کی یہ تاریخ ہے کہ اسے اپنے سسٹم میں جیسے ہی کوئی اختیار ملتا ہے، وہ اپنا اقتدار چلانے کے لیے سب سے پہلے جاسوسی کا نظام قائم کرتا ہے... عارف، حضرت جاسوس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔''

''تو آپ کا خیال ہے، یہ ساری خبریں رحمان ہی نے شمسی صاحب تک پہنچائی تھیں؟'' عارف نے متاملانہ انداز میں دریافت کیا۔

''رحمان، ہمایوں صاحب کا جاسوس ہے عارف!'' نوید نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''شمسی صاحب نے اس نوعیت کی خدمات کے لیے سہیل احمد کو رکھا ہوا ہے۔''

''اوہ...!'' عارف ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

نوید نے کہا۔ ''سہیل سیدھا سادہ صحافی ہے، اس کا پروڈکشن ہاؤس میں کیا کام۔ نہ تو وہ پری پروڈکشن کی میٹنگ میں شمولیت کی اہلیت رکھتا ہے اور نہ ہی پوسٹ پروڈکشن کی ٹیکنیکل اسکل اس کے اندر موجود ہے۔ اس کے لیے سب سے بہترین جائے پناہ کوئی پرائیویٹ نیوز چینل ہی ہو سکتا ہے جہاں وہ کوآرڈی نیشن جیسے کام کرتا رہے۔''

عارف نے سمجھے ہوئے انداز میں کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، ہمیں رحمان کے علاوہ سہیل سے بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے!''

''بالکل...!'' نوید نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''ہم جس فیلڈ میں کام کر رہے ہیں اس میں ہر دوسرے آدمی اور بعض اوقات اپنے سائے سے بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میری دعا ہے، سہیل جلد از جلد اس نیوز چینل کی آفر کو قبول کر لے تاکہ اس کے وجود سے ہمارے پروڈکشن ہاؤس کو چھٹکارا حاصل ہو۔ یہ جب تک یہاں موجود ہے،

فتنے ہی جگا تا رہے گا۔''

''اور جب تک شمسی صاحب نہیں چاہیں گے تو وہ یہاں سے جائے گا نہیں!'' عارف نے حاصل گفتگو کے طور پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' نوید نے تائیدی انداز میں گردن ہلادی پھر کہا۔ ''میرے خیال میں سہیل، رحمان سے بھی زیادہ خطرناک آدمی ہے... کیونکہ ہمارا دن رات شمسی صاحب سے واسطہ پڑتا رہتا ہے۔''

''ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی نوید بھائی!'' عارف نے الجھن زدہ انداز میں کہا۔

نوید نے پوچھا۔ ''کون سی بات؟''

عارف نے وضاحت کے لیے منہ کھولنا ہی چاہا تھا کہ نوید نے جلدی سے کہا۔

''بات شروع کرنے سے پہلے کچن میں فون کر کے میرے لیے ایک گرین ٹی کا کہہ دو... اور تم جو بھی لینا چاہو!''

عارف نے نوید کے لیے گرین ٹی اور اپنے لیے جوشاندے والی چائے کا آرڈر دیا پھر کہا۔ ''نوید بھائی! نزلے نے تو میری زندگی خراب کر رکھی ہے!''

''آج کل ہر طرف یہی حال ہے پیارے صاحب!'' نوید نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''پتا نہیں، یہ وائرس کب کراچی سے رخصت ہوگا!''

''نوید بھائی! میں نزلے زکام کو تو جھیل جاتا ہوں۔'' عارف نے بے چارگی سے کہا۔ ''لیکن آدھے سر کا درد برداشت سے باہر ہوجاتا ہے۔ یہ مجھے بے بس کر کے رکھ دیتا ہے۔''

''ارے ہاں یار، مجھے یاد آیا...'' نوید نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ میرے دوست ہیں نا، آفاقی صاحب... وہ مائگرین کا دم کرتے ہیں۔''

''آپ نے پہلے بھی کئی مرتبہ آفاقی صاحب کا ذکر کیا ہے۔'' عارف نے کہا۔ ''لیکن کبھی ملوایا نہیں۔ وہ مائگرین یا دردِ شقیقہ کا کتنا شافی دم کرتے ہیں، مجھے کیا پتا!''

''یار! آفاقی صاحب لاہور میں ہیں اور تم کراچی میں۔'' نوید نے کہا۔ ''ہزار میل دور سے میں تمہیں کیسے دم کرادوں؟''

''ٹیلے فون پر ہی کوئی پھونک شونک پڑوادیں نوید بھائی۔'' عارف نے منت آمیز انداز میں کہا۔ ''جب آج کل فون پر نکاح اور طلاق ہو رہی ہے تو پھر دم کیوں نہیں؟''

''میں نے آفاقی صاحب کے دم کے حوالے سے ایک خاص بات شاید تمہیں بتائی نہیں۔'' عارف صوفے پر ایزی ہوتے ہوئے بولا۔ ''وہ اس مرض کا دم صرف اسی وقت کرتے ہیں جب درد ہو رہا ہو لیکن تمہیں دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔'' نوید نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ہم بہت جلد ایک میوزیکل نائٹ شوٹ کرنے لاہور جارہے ہیں۔ وہاں تین چار دن تک قیام ہوگا۔ میں تمہیں آفاقی صاحب سے بھی ملوادوں گا۔ اب تم خلوص نیت سے یہ دعا کرو کہ وہاں قیام کے دوران میں تمہارا مائگرین کا درد بیدار ہوجائے اور آفاقی صاحب کو دم کا موقع مل سکے۔ واقفانِ حال بتاتے ہیں کہ محض ایک بار کے دم سے اس دردِ خبیثہ سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جاتی ہے۔''

''نوید بھائی! آپ بھی کمال کا مذاق کرتے ہیں۔'' عارف نے کہا۔ ''کوئی بھلا مائگرین جیسے درد کے لیے خود خلوصِ نیت سے کیونکر دعا کرسکتا ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی نا کہ... آ بیل مجھے مار!''

''بھئی، تمہاری مرضی ہے۔'' نوید نے شرارت آمیز انداز میں کندھے اچکادیے۔ ''تم کسی بیل سے اپنی خاطر تواضع کراؤ یا کسی دردِ خبیثہ سے!''

اسی دوران میں گرین ٹی اور جوشاندہ آمیز چائے آگئی۔ وہ اپنی اپنی پسند سے انصاف کرتے ہوئے اصل موضوع پر آگئے۔ نوید نے وہیں سے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ عارف کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''ہاں، اب بتاؤ... وہ کون سی بات ہے جو تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی؟''

عارف نے کہا۔ ''نوید بھائی! اس روز فرید پاشا نے میٹنگ کے دوران میں شمسی صاحب کے جس منصوبے کا ذکر کیا تھا وہ تو سیدھی سیدھی ایک سازش ہے۔ شمسی صاحب فوٹان پروڈکشنز کے متوازی ایک پروڈکشن ہاؤس کھڑا کرنے کی پلاننگ کر رہے ہیں اور وہ بھی یہیں کے اسٹاف کو توڑ کر... اب یہ تو ممکن نہیں کہ یہ سارا معاملہ ہمایوں اختر صاحب کے پاس نہ پہنچا ہو۔ انہوں نے شمسی صاحب کے خلاف کوئی ایکشن کیوں نہیں لیا ابھی تک؟''

''میں تمہاری اس بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ یہ ساری باتیں ہمایوں صاحب تک ضرور پہنچی ہوں گی۔'' نوید نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر انہوں نے ابھی تک کوئی ایکشن نہیں لیا تو اس کی دو بنیادی وجوہات ہوسکتی ہیں۔''

''مثلاً... کون سی وجوہات؟'' عارف نے پوچھا۔

نوید نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''پہلی وجہ تو یہ

ہوسکتی ہے کہ شمسی صاحب نے اس انداز میں ہمایوں صاحب کے سامنے اپنا کیس پیش کیا ہو کہ وہ خود بے قصور اور پاشا قصوروار نظر آنے لگے۔ شمسی صاحب اتنے فطین اور کائیاں تو ہیں کہ یہ ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پھر فرید پاشا چونکہ فوٹان پروڈکشنز کا باقاعدہ ملازم نہیں تھا اس لیے ہمایوں صاحب نے اسے کسی وضاحت کے لیے اپنے پاس طلب بھی نہیں کیا ہوگا۔''

''اور دوسری وجہ؟'' نوید سانس لینے کے لیے متوقف ہوا تو عارف نے سوال کردیا۔

نوید نے جواب میں بتایا۔ ''ہمایوں اختر صاحب بہت ہی دانا و بینا اور ٹھنڈے مزاج کے انسان ہیں۔ وہ فوری طور پر کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ ہوسکتا ہے، وہ بالا ہی بالا اپنے طور پر شمسی صاحب کی تحقیق کرانے میں مصروف ہوگئے ہوں اور جب شمسی صاحب کی سازش سے متعلق کوئی ٹھوس ثبوت حاصل کرنے میں وہ کامیاب ہوجائیں تو پھر وہ شمسی صاحب پر پکا ہاتھ ڈالیں اور اس سازش کی سزا کے طور پر وہ شمسی صاحب کو اپنے سیٹ اپ سے نکال باہر کریں۔''

''ہاں، یہ زیادہ قرین قیاس نظر آتا ہے۔'' عارف نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ ''نوید بھائی! ویسے آپ کا کیا خیال ہے... کیا شمسی صاحب واقعی اپنا ذاتی پروڈکشن ہاؤس قائم کرنے کی پلاننگ کر رہے ہیں؟''

''پروڈکشن ہاؤس کے بارے میں تو میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' نوید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس بات کا مجھے یقین ہے کہ وہ آج کل کچھ اس نوعیت کی سرگرمیوں میں مصروف ہیں جو فوٹان پروڈکشنز کے لیے بہرحال نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے، شمسی صاحب بھی عنقریب اپنے انجام سے دوچار ہونے والے ہیں!'' عارف نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

عارف کے جواب میں نوید نے محض ایک جملہ ادا کرنے پر اکتفا کیا۔ ''بیٹا جی! اس طرح تو ہوتا ہے، اس طرح کے کاموں میں...!''

عارف نے گفتگو کے زاویے کو تھوڑا تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ''ادھر ماریا اور ضیا میں بھی خاصا تناؤ دکھائی دے رہا ہے!''

''یہ تو شمسی صاحب کی پلاننگ کے عین مطابق ہے۔'' نوید نے کہا۔ ''وہ ضیا کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ ماریا انہی کے اشاروں پر ناچ رہی ہے۔''

''ماریا سے تو آپ کی اچھی خاصی دوستی ہے نوید بھائی۔'' عارف نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''آپ اسے سمجھاتے نہیں ہیں!''

''مثلاً...!'' نوید نے سوالیہ انداز میں عارف کی جانب دیکھا اور پوچھا۔ ''میں ماریا کو کیا سمجھاؤں؟''

''یہی... یہی کہ وہ... شمسی صاحب کے ہاتھوں کا کھلونا نہ بنے!''

''تم کیا سمجھتے ہو، میں نے ماریا کو شمسی کی حقیقت اور سچویشن کی نزاکت کے بارے میں نہیں بتایا ہوگا؟''

''پھر... وہ کیا کہتی ہے؟'' عارف کی سنجیدگی میں اضافہ ہوگیا۔

''وہ کیا کہے گی...!'' نوید نے بڑی بے بسی سے کہا۔ ''اس پر تو شمسی کی محبت کا بھوت سوار ہے۔ پاگل ہوگئی ہے وہ۔ میری کوئی بات اس کی عقل میں نہیں بیٹھتی۔ میں تو یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ شاید وہ اب مجھے اپنا دوست بھی نہیں سمجھتی، بلکہ جو شخص بھی شمسی کے خلاف زبان کھولے، وہ اسے اپنا دشمن تصور کرنے لگتی ہے۔ یہ لڑکی ایک دن بہت پچھتائے گی۔ مجھے اس کا انجام خوش گوار نظر نہیں آرہا۔''

عارف کے منہ سے بے ساختہ یہ الفاظ برآمد ہوئے۔ ''اللہ نہ کرے کہ ماریا کی آنکھوں میں کبھی آنسو بھی اتریں!''

عارف کی اس بے ساختگی پر نوید اسے ایسی نظر سے دیکھنے لگا جیسے وہ بھی ماریا کے امیدواروں میں شامل ہو!

☆☆☆

نوید کی الجھن میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔ وہ شک آمیز نظر سے ماریا کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''تم یقیناً ایک سنجیدہ مذاق کر رہی ہو۔ عرفان شمسی تو ایک مسلمان مرد ہے۔ وہ ہندو کیسے ہوسکتا ہے... اور یہ تم کیا کہہ رہی ہو، وہ اسلام قبول کرنے سے انکاری ہے؟''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا نوید!'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''تم اپنے طور پر ہی بہت دور تک سوچنے لگتے ہو!''

نوید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے احساس ہوگیا کہ ان لمحات میں وہ خاصا جذباتی ہوگیا تھا لیکن اس میں اس کا بھی کوئی زیادہ قصور نہیں تھا۔ ماریا نے ''دو دل دیوانے'' کے حوالے سے بات ہی ایسے سنسنی خیز انداز میں شروع کی تھی کہ وہ سٹپٹا کر رہ گیا تھا۔ بہرحال، حقیقت کیا ہے اس کی وضاحت صرف ماریا ہی کرسکتی تھی لہٰذا وہ سنبھل کر گہری سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔

''ہاں بتاؤ... تم شمسی کے حوالے سے آخر کہنا کیا چاہتی ہو؟''

اس بات کو تو وہ کسی طور پر بھی ہضم نہیں کر سکتا تھا کہ عرفان شمسی ایک ہندو ہوگا۔ ماریا نے اس کے سوال کے جواب میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''نوید! میں نے تمہارے سیریل ''دو دل دیوانے'' کے لاسٹ اپی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہماری کہانی کے لاسٹ اپی میں شمسی ایسا کرنے سے انکاری ہے۔ تم نے میری بات سے یہ مطلب نکال لیا کہ شمسی ہندو ہے اور وہ میری خاطر اپنا مذہب چھوڑنے پر تیار نہیں جبکہ میں نے تو محبت کے حوالے سے ایک تقابلی مثال دی تھی...''

ماریا سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئی تو نوید نے کوئی سوال نہیں کیا بلکہ خاموشی سے اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ سلسلۂ وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''دو دل دیوانے کا ہیرو، ہیروئن سے اتنی سچی اور گہری محبت کرتا ہے کہ جب ہیروئن اس سے مذہب تبدیل کرنے کے بارے میں کہتی ہے تو وہ ایک لمحہ سوچے بغیر اس کام کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ شمسی بھی مجھ سے بے پناہ محبت کا دعوے دار ہے... بلکہ تھا...!'' اس نے دکھ بھرے انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا پھر ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

''اس نے مجھ سے محبت اور چاہت کے بڑے بلند و بانگ وعدے اور دعوے کیے تھے اور مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ مجھ سے ضرور شادی کرے گا۔ میں بھی اس کی محبت میں دیوانہ وار دوڑی چلی جا رہی تھی۔ مجھے شمسی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ وہ مجھے اپنائے گا، مجھے اپنی زندگی کا مستقل ساتھی بنائے گا لیکن اس نے میرا یقین چکنا چور کر دیا، میرے اعتماد اور محبت کی دھجیاں بکھیر دیں... اس نے بڑے واضح الفاظ میں مجھے جتا دیا ہے کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کر سکتا۔ ہاں البتہ، اگر میں اس سے دوستی رکھنا چاہوں تو اسے منظور ہے۔''

وہ ایک بار پھر بولتے بولتے رک گئی۔

نوید کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ ماریا اس وقت ایک جذباتی بھونچال سے گزر رہی تھی۔ اس کے اندر خواہشات اور خوابوں کا جو کانچ محل ایستادہ تھا وہ شمسی کے ایک انکار سے چکنا چور ہو کر زمین بوس ہو گیا تھا اور اب اس مسمار محل کی کرچیاں ماریا کی روح کو لہولہان کر رہی تھیں۔ نوید کو تو بہت پہلے اس بات کا اندازہ تھا کہ ایک دن یہ ڈراپ سین بھی ہونا ہے۔ وہ تو اس محبت کے ایسے حسرت ناک انجام سے بہ خوبی آگاہ تھا اور اس نے ماریا کو سمجھانے کی بھی حتی المقدور کوشش کی تھی لیکن اس پگلی نے کچھ سمجھ کر نہیں دیا تھا جس کا دردناک نتیجہ اب برآمد ہوا تھا۔ ماریا ان لمحات میں بڑی ٹوٹی ہوئی، بہت بکھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔

وہ یک ٹک اسے دیکھتا رہا تاہم کوئی سوال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چاہتا تھا کہ ماریا اپنی زبان ہی سے حالِ دل بیان کرے۔ اس طرح اس کے جی کا غبار نکل جاتا اور وہ اس جذباتی کیفیت سے نکل آتی جس میں وہ اس وقت جکڑی نظر آتی تھی۔ چند لمحات کے گمبھیر توقف کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''نوید! کاش میں نے تمہاری بات پر دھیان دیا ہوتا۔ میں شمسی کی محبت میں اس قدر اندھی ہو گئی تھی کہ اس کے خلاف کچھ بھی سننا نہیں چاہتی تھی۔ تم سچ کہتے تھے، شمسی کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ اس نے شادی سے صاف انکار کر کے میری محبت، میری ذات کی تذلیل کی ہے۔ میں اپنی ہی نگاہ میں گر گئی ہوں...''

جب ماریا ایک ہی بات کو دہراتی چلی گئی تو گفتگو کو آگے بڑھانے کے لیے مجبوراً نوید کو بولنا پڑا۔

''دیکھو ماریا!'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے آج تک تمہیں کیا سمجھایا اور تم نے کیا نہیں سمجھ کر دیا، ان باتوں کے ذکر کا اب کوئی فائدہ نہیں... میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ تم لوگوں کا معاملہ بالکل ٹھیک چل رہا ہے حالانکہ پھر بھی میرا دل مطمئن نہیں تھا لیکن جب شمسی کے پیچھے ہی تم نے بھی فوٹان پروڈکشنز کو چھوڑ کر ٹی وی چینل جوائن کر لیا اور تمہارا نام، شمسی کے نام کے ساتھ ڈراموں کے ٹائٹل پر چلنے لگا تو مجھے تمہاری کچھ زیادہ فکر نہیں رہی تھی۔ پھر تم نے بھی یہاں سے جانے کے بعد مجھ سے رابطہ بہت کم کر دیا تھا۔ بس ڈراموں کے ٹائٹل پر میں تمہارا نام شمسی کے نام کے ساتھ جڑا دیکھ لیا کرتا ہے۔ ایگزیکٹو پروڈیوسر: عرفان شمسی۔ ایسوسی ایٹ پروڈیوسر؟ ماریا... میں تو خوش تھا کہ تم پوزیشن سے ڈائریکٹر بنیں اور پھر پروڈیوسر بن گئیں... پھر یہ قیامت کیسے ٹوٹ پڑی؟''

''تم نے بالکل ٹھیک کہا نوید...!'' وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''یہ حالات میرے لیے کسی قیامت سے کم نہیں ہیں لیکن یہ قیامت میرے لیے بہت رحمت ثابت ہوئی ہے۔ میں شمسی کا اصل چہرہ دیکھنے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ اگر شادی کے بعد اس کی حقیقت

مجھ پر کھلتی تو شاید میں یہ صدمہ سہہ نہ پاتی۔ میں اس کے چنگل میں اس طرح گرفتار ہو چکی ہوتی کہ ایک بے بس پرندے کے مانند پھڑ پھڑا کر رہ جاتی...''

ماریا ذہنی طور پر اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ بار بار ایک ہی سین کو دہرا رہی تھی۔ نوید نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''مجھے صرف یہ بتاؤ کہ شمسی شادی سے انکاری کیوں ہے؟ وہ اس انکار کی کیا وجہ بتاتا ہے...؟''

ماریا نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ کہتا ہے، بیوی رکاوٹ بن رہی ہے۔ وہ اپنا گھر برباد نہیں کر سکتا...!''

''اوہ...!'' نوید نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو یہی نکتہ تمہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ کیا تمہیں اس وقت نظر نہیں آ رہا تھا کہ وہ بیوی بچوں والا ہے۔ دوسری شادی کر کے وہ اپنی جمی جمائی گھریلو زندگی کو تلپٹ نہیں کرے گا۔'' وہ ایک لمحے کے لیے متوقف ہوا پھر ماریا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں اضافہ کیا۔

''وہ تمہاری محبت کے بعد تو شادی شدہ نہیں ہوا تھا نا...؟''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو نوید... بلکہ پہلے بھی تم ہمیشہ ٹھیک ہی کہتے رہے ہو۔'' وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''شمسی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو راضی کر لے گا۔ شادی کے بعد وہ مجھے بالکل الگ تھلگ رکھے گا۔ اگر وہ اپنے بیوی بچوں کی کسی بھی معاملے میں حق تلفی نہ کرے تو اس کی بیوی کو اس کی دوسری شادی پر کوئی اعتراض نہیں... وہ راضی خوشی شمسی کو دوسری شادی کی اجازت دینے کو تیار ہے...!''

''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں ماریا۔'' نوید نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کوئی بھی بیوی اپنے شوہر کو راضی خوشی دوسری شادی کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ شوہر کے کسی غیر نصابی چکر کو تو جیسے تیسے برداشت کر لیتی ہے مگر سوکن کو کسی قیمت پر نہیں۔ شمسی تمہیں اول روز ہی سے بے وقوف بنا رہا تھا اور اب آ کر اس نے اس ڈرامے کا ڈراپ سین کر دیا ہے۔ تم اس کی چال کو سمجھ ہی نہیں سکی ہو...!''

''اس کا مطلب ہے، اس کا مجھ سے دل بھر گیا ہے۔'' ماریا نے شکست خوردہ انداز میں نوید کی طرف دیکھا۔ ''جو وہ مجھ سے جان چھڑانے کے لیے بیوی کا ڈراما ڈال رہا ہے؟''

''مرد کا دل کبھی نہیں بھرتا ماریا...!'' نوید نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''اس کی نیت میں فتور آ جاتا ہے۔ اس فتور کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں...!''

ماریا الجھن زدہ انداز میں نوید کو دیکھنے لگی جیسے خاموش زبان سے پوچھ رہی ہو... مثلاً کون سی وجوہات!

☆☆☆

ماریا کو فوٹان پروڈکشنز میں آئے، ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا اور یہ تمام تر وقت اس نے نوید کے ساتھ ایڈیٹنگ روم میں گزارہ تھا۔ وہ جب سے آئی تھی عارف مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ ماریا کو کافی عرصے سے جانتا تھا اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ وہ ماریا کو دل سے پسند بھی کرتا تھا لیکن اس نے اپنی پسندیدگی کو کبھی ماریا پر کھلنے نہیں دیا تھا۔ وہ اپنی دانست میں یہ سوچتا تھا کہ جب شمسی ایسی شخصیات ماریا میں دلچسپی لے رہی ہیں اور وہ بھی ادھر مائل ہے تو پھر وہ کس قطار شمار میں۔ عارف کی طرح اور بھی بہت سے لوگ اس انداز میں سوچتے ہوں گے بلکہ یقیناً ایسا سوچتے تھے، کسی کو کیسا بھی سوچنے سے روکا تو نہیں جا سکتا نا!

عارف اپنے کمرے میں بیٹھا، ماریا ہی کے حوالے سے سوچ رہا تھا۔ وہ جب تک فوٹان پروڈکشنز میں رہی، عارف کے ساتھ اس کی بڑی اچھی ورکنگ ریلیشن شپ رہی تھی۔ وہ ہر وقت فریش اور خوش رہنے کی عادی تھی۔ وہ فوٹان کو خیر باد کہتے وقت بھی بہت خوش تھی لیکن آج عارف کو اس کے چہرے پر وہ خوشی اور تازگی دکھائی نہیں دی تھی جو اس کے مزاج اور شخصیت کا خاصہ تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ وہ اتنی دیر سے نوید کے ساتھ ایڈیٹنگ روم میں بند تھی تو... اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ماریا کے ساتھ کوئی پرابلم ضرور ہے۔ کیا پرابلم ہے، یہ عارف کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا...!

عارف کے تصور کی آنکھ وہ تمام منظر دیکھ رہی تھی جو اس کی موجودگی میں ''شوٹ'' ہوئے تھے۔ ایک اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے، وہ تیزی سے بدلتی ہوئی سچویشن کو دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتا تھا۔ ماریا کا شمسی کے قریب آنا۔ شمسی کا ماریا کو بڑی خوب صورتی سے ہینڈل اور استعمال کرنا۔ اسے بیوٹیشن سے ہٹا کر ڈائریکشن کی طرف لانا۔ اس کے ذریعے ضیا کو فائر کرنا... یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ نظر آتا تھا۔ ماریا نے جتنا عرصہ ضیا کے ساتھ کام کیا، ان کی ایک دن نہیں بنی تھی۔ ماریا نے ڈائریکشن سیکھی یا نہیں، یہ ایک الگ بحث تھی تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا تھا کہ شمسی نے ایک خاص پلاننگ کے تحت ماریا کو ضیا کے ساتھ لگایا تھا۔ بعض سنجیدہ افراد کا تو یہ دعویٰ تھا کہ شمسی ہی نے ضیا کی چھٹی کرنے کے لیے ماریا کو اس سے بھڑایا تھا۔

بہر حال، ایک سنگین جھگڑے کے بعد ضیا کو فوٹان پروڈکشنز سے الگ کر دیا گیا تھا۔ اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد ایک انقلابی واقعہ پیش آیا۔

اچانک پتا چلا کہ ہمایوں اختر صاحب نے عارف شمسی کو فوٹان پروڈکشنز سے برطرف کر دیا ہے۔ شمسی کو پروڈکشن ہاؤس سے الگ کرنے کے بعد سجاد بخاری کو نیا پروڈکشن ہیڈ مقرر کر دیا گیا تھا۔ شمسی کی برطرفی کے حوالے سے دو تین رائے پائی جاتی تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ سازش جس کا کچھ عرصہ پہلے فرید پاشا نے ایک میٹنگ میں انکشاف کیا تھا، وہ ہمایوں تک من وعن پہنچ گئی تھی۔ انہوں نے کچھ عرصہ اس ''ایشو'' کو اپنے خاص انداز میں ریسرچ سے گزارا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ شمسی کو فائر کر دینا چاہیے، سو انہوں نے شمسی کو فوٹان پروڈکشنز سے نکال باہر کیا تھا۔ اس سلسلے میں عارف کی اپنے گرو نوید سے بھی بات ہوئی تھی۔

''نوید بھائی! لوگ تو طرح طرح کی اڑا رہے ہیں۔ شمسی صاحب کے جانے کے پیچھے اصل اسٹوری کیا ہے؟''

''مثلاً... لوگ کس کس طرح کی اڑا رہے ہیں؟'' نوید نے چشمے کے پیچھے سے گھور کر اپنے ہونہار چیلے سے پوچھا۔

عارف نے جواب دیا۔ ''یہی کہ ہمایوں صاحب نے شمسی کی سازش پکڑ لی تھی اور...''

''اگر یہ وجہ ہوتی تو ہمایوں صاحب شمسی کو فائر کرنے میں اتنی دیر نہیں لگاتے۔'' نوید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ ہمایوں صاحب بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتے ہیں لیکن اگر شمسی واقعی کوئی پروڈکشن ہاؤس کھولنے اور یہاں کا اسٹاف توڑنے کی سازش میں ملوث ہوتا تو ہمایوں صاحب تین چار ماہ تک خاموشی سے انتظار نہ کرتے...''

''اس کا مطلب ہے، پاشا صاحب نے اس روز میٹنگ میں جو کچھ بیان کیا تھا، وہ ان کا اپنا پرسیپشن تھا؟'' عارف نے چونک کر نوید کی طرف دیکھا۔

''ہاں، ایسا ہو سکتا ہے۔'' نوید نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''اور یہ بھی ممکن ہے کہ پاشا نے اپنے دوست ضیا کی محبت میں یہ ڈراما رچایا ہو۔ پاشا کو یہ بات قطعاً پسند نہیں تھی کہ شمسی ہر موقع پر ضیا کو نیچا دکھانے اور ذلیل کرنے کی کوشش میں نظر آتا تھا۔''

''تو یہ... معاملہ تھا۔'' عارف نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔

نوید نے سرسری انداز میں گردن ہلا دی۔ ''ہاں، کچھ ایسی ہی صورتِ حال تھی۔''

عارف دوبارہ اصل موضوع پر آ گیا اور کہا۔ ''کچھ لوگ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ ہمایوں صاحب، شمسی صاحب کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھے۔''

''کارکردگی سے مطمئن نہیں تھے، کیا مطلب؟'' نوید نے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''مطلب یہ کہ...'' عارف وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جب تک شمسی صاحب پروڈکشن ہیڈ رہے، ہم نے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا۔''

''بکواس بات ہے یار۔'' نوید نے برہمی سے کہا۔ ''یہ ایک طرح کا پروپیگنڈا ہے عارف... ورنہ تم جانتے ہو، ہم نے دو ماہ پہلے جو ڈراما بنایا تھا، وہ پچیس ہزار روپے فی منٹ کے ریٹ سے فروخت ہوا تھا اور آن ایئر جانے کے بعد بھی وہ سپر ہٹ رہا تھا۔ اس پروڈکشن میں فوٹان نے سو فیصد کمایا ہے... اور اس سے پہلے میرے ڈائریکٹ کیے ہوئے تین ہٹ کام بھی بڑے چینلز کے پرائم ٹائم میں چلے ہیں۔''

''تو پھر نوید بھائی...'' عارف اپنی میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''شمسی صاحب کو فائر کرنے کا اصل سبب کیا ہے؟''

''بارگیننگ اینڈ بلیک میلنگ!'' نوید نے بڑے وثوق سے کہا۔

''کیسی بارگیننگ نوید بھائی!'' عارف نے حیرت آمیز انداز میں کہا۔ ''اور یہ بلیک میلنگ کا کیا قصہ ہے؟''

نوید نے وضاحتی انداز میں بتایا۔ ''تم جانتے ہو، شمسی کو فوٹان پروڈکشنز سے ون پوائنٹ فائیو (ڈیڑھ لاکھ روپے) سیلری مل رہی تھی۔ اس نے پہلے ہمایوں صاحب سے سیلری بڑھانے کی بات کی۔ جب انہوں نے ''فی الحال ممکن نہیں'' کہہ کر بات ختم کرنا چاہی تو شمسی نے ہمایوں صاحب کو بتایا کہ اسے ایک پرائیویٹ چینل سے ٹو پوائنٹ سم تھنگ کی آفر ہے۔ یہ سنتے ہی ہمایوں صاحب نے فوری فیصلہ کر دیا۔ انہوں نے دوٹوک انداز میں شمسی سے کہا، میں آپ کو زیادہ سے زیادہ ون پوائنٹ سیون فائیو دے سکتا ہوں اور یہ انکریمنٹ بھی نئے سال سے ہوگا، باقی آپ کی مرضی ہے۔ شمسی دو سے نیچے آنے کو تیار نہ ہوا لہٰذا ہمایوں صاحب نے ''جانے والے کو روکو نہیں اور آنے والے کو ٹوکو نہیں'' کے مصداق شمسی کو فارغ کر کے بخاری کو رکھ لیا ہے اور میں سمجھتا ہوں، شمسی کی بہ نسبت بخاری زیادہ قابل آدمی ہے اور کسی حوالے سے اس کی ذات بھی متنازع نہیں ہے۔''

''تو یہ ہے اصل اسٹوری...'' عارف نے گمبھیر انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''اس صورتِ حال میں ماریا کا کیا ہوگا؟''

''شمسی نے پرائیویٹ چینل جوائن کر لیا ہے۔'' نوید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں، آج کل میں ماریا بھی فوٹان کو چھوڑ کر وہیں چلی جائے گی۔''

عارف اداس نظروں سے نوید کو دیکھنے لگا۔

چند روز بعد نوید کی پیش گوئی پوری ہو گئی۔ ماریا واقعی فوٹان پروڈکشنز کو چھوڑ کر اس پرائیویٹ چینل میں چلی گئی تھی جو حال ہی میں شمسی نے جوائن کیا تھا۔ ماریا کے حوالے سے عارف کو مختلف نوعیت کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ ڈائریکٹر تو وہ فوٹان میں رہتے ہوئے ہی بن چکی تھی، چینل جوائن کرنے کے بعد وہ پروڈیوسر بھی ہو گئی تھی۔ عارف کو ماریا کی ترقی سے خوشی تو تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا دکھ بھی تھا کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی نظر سے دور ہو گئی تھی۔ ماریا کو چاہے احساس ہو یا نہ ہو لیکن عارف کے دل میں اس کے لیے محبت اور چاہت کا ایک سمندر موجزن تھا۔

کاش! محبت کی کوئی زبان ہوتی... اگر ایسا ہوتا تو بہت سے محبت کرنے والوں کے آدھے سے زیادہ مسائل خود بہ خود حل ہو جاتے!

☆☆☆

نوید نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''ہو سکتا ہے، کوئی اور لڑکی اس کی نظر میں سما گئی ہو...''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' ماریا نے قطع کلامی کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں بولی۔ ''میں اس کی طرف سے بے خبر نہیں رہی ہوں۔ اس کی ایک ایک مصروفیت پر میری گہری نظر رہی ہے۔ اگر وہ کسی اور لڑکی میں انوالو ہوتا تو مجھے فوراً پتا چل جاتا۔''

''پھر یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ تمہارے، شادی کے مطالبے نے اسے گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا ہے۔'' نوید نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ خوف زدہ ہو گیا ہے کہ اب زیادہ دیر تک تمہیں بے وقوف بنا کر ٹال مٹول نہیں کی جا سکتی لہٰذا بیوی کی آڑ لے کر اس نے تم سے جان چھڑانے کی کوشش کی ہے۔ اسے بڑی شدت سے یہ محسوس ہو گیا ہوگا کہ عنقریب تم اس کے لیے ایسے نوالے کی شکل اختیار کرنے والی ہو جسے نگلنا اور اگلنا اس کے بس میں نہ رہتا۔''

''یہ تو کھلی چیٹنگ ہے۔'' ماریا نے نیم احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''شادی کا وعدہ خود شمسی نے مجھ سے کیا تھا۔''

''یہ مردوں کی ایک چال ہوتی ہے ماریا۔'' نوید نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''جسے بے وقوف تو کیا، عقل مند لڑکیاں بھی سمجھ نہیں پاتیں۔ وہ شادی جیسے سنہری جال میں پھنس جاتی ہیں۔ اگر مرد، عورت کو شادی کا جھانسا نہ دے تو کوئی صاحبِ کردار لڑکی اس کے قریب نہیں آئے گی۔''

''چھی... چھی... چھی۔'' ماریا نے ناگواری سے کہا۔ ''تم مرد لوگ کتنے گندے اور دھوکے باز ہوتے ہو۔''

''یہ فارمولا تم ہر مرد پر اپلائی نہیں کر سکتیں۔'' نوید نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''بہر حال، جو حقیقت تھی وہ میں نے بیان کر دی ہے۔'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ماریا! تمہیں ایک دلچسپ بات بتاؤں!''

''ہاں ہاں، ضرور بتاؤ۔'' ماریا نے جلدی سے کہا۔ نوید سے بات کر کے وہ کافی حد تک ریلیکس ہو گئی تھی۔

نوید نے کہا۔ ''مضبوط کردار کی لڑکیاں صرف شادی کے آسرے اور وعدے پر ہی مردوں کے قریب آتی ہیں اور اگر کسی مرد سے محبت ہو جائے تو اس کا شادی شدہ ہونا بھی دل اور ذہن میں نہیں کھٹکتا جیسا کہ تمہارے ساتھ ہوا لیکن...'' اس نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے لمحاتی توقف کیا پھر سنسنی خیز لہجے میں بولا۔

''جبکہ کردار کی کمزور لڑکیاں ایسے مردوں پر بالکل بھروسا نہیں کرتیں جو شادی کا یقین دلا رہے ہوں۔ وہ ایسے کرداروں سے بدک جاتی ہیں۔''

''اب ان باتوں سے کچھ حاصل نہیں نوید۔'' ماریا نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں نے شمسی پر لعنت بھیج دی ہے۔''

نوید کو اپنے تن بدن میں سنسنی سی دوڑتی محسوس ہوئی، اس نے پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔ ''لعنت بھیج دی ہے... کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ...'' ماریا نے چٹانی لہجے میں کہا۔ ''مجھے شمسی سے اب کوئی غرض نہیں۔ میں نے اس سے متعلق ہر تعلق ناتا توڑ دیا ہے۔''

نوید کے وجود میں مسرت کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔ اس نے اضطراری انداز میں دریافت کیا۔ ''کیا ہمیشہ کے لیے؟''

''ہاں... ہمیشہ کے لیے!'' ماریا کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ ''میں ساری زندگی کبھی پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھوں گی۔''

''کیا یہ تمہارا حتمی فیصلہ ہے؟'' نوید نے اتمام حجت کے طور پر پوچھ لیا۔

''ہاں... فل اینڈ فائنل!'' ماریا نے اٹل لہجے میں کہا۔ ''اور اس کے ساتھ ہی میں نے ایک اور فیصلہ بھی کیا ہے۔''

''کیسا فیصلہ؟'' نوید نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

''شادی کا فیصلہ!'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔
''کس کی شادی کا فیصلہ؟''
''اپنی...اور کس کی شادی کا فیصلہ؟'' وہ نوید کی آنکھوں میں بہت گہرائی تک دیکھتے ہوئے بولی۔
نوید گڑبڑا کر رہ گیا، اس نے تعجب خیز لہجے میں پوچھا۔
''وہ خوش قسمت کون ہے بھئی؟''
''وہ ایک ایسا شریف النفس انسان ہے جو مجھ سے سچی محبت کرتا ہے لیکن میں نے اس کی محبت کو ہمیشہ نظر انداز کیا۔'' ماریا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بدقسمتی کے تلخ تجربے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ مجھے اس شریف النفس انسان کی، خاموش محبت کی قدر کرنا چاہیے۔ مجھے امید ہے، بلکہ کامل یقین ہے کہ میں اس کے ساتھ زندگی بھر خوش رہوں گی۔ وہ سچے دل سے میری قدر کرے گا اور ناز نخرے بھی اٹھائے گا۔''
نوید کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ اسے صد فیصد یقین تھا کہ ماریا کا خاموش اشارہ اسی کی طرف ہے۔ یہ قرعہ فال اسی کے نام نکلنے والا ہے لیکن وہ اپنی جانب سے کچھ کہنے کے بجائے ماریا کی زبان ہی سے یہ نویدِ مسرت سننے کا خواہاں تھا لہٰذا اپنے دلی جذبات کو چھپاتے ہوئے اس نے سرسری لہجے میں پوچھا۔
''ماریا! تم نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا... تم نے کس خوش نصیب سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے؟''
''نوید... تم اس شخص کو اچھی طرح جانتے ہو۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولی۔ ''اس سلسلے میں تمہیں میری مدد کرنا ہو گی... بولو، مدد کرو گے؟''
''ہاں کروں گا...'' وہ پُرعزم انداز میں بولا۔ ''بتاؤ، کرنا کیا ہے؟''
نوید کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس سے تھوڑا کھیلنے کے بعد اسی کا نام ڈکلیئر کر دے گی۔ وہ بڑی امید بھری نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ چند لمحات کے پُراسرار توقف کے بعد ماریا نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
''نوید! میں لڑکی ہوں۔ اپنی بات کو خود ہی آگے بڑھاتے ہوئے اچھی نہیں لگوں گی۔ تمہیں اس معاملے کو ہینڈل کرنا ہے۔''
''اتنا سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟'' نوید نے شکایتی انداز میں کہا۔ ''میری برداشت کا اور امتحان نہ لو... دوٹوک الفاظ میں بتاؤ، تمہارا انتخاب کون ہے؟''
ماریا نے دوٹوک الفاظ میں بتا دیا۔ سارا سسپنس ختم ہو گیا۔

☆☆☆

نوید نے رنگ برنگی شعاعیں خارج کرنے والی مخصوص گن عارف کی طرف بڑھاتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''یہ ریوالور ہم نے ''دو دل دیوانے'' کے آخری ایپی سوڈ کے لیے ارینج کیا تھا جب ہیروئن کا کزن اسے متاثر کرنے کے لیے ''نیا سال'' وِش کرتا ہے۔ یہ سیریل تو فی الحال کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اس اسپیشل ریوالور سے استفادہ کرو۔ ایک دو روز میں نیا سال شروع ہونے والا ہے...'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا، ایک بوجھل سانس خارج کی پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔
''تمہیں اس ریوالور کو آپریٹ کرنا تو آتا ہے نا؟''
''جی نوید بھائی!'' عارف نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں پہلے چلا کر آپ کو دکھا چکا ہوں۔''
''تو جاؤ... پھر مزے کرو۔'' نوید نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''وِش یو گڈ لک۔''
''نوید بھائی!'' عارف بے حد جذباتی ہو گیا۔ ''آپ نے میرے لیے جتنا کچھ کیا ہے، کوئی باپ بھی اپنے بیٹے کے لیے نہیں کر سکتا ہے۔ میں زندگی بھر آپ کے اس احسان کو نہیں بھول سکتا۔''
''پاگل انسان! میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔'' نوید نے اپنے لہجے میں مصنوعی مضبوطی بھرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں تو ماریا کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جس نے تمہارے حق میں فیصلہ سنایا ہے... میرا رول تو کوآرڈی نیٹر سے زیادہ نہیں ہے۔''
عارف تشکر آمیز نظر سے اپنے اصلی گرو کو دیکھتا چلا گیا۔
نوید نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ ''اب جاؤ... اور اس ریوالور کو چلانے کی تھوڑی ریہرسل بھی کر لو۔ یہ بات ذہن میں رکھنا کہ ماریا صرف بیوٹیشن اور پروڈیوسر ہی نہیں بلکہ ایک اچھی ڈائریکٹر بھی ہے۔ وہ کسی بھی وقت ''کٹ'' کا نعرہ بلند کر سکتی ہے۔''
عارف نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور اپنے گرو کو سیلوٹ مار کر کمرے سے نکل گیا۔
عارف کے جانے کے بعد نوید اپنے اندرونی جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ بڑی دیر سے اس کی آنکھوں کے پیچھے جو طوفان تھما ہوا تھا، ضبط کے بند ٹوٹتے ہی وہ کسی سیلابی ریلے کے مانند بہہ نکلا۔ نوید نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیچھے چھپا لیا اور کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر ایک المیہ نغمہ گنگنانے لگا۔ اس نے اپنا چہرہ تو ڈھانپ لیا تھا لیکن آنکھوں کی نمی اس کے شکستہ ارمانوں کا نوحہ پڑھ رہی تھی۔

اسماء الحسنیٰ ۔ کامیابی کا راستہ

دینِ اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

ایس ۔ ایم ۔ قادری

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ وحق سبحانہٗ کو زیبا ہیں۔ کہ جس نے کن فیکون سے عالمِ فانی کو کمال مہربانی سے تخلیق کیا۔ اور اس کو اپنی ذات کے نور سے منور کیا ہے۔ اس نے بہترین مذہب اور بہترین رسولؐ عطا کیا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ مقدس نے انسانی شعور کو ہدایت کی ان بلندیوں کی جانب گامزن کیا کہ جہاں ذاتِ باری تعالیٰ کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ انسان کیلئے آج بھی راہِ ہدایت موجود ہے۔ کتابِ الٰہی ابد تک ہمارے روشن مستقبل کی جانب رہنمائی کرتی رہے گی۔ اور اسی طرح سنتِ رسول کریم ﷺ آج بھی قائم دائم ہے۔ اور تا قیامت عالمِ انسانیت کے لئے روشنی کا مینار رہے گی۔ تو پھر آیئے ہم اپنی کوتاہ نظری اور بیماری، تفکرات کو اسماء الحسنیٰ اور اسوۂ حسنہ سے تر و تازگی بخشیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام سے اپنی عقل وقلوب کو روشن کریں۔ دکھوں پریشانیوں اور مشکلات کے حل کے لئے اس معبودِ برحق کی جانب رجوع کریں۔ جو کل عالمین کا رب ہے۔ جس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں جو ملکیت، اقتدار، ترقی، آسائش، شعور وآگاہی اور انسانی ضروریات کے تمام وسائل کا خالق ومالک ہے۔

جناب محترم ایس۔ ایم۔ قادری صاحب معروف روحانی سکالر، اسماء الحسنیٰ کے محقق ودیگر دینی اور روحانی علوم پر گہری نظر رکھنے والے عرصہ دراز سے اندرون اور بیرون ملک عوام کو اپنے مشوروں سے مستفید فرما رہے ہیں۔ انتہائی قابلِ قدر کتب کے مصنف ہیں۔ ان کے کالم ملک کے تمام قومی اخبارات، جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے مداحوں میں ملکی وغیر ملکی معروف اہلِ علم، دانشور، بیوروکریٹس اور اہم سیاسی شخصیات شامل ہیں اندرون اور بیرون ملک ایک وسیع تر حلقہ محترم ایس، ایم، قادری صاحب کے مشوروں سے فیضیاب ہو کر سکون اور اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ہر سال بارہ سے پندرہ ہزار افراد بذریعہ خط وکتابت روحانی تسکین اور جسمانی امراض میں شفا کے حصول کے لئے رہنمائی حاصل کر رہے ہیں۔ یہ طرۂ امتیاز بھی محترم ایس۔ایم۔ قادری صاحب کو ہی حاصل ہے کہ وسطی ایشیا، عرب ممالک، کینیڈا، امریکہ اور یورپ میں رہنے والے ہزاروں افراد بھی آپ سے بذریعہ خط وکتابت فیض حاصل کر رہے ہیں۔

ایس۔ایم۔ قادری صاحب کی شخصیت اس لحاظ سے بھی ممتاز ومنفرد ہے۔ کہ ان کے پروگرام بعنوان اسماء الحسنیٰ 1998ء سے پی ٹی وی ورلڈ پر ٹیلی کاسٹ ہونا شروع ہوئے۔ ان پروگرام کی مقبولیت اور افادیت کا یہ عالم ہے کہ نہ صرف یہ کہ پاکستان میں ''ARY ڈیجیٹل'' سے آپ کے پروگرام اسماء الحسنیٰ بعنوان ''کامیابی کا راستہ'' ہر جمعۃ المبارک کو نشر ہوتا رہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ روزانہ دنیا میں کسی نہ کسی چینل کے حوالے سے پروگرام اسماء الحسنیٰ ٹیلی کاسٹ ہوتے رہتے ہیں۔

☆☆--☆☆

کنول۔ جیکب آباد

محترم! آپ کا پروگرام اسماء الحسنیٰ کامیابی کا راستہ بہت عمدہ معلوماتی پروگرام ہے اس میں جس طرح اللہ تعالیٰ کے ناموں سے ہماری راہنمائی کی جاتی ہے اس کی مثال نہیں ملتی میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ترقی و کامیابیاں عطا فرمائے۔ (آمین) میرے شوہر ایک سرکاری افسر ہیں اچھے عہدے پر فائز ہیں مگر ہمیشہ ان کی پروموشن میں غیر ضروری تاخیر ہو جاتی ہے دوسرے یہ کہ وہ ان چند افسروں میں ہیں جن کا اوڑھنا بچھونا ایمان دار ہوتا ہے اور بعض اوقات افسران بالا کو یہ بات پسند نہیں آتی ہے اس لئے بھی ملازمت میں کچھ نہ کچھ مسائل حائل ہی رہتے ہیں آپ سے درخواست ہے کہ کوئی ایسا اسم الٰہی یا وظیفہ یا لوح عنایت فرمائیں کہ جس سے ان کے معاملات میں بہتری آجائے اور پروموشن کے معاملات آسان ہو جائیں۔

☆ عزیز بہن! البیک ٹی وی کیلئے نیک تمناؤں کا شکریہ! اللہ تعالیٰ

www.urdutech.com

آپ کے شوہر کے تمام معاملات میں خیر و برکت عطا فرمائیں اور انہیں حاسدین کے شر سے محفوظ و مامون رکھیں۔ (آمین) آپ "یارافع یاقدوس" ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کرلیا کریں اول آخر 7 مرتبہ درود شریف آپ کی فرمائش پر ترقی اور خیر و برکت کیلئے لوح شمس ارسال کی جارہی ہے نماز کی پابندی فرمائیں۔

نورالعین۔ چیچہ وطنی

O محترم! برسوں سے جاسوسی کی خاموش قاری ہوں اس کی بعض تحریریں تو میری زندگی کی ترجمانی کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ لیکن آپ کے کالم نے آج مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا ہے۔ میری زندگی انتہائی خوشحال تھی والدین متمول طبقے سے تعلق رکھتے تھے زندگی کی ہر خوشی میسر تھی۔ لیکن برا ہو محبت کا۔ اس نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔ اس محبت کے لئے میں نے اپنے والدین سے بغاوت کی۔ بھائیوں کا سر نیچا کیا بزرگوں کو رسوا کیا لیکن نتیجہ کیا ملا؟ جس کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا اس نے محض دو سال میں ہی اپنا اصل چہرہ دکھا دیا۔ محبت اور عاشقی کا نقاب اتار دیا۔ اندر سے خود غرض، مطلبی، مکار چہرہ نمودار ہوگیا۔ جس سے مجھے حیران کر دیا۔ اس نے یہ شادی میری محبت میں نہیں دولت کے لالچ میں کی تھی۔ وہ پہلے سے شادی شدہ اور چار بچوں کا باپ تھا۔ نہ پوچھئے مجھ پر کیا نہ بیتی۔ میں دھوبی کا کتا بن گئی۔ نہ گھر کی نہ گھاٹ کی والدین کے پاس کیا منہ لیکر جاتی رو دھو کر چپ رہی کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی مگر پھر ایک دن معلوم ہوا کہ اس نے نشہ کرنا شروع کر دیا ہے گھر کی ہر چیز بک گئی آخر میں میں رہ گئی۔ اس سے پہلے کہ مجھے بیچ دیتا۔ میرا چھوٹا بھائی میری مدد کو آگیا اس نے مجھے بچالیا کن مشکلوں سے اس نے میری جان چھڑائی۔ یہ ایک علیحدہ کہانی ہے انہی دنوں والد فوت ہوگئے ان کی وصیت کے مطابق مجھے جائیداد میں سے حصہ تو ملا مگر انہوں نے وصیت کر دی تھی کہ نورالعین کو میرا مرا ہوا منہ دیکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے میں جس کی آنکھوں کا نور، دل کا سرور تھی جس کے سینے سے لپٹ کر بچپن بتایا۔ وہ باپ مرتے مرتے بھی میرا قصور معاف نہ کر سکا۔ مجھ سے بڑھ میری بدبختی اور کیا ہوسکتی تھی۔ کچھ عرصے کے بعد امی کا انتقال ہوا تو انہوں نے بھی یہی وصیت کی کہ جس کو میرا شوہر آنے کی اجازت نہ دے سکا اس کو میرے جنازے میں مت آنے دینا۔ قادری صاحب! میرا یہ خط ضرور چھاپئے گا تاکہ محبت میں اندھے ہوکر لڑکیاں ماں باپ کو زندہ درگور نہ کریں۔ ماں باپ، بہن بھائی کو ایک شخص کیلئے قربان نہ کریں۔ میں آج ایک اچھے اسکول میں پڑھا رہی ہوں اللہ کا شکر ہے کہ بہت اچھی گزر رہی ہے لیکن دل کے گھاؤ چین نہیں لینے دیتے ہیں آپ سے درخواست ہے کہ میرے سکون کیلئے دعا کیلئے کوئی اسم الٰہی تجویز فرما دیجئے۔

☆ عزیز بیٹی! اللہ تعالیٰ آپ کو صبر اور سکون عطا فرمائے۔ "یاغفور الرحیم" ہر نماز کے بعد 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کیا کیجئے۔ اول آخر 3 مرتبہ درود شریف۔ لبیک ٹی وی کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔

محمد مطیع الرحمٰن۔ سیالکوٹ

O محترم! جاسوسی کے ذریعے آپ سے تعارف ہوا۔ آپ کے ہاں گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا میں حاضر ہوا تھا آپ کے خطاب سے بے حد راہ نمائی ملی۔ اس کے بعد آپ کی اقتداء میں نماز مغرب اور پھر اجتماعی دعا نے، یقین کیجئے کہ یوں لگا کہ آپ نے نہ صرف میری بلکہ تمام حاضرین محفل کی دلی آرزوئیں اللہ کے حضور پیش کر دیں۔ اللہ تعالیٰ قبول و منظور فرمائیں (آمین) اس دن میں آپ سے مل کر اپنا مسئلہ بیان نہ کرسکا میری شادی کو چھٹا برس ہے لیکن اولاد سے محروم ہوں شادی کے ابتدائی دو سالوں میں حمل ہوا تھا لیکن مصلحت خداوندی سے ضائع ہوگیا۔ اس کے بعد اولاد کے حوالے سے دامن مراد خالی ہی رہا۔ آپ کے کالم اور کتب نے راہ نمائی دی، مجھے صحیح اسلامی خطوط پر اولاد کے لئے کوئی علاج تجویز فرما دیجئے تاکہ میں بھی اولاد کی نعمت حاصل کرسکوں اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ کا اقبال بلند رکھیں۔ (آمین)

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کو یقیناً اولاد کی نعمتوں سے سرفراز فرمائیں گے وہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ہر نماز کے 125 مرتبہ "یا کریم یاوارث" پڑھکر دعا کریں۔ اول آخر 5 مرتبہ درود شریف۔ بطور روحانی علاج اولاد کے لئے علاج درعقیم ارسال کیا جارہا ہے۔

شہزاد اختر۔ اسلام آباد

O محترم! والدین نے اپنی مرضی اور خوشی سے میری منگنی کی۔ یہ منگنی 6 برس رہی قدرتی طور پر ہمیں ایک دوسرے سے محبت ہو گئی۔ لیکن اب ایک معمولی سی بات پر میرے والدین نے منگنی توڑ دی ہے جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خدا کے لئے آپ ہماری مدد کیجئے۔ چونکہ اس میں ہمارا کوئی قصور ہے اور نہ ہی یہ بات ایسی ہے کہ جس پر رشتہ توڑا جائے مسئلہ صرف انا پرستی ہے کوئی اسم الٰہی اور لوح تجویز فرمائیے۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ ہم سب کو انا پرستی، اور عجلت پسندی سے محفوظ رکھے در حقیقت تکبر اور عجلت شیطان کی صفت ہے اور اسی کی وجہ سے وہ راندہ درگاہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کے والدین کو صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت عطا فرمائے (آمین) ہر نماز کے بعد 141 مرتبہ "یا کریم یاسلام یالطیف یاجامع" پڑھ کر دعا کریں اول آخر 5 مرتبہ درود شریف۔ آپ کی فرمائش پر شادی کے لئے لوح زہرہ ارسال کی جارہی ہے۔

محمد رضا احمد۔ نارووال

O محترم! گزشتہ کئی برسوں سے آپ کو پڑھ رہا ہوں مشوروں سے براہ راست نہ سہی بالواسطہ مستفید ہوتا رہا ہوں۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ آپ کے کالم حقیقی راہ نمائی کا حق ادا کر رہے ہیں آپ اسماء الحسنٰی کے ذریعے جس طرح اللہ کے نام کو اس کی صفات کو دلوں میں راسخ کر رہے ہیں اس کا اجر آپ کو دنیا اور آخرت دونوں میں نہایت بھرپور ملے گا۔ انشاء اللہ۔ اس کے ساتھ محترم معراج رسول، محترمہ عذرا رسول بھی مبارکباد کی مستحق ہیں جو کہ اس قدر مفید اور معلوماتی روحانی کالم شائع کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے بھی دینی اور دنیاوی درجات میں اضافہ فرمائے (آمین) آج ہمت کر کے پہلی بار آپ سے مخاطب ہونے کی جسارت کر رہا ہوں آپ کی محبتوں اور کرم فرمائیوں نے حوصلہ دیا ہے۔ الحمدللہ تین بیٹوں کا باپ ہوں۔ اللہ کی رحمت ہے۔ ان سے گھر میں رونق اور خوبصورتی ہے۔ مگر اب آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جناب سے ایک بیٹے کی دعا قبول ہو جائے۔ آپ کے علاج درعقیم کی بہت شہرت ہے کئی لوگوں کے دامن مراد بھرتے دیکھے ہیں کیا یہ ممکن ہے کہ یہ ہمارے لئے آپ اپنی خصوصی توجہ سے عنایت فرمادیں۔ نہایت کرم ہوگا آپ کیلئے ہمیشہ دعا گو۔

شرفِ ستارگان کی الواح

اپنے نام اور ستارے کے مطابق لوح حاصل کر کے کامیاب زندگی بسر کریں۔

لوح شرفِ مریخ
دل کی گھبراہٹ، ڈپریشن، مردانہ امراض، خواتین کے امراض، خون کی کمی، آسیب سے نجات، افسرانِ بالا کی توجہ اور رجوع خلق کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ زہرہ
تسخیر خلق، پسند کی شادی، ڈاکٹر و حکیم، سیاستدان، عورتوں کے امراض، انٹیریئر ڈیکوریشن، مصوروں، خطاطوں اور ادیبوں کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ عطارد
علمی ترقی، حافظے میں اضافہ، تعلیم میں کامیابی، یادداشت میں اضافہ، بچوں کا خواب میں ڈرنا، ٹرانسپورٹ، تجارت اور کمیونیکیشن سے منسلک افراد کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ قمر
پرانی جسمانی بیماریاں، نسوانی امراض، تسخیر، ترقی، زراعت اور باغبانی کے لئے مفید ہے۔ دماغی قوتوں میں اضافہ، روحانی علوم میں کامیابی، تسخیر خلق کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ شمس
ترقی، عروج، سحر، جادو سے حفاظت، روپے پیسے کی آمد، سماجی مرتبے میں اضافے کے لئے تیار کی جاتی ہے، جن کے زائچے میں شمس کمزور ہو ان کیلئے مفید ہے۔

لوح شرفِ مشتری
مالی خوش بختی، حصول دولت، آمدنی کے مختلف ذرائع کو ترقی دینا، انعامی اسکیموں میں فائدہ، مستقبل کی بہتری، کیرئیر اور ترقی کے استحکام کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ زحل
کاموں میں رکاوٹ، جائیداد کے تنازعات، پرانے امراض، ضدی امراض، نحوست، جادو، آسیب سے نجات کیلئے تیار کی جاتی ہے۔

لوح شرفِ سبع ستارگان
ساتوں ستاروں کا یکجا نقش

خیر و برکت، مالی خوش بختی، تسخیر خلق، مرد اور عورتوں کے پرانے امراض، شادی میں تاخیر اور رکاوٹ، علمی ترقی، تعلیم میں کامیابی، گھریلو پریشانیاں، جادو، آسیب سے نجات کے لئے تیار کی جاتی ہے۔

اپنی پسند کی لوح منگوانے کیلئے رابطہ کیجئے B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ پاکستان۔ فون نمبر: 5168036-5167842

www.urdutech.com

لیک ٹی وی دیکھنے کیلئے اپنے کیبل آپریٹر کو ٹیلی فون کیجئے

ورلڈ کال ،وطین،اور پی ٹی سی ایل سمارٹ کے ناظرین درج ذیل نمبروں پر فون کر کے لیک ٹی وی دیکھ سکتے ہیں۔

ورلڈکال: 111-111-965

وطین: 111-365-111

پی ٹی سی ایل سمارٹ: 0800-808000

☆عزیزم! دعاؤں اور محبتوں کا شکریہ۔ اللہ تعالیٰ یقیناً ہم سب کی فریادوں اور دعاؤں کا سننے والا ہے اس کی عطا کا کوئی ٹھکانہ نہیں شرط صرف خلوص نیت کی ہے۔ ''یاوارث یاباقی'' ہر نماز کے بعد125 مرتبہ پڑھکر دعا کریں اول آخر 7مرتبہ درود شریف۔ آپ کی فرمائش پر اولاد نرینہ کے لئے علاج درعقیم ارسال کیا جارہا ہے۔ دعاؤں کا بہت شکریہ۔

فریادحسین۔ساہیوال

O محترم! طویل عرصے قبل آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اس وقت بہن کی شادی کا مسئلہ درپیش تھا۔ آپ کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا اور بہن اپنے گھر کی ہوگئیں اب ماشاءاللہ چار بچوں کی والدہ ہیں میری شادی جہاں ہوئی ہے وہ پانچ بہنیں ہیں اور میری بیگم سب سے بڑی ہیں ان کی دیگر بہنوں کے رشتے آتے ہیں لیکن کوئی بات ہی دیکھنے دکھانے سے آگے بڑھتی نہیں ہے کئی لوگوں سے پوچھا ہے سب یہی بتاتے ہیں کہ حاسدوں نے زبردست بندش کی ہوئی ہے۔ عرض یہ ہے کہ کہ بندش ہو یا جادو، یا کوئی بدنظر، ہم پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہوگئے ہیں کوئی دعا اور لوح تجویز فرما دیجئے۔ نیز گیارہویں شریف کے لئے ایک چھوٹا سا نذرانہ منی آرڈر کررہا ہوں قبول فرمایئے گا۔

☆عزیزم! دعاؤں کا شکریہ۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ آپ سب اہل خانہ کو خیر وعافیت سے نوازیں (آمین) بچیوں کی شادی کے لئے ''یالطیف یافتاح'' ہر نماز کے بعد225 مرتبہ پڑھ کر دعا کر لیں۔ اول آخر 7مرتبہ درود شریف شادی کے حوالے سے لوح تسخیر خاص ارسال کی جارہی ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کی تمام دلی جائز خواہشات کو پورا فرمائیں (آمین)

ریحانہ تبسم۔ فیصل آباد

O محترم! آپ کے کالم کو پڑھ کر ایک روشنی کا احساس ہوتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا معاشرہ اہل خیر سے خالی نہیں ہوا ہے۔ آپ لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں ان کے رازوں کے امین ہیں۔ یہ بڑا مقام ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے۔ میں بھی اس محفل میں اس لئے حاضر ہوگئی ہوں کہ آپ سے راہ نمائی طلب کروں۔ گزشتہ سال یونہی ایک رانگ نمبر سے گفتگو کا آغاز ہوا وہ کچھ دنوں میں ہی سنجیدہ ہوگیا۔ اور اس نے بڑے خلوص سے اپنے والدین کو میرے گھر بھیجنے کے لئے کہا۔ میں نے اپنی بڑی بہن کے ذریعے والدہ کو آگاہ کیا خیر والدہ کی اجازت سے وہ گھر آئے۔ انتہائی خوش مزاج اور اچھے خاندان کے لوگ تھے۔ ہمارے گھر والوں کو پسند آئے۔ چند دنوں کے بعد ابو بھی ان کے ہاں گئے اور ہاں کر آئے۔ ایک دن یونہی باتوں باتوں میں امی کے منہ سے نکل گیا کہ ریحانہ کا انتخاب بہت اچھا ہے ابو کا ماتھا ٹھنکا۔ انہوں نے کرید کرید کر ساری صورت حال پوچھی، امی نے کچھ سادی میں، کچھ یہ سوچ کر کہ خود ہاں کر کے آئے ہیں۔ ہر چیز سے مطمئن ہیں سب بتادیا ساری تفصیلات جان کر ابو نے ارشاد کیا کہ ''عاشقی'' کی شادی نہیں ہونے دیں گے اور فون کر کے لڑکے والوں کو صاف منع کر دیا۔ فراز کے والد بہت سلجھے ہوئے آدمی ہیں انہوں نے کہا کہ بچوں کی پسند پر جب ہمیں اعتراض نہیں تو آپ کیوں اعتراض کرتے ہیں مگر ابو کی ناں ہاں میں نہ بدلی۔ آپ بتایئے کہ اگر ہم نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا اور شرعی طریقے سے والدین کے ذریعے اپنی پسند حاصل کرنا چاہی تو اس میں برا کیا ہے گناہ کیا ہے؟۔ وہ لوگ ابھی تک منتظر ہیں لیکن ابو نہیں مان رہے۔ اس صورتحال سے سخت پریشان ہوں کوئی دعا کوئی نقش ارسال فرمایئے تاکہ ابو اس مسئلے پر ہمدردی اور محبت سے غور کر کے ہمارے حق میں فیصلہ کریں۔ نہایت مشکور رہوں گی۔

☆عزیز بیٹی! دعاؤں کا شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کے والد صاحب کو عقل سلیم عطا فرمائے اور وہ آپ کے حق میں مناسب فیصلہ کر

سکیں (آمین) ہر نماز کے بعد140 مرتبہ ''یالطیف یاجامع یافتاح'' پڑھ کر دعا کریں اول آخر 9مرتبہ درود شریف۔ آپ کے لئے لوح زہرہ ارسال کی جارہی ہے نماز کی پابندی کیجئے۔

نوٹ: اکثر بہن بھائی درود شریف کے حوالے سے پوچھتے ہیں کہ وہ اول آخر کون سا درود شریف پڑھا کریں تو نوٹ کر لیجئے کہ افضل ترین درود شریف، درود شریف ابراہیمی ہے۔ اور اگر بعض اوقات کہیں لکھا نہ بھی تو عمل یا دعا کے اول آخر میں درود شریف ضرور پڑھنا چاہیے کہ اس سے دعا کی جلد قبولیت کے دروازے کھلتے ہیں براہ راست جواب کے لئے آپ جوابی لفافے کے ساتھ B-359 فیصل ٹاؤن لاہور کے پتے پر خط لکھ سکتے ہیں۔ رسالے میں جواب باری آنے پر دیا جاتا ہے۔ صرف وہ بہن بھائی جو پاکستان سے باہر ہیں وہ جوابی لفافہ نہ بھیجیں کیونکہ ان کے لئے پاکستان کا لفافہ یا ٹکٹ لینا ممکن نہیں ہوتا وہ اپنا مکمل پتا معہ ٹیلی فون نمبر ارسال کریں انہیں جواب دیدیا جائے گا۔

محمد رفیق۔ گوجرانوالہ

O محترم! میں گزشتہ 8 سال سے کاروبار کر رہا ہوں مگر اس سے مطمئن نہیں ہوں یوں لگتا ہے کہ بہتری پر جاتے جاتے اچانک رکاوٹ پڑ جاتی ہے کبھی مطمئن نہ ہوسکا کہ یہ ایورتج آمدنی ہے کہ جس کے مطابق کوئی مزید فیصلے کر سکوں یوں سمجھ لیجئے کہ روز کنواں کھودنا اور پانی پینے والا مسئلہ ہے میں اپنا کاروبار بدلنا نہیں چاہتا ہوں اس لئے کہ اب اس میں اتنا سرمایہ لگ چکا ہے اتنا وقت دے چکا ہوں کہ بدلنا یا بند کرنا دونوں ہی ممکن نہیں ہیں۔ لہٰذا آپ سے التماس یہ ہے کہ آپ کوئی اسم الٰہی، یا کوئی لوح تجویز فرما دیجئے کہ جس سے کاروباری معاملات کھل جائیں۔ اور میں مطمئن اور فارغ البال زندگی گزار سکوں آپ کے لئے ہمیشہ دعا گو۔

☆عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کو کاروباری خیر وبرکت سے نوازیں (آمین) ہر نماز کے بعد140 مرتبہ ''یاوہاب یافتاح'' پڑھ کر دعا کیا کریں۔ اول آخر 7مرتبہ درود شریف حسب توفیق صدقہ دیا کیجئے کاروباری ترقی اور خیر وبرکت کے لئے لوح مشتری ارسال کی جارہی ہے۔

شمشاد اختر۔ بھلوال

O محترم! میری شادی کو آٹھ برس ہوگئے ہیں لیکن بیگم صاحبہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا کئے رکھتی ہیں۔ لڑنا، ناراض ہونا، روٹھکر میکے چلے جانا۔ ان کی عادت ہے مزے کی بات یہ ہے کہ نہ صرف سسرال میں بلکہ میکے میں بھی اس کی بے جا زبان درازی، ہر معاملے میں مداخلت سے نہ بہنیں بھائی خوش ہیں نہ بھاوجیں۔ مگر یوں لگتا ہے کہ انہیں کسی کی پرواہ نہیں ہے وہ اپنے آپ میں مگن ہیں۔ ہم سب خلوص سے ان کی اصلاح چاہتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ ایک اچھی بہن، ایک اچھی بہو بن جائیں۔ بچوں کی ذمہ دار ماں بن بنیں۔ اس لئے آپ سے گزارش ہے کہ کوئی لوح وغیرہ تجویز کیجئے آپ کے لئے دعا گو۔

☆عزیزم! اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کی بیگم کی اصلاح فرمائے (آمین) ہر نماز کے بعد ''یاسلام یاقدوس یاشہید'' 125 مرتبہ پڑھ کر دعا کر لیں اول آخر 9مرتبہ درود شریف اصلاح کے لئے لوح تسخیر ارسال کی جارہی ہے۔ دعاؤں کا شکریہ۔

محمد اویس۔ کراچی

O محترم! میری شادی کو چھ سال کا عرصہ ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی خوشخبری نہیں ملی ڈاکٹروں کی رپورٹس کے مطابق ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہے اس سلسلے میں آپ سے مدد کی درخواست ہے آپ ہماری مدد فرمائیں تاحیات آپ کے احسان مند رہیں گے۔ ہمیشہ آپ کے لئے دعا گو!

☆عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کو اولاد نرینہ کی نعمت سے سرفراز فرمائے (آمین) آپ بکثرت ''یامصور یاوارث'' پڑھیں آپ کی فرمائش پر آپ کیلئے نقش علاج درعقیم ارسال کیا جارہا ہے۔

ملاقات: روزانہ صبح 9 تا مغرب ''جمعۃ المبارک تعطیل'' (براہ راست جواب کیلئے جوابی لفافہ بھیجئے۔)
ایس۔ایم۔قادری B-359 فیصل ٹاؤن لاہور۔ فون نمبر: 042-5167842,5168036
ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا ہر انگریزی مہینے کی پہلی اتوار کو بعد نماز عصر تا مغرب منعقد ہوتی ہے

عباس علی۔ گجرات

○ محترم! آپ کے کالم کا پرانا قاری ہوں، آپ جس انداز میں اسماء الحسنیٰ بتاتے ہیں اس سے بڑا متاثر ہوا ہوں میرا روزگار کا مسئلہ ہے عرصہ تین سال سے فارغ پھر رہا ہوں ہر جگہ سے مایوس ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں میری مدد فرمائیں۔

☆ عزیزم! اللہ تعالیٰ آپ کے تمام احباب کے معاشی معاملات بہتر فرمائے۔ آپ ہر نماز کے بعد 140 مرتبہ "یارازق یاوہاب" پڑھیں اول آخر 7 مرتبہ درود شریف۔ آپ کی فرمائش پر لوح مشتری ارسال کی جارہی ہے۔

ضروری گزارش

☆☆ خط لکھتے وقت اپنا نام اور پتہ معہ شہر کے مکمل لکھئے۔ مخفف نام والے خطوط قابل جواب نہ ہوں گے۔ براہ راست جواب کے لئے پتا لکھا ہوا جوابی لفافہ ارسال کیجئے اور ف، ک، ٹائپ کے نام لکھنے سے گریز کیجئے۔ اگر آپ اپنا نام نہ شائع کروانا چاہیں تو فرضی نام لکھ کر واضح ہدایت کر دیجئے۔ فون پر مسئلہ ڈسکس نہیں کیا جاتا جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھ دیں۔

○ صفدر، نائلہ پروین، صائمہ اختر، سائرہ خان، محمد یونس، پرویز خان، شفقت بانو، مولوی بشیر احمد، حیات اللہ۔ متفرق شہر

☆ آپ سب نے ختم شریف میں قرآن حکیم، کلمہ شریف، سورۃ ملک، سورۃ یٰسین، آیت کریمہ کی جو پڑھائیاں ایصال ثواب کے لئے تحریر کئے تھے۔ وہ سب محفل ختم شریف میں حضور اکرم نور مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، انبیاء علیہ السلام صحابۂ اجمعینؓ، سیدنا غوث الاعظمؒ جملہ مسلمین و مسلمات کیلئے ہدیہ کر دیئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری کاوشوں کو قبول و مقبول فرمائے۔ جو بہن بھائی ایصال ثواب حصول خیر و برکت کیلئے قرآن حکیم، مختلف سورتیں۔ کلمہ شریف، درود شریف شریف پڑھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ان کی طرف سے ہادی عالمؐ کی بارگاہ میں، بزرگان دین کے لئے پڑھائیوں کے ہدیئے بھیجنا چاہیں وہ بذریعہ خط، ٹیلی فون پر مطلع فرمادیا کریں۔

☆☆☆

اس مرتبہ ختم گیارہویں شریف اور اجتماعی دعا انشاء اللہ 4 جنوری بروز اتوار کو ہو گی۔ تمام بہن اور بھائیوں اور مریدین سے شرکت کی استدعا ہے۔

☆ درسِ بخاری شریف ☆

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں بھرا پروگرام

☆ اسماء الحسنیٰ۔ کامیابی کا راستہ ☆

مقرر: ایس ایم۔ قادری۔۔ ہر شب 8 بجے

آپ کے مسائل پر مبنی پروگرام

☆ احکام القرآن ☆

قرآنی تعلیمات پر مبنی تفسیر کا پروگرام

رات 9 بجے

☆ صبح اُمید ☆

کھٹی میٹھی گفتگو کا پروگرام جس میں آپ بھی شرکت کر سکتے ہیں۔

0900-10256

ہزاروں دلچسپیاں۔ ہزاروں نیرنگیاں

اپنے کیبل آپریٹر سے کہہ دیں

کہ وہ لبیک ٹی وی لگا دیں

AKS Communication (Pvt) Ltd.
359-B, Faisal Town, lahore Pakistan.
Ph:92425167842,5168036